ماشاء اللہ

تاریخ ملتان

جلد دوم

مولانا نور احمد خان فریدی

قصر الادب رائٹرز کالونی، ملتان

مُلتانِ ما بجنتِ اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

تاریخ ملتان

جلد دوم

لنگاہوں کے دَور سے عہدِ حاضر تک

از

مولانا نور احمد خان فریدی

ناشر قصر الادب
نور محل براہ شجاع آباد ضلع ملتان
رائیٹرز کالونی، ملتان شہر

۷۸۶

خطۂ پاکیزۂ ملتان و سندھ ہست تصویرِ عرب در ملکِ ہند
مایۂ ناز است بہر ایں زمیں نقشِ پائے ابنِ قاسم بر جبیں
در ضلالت خانۂ ہندوستاں
اوّلیں گہوارۂ اسلامیاں

اسد ملتانی

تاریخ ملتان

جلد دوم

لنگاہوں کے دور سے عہدِ حاضر تک

از

مولانا نور احمد خاں فریدی

ناشر

عمر علی خاں، منیجر قصر الادب، رائیٹرز کالونی ملتان شہر

تاریخ ملتان ——— جلد دوم

مصنف ——— مولانا نور احمد خاں فریدی

ضخامت ——— ۵۰۴ صفحات

کتابت ——— صالح محمد جمالی

طباعت ——— ہمدرد پرنٹنگ پریس ملتان

طابع ——— مولوی عبید احمد قادری

ناشر ——— عمر علی خاں

مکتبہ ——— قصر الادب رائٹرز کالونی ملتان

بار اوّل ——— ۱۹۷۷ء

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت -/250
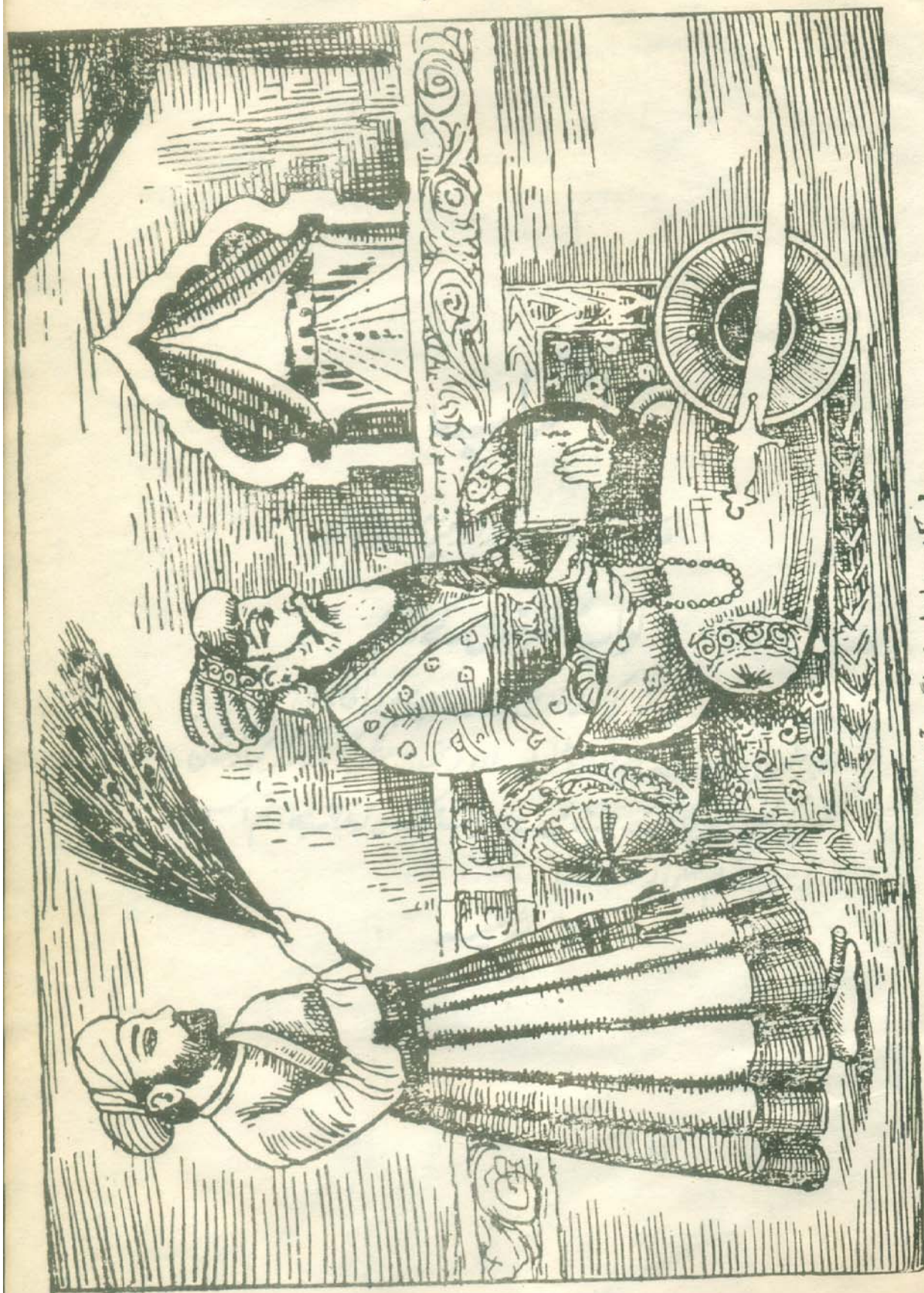
از کش ما را خدنگ آخریں

نواب مظفر خاں شہید سدوزئی صوبیدار ملتان

انتساب

ملتان کے آخری بہادر اور غیور مسلمان حکمران

نواب مظفر خاں کے نام

جس نے اس تاریخی شہر کی حفاظت کے لئے اپنا پورا خاندان شہید کرا دیا مگر سکھوں کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔ اور رنجیت سنگھ کو للکار کر کہا کہ ملتان شہر کی کنجی مظفر خاں کے پیٹ میں ہے۔ جب تک یہ زندہ ہے، تم اس سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتے!

رحمۃ اللہ علیہ
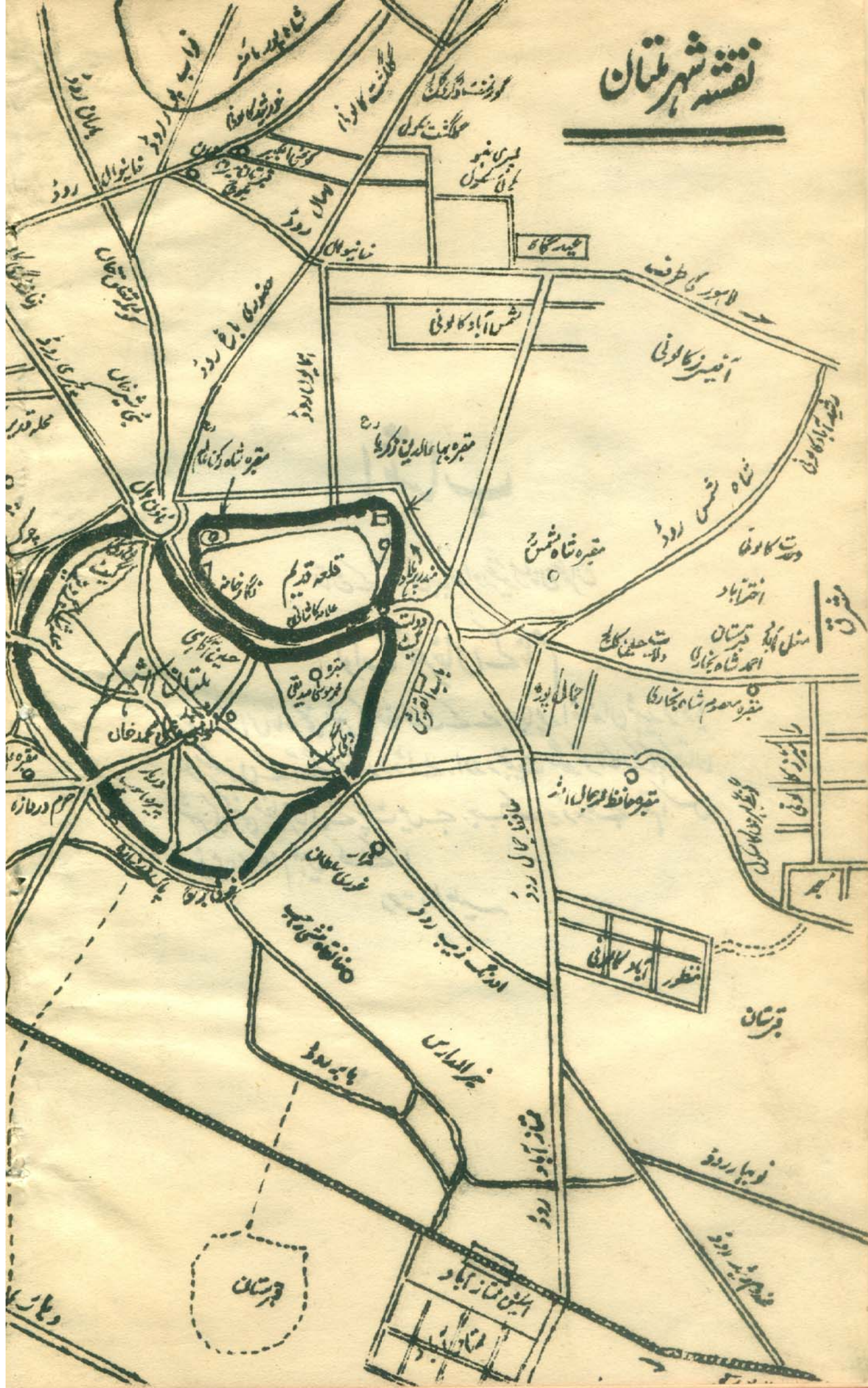
نقشہ شہر ملتان
لاہور کی طرف
آفیسرز کالونی
شمس آباد کالونی
عید گاہ
گلگشت کالونی
قلعہ قدیم
مقبرہ شاہ رکن عالم
مقبرہ بہاء الدین ذکریا
مقبرہ شاہ شمس
شاہ شمس روڈ
وحدت کالونی
اختر آباد
حرم دروازہ
منظور آباد کالونی
قبرستان
نوبہار روڈ
اسٹیشن ممتاز آباد

شمال
بند روڈ
ڈسٹرکٹ جیل
نشتر کالج ہوسٹل
نشتر میڈیکل کالج
قبرستان
پولیس لائن
کینال آفیسز
بہاول پور روڈ
انجینئرز کالونی
نواں شہر
ابدالی روڈ
چوک نواں شہر
ریڈیو اسٹیشن
کمشنر ہاؤس
صدر بازار ملتان چھاؤنی
التمش روڈ
گوجر کھڈہ
ڈیرہ اڈہ
شیر شاہ روڈ
حسن پروانہ کالونی
اکبر روڈ
اسٹیشن ملتان چھاؤنی
کمہار منڈی
ولایت آباد
وہاڑی روڈ
فضل آباد
وہاڑی روڈ
چوک شاہ عباس
اسٹیشن ملتان شہر
جنوب

ملتان کی یاد میں

ایک ہندو دانش ور کے تأثرات

شباب الملت ایم اے ملتان کا وہ نوجوان شاعر ہے جو گنگ و جمن کی حسین وادیوں میں جا کر بھی وطنِ عزیز کو نہیں بھول سکا۔ ربع صدی گزر جانے کے باوجود اس کا دل ملتان کی یاد میں خون کے آنسو روتا ہے۔ درجِ ذیل نظم اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک کربناک چیخ ہے۔ جس سے ملتان کی ہمہ گیری اور لازوال محبوبیت کا پتہ چلتا ہے۔

ارضِ ملتان، تجلی گہِ حسنِ مشرق / اے پری پیکر و طناز حسینوں کے وطن
رنگ و رامش سے ہے لبریز ترا ہر کوچہ / گل رخوں، سیم بروں، زہرہ جبینوں کے وطن
سرفروشوں کے وطن، حوصلہ مندوں کے وطن / اے شجاعت کی، تقدس کی، وفا کی دھرتی
سورماؤں کی، سرافراز جوانوں کی زمیں / اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ صفا کی دھرتی
ارضِ ملتان! ترے لاڈلے جانبازوں نے / اپنی شمشیر سے روکے تھے سکندر کے قدم
ان قبائل کے مقدر میں تھی ہر چند شکست / تیغِ یوناں کی یہیں آب ہوئی تھی مدہم
تیرے محلوں، تیری سنگین فصیلوں نے کبھی / اہلِ غزنی سے بھی افسانۂ شمشیر سنا
کبھی نادر، کبھی غوری، کبھی بن قاسم سے / نعرۂ وحدتِ حق، نعرۂ تکبیر سنا
عہدِ حاضر ترا ماضی سے سوا روشن ہے / کشورِ پاک کا رنگین طرب زار ہے تو
اب بھی ہے اوجِ ثریا پہ مقدر تیرا / مملکت کے لئے اک دولتِ بیدار ہے تو
تیری آغوش کا پروردہ شبابِ محزوں / جس کی تخمیر ہوئی تیرے ہی آب و گل سے

آہ اے جاذبِ دل مست نظاروں کے وطن
آج ہے دور، بہت دور تری محفل سے

شبابِ ملت ایم اے

پٹھان کوٹ (بھارت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۃ

خداوندِ قدوس کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج یہ نیاز مند تاریخ ملتان کی دُوسری جلد پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ جلد اوّل عہدِ قدیم سے عہدِ قریش یعنی مخدوم محمد یوسف قریشی فرمانروائے ملتان تک کے حالات پر مشتمل تھی۔ دُوسری جلد عہدِ حاضر بلکہ اس شہر کے دَورِ جدید تک محیط ہے۔ ان اوراق کے جمع و تدوین سے میرا مقصد کسی رئیس کی رضا طلبی یا کسی صاحبِ اختیار حاکم کی خوشنودی مقصود نہیں اور نہ ہی ان اوراق میں اپنے آپ کو کسی قسم کے نفاق یا بے جا مدح و ستائش سے ملوّث کیا ہے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی مالی منفعت پیشِ نظر ہے۔ بلکہ یہ بندہ اپنے ربِ کریم سے ملتجی ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اسے اس راہ کی ایسی لغزش سے محفوظ رکھے جس کا مدار تجارت اور نفع اندوزی پر ہو۔ البتہ نیاز مند سیّد اسد علی شاہ صاحب گیلانی کمشنر ملتان کا احسان مند ضرور ہے کہ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود بلدیۂ ملتان سے پانچ ہزار روپے کی مالی امداد دلائی۔ ان کی جگہ جناب محمد محسن صاحب قریشی تشریف لائے تو انہوں نے خصوصی سرکلر کے ذریعے تمام ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت کی کہ خاکسار سے تاریخ ملتان جلد اول کے مطبوعہ نسخے خرید لیں تاکہ نیاز مند کو جلد دوم کی طباعت میں آسانی ہو۔

احقر خلوصِ قلب سے سابق اور موجودہ علم دوست کمشنر صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اس تاریخی تحفہ کو منظرِ عام پر لانے میں احقر کی مدد فرمائی اور اہلِ ملتان کو تاریخی معلومات کا ایسا تابناک گنجینہ مرحمت کیا جس سے صدیوں تک آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔

اس صحیفۂ صدق کو خاکسار نے صوبیداروں اور حکمرانوں کے جنگ و جدل کے واقعات تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ اُن کے ذاتی کردار اور اخلاق کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو سبھی ناظم اچھے تھے اور انہوں نے ملتان و اہلِ ملتان کے لئے کافی کچھ کام کیا اور آنے والی نسلوں

کے لئے اپنی معدلت گستری، خدا ترسی اور رعایا پروری کی انمٹ داستانیں یادگار چھوڑ گئے۔ مگر آخری مسلمان فرماں روا نواب مظفر خاں اپنے قول و کردار کے اعتبار سے تمام دُنیا کے حکام کے لئے مثالی حیثیت رکھتا ہے جس نے ملتان میں خالص دینی فضا پیدا کی۔ نامساعد حالات کے باوجود عوام کے لئے فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے کے مواقع پیدا کئے اور جب ایک ظالم حملہ آور نے اس شہر پر حملہ کیا تو اس نے انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا۔۔۔ اپنے بیٹوں عزیزوں سمیت دُشمن کو للکارتا اور تیغ زنی کرتا ہُوا شہید ہُوا اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ مسلمان کے لئے صرف دو راستے ہیں، فاتحانہ زندگی یا شہیدوں کی باوقار موت۔ بقول اُئے ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

ظاہری حکام اور اُمراء کے ساتھ ملتان کے اُن بوریہ نشین درویشوں کا ذکر بھی ہے جنھوں نے ہر دَور میں اسلام کی شمع روشن رکھی اور ہزاروں بلکہ لاکھوں گم گشتگانِ بادیہ ضلالت کو صراط المستقیم پر گامزن کیا۔ ان میں حضرت مخدوم سیّد حامد جہاں بخش اور ان کے نامور فرزند مخدوم سید جمال الدین موسیٰ پاک شہید کا بڑا مقام ہے۔ اوّل الذکر کے مریدوں میں حضرت بندگی شاہ داؤد کرمانیؒ، شاہ ابو المعالیؒ اور شیر شاہؒ جیسے اقطابِ دوراں نظر آتے ہیں، تو حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے غلاموں میں مولانا شیخ عبد الحق محدّث دہلوی سا علامۂ روزگار دکھائی دیتا ہے جس کے علم و فضل پر شہنشاہ نور الدین جہانگیر بھی ناز کرتا تھا۔ اور پھر خواجگانِ چشت اہلِ بہشت کا ذکر ہے جنھوں نے سہروردی مشائخ کے نقشِ قدم پر عمل پیرا ہو کر ملتان کو ایک دفعہ پھر مہبطِ انوارِ الٰہی بنا دیا تھا۔ ان شہبازانِ ولایت میں حضرت حافظ محمد جمال اللہؒ، مولانا محمد موسیٰ صدیقی، مولانا خدا بخش خیر پوری، اور مولانا محمد عبید اللہ رحمہم اللہ علیہم خاص مقام رکھتے ہیں۔ اخیر میں ان ترقیاتی منصوبوں کا ذکر ہے جن کے طفیل مملکتِ خداداد پاکستان نے ملتان کو کراچی اور لاہور کا ہم پلّہ بنا دیا۔ بایں ہمہ مصنف کو اپنی تہی دامنی کا بھی اعتراف ہے اس لئے احباب کرام سے استدعا ہے کہ اگر تاریخ ہذا کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل پائیں تو خاکسار کو ضرور مطلع فرمائیں، تاکہ دُوسرے ایڈیشن میں اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

تاریخ ملتان کی تیسری جلد زیرِ تدوین ہے اس میں فرزندانِ ملتان کے حالات دیئے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے ان قدیم باشندوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مخصوص حالات کی بنا پر ملتان چھوڑ

گئے۔ ہندو تار کین وطن میں بگائی، بھلہ، ترکھا، مرانیمرادے، وجھ، ببر، لیکھا، کشمیری پنڈت، ڈھینگرہ، اتمرادھی، اوسوال، گمبر، جین اور بترا شامل ہیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد جن لوگوں نے ملتان شہر کو اپنی بود و باش کے لئے منتخب کیا ہے۔ ہمیں ان کے حالاتِ زندگی اور زندگی سے متعلق دیگر کوائف کی ضرورت ہے۔ انتقال آبادی سے پہلے یہ لوگ کہاں آباد تھے۔ وہاں ان کی معاشی اور اقتصادی حیثیت کیا تھی معاشرے میں کیا مقام رکھتے تھے۔ انتقال آبادی کے وقت ان پر کیا گذری، یہ لوگ پاکستان کیونکر پہنچے ملتان کیسے آباد ہوئے اور اب ان کے گذر اوقات کی صورت کیا ہے؟

ہم مہاجرین بھائیوں کے حالات ضلع وار جمع کر رہے ہیں تاکہ حادثات اور واقعات میں ربط پیدا ہو سکے۔ آج وہ آنکھیں موجود ہیں جنھوں نے بھارت کے مظالم کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ جن کے سامنے ملتِ اسلامیہ کا گلستان پامال ہوا۔ جہاں بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور مردوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ آج ہم تھوڑی سی کوشش سے ان ہوشربا حوادث کو حیطۂ تحریر میں لا سکتے ہیں۔ اگر ہم نے تغافل سے کام لیا تو آنے والی نسلوں کو یہ علم بھی نہیں ہو سکے گا کہ ان کے آباؤ اجداد نے کن حالات میں بھارت کے کفرستان کو خیرباد کہا تھا۔ اور ان پر کیا کیا حادثے گزرے تھے۔ ملتان کس حالت میں پہنچے۔ اور پھر انہیں اپنی حالت سدھارنے کے لئے کتنے صبر آزما مراحل طے کرنے پڑے۔ اگر ہر شخص اپنے صحیح واقعات لکھ کر ہمارے حوالے کرے تو اس سے اجتماعی کوائف مرتب کرنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ مہاجرین کے بعد ملتان کے تاریخ ساز خانوادوں کا نمبر آتا ہے۔ جن کی فہرست درج ذیل ہے:۔

قریش —— ہاشمی، علوی، اسدی۔

سادات —— بخاری، حسنی الحسینی، گیلانی، مشہدی، نقوی، موسوی، رضوی، عسکری اور گردیزی۔

افاغنہ —— خدکہ، سدوزئی، خوگانی، ترین، بابوزئی، بادوزئی، علے زئی، صافی

حکماء —— خاندان حکیم شیر محمد، خاندان حکیم شاہ بخش، حکیم عطاء اللہ، حکیم فیروز الدین حکیم محمود سلطان، حکیم غلام محی الدین۔

خاندان —— بوسن، لنگاہ، کھگہ، ڈھڈی، چوہان، نقیر قادری

کھوکھر، سرگانہ جو خاندان مضافات سے آکر ملتان میں آباد ہوئے

بچہ، ڈہا، سیال، ہراج، چغتائی، نون، بھٹی، بلوچ، کانجوں، کھچی، سہو، شیخ، وینس وغیرہ

خاکسار مصنف ملتان شہر کے جملہ باشندگان سے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے بارے میں جو بھی واقفیت رکھتے ہوں اس سے نیازمند کو محروم نہ رکھیں۔ ممکن ہے یہ حضرات اپنے خاندانی اسناد، پرانے سکّے، قلمی نسخے، پٹہ جات اور وثیقوں کو چنداں اہمیت نہ دیں۔ لیکن ایک مؤرخ ان سے تاریخ کی تدوین میں کافی مدد لے سکتا ہے۔ آپ کے شجروں میں بھی ایسے افراد مل سکتے ہیں جنہیں اپنی زندگی میں ملتان کی سیاست سے خاص تعلق رہا ہو۔ ان کے خاندان کا یہاں آکر آباد ہونا۔ انہیں حکومت سے خدماتِ جلیلہ کے صلہ میں جاگیروں کا ملنا بھی بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ اس شہر کے بعض خاندان ایسے ہیں جن کے اکابر اس شہر کے حاکم تھے۔ کئی شاہی معالج اور کئی درسگاہوں کے معلّم تھے۔ بعض نے مسندِ ارشاد کو زینت دے کر خلقِ خدا کو گمراہی سے نکالا۔ بعض نے میدانِ جنگ میں اپنی خون آشام تلواروں سے کشتوں کے پشتے لگائے۔

تاجر اور صنعت کار، جنہوں نے اس شہر میں فیکٹریاں اور ملیں قائم کیں اور سامانِ تجارت سے شہر کو مالا مال کر دیا۔

وہ لوگ جو بسلسلۂ ملازمت یہاں آئے اور ریٹائر ہونے پر مستقل طور پر یہاں آباد ہو گئے! ہمیں ان سب کے حالات درکار ہیں۔

اگر ان کے پاس اپنے بزرگوں کی تصاویر ہیں۔ کتابوں کے قلمی نسخے، شمشیر ہائے مرصّع تیر و تبر یا گرز وغیرہ ایسی نادر اشیاء ہوں تو ان کے فوٹو بھی اسی تاریخ کی زینت بن سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرات شہر کے معروف آدمی ہیں اور انہوں نے قوم و ملّت کے سود و بہبود کے لئے کچھ کام کیا ہے تو ان کے فوٹو بھی اس کتاب میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ خاکسار مصنف کو ان سب سے تعاون کی توقع ہے۔ اُمید ہے کہ اہلِ ملتان مجھے مایوس نہیں کریں گے۔

خاکسار

نُور احمد خاں فریدی

قصر الادب، رائٹرز کالونی ملتان
یکم نومبر ۱۹۷۳ء

فون نمبر ۶۰۷۸

فہرس

ملتان ـــــ نیا وطن

یہ نظم صرف جناب عاصی کرنالی کی ہی نہیں بلکہ اُن لاکھوں مہاجرین کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہے جنہیں مجبوراً اپنا وطن ترک کرنا پڑا، اور مدینۃ الاولیا، ملتان نے اُنہیں اتنی محبت وشفقت سے اپنے سینے میں جگہ دی کہ سابقہ وطن کی یاد اُن کے دلوں سے محو ہو گئی اور یہ دل وجان سے اس عظیم شہر کے والہ وشیدا بن گئے۔

یہ جلوہ گاہِ سعادت، یہ خطۂ ملتان
ہیں جس کے ذروں کے باطن میں آفتاب نہاں!

وہ ارضِ حق کہ جہاں کفر کو اماں نہ ملی
ہے جس کے قطروں کے دامن میں شوکتِ طوفاں

رکھا ہے ہند کو سیراب جس نے ماضی میں
وہ چشمۂ دل ودیں وصداقت وایقاں

جہاں پہ ملتے ہیں آ آ کے جادۂ سلوک
وہ شاہراہِ محبت وہ منزلِ عرفاں

کوئی تو شہر ہے دل اور کوئی شہر دماغ
مگر یہ شہرِ مقدس ہے رُوحِ پاکستاں

یہ اصفیاء کی مساجد یہ اولیاء کے مزار
گڑے ہیں دینِ الٰہی کی عظمتوں کے نشاں

امینِ عزم وشجاعت، کفیلِ جود وسخا
مکانِ علم وثقافت، مقامِ رفعتِ شاں

طلوعِ حکمت ودانش، ظہورِ عشق ونظر
فروغِ دین وشریعت طہارتِ دل وجاں

رہے گا زندہ وپائندہ وفروزندہ
ہمارا شہر کہ ہے سرزمینِ زندہ دلاں

ملتان شہر ـــــ عاصی کرنالی ایم اے

تقریظ

از ادیب اعظم پیر سیّد حسام الدین، راشدی، کراچی

دارالامان ملتان برصغیر پاک وہند کے شہروں پر کئی لحاظ سے فوقیت اور افضلیت رکھتا ہے تاریخی، تمدنی، تہذیبی اور رُوحانی نقطہ نگاہ سے ملتان کو اللہ نے بڑا شرف، و امتیاز عنایت کیا ہے۔ ملتان شہر تاریخی واقعات اور حوادث کا منبع ہے۔ خداوالوں کا شہر ہے۔ اور نیک، شریف اور وضعدار انسانوں کا مسکن ہے۔ اِس شہر کا تمدّنی اور تہذیبی معیار سطحی نہیں ہے۔ کہ کسی حادثہ، یا انقلاب سے مٹ جائے، یا ماند پڑ جائے۔ اس کے تہذیبی رشتے اور تمدّنی عناصر پاتال تک ہیں سینکڑوں انقلابات آئے۔ کئی حوادث گزرے۔ زمانے نے کئی ورق اُلٹے اور لیل ونہار نے گوناگوں پلٹے کھائے۔ لیکن اس شہر کی محکم اور مستحکم روایات کی بنیادیں جُوں کی توں قائم رہیں۔ کوئی طاقت انہیں ہلا نہ سکی۔

قومیں اور تہذیبی شہر انقلابات کی زد میں آکر اپنی اصلیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے تاریخی کردار کو ضائع کر دیتے ہیں۔ لیکن ملتان ایک ایسا شہر ہے جس نے اپنی ہیئت کذائی کو صدیوں کے زیر و بم کے باوجود کسی صورت مٹنے نہیں دیا۔ ملتان کے مکین آج بھی شرافت، نیکی، اخلاق، فروتنی اور انسانیت کی تمام خصوصیات سے مزیّن اور مالامال ہیں۔ زمانے کے کسی اُلٹ پھیر نے اُن کے مزاج میں گراوٹ یا اوچھا پن پیدا ہونے نہیں دیا۔ وہ تاریخ کے مختلف ادوار میں جس اونچے مقام پر فائز رہے ہیں، آج بھی خدا کے فضل وکرم سے اُن کو وہی بلند مقام اور منصب حاصل ہے۔

لالہ حکم چند اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ملتان نے انگریزوں کے ابتدائی دور میں تاریخ ملتان مرتب کی۔ جارج پنجم کی سلور جوبلی کے موقع پر سیّد اولاد علی شاہ گیلانی نے "مرقع ملتان" لکھ کر اس عظیم شہر سے متعارف کرانے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ ایک اور غیر مطبوعہ فارسی تاریخ "تذکرۃ الملتان" مخدوم سید محمد یوسف

گردیزی کی لکھی ہوئی کتب خانہ ناصریہ میں موجود تھی۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں پیر سیّد جماعت علی شاہ صاحب علی پوری کی فرمائش پر مولانا نور احمد خاں صاحب فریدی نے "سرزمین ملتان" کے نام سے ایک تعارفی کتاب لکھی۔ اس کے بعد مولانا موصوف نے نواب مخدوم مرید حسین صاحب قریشی مرحوم و مغفور کی تحریک پر کئی سال کی محنت اور عرق ریزی کے بعد اس سلسلے کی یہ کتابیں مدوّن کر کے شائع کیں:۔

۱۔ تذکرہ قطب الاعظم غوث الاکرم حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ تذکرہ حضرت شیخ الاسلام صدر الدین عارف رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ تذکرہ قطب الاقطاب شاہ رکن عالم قدس سرہٗ ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ تینوں کتابیں عالم اسلام کی تین برگزیدہ ہستیوں کی شرح احوال پر حاوی ہیں۔ فریدی صاحب نے بڑی محبّت بلکہ وارفتگیٔ عشق کے عالم میں یہ کتابیں لکھی ہیں۔ دوران مطالعہ یوں لگتا ہے کہ گویا پڑھنے والا خود ان اولیا حق کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل کر رہا ہے اور بے انداز برکتوں سے اپنے تہی دامن کو مالا مال کر رہا ہے ــــــــ یقیناً یہاں بزرگوں کی روحانیت کا تصرف ہے۔ لیکن ساتھ ہی لکھنے والے کی شیفتگی اور عشق کا اعجاز بھی تو ہے۔ لکھنے میں کامیابی اور سرافرازی کا اس سے زیادہ معراج کیا ہو سکتا ہے!

مولانا فریدی صاحب کی اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب تاریخ ملتان جلد اوّل ہے۔ جسے آپ نے نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے مدوّن فرمایا ہے۔ ملتان کی تاریخ، جس طرح عرض کیا گیا ہے، مختلف کتابوں میں موجود تو ہے، لیکن نہایت مختصر اور وہ بھی بے حد منتشر۔ اس بکھرے ہوئے مواد کو ہزاروں صفحات پڑھنے اور کھنگالنے کے بعد جمع کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ بڑے صبر اور شکیبائی کا کام تھا۔ جسے اس پیر مرد نے ایک لامتناہی انہماک کے عالم میں بڑے سلیقہ اور قابلیت سے انجام دیا ہے۔ بڑی خوبی اس تصنیف کی یہ ہے کہ مولانا نے حکایات و روایات کو بجنسہٖ نقل نہیں کیا، بلکہ اسے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر اس طرح محققانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ مسخ شدہ حقائق اصلی روپ میں اُجاگر ہو گئے ہیں۔ اور ان کا حسن و جمال نکھر آیا ہے۔ جیسے ملتان کے حضرت شاہ شمس علیہ الرحمۃ کا معاملہ ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں فرقہ نور بخشیہ کا موسس اور الاحوط کا مصنف ظاہر کر کے ان کی روحانی عظمت اور دینی سطوت کو گہنا دیا تھا۔ مولانا نے موثق شہادتوں سے ثابت

کیا ہے کہ الاحوط کے مصنف اور فرقہ نوربخشیہ کے موسس شاہ شمس عراقی تھے۔ جن کی قبر کشمیر میں ہے ملتان کے شاہ شمسؒ کا ان کے معتقدات سے کچھ تعلق نہیں۔

"سکہ" ملتان اور اسکلندہ کے درمیان ایک مشہور شہر تھا۔ ملتان کی سابقہ تاریخوں میں اس کا محل وقوع دریائے راوی کا کنارہ درج تھا۔ مگر مولانا نے البلاذری کی روایت "دوابیا" سے ثابت کیا کہ موجودہ قصبہ "سردار شکوٹ" ہی وہ مقام ہے جہاں عربوں کے حملے کے وقت سکہ واقع تھا۔

"کوٹ بھاٹیہ" جسے عربوں اور افغان مورخوں نے "الباطیہ" سے موسوم کیا ہے۔ برصغیر کے مورخین نے اس قلعے کے بارے میں عجیب شوشے چھوڑے ہیں۔ بعض نے بھیرہ کو بھاٹیہ لکھا ہے اور بعض نے اسے بھٹنیر بنا دیا ہے۔ مولانا فریدی صاحب نے فاضلانہ تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ "کوٹ بھٹیا" جلال پور پیروالا اور لودھراں کے درمیان اب بھی اپنے اصلی نام سے موجود ہے، اور اس کے گرد و پیش چار عظیم قبرستان ہیں، جن میں ہزاروں شہدا محوِ خواب ہیں۔

تاریخ ملتان جلد دوم

آئندہ صفحات میں اسی کتاب کی دوسری جلد پیش کی جا رہی ہے۔ جسے فریدی صاحب دورِ حاضر تک لے آئے ہیں۔ یہ جلد بھی اسی تحقیق اور تجسس سے لکھی گئی ہے جو مصنف موصوف کا اپنی دوسری تصنیفات میں انداز اور شیوہ رہا ہے۔

اس جلد کی تدوین میں مصنف نے زیادہ تر تذکرۃ الملوک، عملِ صالح، تذکرۃ الانساب بحر الاسرار، تذکرۃ الملتان، غوث الاعظم، مقامات داؤدی، مرقع ملتان، کلیات سعیدی، عالمگیر نامہ، گل بہار، رنجیت سنگھ اور ڈسٹرکٹ گزیٹر ملتان وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔ پہلی جلد قریشی خاندان کی روحانی اور سیاسی عظمت و شوکت کی آئینہ دار تھی۔ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا، شیخ العارف صدرالدینؒ اور قطب الاقطاب شاہ رکن عالم قدس اللہ اسرارہم کی باطنی جلالت قدر کے ساتھ ساتھ اس خطے کا نظامِ حکومت بھی اسی خاندان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ بارہ برس تک حضرت مخدوم محمد یوسف قریشی علیہ الرحمۃ نے بحیثیت خود مختار بادشاہ کے اس ریاست کا بہترین انتظام کیا۔ یہ دوسری جلد لنگاہ خاندان کے عروج و اقبال سے شروع ہوتی ہے۔ سلطان حسین خاں لنگاہ اشاعت علم دوست اور

انصاف پسند بادشاہ تھا، کہ اسے سلطان بہلول لودھی کے پہلو میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ روحانی اعتبار سے گیلانی مخادیم کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ انہوں نے ملتان کو ایک دفعہ پھر سجدہ گاہِ ملائکؑ[1] بنا دیا تھا۔ محدّثِ دہلوی سا عالمِ باعمل، مفسّر محدث اور فقیہہ کئی سالوں تک ان کی خدمت میں رہ کر فقر و ولایت کی منزلیں طے کرتا رہا۔ اُسے ملتان سے اتنی عقیدت اور محبت ہو گئی تھی کہ اسے "مدینۂ خورد" سے موسوم کرتا تھا۔ سہروردیوں کی طرح قادریہ خانوادہ کے ان جلیل القدر فرزندوں کو بھی ملتان کی باطنی حکومت کے ساتھ ساتھ ظاہری اقتدار تفویض ہُوا۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں نواب یحییٰ سخیؒ اور شاہجہاں کے عہد میں نواب موسیٰ گیلانیؒ یکے بعد دیگرے صوبہ ملتان کے گورنر رہے اور انتہائی نیک نامی سے حکومت کی۔ اوّل الذکر کے جُود و سخا اور مؤخر کی نمک حلالی اور صدق مقالی سے ملتان کی تاریخیں مزیّن ہیں۔ ان کے بعد بلوچوں کا دَور آتا ہے۔ اگرچہ مختصر ہے، لیکن نواب میرن خاں کی عدیم النظیر شجاعت اور اس کی درد انگیز شہادت قاری کے دل پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ جناب عبدالقادر خاں لغاری نے "اعظم ہمایوں" کی قساوتِ قلبی اور نواب میرن خاں کی بے باکی اور جوانمردی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس کی تاریخ شیر شاہی سے نفی نہیں ہوتی۔ عباس خاں سروانی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ شیر شاہ کے حکم سے اعظم ہمایوں نے نواب میرن خاں کو قتل کرا دیا اور جناب عبدالقادر خاں لغاری نے اس اجمال کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

میر ہیبتان سفاکی اور درندگی میں حجاج بن یوسف سے بھی کئی قدم آگے نظر آتا ہے۔ جس جنُون سے اس نے خانِ اعظم میر چاکر خاں کے حسین و جمیل شہزادے میر شہک کے سینے کا گوشت کاٹ کر کباب بنایا اور میر بجار خاں جیسے بہادر جرنیل کے قتل ہوتے پر اس کی لمبی ڈاڑھی کی جنوری بنائی۔ یہ روایت قاری کے ذہن کو بہت دُور افریقہ کے جنگلات میں لے جاتی ہے اور وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ کسی قبائلی سردار کی انتقامی کارروائیوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اور پھر جس سرعت، حوصلہ مندی اور بے پناہ بہادری سے چاکر اعظم اپنے بیٹے کی مظلومانہ شہادت کا انتقام لیتا ہے۔ اس سے رُستم اور سہراب کے چہرے نظروں میں گھومنے لگتے ہیں۔ مولانا فریدی

---

[1] شیخ الاسلام حضرت زکریاؒ کا شعر ہے۔ ملتانِ ما بجنّتِ اعلیٰ برابر است ۔ آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

کا اسلوبِ بیان ملاحظہ ہو:۔

"ہیبتان جان بچانے کے لئے پہاڑ کی طرف بھاگا، مگر کسی غار میں گر کر مر گیا۔ ایک سرگانی مزاری جو اس کے تعاقب میں تھا غار میں اُترا اور اس کا سر کاٹ کر چاکر خاں کے پاس لے آیا۔ خانِ اعظم نے کہا۔ اے جوان! تو نے کیا کیا کہ اس کی لاش کو وہیں چھوڑ آیا۔ جب سے شہک کی پسلیوں کے کباب بننے کی خبر سُنی ہے میری ایک ایک پسلی کباب بن رہی ہے اچھا، اس کا سر توڑ کر کھوپڑی آگے لاؤ۔

خدام نے فوراً سر توڑ کر پیالہ نما کھوپڑی آگے بڑھائی۔ خانِ اعظم کی آنکھیں جوشِ انتقام سے شعلہ جوالا بن رہی تھیں اس نے کھوپڑی میں پانی ڈال کر چند گھونٹ نوشِ جاں کئے اور پھر اسے باہر پھینک دیا۔ اس طرح بلوچ قوم کے اس بوڑھے جرنیل نے اپنے فرزندِ دلبند اور بڑے رفیقِ کار کے خون اور اہانت کا بدلہ لے کر ثابت کر دیا کہ باری تعالیٰ کا یہ ارشادِ گرامی وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یٰاُولِی الْاَلْبَاب بلاشبہ اقوام و ملل کے لئے نشاۃ ثانیہ کا حکم رکھتا ہے۔"

نواب موسیٰ گیلانی کے بعد نواب مظفر خاں تک جو گورنر مقرر ہوئے ان میں سے اکثر اپنے پیچھے اچھی شہرت چھوڑ گئے ہیں۔ کسی نے عید گاہ تعمیر کی، کسی نے قلبِ شہر میں جامع مسجد بنوائی۔ کسی نے باغ لگوائے کسی نے ملک کی سیرابی کے لئے نالے احداث کرائے۔ فقراء اور مشائخ میں سب سے پہلے سہروردی مشائخ نے اس شہر کو مدینۃ الاولیاء ہونے کا شرف و اعزاز بخشا۔ ان کے بعد بخاری اور گیلانی سادات نے اس خطے کو اپنی روحانی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ نواب محمد شجاع خاں کے زمانے میں حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی نور اللہ مرقدہٗ کے ایماء پر مشائخ چشت اس طرف متوجہ ہوئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پوٹھوہار سے ٹھٹھہ تک روحانیت کے سینکڑوں چشمے اُبل پڑے۔ ملتان کے ہر گلی کوچے میں مدارس قائم تھے۔ جگہ جگہ مساجد بنی ہوئی تھیں۔ عوام روحانی طور پر ان مرکزوں سے وابستہ تھے۔ صبح کو درسِ قرآن میں شریک ہوتے اور شام کو وعظ سُنتے تھے۔ مولانا فریدی نے اپنی تاریخ میں ملتان کی روحانی منزلت کی مناسبت سے قدم قدم پر نوعِ انسانی کو لادینی کے بھیانک خطروں سے آگاہ کیا ہے بایں ہمہ مولانا کا اسلوب قنوطی نہیں رجائی ہے۔

حکومت کے لئے لمحۂ فکریہ

مولانا نے تاریخ کے ہر موڑ پر حکومت کے لئے کوئی نہ کوئی قابلِ عمل پروگرام پیش کیا ہے۔ بحیثیت مصنّف ان کا یہ اہم فریضہ تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آنے والی نسلیں انہیں ہرگز معاف نہ کرتیں۔ اور چونکہ مجھے اس تاریخ کی تقریظ لکھنے کی خدمت سپرد ہوئی ہے۔ اس لئے میں بھی حکومتِ پاکستان کی توجہ ان ضروری امور کی طرف مبذول کرانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

مزارات کا تحفظ

تاریخ ہذا کی دونوں جلدوں میں مولانا نے جس بات کا بڑے دُکھ اور درد سے اظہار کیا ہے۔ وہ قبروں کی بے حرمتی ہے۔ چنانچہ جلد اوّل کے صفحہ ۳۰۳ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"آج سے تیس بتیس برس پیشتر مساجد کے پہلوؤں میں ایسی کافی قبریں موجود تھیں جنہیں ہندوؤں اور سکھوں کی بربھاگردی کے دور میں بھی نہیں مٹایا گیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ جب سے اپنی حکومت قائم ہوئی ہے خود مسلمانوں نے ہی اپنے بزرگوں کے نشانات کو مٹانا شروع کر دیا ہے۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ قبریں جو حسن پروانہ روڈ کے متصل واقع ہیں۔ ان پر تانگے والوں نے گھوڑے باندھ رکھے ہیں جو ہمہ وقت ان پر پیشاب کرتے رہتے ہیں۔ یہ انتہائی بارونق سڑک ہے۔ جو بھی باہر سے ملتان آئے۔ وہ یہاں سے ضرور ہو کر گزرتا ہے جب ان لوگوں کی نظر ان گھوڑوں اور قبروں پر پڑتی ہوگی تو وہ شہر کی انتظامیہ کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟"

قلعہ قدیم ملتان

یہ قلعہ برصغیر کے تمام قلعوں سے قدیم تر ہے۔ کیونکہ اس میں پرہلاد جی کا مندر ہے جس کا زمانہ طوفانِ نوح سے قریب تر بتایا جاتا ہے۔ یہ قلعہ اس وجہ سے بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کی چار دیواری کے اندر ایک راجہ نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس قلعے کو فتح کرنے میں سکندر نے اتنے کاری زخم کھائے کہ ان سے ہی بمقام بابل فوت ہو گیا۔ غازی محمد بن قاسمؒ نے اسے فتح کرنے کے بعد اس پر اسلامی پرچم لہرایا اور جامع مسجد تعمیر کی۔ اسی قلعے میں شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ نے صوفیانہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی اور اسے رشد و ہدایت کا مرکز قرار دے کر جاوا، سماٹرا اور چین تک اپنے مبلغین روانہ کئے۔ اسی پر شاہ رکنِ عالم قدس سرہٗ کا مقبرہ واقع ہے، جو

سات سو برس سے پنجاب اور سندھ کے سنگم پر کھڑا حوادثِ دہر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ بلحاظ وسعت اور بلندی
اسے برِّصغیر کے جملہ مقابر میں دُوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ پنجاب اور پاکستان کی حکومتیں اگر اس پر پچاس لاکھ
روپے خرچ کر ڈالیں تو یہ نہ صرف ایک تفریحی مقام بن سکتا ہے، بلکہ اس پر شعبۂ سیر و سیاحت، شعبۂ نشر و اشاعت
کی عمارتیں اور علاقائی مصنوعات کی مارکیٹ تعمیر کی جاسکتی ہیں۔ بیرونی فصیل کو قدیم اسلوب میں تعمیر کیا جائے۔
بابُ القاسم، بابِ زکریّا اور خضری دروازہ صرف تین دروازے ہوں جو مقررہ اوقات پر کھلیں اور بند ہوں،
دمدمے پر توپیں رکھی جائیں اور بُرجوں کو بھی تعمیر کیا جائے۔

خانقاہ شیخ الاسلام کی تعمیر و مرمّت کا مسئلہ

حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا نوّراللہ مرقدہٗ کی خانقاہ کو ملتان میں وہی حیثیت حاصل ہے، جو
شیخ الہند قدس سرّہٗ کے مقبرے کو اجمیر میں اور حضرت داتا صاحب علیہ الرحمۃ کے روضہ کو لاہور میں حاصل ہے
ملتان آپ ہی کی وجہ سے ہی غوث کی نگری کہلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے محکمہ اوقاف یا تو آپ کی عظمت سے ناواقف
ہے یا وہ کسی نامعلوم مصلحت کے پیشِ نظر اس آستان کی جلالتِ قدر کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا
ہے کیونکہ وہ اس کی مرمّت اس معیار پر نہیں کرنا چاہتا جس پر مذکورۃ الصدر خانقاہوں کی مرمت ہوئی ہے
صرف مولانا نور احمد خاں فریدی ہی نہیں بلکہ حضورؒ کے لاکھوں ارادت مند جو اس مقبرہ شریفہ کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی
کرتے ہیں۔ آرزومند ہیں کہ مقبرۂ عالیہ کی موجودہ عمارت کو بھی حضرت داتا صاحبؒ کے دربار کی طرح مزیّن کیا جائے۔

میں اس سرزمین سے تعلق رکھتا ہوں جو اس خانقاہ مبارک سے والہانہ عقیدت رکھتی ہے، اور ہر سال
ہزاروں سندھی پا پیادہ درگاہ پر پہنچتے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اس لئے راقم نے اس پاک آستان کی تعمیر و
مرمت کے لئے جو کچھ لکھا ہے اسے پُورے سندھ کی آواز تصوّر کیا جائے۔

سندھ اور ملتان کی تاریخ کا قدیم سے چولی دامن کا ساتھ چلا آتا ہے۔ ان دونوں خطّوں کی تاریخ
کو گردشِ روزگار نے ملا کر تشکیل کیا ہے۔ نہ فقط ملکی، طبعی اور طبیعی طور پر ان کی باہم مناسبتیں ہیں بلکہ حضرت
شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کی وجہ سے کبھی نہ ٹوٹنے والے ایسے رشتے ہیں کہ زمانے کی کوئی گردش اور لیل و نہار
کی کوئی کروٹ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔ پاکستان کے کسی حصے سے سندھ کا اتنا گہرا تاریخی رشتہ
نہیں جتنا کہ ملتان سے ہے۔ پس ملتان پر جو کچھ لکھا جاتا ہے دراصل وہ سندھ کی تاریخ کا ایک ورق ہوتا ہے۔
اس لئے مولانا فریدی صاحب نے یہ تاریخ لکھ کر نہ تنہا اہلِ ملتان پر احسان کیا ہے بلکہ سندھ کے سر بھی ان

کی ہزار ہزار منتیں ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی شہر یا قوم کی تاریخ کتنی ہی قدیم اور شاندار کیوں نہ ہو۔ جب تک اسے حیطۂ تحریر میں نہ لایا جائے اس کی حیثیت دیو مالا یا لوک کہانیوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بلاد ہوں یا اُمم، اس وقت تک وہ ایک بہرے گونگے کی مانند ہیں جب تک کہ انہیں لکھنے اور قلمبند کرنے والا نہیں ملتا۔ ملتان اور اس کے مکین کتنے ہی غیر معمولی ماضی کے مالک کیوں نہ ہوں۔ اگر مولانا فریدی ان کی روایات و تاریخ کو ماضی کے غلافوں سے نکال کر اپنی تالیفات کے ذریعے مجسم صورت میں پیش نہ کرتے تو آج ہم سب تاریخ ملتان کے اس اہم اور دلچسپ باب سے بالکل ہی بے بہرہ ہوتے۔ ملتان اور اہل ملتان کو مولانا فریدی صاحب کی صورت میں گویا زبان دی گئی ہے۔ اور ان کی ذات واقعی ایک نعمت خداوندی ہے۔ نہ فقط ملتان کے لئے بلکہ پورے علمی سماج کے لئے!

مولانا فریدی جیسے اہل قلم روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ملتان کو ان جیسا عاشق صادق پھر ملنا مقدر کی بات ہے۔ اگرچہ مولانا نے زیر نظر نسخے میں زبان و ادب پر سیر حاصل بحث کی ہے تاہم ان پر الگ الگ ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اگر مولانا انہیں بھی مدوّن کر لیں تو ایک طرف تاریخ ملتان کا سلسلہ کامل تر ہوگا اور دوسری جانب علمی دنیا پر بھی بہت بڑا احسان ہو جائے گا۔ وہ موضوع یہ ہیں:-

(۱) تذکرہ مشاہیر ملتان (۲) تذکرہ مصنفین ملتان (۳) تذکرہ فارسی گو شعرائے ملتان

مولانا نور احمد خاں فریدی کو رب العزت نے تمام علوم میں کامل قدرت عطا فرمائی ہے۔ علم کے ساتھ ان کو ادب پر بھی دسترس حاصل ہے۔ شعر و سخن کا صحیح ذوق بھی ودیعت ہوا ہے۔ چونکہ ملتان کی پوری سیاسی، روحانی اور علمی تاریخ آپ کے سامنے آئینہ کی طرح روشن ہے، اس لئے ان سے بہتر اس علمی کام کو اور کوئی انجام نہیں دے سکتا۔

ہم سب ملتان کے اس "لالۂ صحرائی" سے آرزومند ہیں اور ذات باری تعالیٰ کے حضور میں دست بدعا ہیں کہ وہ آپ کو قوت و صحت مرحمت فرمائے تاکہ یہ علمی کام آپ کے ہاتھوں انجام پائے۔ آمین!

حسام الدین راشدی

کراچی۔ جمشید روڈ

۲۷ر دسمبر ۱۹۷۳ء

جیلانی مخادیم

رحمہم اللہ علیہم جمیعا

اُچ میں دو خانوادے روحانیت کے عظیم مرکز خیال کیئے جاتے تھے۔ ایک بُخاری خاندان تھا جو سہروردی مسلک کا علمبردار اور جنوبی ایشیا میں اسلام کی تبلیغ کا ممتاز ادارہ رہ چکا تھا۔ سیّد السادات جلال بخاریؒ، مخدوم جہانیاںؒ، سیّد احمد کبیرؒ، سیّد راجن قتالؒ اور سیّد جلال سلھیؒ اسلام کے بہت بڑے داعی تھے۔ انہوں نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بھولے بھٹکے انسانوں کو صراط المستقیم پر گامزن کیا تھا مگر اب وہ شمعیں جن کی تابناکیوں نے مشرق بعید کے ملکوں کو منوّر کر رکھا تھا، خاموش ہو چکی تھیں۔ چونکہ قدرت کو یہی منظور تھا کہ یہ خطّہ برابر مہبطِ انوار بنا رہے اور اس کی ضیا پاشیوں میں کسی قسم کی کمی نہ آنے پائے۔ کارکنانِ قضا و قدر نے سادات کرام کے ایک اور معزّز و محترم خانوادے کو اس خطے کی روحانی تربیت کے لئے بھیج دیا۔ اور وہ حضرت محبوبِ سبحانی قطبِ ربّانی سیّدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرّہٗ کا خاندان تھا۔

مخدوم سیّد محمدؒ غوث بندگی علیہ الرحمۃ اس مکرّم و محترم خاندان کے پہلے بزرگ تھے، جو حلب سے بغرضِ اشاعتِ اسلام ملتان تشریف لائے۔ آپ کا نسب سات واسطوں سے حضرت سیّدنا غوث الاعظم سیّد عبدالقادر جیلانی قدس سرّہٗ سے اور بائیس واسطوں سے سیّدنا ہاشم سے مل جاتا ہے جیسا کہ شجرہ سے ظاہر ہے:۔

نسب نامہ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

سیدنا ہاشم

سیدنا اسد — سیدنا عبدالمطلب

سیدہ فاطمہ (بنت سیدنا اسد) — سیدنا ابوطالب، سیدنا عبداللہ (ابنائے سیدنا عبدالمطلب)

امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ (از سیدہ فاطمہ و سیدنا ابوطالب) — سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن سیدنا عبداللہ)

سیدہ فاطمہؓ

سیدنا امام حسن علیہ السلام — سیدنا امام حسین علیہ السلام

سیدنا حسن مثنیٰ رضؓ — سیدہ فاطمہؓ

سیدنا عبداللہ المحض رضؓ
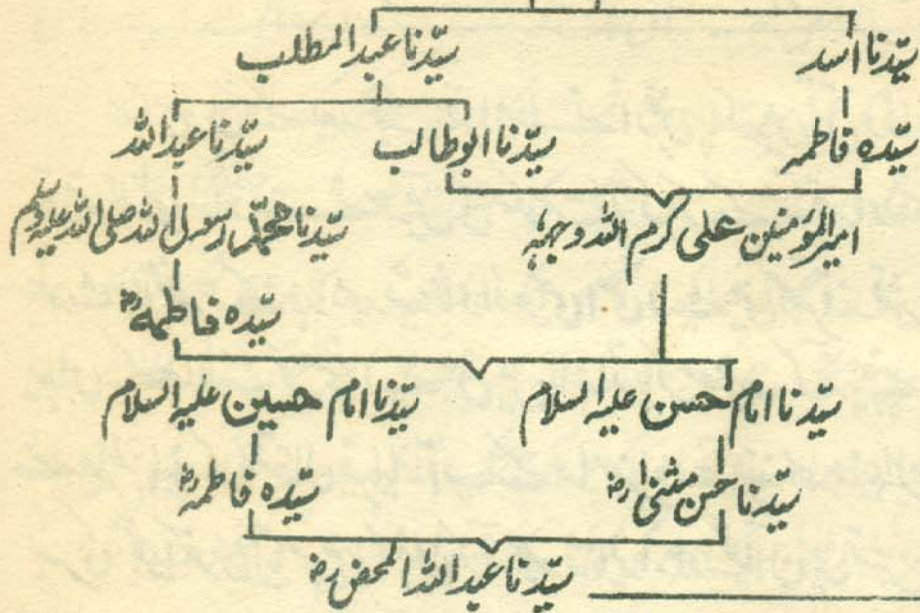
سیدنا موسیٰ الجونؒ — سیدنا عبداللہ ثانیؒ — سیدنا موسیٰ ثانیؒ — سیدنا داؤد الامیرؒ — سیدنا محمد عابدینؒ — سیدنا یحییٰ زاہدؒ — سیدنا عبداللہ ثالثؒ — سیدنا ابوصالح موسیٰؒ — شیخ العرب والعجم سیدنا غوث الاعظمؒ — سیدنا سیف الدین عبدالوہابؒ — شیخ ابونصر صفی الدین عبدالسلامؒ — سید احمدؒ — سید مسعودؒ — سید علیؒ — سید شاہ میرؒ — سید شمس الدین احمدؒ — مخدوم شیخ محمد غوث الجیلیلیؒ

جیسا شجرہ ہذا سے ظاہر ہے کہ حضرت غوث الاعظم حسب نسب کی رُو سے حسنی حسینی سید ہیں اور سیدنا ہاشم تمام ہاشمی قریش کے مورث اعلیٰ ہیں۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے، سیدنا اسدؓ اور سیدنا عبدالمطلب، سیدنا اسد کا ایک بچہ تھا جو کم سنی میں فوت ہو گیا۔ دوسری آپ کی صاحبزادی جنابہ فاطمہ تھیں۔ اس پاک دامنہ کی شادی حضرت ابوطالب سے ہوئی اُن کے بطن عفت سے حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ تولد ہوئے۔ حضرت عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو نبی آخر الزمان سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی سیدہ فاطمہ رضؓ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حبالۂ نکاح میں دے کر انہیں زوجِ بتول ہونے کا اعزاز عطا فرمایا۔ حضرت حسن مثنیٰؒ کی شادی حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی سیدہ فاطمہؒ سے ہوئی تھی۔ ان سے حضرت عبداللہ المحضؒ پیدا ہوئے، اور یہی بزرگوار تمام حسنی حسینی سادات کے مورث اعلیٰ ہیں۔

حضرت غوث الثقلین کا ذکرِ جمیل

عباسیوں کے بعد جب قرامطہ نے ارضِ پاک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو بنو فاطمی سادات نے حرمین کی سکونت ترک کر کے سمرقند اور بخارا کا رُخ کیا حضرت غوث الاعظمؒ کے جد امجد سید نا داؤد بھی اسی ریلے میں سمرقند تشریف لے گئے، مگر یہاں کے حالات کو بھی اپنے حق میں ناساز پاکر حضرت کو فہ پہنچے اور یہیں عالمِ فانی سے عالمِ باقی کو انتقال فرمایا۔ آپ کے صاحبزادے سید محمد عابدینؒ نے زندگی کوفہ میں بسر کی، مگر آخری ایام میں اُنہیں کوفہ چھوڑنا پڑا۔ اور گیلان میں تشریف لے گئے مشیّت ایزدی اسی میں تھی کہ خاندانِ نبوّت اقطاعِ عالم میں پھیل کر دینِ اسلام کی اشاعت کا فریضہ انجام دے۔ اِس لئے حالات کچھ اس قسم کے ہو گئے کہ فاطمہؓ کے جگر کے ٹکڑے مدینہ منورہ سے جو نکلے، عراق، ایران، افغانستان اور ہندوستان تک پھیل گئے۔ اور ہر جگہ توحید کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ حضرت غوث الاعظمؒ کے اجداد میں سے سیّد محمد عابدینؒ پہلے بزرگ ہیں، جنھوں نے گیلان کو اپنا وطن بنایا۔ ان کے بعد سیّد یحییٰؒ، سیّد عبداللہ ثالثؒ ۔۔۔ پھر آپ کے والد ماجد مخدوم سیّد ابو صالح موسیٰ علیہ الرحمۃ سب نے گیلان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیئے اور طبعی عمر کے لیل و نہار ختم کر کے اسی مینو سواد خطے کی سرزمین میں دفن ہوئے۔

حضرت غوث الاعظمؒ ۴۷۱ھ میں بمقام جیلان عالمِ ارواح سے عالمِ شہود میں تشریف لائے۔ ابتدائی تعلیم جیلان میں پائی۔ باقی کتابیں بغداد پہنچ کر شیخ حماد

سے پڑھیں۔ شیخ حماد آپ کے اُستاد بھی تھے اور پیر صحبت بھی۔ خرقہ آپ نے شیخ ابو سعید مخزومیؒ سے حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ نے بڑے بڑے مجاہدے اور بھاری بھاری ریاضتیں کیں۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے آپ کو محبوبیت اور غوثیت کا درجہ عطا کر کے وہ شرف و افتخار بخشا جسے آج تک کوئی ولی اللہ نہیں پہنچ سکا۔ حضرت غوث الاعظمؒ کی پُرتاثیر اور انقلاب آفرین عمل کا یہ اعجاز تھا کہ جو شخص ایک دفعہ آپ کا وعظ سُن لیتا پھر وہ زندگی بھر آپ سے منسلک ہو کر رہ جاتا تھا۔ پھر بیعت اور تلقین کے نظام نے وہ ہمہ گیر اور لازوال صورت اختیار کی جو آج تک قائم ہے۔ یہ آفتاب شریعت و ماہتاب طریقت ۱۱ ربیع الثانی ۵۶۱ھ کو عشاء کے بعد بغداد شریف میں غروب ہو گیا۔

حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ کی اولاد میں سے سیدنا سیف الدین عبدالوہاب کو علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں خاص مقام حاصل تھا۔ آپ بہت بڑے عالم اور شیریں کلام خطیب تھے۔ سیدنا صفی الدین ابو نصر مفتی اور مدرّس تھے۔ سید احمد تاتاری حملے کے سبب ارضِ روم میں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے اور ۶۱۳ھ میں یہیں انتقال فرمایا۔

سید مسعودؒ، سید علیؒ اور سید شاہ میرؒ تینوں ارضِ روم میں رہے۔ سید شمس الدین محمدؒ ہلاکو کے حملوں کی وجہ سے روم کی سکونت ترک کر کے حلب تشریف لائے۔ یہیں آپ کے مشکوئے معلّٰی میں حضرت سید محمد غوثؒ اوّل پیدا ہوئے۔

سلطان العارفین حضرت مخدوم سید محمد غوثؒ

خاندانِ جیلان کے یہ پہلے بزرگ ہیں جو حلب سے سرزمینِ پاک میں داخل

ہوئے۔ پاک و ہند کے قادریہ سادات کے مورثِ اعلیٰ آپ ہی ہیں۔ ان دنوں ملتان قحط سالی کے سبب علما، اور مشائخ سے خالی ہو چکا تھا اور عوام اس صورتِ حال کو نئے بادشاہ کی نحوست سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ سلطان قطب الدین بھی اس انخلاء سے سخت پریشان تھا۔ چنانچہ جب اُسے اطلاع ہوئی کہ حضرت غوث الاعظمؒ کی اولاد سے ایک بزرگ تشریف لائے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ ملتان کے عوام میں حضرت مخدوم کے آنے کی دھوم مچ چکی تھی اور ہر کوئی قدمبوس ہونے کے لئے دوڑا جا رہا تھا۔ بادشاہ بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس شہر میں اقامت اختیار کرنے کی درخواست کی۔ حضور اُس وقت تن تنہا بعزم سیاحت گھر سے روانہ ہوئے تھے۔ غالباً اس سفر سے ان کا مقصد اشاعتِ اسلام کے لئے بہترین مرکز کا انتخاب کرنا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت مخدوم نے سلطان کو کیا جواب دیا۔ لیکن حالات سے پتہ چلتا ہے کہ دُنیا بھر کے معروف مقامات کی سیر و سیاحت کے بعد حضرت نے ملتان کو ہی اپنی اقامت کے لئے مناسب خیال کیا۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ بعد حضرت مخدوم معہ خدم و حشم اور اہل و عیال تشریف لے آئے۔ سلطان قطب الدین لنگاہ نے آپ کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور آپ کے مریدوں میں داخل ہو گیا اور جب اس نے عوام الناس کو انتہٰی عقیدت سے حضرت مخدوم کی طرف جھکتا دیکھا تو اس نے مناسب سمجھا کہ حضرت کو دامادی میں لے کر اپنی سیاسی طاقت کو اور مضبوط بنائے۔ کیونکہ مخدوم شیخ محمد یوسف قریشی دہلی میں موجود تھے اور سلطان بہلول کو ہمہ وقت ملتان پر حملہ کرنے کے لئے اُکساتے رہتے تھے۔ الغرض سلطان نے اپنی صاحبزادی دیس گسائیں کو حضرت کی زوجیت میں

دے کہ آپ کے اثر و نفوذ سے بیش از بیش مفادات حاصل کرے۔

اُچ میں قیام

حضرت مخدومؒ کو ملتان تشریف لائے تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ امراء کی آمد و شد سے آپ کو وقت کے ضیاع کا احساس ہوا۔ اس لئے حضرت ملتان کی سکونت ترک کرکے اُچ تشریف لے گئے، اور اُسے قادریہ سلسلے کی تبلیغی اور روحانی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ علمائے ظواہر نے ابتداءً مخالفت کی طرح ڈالی اور اس غرض کے لئے ایک مناظرہ بھی ترتیب دیا، مگر آپ نے اس اجلاس میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کی اور ایسے استدلال قائم کئے کہ تمام علماء آپ کی عظمت و شان کے آگے جُھک گئے۔

حضرت مخدوم تخلّص قادری فرماتے تھے۔ آپ کے ایک ارادت مند اور جاں سپار خدمت گزار مولانا عبدالقادرؒ جو آپ کے ہمراہ حلب سے تشریف لائے تھے، اور آپ کے بچوں کے اتالیق تھے۔ آپ کے تخلص کی نسبت سے فقیر قادری کہلاتے تھے۔ یہ بزرگوار سائے کی طرح اپنے مرشد کے ہمراہ رہے۔ آپ کے بعد حضرت مخدوم ثانیؒ کے ہمراہ ملتان آئے۔ اور طبعی عمر ختم کرنے کے بعد چوک شاہ عباس کے قریب دفن ہوئے۔ ان کی اولاد میں مولانا عبید اللہؒ الملتانی، مولانا حمید الدینؒ اور مولانا علی مردانؒ بہت بڑے ولی گزرے ہیں۔ مولوی محبوب احمد اُویسی، مولوی منظور احمد احقر، ایم طفیل احمد، حافظ شاہ بخش، مولوی محمد مراد اور دوسرے وہ تمام حضرات جو فقیر قادری کہلاتے ہیں، آپ کی ہی اولاد ہیں۔

سلطان قطب الدین کی وفات

سلطان قطب الدین سولہ سال حکومت کرنے کے بعد ۸۷۶ھ ۱۴۹۰ء

میں فوت ہو گیا۔ سلطان بڑا خوش تدبیر شخص تھا۔ اگرچہ شاہ گردی اور قحط نے ملتان کی چولیں ہلا دی تھیں تاہم اس ویرانی کے دُور کرنے میں اس نے پُوری کوشش کی۔ اور جب اس نے انتقال کیا۔ ملتان میں قحط کا نشان تک نہ تھا۔ ہر طرف امرفہ الحالی کا دَور دَورہ تھا۔

سُلطان حسین خاں لنگاہ

سلطان قطب الدین کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان حسین خاں لنگاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ یہ بڑا قابل اور مستعد حکمران تھا۔ ایک غاصب سلطنت کا لڑکا ضرور تھا، مگر اس کے علاوہ اور کوئی عیب اس میں نہ تھا۔ سلطان حسین خاں نے علما اور مشائخ کی پرورش کی۔ اور علومِ متداولہ و فنونِ جاریہ کو ترقی دی۔ اس نے شور کوٹ اور "کونکر" کو فتح کر کے اپنی سلطنت کو دین کوٹ تک وسیع کیا۔ یہ ابھی اس نواح میں حدود کا انتظام کرتا پھرتا تھا کہ معزول بادشاہ شیخ محمد یوسف قریشی کے اصرار پر سلطان بہلول نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو ملتان کی مہم پر روانہ کیا، اور تاتار خاں لودھی کو بھی ہدایت ہوئی کہ پنجاب کے لشکر سے اس کی مدد کرے یہ دونوں سردار متواتر کوچ کرتے ہوئے ملتان کو روانہ ہوئے۔ اتفاق سے انہی ایام میں سلطان کا حقیقی بھائی جو کوٹ کروڑ کا حاکم تھا۔ اس سے منحرف ہو گیا اور اس نے سلطان شہاب الدین لنگاہ کے نام سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سلطان حسین خاں نے اس فتنے کے مٹانے کو تمام امور پر مقدم جانا۔ بگولے کی طرح اُڑ کر کوٹ کروڑ پہنچا۔ اور سلطان شہاب الدین کو زندہ گرفتار کر کے فتح و نصرت کے شادیانے بجواتا ملتان کو روانہ ہوا۔ راستے میں باربک شاہ کے حملے کی اطلاع ملی۔ اس خبر کے سُنتے ہی راتوں رات سلطان دریائے سندھ سے بھاگا اور دریائے

چناب کو عبور کر کے صبح صادق سے پہلے قلعہ ملتان میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اپنی فوج کو جمع کر کے بڑی مؤثر تقریر کی اور کہا کہ :-

"تمام فوج سے شمشیر زنی کی توقع نہیں ہو سکتی۔ بعض کو عیال و اطفال کی محبت دامنگیر ہوتی ہے اور بعض کو کچھ اور مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ جنگ جدل میں مفید ثابت نہیں ہوتے، لیکن دوسرے کاموں میں بڑی مدد دے سکتے ہیں، جیسے قلعے کی حفاظت اور لشکر کو رسد پہنچانا وغیرہ لہٰذا میری طرف سے کسی پر جبر نہیں۔ جو وطن پر جان قربان کر سکتا ہو اور بے تکلف تلوار چلانا جانتا ہو وہ صبح کو میدان میں نکلے۔ باقی قلعہ کا خیال رکھیں!"

چنانچہ بارہ ہزار سوار و پیادہ جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو ملتان کا یہ لشکر جرار نقارہ بجاتا ہوا شہر سے برآمد ہوا۔ اور سلطان حسین خاں باربک شاہ کی فوج کے سامنے ڈٹ گیا۔

مخدوم سید عبدالقادرؒ ثانی اور حضرت سید مخدوم گیلانی کی طرف سے "فتح مبین" کی بشارت

حسنؒ روایت کرتے ہیں کہ جب سلطان حسین خاں کو باربک خاں اور تاتار خاں حاکم پنجاب کے ملتان پر حملہ آور ہونے کی اطلاع ملی۔ نیز یہ بھی پتہ چلا کہ ہاتھیوں کا رسالہ بھی ان کے ساتھ ہے تو وہ سخت مضطرب ہوا۔ فوراً آنحضرت مخدومؒ کی خدمت میں قاصد دوڑایا، اور دُعا کی درخواست کی اور خود لشکر لے کر باربک شاہ کے مقابلے میں نکلا۔ دونوں فوجیں لمحہ بہ لمحہ قریب تر ہوتی چلی آتی تھیں۔ اسی اثنا میں بارگاہِ غوثیہ سے قاصد نے واپس آ کر "فتح مبین" کا پیغام سنایا۔ اس بشارت

سے سلطان کی دلجمعی ہوئی اور اس نے حکم دیا کہ تمام سوار پیادے ہو جائیں۔ خود بھی گھوڑے سے اُتر پڑا، اور فرمایا کہ تمام فوج ایک ہی دفعہ تین تیر دشمن پر چلائے۔ پہلی ہی بار بارہ ہزار تیر کمان سے نکلے۔ باربک شاہ کی فوج گھبرا اُٹھی۔ دوسری بوچھاڑ نے ان میں انتشار پیدا کر دیا، اور تیسری میں وہ لشکر اس طرح بھاگا کہ چنیوٹ تک کہیں دم نہ لیا۔ اس مہم میں بجائے اس کے کہ ملتان ہاتھ آتا، دلّی کا لشکر اپنا وقار بھی کھو بیٹھا اور لاکھوں روپوں کا سامان چھوڑ گیا۔

بلوچ سرداروں کی آمد

ملّا نظام الدین احمد بدخشی لکھتا ہے کہ "چونکہ آئے دن سلطان حسین خاں کو کوہِ سلیمان[1] کے بلوچوں کی بغاوتوں اور شورشوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس لیے اس نے ان سے پیچھا چھڑانے اور اپنی عسکری طاقت بڑھانے کے لیے اپنے قدیم دوستوں ملک سہراب خاں دودائی اور جام اسمٰعیل خاں ہوت کو ملتان آنے کی دعوت دی

---

[1] معصومی نے اپنی تاریخ میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ خسرو خاں (کشلو خاں)، گورنر ملتان نے جب سلطان محمد تغلق سے لڑنے کا ارادہ کیا تو اس نے کوہِ سلیمان کے دامن سے بلوچوں کو طلب کر کے اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ نظام الدین احمد بدخشی بھی محمد تغلق کے ضمن میں لکھتا ہے کہ محمد تغلق سے بغاوت کرنے میں کشلو خاں نے بلوچوں سے مدد لی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوہِ سلیمان کی گھاٹیاں اس زمانے میں بھی بلوچوں سے بھری پڑی تھیں۔

لیفٹیننٹ میکیگن نے بھی ایک فارسی دستاویز کے حوالے سے ثابت کیا ہے، کہ سلطان حسین خاں لنگاہ کے زمانے میں کوہ سلیمان کے بلوچ بڑی طاقت رکھتے تھے، اور انہوں نے سلطان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ دریائے سندھ کی اراضی بلوچ سرداروں کو دے کر اس نے کوئی احسان نہیں کیا تھا، بلکہ اس کی ریاست کی غربی سرحد کا اس سے اچھا انتظام اور ممکن ہی نہ تھا۔

یہ لوگ مکران سے ہزاروں جانباز بلوچ نوجوانوں کو جلو میں لئے ملتان پہنچے، اور سلطان نے دین کوٹ سے کوٹ کروڑ تک کا علاقہ ان کی سرداری میں دے دیا۔ جب یہ خبر سندھ پہنچی تو سردار حاجی خاں میررانی بھی اپنے جواں سال بیٹے غازی خاں اور اپنے قبیلے کے سینکڑوں کڑیل نوجوان ہمراہ لے کر ملتان آ گیا۔ سُلطان نے اُسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور کوٹ کروڑ سے سیت پور تک کا علاقہ کوہ سلیمان کے دامن تک اسے دے دیا۔ جب کوہستانی بلوچوں کو نئے قابضین کی آمد کا علم ہوا تو وہ بڑے جز بز ہوئے۔ اور اپنی اپنی گھاٹیوں سے نکل کر دریائے سندھ تک پھیل گئے۔ سردار حاجی خاں کو اپنی ریاست پر قبضہ کرنے کے لئے اُن سے کافی جنگیں لڑنا پڑیں۔ اور اس نے اتنے قبائلی قتل کئے کہ اُن کے خُون سے دریائے سندھ کا پانی سُرخ ہو گیا۔

اسی طرح ملک سہراب اور جام اسمٰعیل کو بھی اپنے علاقوں پر قبضہ کرنے میں خاصی دُشواریاں پیش آئیں۔ چونکہ ملک سہراب کو سلطان نے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا تھا۔ اس لئے وہ مستقل طور پر ملتان میں رہتا تھا۔ جاگیر میں اس کا بیٹا بابر بن سہراب حکومت کرتا تھا۔ ابتداءً ملک بابر بن سہراب نے اپنے نام پر کوٹ بابر کی بنیاد ڈالی۔ اور لسکانی، کلاچی، کودائی اور دُوسرے بلوچ سرداروں کے علاوہ جام اسمٰعیل خاں نے بھی اسی کو اپنا مستقر قرار دیا اور جب اس کی اپنی جاگیر لٹیروں اور قبائلی حملہ آوروں سے خالی ہو گئی تو اس نے کوٹ بابر سے بیس میل شمال کو دریائے سندھ کے غربی کنارے اپنے نام پر ڈیرہ اسمٰعیل خان آباد کیا۔ بابر کو کافی عرصہ میررانی اور کوہستانی بلوچوں سے جنگیں لڑنا پڑیں۔ آخر کار حرب و ضرب کی طوالت سے تنگ آ کر وہ اپنے والد کے ہاں ملتان چلا آیا۔ یہاں شہر

سے دو میل مغرب کو ملک سہراب نے اس کے نام پر قلعہ تعمیر کرایا تھا جس کے کھنڈر سورہ میانی کے راستے میں سر اُٹھائے نظر آتے ہیں۔ اس میں رہائش اختیار کی۔ اور باپ کی طرح لنگاہ دربار سے منسلک ہو کر رہ گیا۔

سکندر لودھی سے معاہدہ

سنہ ۱۴۸۹ء میں سلطان بہلول کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا لڑکا نظام شاہ سکندر لودھی کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اسے بھی کئی حریفوں سے ٹکر لینا پڑی۔ بہار جون پور، ترہٹ اور گوالیار کی مہمات میں وہ اس قدر اُلجھا کہ ۱۴۹۱ء تک دہلی واپس نہ آسکا۔ سلطان حسین خاں نے جب اسے مخالفوں میں گھرا ہوا دیکھا تو اس نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ تعزیت اور تہنیت کا ایک خط مع قیمتی تحائف ایلچیوں کے ہاتھ ارسال کیا اور ساتھ ہی اس امر کی درخواست کی کہ آپس میں مصالحت کا عہد نامہ ہو جائے۔ سکندر کو ناموافق حالات کے باعث یہی مناسب معلوم ہوا کہ لنگاہ بادشاہ سے صلح کر لے۔ چنانچہ اس نے صلحنامہ پر دستخط کر دیئے اور ایلچیوں کو خلعتِ فاخرہ دے کر بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ملتان کی مردم خیزی کا اعتراف

سلطان حسین خاں کی جب ادھر سے خاطر جمع ہوئی تو اس نے سلطان مظفر گجراتی سے خط و کتابت شروع کی۔ اور قاضی محمدؒ کو اس لئے گجرات روانہ کیا کہ وہاں کے محلات دیکھ کر نقشے تیار کر لائے تاکہ ملتان میں بھی ویسی عمارتیں تیار کی جائیں۔ چنانچہ قاضی محمدؒ، احمد آباد پہنچا اور سلطان کی خدمت میں باریاب ہو کر تحفہ و ہدایا پیش کئے۔ سلطان بڑے اخلاق سے پیش آیا اور اس کی بڑی عزت

کی۔ جب قاضی صاحب واپس آنے لگے تو انہوں نے سلطان کی خدمت میں محلات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ سلطان نے داروغہ محلات کو حکم دیا کہ مہمانِ عزیز کو تمام عمارات کی سیر کرائے۔ قاضی محمدؒ نے محلاتِ شاہی دیکھ کر ان کے خاکے تیار کر لیے، اور جب ملتان واپس پہنچا تو سلطان حسین کی خدمت میں عرض کی کہ "اے بادشاہ! زبان احمد آباد کے محلات کی تعریف بیان کرنے سے قاصر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ آپ اگر تمام مملکت کا ایک سال کا خراج صرف کر ڈالیں تو بھی احمد آباد کے محلات جیسا ایک محل بھی تعمیر نہیں ہو سکتا۔" سلطان یہ حال سن کر مغموم ہوا۔ عماد الملک وزیر حاضر ہوا، اور اس نے بادشاہ کو مغموم پا کر وجہ دریافت کی۔ سلطان نے کہا: "کہنے کو تو بادشاہ کہلاتا ہوں، مگر لوازماتِ شاہی سے محروم ہوں۔ قیامت کے دن جب بادشاہوں کے ساتھ اٹھایا جاؤں گا تو اُن کے سامنے میری کس قدر سبکی ہوگی!" عماد الملک نے عرض کی کہ خداوند تعالیٰ نے تمام دُنیا کی خوبیاں ایک ہی ملک میں ودیعت نہیں فرمائیں۔ گجرات، دکن اور مالوہ کے ممالک اگر زیادہ زرخیز اور شاداب ہیں تو ملتان کی مردم خیزی بھی کچھ کم فخر کی چیز نہیں۔ یہاں کے عالم اور ہنرمند سارے جہان میں مشہور ہیں یہاں ایسے مشائخ ہیں جن کی دامادی پر سلطان بہلول لودھی فخر کرتا ہے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کے خاندان میں اب بھی قابلِ فخر ہستیاں موجود ہیں۔ مولانا فتح اللہ اور ان کے شاگرد مولانا عزیز اللہ جیسے نامور علماء اسی خطہ کے رہنے والے ہیں۔ عماد الملک کی یہ تقریر سن کر سُلطان حسین خوش ہو گیا۔

سمہ سرداروں کی باریابی

سُلطان حسین کی قدردانی اور معارف پروری کا چرچا دُور دُور تک پھیل چکا تھا۔ جام بایزید اور

جام ابراہیم سمہ قوم کے دو سردار تھے۔ سندھ کے بادشاہ جام نظام الدین کی بے رُخی دیکھ کر یہ دونوں سردار سندھ سے سلطان حسین خاں کی خدمت میں چلے آئے۔ سلطان اِن دونوں کی آمد سے بڑا خوش ہوا۔ بایزید کو قلعہ شور اور ابراہیم کو اُچ کی حکومت عنایت کی۔

جام بایزید خود علم و فضل کے زیور سے آراستہ تھا۔ اس لئے اس کا دربار علماء اور فضلاء کا مرکز تھا۔ شیخ جمال الدین قریشی جو شیخ عالم قریشی کی اولاد سے تھے اور خراسان کے قیام کے دوران انہوں نے مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ اگرچہ ان دنوں اُن کی آنکھیں نُورِ بصارت سے محروم ہو چکی تھیں لیکن اُن کے علم و فضل کے باعث جام بایزید نے انہیں اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ جام بایزید بڑا متقی اور دیندار حکمران تھا۔ ایک دفعہ وہ اپنے دارالحکومت شور میں مکان تعمیر کرا رہا تھا کہ زمین سے خزانہ نکل آیا۔ اُس نے پورا خزانہ شرعی وارث سلطان حسین لنگاہ کی خدمت میں بھجوا دیا۔ جس سے وہ بہت خوش ہوا اور اکثر اوقات سرِ دربار اس کی دیانت اور اخلاص کا ذکر کیا کرتا تھا۔[1]

عماد الملک کی گرفتاری اور قتل

افسوس ہے لنگاہوں میں سلطان حسین خاں کے پایہ کا پھر کوئی اور آدمی پیدا نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنی زندگی کے آخری دَور میں بڑے لڑکے فیروز خاں کو تخت پر بٹھایا، لیکن یہ شہر یاری کے لائق ثابت نہ ہوا۔ بخیل اور مزاج کا بڑا تیز تھا۔ اس نے عماد الملک کے ایک لڑکے کو قتل کرا دیا۔ وزیر نے بیٹے کے انتقام میں اُسے زہر دے کر دُنیا سے رخصت کیا۔ سلطان حسین ابھی زندہ تھا۔ اُسے بیٹے کی

[1] تاریخ ہند از مولانا ذکار اللہ

جوانمرگی کا سخت صدمہ ہوا اور اُس نے شورکوٹ کے حاکم جام بایزید کو اشارہ کیا جس نے عماد الملک کو عین اُس وقت جبکہ وہ اس کے لشکر کا جائزہ لے رہا تھا، گرفتار کر کے قید کر دیا۔

سُلطان محمود لنگاہ

۹۰۰ھ میں سُلطان نے اپنے پوتے محمود شاہ کو ولیعہد بنایا اور جام بایزید کو اس کا اتالیق اور وزیر مقرر کیا۔ سلطان حسین خاں ۹۰۸ھ میں فوت ہو گیا۔ محمود خاں کمسن تھا۔ نالائق لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے وزیر اور بادشاہ کو لڑا دیا۔ جام بایزید ملتان سے بھاگ کر قلعہ شورکوٹ میں چلا گیا۔ سلطان سکندر لودھی ابھی زندہ تھا جام بایزید نے ایلچی بھیج کر اس کی خدمت میں اپنی اطاعت کا اظہار اور اپنی ریاست کا سلطنتِ دہلی سے الحاق کر لیا۔ سکندر لودھی اس سے بڑا خوش ہوا۔ اس نے پنجاب کے گورنر دولت خاں لودھی کو حکم دیا کہ ضرورت کے وقت جام بایزید کی امداد کرے۔ چند دنوں کے بعد سلطان محمود نے قلعہ شورکوٹ پر حملہ کیا۔ جام نے فوراً دولت خاں کو اطلاع کی۔ اُس نے دونوں فریقوں میں مصالحت کرا دی اور دریائے راوی کو حدِ فاصل قرار دیا۔ سلطان محمود کے اعمال اس قابل نہ تھے کہ سلطنت کو طول نصیب ہوتا۔ لیکن ملک سہراب بلوچ جو اس خاندان کا پشت پناہ چلا آتا تھا۔ جام بایزید کی علیحدگی پر اُس نے دوبارہ قلمدانِ وزارت سنبھال لیا۔ جس سے لنگاہ سلطنت کی عمر کچھ زیادہ ہو گئی۔

حضرت مخدوم سیّد محمد غوث کا سفرِ آخرت

مفتی غلام سرور لاہوری کی تحقیق کے مطابق ۹۲۳ھ میں حضرت مخدوم نے سفرِ آخرت اختیار کیا اور اُچ کی خاکِ پاک میں دفن ہوئے۔ آپ کے چار

صاحبزادے تھے۔ چونکہ سید عبدالقادر اُن سب سے بڑے تھے، اس لئے والد ماجد کے جانشین قرار پائے۔

مخدوم سید عبدالقادر ثانی رحمۃ اللہ علیہ

مخدوم سید عبدالقادر ابتداءً امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ جب حضرت مخدوم سید محمد غوثؒ آپ کے اسبابِ تعیش پر نظر ڈالتے تو یہ صورت اُن کے لئے آزردگی کا موجب بنتی تھی۔ ایک دفعہ حضرت مخدوم نے سخت الفاظ میں سرزنش کی اور صاحب زادہ چپ چاپ سُنتے رہے۔ رات کو حضرت غوث صمدانیؒ کی زیارت ہوئی، فرمایا

"عبدالقادر میرا فرزند ہے، اسے میرے حوالے کیجئے۔ اس کی تربیت میں خود کروں گا۔ آپ دُوسرے صاحبزادوں کو سنبھالیں اس کی فکر نہ کریں!"

اس واقعہ سے اِدھر تسلّی ہوئی اُدھر جذبۂ الٰہی پیدا ہُوا۔ تمام آلاتِ موسیقی توڑ دیئے، شکاری جانوروں کو دُور کر، سر منڈوا، مراقبہ میں ہو بیٹھے۔ پھر تو عبدالقادر وہ عبدالقادر ہوئے کہ عبدالقادر ثانیؒ کہلائے۔ محدّث دہلوی فرماتے ہیں کہ یہ مسلّمہ امر ہے کہ غوث صمدانی، محبوبِ سُبحانی کا کوئی ثانی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سے بڑا مرتبہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی عبدالقادر ثانی کہلائے۔ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں:-

"ہر چند کہ آنحضرت ثانی ندارد اما کدام درجہ عالی تر ازاں باشد کہ کسے ملقّب بایں لقب باشد!"[1]

---

[1] اخبار الاخیار

خانِ اعظم میر چاکر خاں رِند کی فاتحانہ یلغار

اُن دنوں اُچ میں بلوچ قوم کا ایک بہادر جرنیل خانِ اعظم میر چاکر خاں رِند بہت بڑے لشکر کے ہمراہ وارد ہوا۔ اُس نے پاک و ہند کی تاریخ میں اتنا اہم کردار انجام دیا کہ برِ صغیر کے طول و عرض میں دھوم مچ گئی۔

یہ آہنی عزم کا بلوچ جرنیل میر شہک کا بہادر بیٹا تھا۔ باپ کے انتقال پر بلوچوں کا سردار مقرر ہوا۔ شہر سبی اس کا پایۂ تخت تھا۔ ایک اور بلوچ سردار میر گواہرام گندادہ کا حکمران تھا۔ کسی بات پر ان دونوں میں جنگ چھڑ گئی اور تیس سال تک ایک دُوسرے کے گلے کاٹتے رہے۔ ہزاروں بلوچوں کے قتل کے بعد لاشار قبائل کو شکست ہوئی۔ وہ گجرات (کاٹھیاواڑ) کی طرف منتقل ہو گئے اور خانِ اعظم میر چاکر خاں کو بھی اس خونین سرزمین سے نفرت ہو گئی۔ اپنے ہزاروں جنگ آزما اور صف شکن بہادروں کو جلو میں لیے پنجاب کو اپنا وطن بنانے کی نیت سے روانہ ہوا۔ جب اُچ میں داخل ہوا تو اس نے بخاری اور گیلانی بزرگان کے مزارات پر حاضری دینے کے بعد حضرت مخدوم سید عبدالقادر ثانی قدس سرہٗ کی پابوسی کا شرف حاصل کیا۔ ان دنوں اُچ کے علاقے کا حاکم جام ابراہیم سمہ تھا۔ اُس کے تعلقات بلوچ سردار سے بڑے خوشگوار تھے۔ خانِ اعظم میر چاکر خاں نے اپنا لشکر جام کے پاس چھوڑا اور خود اپنے صاحبزادوں میر شہداد اور میر اللہ داد کے ہمراہ ملتان چلا آیا۔ اُس زمانے میں لنگاہوں کا تو صرف نام تھا۔ ان کے پردے میں بلوچ حکومت کر رہے تھے۔ ملک سہراب وزیر اعظم اور لشکر خاں سپہ سالار تھا۔ خانِ اعظم میر چاکر خاں کی آمد آمد سُنی تو ملک سہراب سہم گیا اور اُسے

اپنا مستقبل نقش بر آب نظر آنے لگا۔ اس نے سلطان محمود سے صاف صاف کہہ دیا کہ جو شخص اقتدار کی خاطر اپنے تیس ہزار بھائیوں کا گلا کاٹ سکتا ہے وہ ہمیں کب چھوڑے گا۔ اس پر اعتماد کرنا حزم و احتیاط کے منافی ہے۔ بہتر ہے کہ اسے چلتا کیجئے ورنہ میرا استعفار قبول فرمایئے۔ خانِ اعظم میر چاکر خاں نے سلطان سے تخلیہ میں ملاقات کی اور کہا کہ اگر آپ مجھے اپنا سپہ سالار بنالیں تو میں دہلی تک آپ کی سلطنت کو پھیلا دوں گا۔ سلطان محمود، خانِ اعظم میر چاکر خاں کی خون آشامی سے خود بھی بخوبی واقف تھا اور پھر ملک سہراب نے اس پر اس قدر رنگ و روغن چڑھا دیا تھا کہ وہ گھبرا اُٹھا۔ اُس نے خانِ اعظم سے کہا کہ ملتان ایک چھوٹی سی ریاست ہے، آپ جیسے اولوالعزم رزم آزما جرنیل کی کیونکر متحمل ہوسکتی ہے۔ آپ کے پاس اپنی فوج کافی ہے، کسی دوسرے کو ساتھ ملانے کی کیا ضرورت ہے دہلی کا میدان خالی ہو رہا ہے، آگے بڑھ کر قسمت آزمائی کیجئے۔

چونکہ ملتان کی حکومت چند دنوں کی مہمان نظر آرہی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ حکومت کے اہم عہدوں پر بلوچ فائز تھے۔ خانِ اعظم میر چاکر خاں نے کسی سے اُلجھنا پسند نہ کیا اور شور کوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جام بایزید جام ابراہیم کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اُس نے خانِ اعظم کو اپنا معتمد دوست سمجھ کر بڑی عزت کی۔ اور اپنی ذاتی جاگیر میں سے اسے اور اس کے لڑکوں کو معقول اراضی عطا کی، جو راوی سے دیپال پور تک پھیلی ہوئی تھی۔ فرشتہ اپنی تاریخ میں اس واقعہ کی نشاندہی اس طرح سے کرتا ہے :-

" دریں خلال ایں احوال میر چاکر خاں رند و پسر میر شہداد از جانب سیوی ملتان آمدند۔ چوں ملک سہراب دودائی پیش سلطان لنگاہ

عزّت تمام داشت، میر چاکر آنجا نتوانست بود، واز انجا بجام بایزید رفت۔ جام بایزید بسیار بعزّت آمدہ پارہ از ولایت در وجہ خاصہ خود مقرر کردہ بود بمیر چاکر خاں و فرزندان او را داد و ایں جام بایزید مردِ محسن و کریم العزّت بود۔[۱]

کوٹ چاکر

اسی طرح جام ابراہیم نے بھی خانِ اعظم میر چاکر خاں کو اُچ اور ملتان کے درمیان معقول اراضی پیش کی۔ یہ علاقہ دریائے چناب اور ستلج کے درمیان واقع تھا۔ خانِ اعظم نے اس اراضی میں اپنے نام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا جو اَب تک جلال پور پیروالہ اور لودھراں روڈ پر سر اُٹھائے بلوچوں کے قافلے کی واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس طرح خانِ اعظم نے اپنے نصف قبائل کوٹ چاکر میں اور نصف جام بایزید کی دی ہوئی جاگیر کے صدر مقام ست گھرہ میں آباد کئے۔

اُس زمانے کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جام برادران کی یہ داد و دہش مصلحت سے خالی نہیں تھی۔ جام ابراہیم نے خانِ اعظم میر چاکر خاں کو اپنے اور لنگاہوں کے درمیان اراضی دے کر ایک قسم کی سدِّ سکندری کھڑی کر لی تھی، اور وہ ملتان کی طرف سے بے خوف ہو گیا تھا۔ جام بایزید پر لودھی حکومت کا خوف مسلّط تھا اور پھر بابر بھی عقاب کی طرح وادیٔ پنجاب پر منڈلا رہا تھا۔ اُس نے بھی اپنے اور لاہور کے درمیان میر چاکر خاں کو حائل کر کے گویا اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھڑا کر لیا۔ سردار غلام رسول خاں قرائی تو اتنا لکھ گئے ہیں کہ خانِ اعظم میر چاکر خاں کو پنجاب کی طرف آنے کی دعوت ہی جام برادران

---

[۱] تاریخ فرشتہ صفحات ۶۰۸ تا ۶۱۲

نے دی تھی۔ اور خانِ اعظم ان کے بُلاوے پر ہی اس طرف آئے تھے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ :-

"شاہ محمود لنگاہ کی تخت نشینی پر جاموں اور دودائیوں میں تنازعہ ہُوا۔ جاموں نے میر چاکر خاں کی طرف جو سبّی کا رند بلوچ تھا۔ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ میر چاکر خاں نے جاموں کی درخواست کا جواب فوری طور پر آمنّا و صدقنا میں دیا[1]۔"

خانِ اعظم نے جدید اراضیات پر قبضہ کرنے کے بعد انہیں آباد کرنے، اور اُن میں اپنے اور اپنے لڑکوں اور عزیزوں کے لیے محلات اور قلعے تعمیر کرنے شروع کیے۔ کیونکہ وہ حملہ آور نہیں تھا کہ لوٹ مار کے بعد چلا جاتا، بلکہ وہ اپنی قوم کے لئے ایک زرخیز اراضی حاصل کرنے اور اُسے اپنا اور اپنی اولاد کا وطن بنانے آیا تھا۔ چنانچہ اُس نے پُرانے ست گھرہ کے قریب جدید ست گھرہ کی بنیاد رکھی، عالی شان محلات تعمیر کرائے اور ان کے گرداگرد سر بفلک فصیل تیار کرکے ایک ایسا قلعہ بنا کھڑا کیا، جو لاہور کے شاہی قلعہ سے چشمک زنی کرتا تھا۔ اسی طرح خانِ اعظم کے بڑے لڑکے میر شہداد نے راوی کے کنارے اپنے نام پر ایک شہر آباد کیا اور اُسے کوٹ میر شہداد سے موسوم کیا اور کچھ فاصلے پر اپنے بیٹے میر بیران کے نام پر میر پور تعمیر کیا۔ پاکپتن کے قریب میر شاہو خاں نے اور ساہیوال و ست گھرہ کے مابین میر تھیک نے بھی اپنے اپنے نام سے قلعے اور شہر تعمیر کیے۔ ست گھرہ اور کوٹ میر شہداد کے درمیان گشکوری اور گورگیج امرار کو جاگیریں دی گئی تھیں۔ جن میں کوٹ گشکوری، فتح پور اور گورگیجن

---

[1] بلوچ پنجاب میں صہ۱۸ از سردار غلام رسول خاں قرانی بی اے پی سی ایس، سب جج۔

نام سے کئی قلعے سطح زمین پر اُبھر آئے۔ خان اعظم میر چاکر خاں اور اُن کے بیٹے اگرچہ اپنے نئے وطن کو سنوارنے میں لگے ہوئے تھے، تاہم ملتان کے حالات سے غافل نہیں تھے۔ ست گھرہ، لاہور اور ملتان کے درمیان واقع تھا۔ تمام قافلے جو ملتان سے لاہور، اور لاہور سے ملتان کو جاتے تھے، ست گھرہ سے ہو کر گزرتے تھے۔ اس طرح خانِ اعظم کو روزانہ نہ صرف لاہور اور ملتان بلکہ بلوچستان تک کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔

خانِ اعظم میر چاکر خاں کو ست گھرہ میں آباد ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ لنگاہ سلطنت کے جاں سپار اور مدبّر وزیر اعظم ملک سہراب کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ سید شجاع الملک بخاری کو جو سلطان حسین خاں اول کا داماد تھا، سلطان محمود نے اپنی سلطنت کے سیاہ و سفید کا مختار بنا دیا۔ تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک بلوچ لنگاہ سلطنت میں دخیل رہے، یہ روزافزوں ترقی کرتی رہی۔ اگر شورؔ اور اُچؔ کی ریاستیں لنگاہوں کے قبضہ اقتدار سے نکل گئیں تو اس کی ذمہ داری سلطان کے شوریدہ سر لنگاہ امرار پر عائد ہوتی ہے۔ جنھوں نے بلاوجہ جام فریدکے بیٹے جام عالم خاں کو سرِ دربار ذلیل کیا تھا۔

مخدوم گیلانی اور لنگاہ سلطان کے مابین تاریخی خط و کتابت

مخدوم سید عبدالقادر ثانی قدس سرّہ، گوشہ نشین بزرگ تھے اور اُچ میں عوام کو سبیل الرشاد پر گامزن کرنے میں مصروف تھے۔ سلطان محمود لنگاہ کے دربار میں بخاری سادات کا طوطی بول رہا تھا۔ سلطان چاہتا تھا کہ گیلانی مخدوم اور

سادات بھی دربار کی زینت بنیں، مگر حضرت مخدوم اس طرف متوجہ نہ ہوئے مصاحبوں نے سلطان کو مشورہ دیا کہ اگر منصبِ سجّادگی حضرتِ مخدوم سے چھین کر ان کے کسی بھائی کو دے دیا جائے اور جاگیریں بھی ضبط کر لی جائیں تو ان کا تمام فخر و غرور ہرن ہو جائے گا اور وہ دربار میں دوڑے چلے آئیں گے۔ ابھی دربار سے اس بارے میں کوئی حکم صادر نہیں ہوا تھا کہ حضرت مخدومؒ نے اطلاع پاکر از خود تمام فرامین اور سندات جو معافیات اور وظائف سے متعلق تھیں سلطان کو واپس لوٹا دیں کہ ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے، جسے آپ چاہیں سجّادہ نشین بنا دیں۔ ہمارے لئے خزانۂ غیبی کافی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لنگر خانے کے لئے جو وظائف اور جاگیریں مقرر تھیں سب ضبط ہو گئیں۔ آپ کے عالی مقام برادران پر لنگاہ گورنمنٹ نے سجّادگی قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کیا تو وہ سب لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی سربلندی کے لئے گراں قدر کام کیا۔

جاگیر اور وظائف کی ضبطی سے اگرچہ حضرت مخدوم سیّد عبدالقادرؒ کو انتہائی تنگدستی سے دوچار ہونا پڑا، مگر تسلیم و رضا کا یہ پیکرِ جمیل شکوہ زبان تک نہ لایا۔ سلطان نے جب دیکھا کہ ان اوچھے اقدامات کا حضرت پر کچھ اثر نہیں ہوا تو پھر اس نے منّت خوشامد شروع کی اور اپنے مصاحبِ خصوصی کی وساطت سے ایک نیاز نامہ حضرت مخدوم کو ارسال کیا کہ اگر حضور دربارِ شاہی کو رونق بخشیں تو تمام جاگیرات اور وظائف بحال کر دیئے جائیں گے۔ حضرت نے جواب میں یہ قطعہ لکھ بھیجا ؎

بہ ہیچ باب ازیں باب روئے گشتن نیست　　　ہر آنچہ بر سر ما مے رود مبارک باد

کسے کہ خلعتِ سلطانِ عشق پوشیدست تجمّلہ ہائے بہشتی کجا شود شاد

یعنی ہم کسی طرح سے اپنی روش ترک نہیں کر سکتے۔ اس کے بدلے جو کچھ بھی ہمارے سر پر گزرے، وہ ہمارے لئے مبارک ہے۔ جس نے سلطانِ عشق کا خلعت زیبِ تن کر رکھا ہے وہ بہشتی خلعتوں کو کیسے خاطر میں لا سکتا ہے۔

محدّث دہلوی فرماتے ہیں کہ یہ جواب مشابہ اس جواب کے ہے جو حضرت غوث صمدانی محبوب سبحانی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہِ سنجر کو دیا تھا۔

شاہ حسین ارغون کا پہلا حملہ

۹۳۱ھ میں اطلاع ملی کہ شاہ حسین ارغون لشکرِ جرّار جلو میں لئے ملتان فتح کرنے کی نیّت سے اُڑا چلا آتا ہے۔ سلطان محمود نے لنگاہوں اور بلوچوں کا لشکر مقابلے پر روانہ کیا۔ سلطان سیوراہی کو فتح کرنے کے بعد قلعہ مَو کے قریب پہنچا۔ ان ایّام میں سلطان التارکین حمید الدین حاکم قدس سرہٗ کے صاحب سجّادہ حضرت مخدوم روح اللہؒ تھے۔ علم و فضل اور زہد و ورع کے سبب دُور دُور تک اُن کا شہرہ تھا۔ جب لشکرِ شاہی قلعہ کے قریب پہنچ گیا تو حضرت مخدوم ہاشمی سلطان کے استقبال کو نکلے اور اہلِ قلعہ کے لئے امان طلب کی۔ سلطان نے حضرت مخدوم کی سفارش منظور کی اور مرزا مسکین خان ترخان کو حکم دیا کہ فوج کا ایک دستہ ہمراہ لے کر قلعہ میں جائے اور اجناس کے ذخائر کا جائزہ لے کر رپورٹ کرے، نیز اگر کوئی بلوچ یا لنگاہ اس قلعہ میں ہو تو اسے باہر نکال دے اور جو شخص سلطان التارکینؒ[1] کے

---

[1] مَو مبارک ضلع رحیم یار خاں کا مشہور قصبہ ہے۔ اس میں حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے خلیفۂ اعظم سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ کا مزار ہے۔ ان کی اولاد میانوالی قریشیاں اور اس کے گرد و پیش میں آباد ہے۔ جناب مخدوم حمید الدین، ان کے سجادہ اور مخدوم نور محمد قریشی الہاشمی رکن پنجاب اسمبلی علم دوست اور مخیّر رئیس ہیں۔

آستانِ پاک میں پناہ لے اس سے کچھ تعرّض نہ کرے۔ چنانچہ مرزا اسکین مخدوم روح اللہ کی معیت میں قلعہ کا گوشہ گوشہ دیکھ کر باہر نکل آیا اور کسی کو تکلیف نہ پہنچائی۔ اس کے بعد شاہ حسین بغرضِ سیر قلعہ میں داخل ہوا اور حاکمِ مشائخ سے اس امر کا عہد لیا کہ وہ اس کے آدمیوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں گے اور اس کے مخالفوں سے کچھ رابطہ نہ رکھیں گے۔ ازاں بعد وہ اُچ کی طرف متوجہ ہوا اگرچہ لنگاہوں اور بلوچوں کا لشکرِ جرّار مقابلے کو تیار تھا، لیکن مرزا کا بخت اُن پر غالب آیا اور اُنہیں سخت شکست ہوئی۔ یہاں سے لشکرِ شاہی نے ملتان کا رُخ کیا۔ سلطان محمود بلوچوں اور دوسری اقوام کے اسّی ہزار نبرد آزما نوجوان ہمرکاب لے کر ملتان سے روانہ ہوا۔ اُسے اپنے ساز و سامان اور لشکر کی کثرت کی بنا پر یہ یقین تھا کہ شاہ حسین ایک پلّے کی تاب بھی نہ لا سکے گا۔ تاہم اُس نے مسلمانوں کے کشت و خون سے بچنے کے لئے حضرت غوثِ زماں شیخ بہاء الدین قریشی سجّادہ نشین آستانۂ غوثیہ کو مرزا کے پاس بھیجا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اسے صلح کی طرف راغب کریں۔ ساتھ ہی مولانا بہلول کو جو اُس دور کے جیّد عالم تھے، ہمراہ کر دیا۔ یہ بزرگوار مرزا کے لشکر میں پہنچے تو وہ بڑے ادب سے پیش آیا، اور اس نے کہا کہ میں تو سلطان محمود خاں کی تربیت اور حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی قدس سرہٗ کی زیارت کے لئے آیا ہوں[1]۔

مولانا بہلول نے فرمایا۔ کیا ہی بہتر ہو کہ آپ سلطان محمود کی مثلِ اُویس قرنی کے تربیت فرمائیں، جیسا کہ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی

---

[1] آمدن من بغرض تربیت سلطان و زیارت شیخ بہاء الدین زکریا است!

تھی۔ باقی رہی شیخ الاسلام کی زیارت، تو اس کے لئے جب شیخ بہاء الدین خود حاضر ہیں، آپ کو ملتان جانے کی کیا ضرورت ہے[1]؟

ابھی یہ مذاکرات جاری تھے کہ سلطان محمود لنگاہ کی وفات کی اطلاع پہنچی حضرت شیخ بہاء الدین سرعت سے واپس پہنچے، اور سلطان محمود کا جنازہ پڑھ کر اس کی لاش کو ملتان روانہ کیا۔ مادرِ سلطان اور امرائے سلطنت کے مشورہ سے شہزادہ حسین کو مسندِ حکومت پر بٹھایا۔ اور صلح کے مذاکرات کی تکمیل کے لئے علماء اور مشائخ کی ایک جماعت کو ہمراہ لے کر پھر سلطان کے پاس پہنچے اور فرمایا۔

"سلطان محمود، جس سے آپ کو شکایت تھی، فوت ہو گیا۔ اب آپ یتیم بچے سے لڑ کر کیا لیں گے، بہتر ہے کہ آپ واپس تشریف لے جائیں اور مسلمانوں کے دو فریقوں کا خون اپنے سر پر نہ لیں!"

مرزا نے آپ کی سفارش منظور کر لی۔ دریائے ستلج کے کنارے ایک عہد نامہ لکھا گیا جس کی رُو سے ارغون اور لنگاہوں کی سلطنتوں میں اس دریا کو حدِ فاصل قرار دیا گیا۔ جب آپ روانہ ہونے لگے تو مرزا نے ۹ گھوڑے، ایک قطار شتر اور نقد و جنس نذر کے طور پر پیش کئے اور یقین دلایا کہ کل ہی اس کا لشکر یہیں سے واپس لوٹ جائے گا۔

لنگاہوں کا زوال

۹۳۳ھ کے اواخر میں لنگاہوں کے خاندان میں زوال کے آثار شروع ہو گئے۔ سلطان حسین خاں ایک کمسن بچہ تھا۔ جس طرح اُسے ماں یا خاندان کی دُوسری عورتیں کہتیں اُسی طرح کرتا تھا۔

---

[1] مولانا بہلول گفتند چہ شود کہ تربیت سلطان بطور تربیت اویس قرنیؓ باشد کہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم بروحانیت تربیت او نمودہ بود دیگر آنکہ شیخ بہاء الدین بخدمت آمد چہ احتیاج تصدیع کشید نیست!

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لنگاہوں کی وہ عظیم الشان ریاست جو شورکوٹ سے سکھر تک پھیلی ہوئی تھی، اب راوی سے ستلج تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ لنگاہ امیروں کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ جسے چاہتے، مار ڈالتے، اور کوئی ان سے اتنا نہ پوچھ سکتا کہ مقتول کا قصور کیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے دو گردیزی سادات[1] کو، جن میں سے ایک تایا اور دوسرا بھانجا تھا، بے وجہ قتل کر دیا۔ اس پر اہلِ ملتان نے مشتعل ہو کر بابر کی خدمت میں قاصد بھیجے کہ خدا کے لئے ملتان کو لنگاہوں کے ظلم و تعدی سے نجات دلائیے۔ بادشاہ نے شاہ حسین ارغون کو لکھا کہ بڑھ کر ملتان پر قبضہ کر لو۔
اس حالت میں جبکہ ایک سرسبز و شاداب ریاست اور ایک نادرۂ روزگار عظیم شہر مفت میں ہاتھ آ رہے تھے۔ ارغون کو کونسی چیز حملہ سے روک سکتی تھی چنانچہ ۹۳۳ھ میں شاہ حسین پھر ملتان کی طرف متوجہ ہوا، اور منزل بہ منزل مار امار کرتا ملتان آ پہنچا۔ اس پر بھی لنگاہ امراء کا مزاج درست نہ ہوا، اور وہ اپنی سابقہ روش پر قائم رہے۔ اقبال خاں جو متوفی سلطان کا کوکہ اور لنگاہوں کا دلی خیرخواہ تھا۔ قوام خاں اور لنگر خاں جو صاحبِ اقتدار امیر تھے۔ حالات کی اصلاح میں کوشاں ہوئے تو بھرے دربار میں ان کا مذاق اڑایا گیا۔ بجائے اس کے کہ بادشاہ انہیں ٹوکتا، الٹا ہنس ہنس کر مزے لیتا رہا۔ جس پر یہ تینوں اکابر امراء ادھر سے کٹ کر سلطان حسین ارغون سے جا ملے۔

شاہ حسین ارغون کا دوسرا حملہ

اہلِ ملتان کو جب اس امر کی اطلاع ہوئی، کہ شاہ حسین اس طرف متوجہ ہے تو وہ قتل و غارت

---

[1] ان کے مزارات چوک شہیداں ملتان میں سبزی منڈی کی جانب ایک مسجد کے پہلو میں واقع ہیں اور چوک بھی انہی سے موسوم ہے۔

کے تصوّر سے کانپ اُٹھے اور انہوں نے شیخ اسمٰعیل قریشیؒ کو جو غوثِ زماں شیخ بہاء الدینؒ سجادہ نشین حضرت شیخ الاسلام کے چھوٹے بھائی اور "عمدۃ المشائخ" کے لقب سے ممتاز تھے۔ برسم رسالت شاہ حسین کے پاس روانہ کیا۔ مرزا نے شیخ کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ اور مہمانی کے طور پر کچھ روپیہ بھی نذر کیا۔ لیکن جب حضرت نے صلح کی غرض سے سلسلۂ جنبانی کی تو اس کا کچھ نتیجہ مترتب نہ ہوا۔ مرزا نے کہا کہ اہلِ شہر کی مسلسل درخواستوں پر یا بر بادشاہ نے یہ حکم دیا ہے۔ میں اس سے انحراف کیونکر کر سکتا ہوں۔ جب شیخ مایوس ہوئے تو انہوں نے اہلِ شہر کے لئے امان طلب کی۔ کہا "ہاں! اگر وہ میرے مقابلے میں نہ نکلے تو میں اُن سے تعرّض نہ کروں گا۔ اس کے بعد شیخ تو بدیں چلے گئے اور مرزا منزل بہ منزل مارا مار کرتا اُچ آ پہنچا۔

ارغون اُچ میں

شاہ حسین ارغون کی جب آمد آمد ہوئی تو مخدوم سیّد عبد القادر ثانی جیلانیؒ نے اُچ سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا اور اہلِ شہر کے لئے امان طلب کی۔ مرزا نے کہا کہ اُچ اور اہلِ اُچ کو اس شرط پر امان دی جا سکتی ہے کہ آپ ملتان کی مہم میں ہمارا ساتھ دیں۔ آپ نے مرزا کی درخواست قبول کر لی اور اس کے ہمراہ ملتان جانے کو تیار ہو گئے۔ مرزا نے وعدہ ایفا کیا۔ اور اُچ سے باہر باہر عازمِ ملتان ہوا۔ اس طرح اہلِ شہر لشکر کی تاخت و تاراج سے بچ گئے۔

ملتان شہر کا محاصرہ

مرزا نے ملتان پہنچتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان حسین خان ثانی لنگاہ نے اپنے ایک بھائی کو شیخ شجاع الملک بخاری وزیر اعظم کے ہمراہ مرزا کی خدمت میں بھیج کر اطاعت کا اظہار کیا۔ مرزا نے شہزادے کی بڑی عزت کی اور فرمایا کہ تم اپنے بھائی سے کہو کہ وہ قلعہ سے باہر

نکل کر ہماری ملاقات کرے۔ ہم اسے پند و نصیحت کر کے واپس لوٹ جائیں گے۔ اور یہ ریاست اسے واپس کر دیں گے۔ جب شہزادے نے یہ پیغام اندر جا کر سنایا، تو لنگاہوں نے سلطان کو باہر بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ قلعے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے، اور مرزا کے لشکر سے سخت جنگ کی۔ مرزا نے بھی غصے میں آ کر تیر و تفنگ کا ایسا مینہہ برسایا کہ لنگاہوں کو قلعے میں سر چھپا کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ شہر میں قحط پڑ گیا۔ یہاں تک کہ گائے کی سری دس ٹنکہ کو اور ایک من گندم سو ٹنکہ کو فروخت ہونے لگی۔

لنگاہوں کا قتل عام

الغرض ۱۰ ربیع الاول ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں ارغون کے بہادروں نے ایک فیصلہ کن حملہ کر کے لوہاری دروازہ توڑ دیا اور شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار شروع کر دی۔ سات سال سے ستر سال کی عمر تک کے آدمی قید کر لئے گئے۔ لیکن جو لوگ حضرت شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریا اور مخدوم شیخ محمد یوسف گردیزی رضوان اللہ علیہم کی خانقاہوں میں پناہ لے گئے محفوظ رہے۔ حضرت مخدوم بہاء الدین قریشی علیہ الرحمۃ کو اطلاع ملی کہ لنگاہ خاندان مع مال و اسباب اور خزانہ حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے مقبرے میں چھپا بیٹھا ہے۔ اور محب خاں ترخان فوج کا ایک دستہ لئے انہیں نکالنے جا رہا ہے۔ حضرت فوراً موقع پر پہنچے اور محب خاں کو حملہ کرنے سے روک دیا۔ شاہ حسین سے پناہ گزینوں کے لئے سفارش کی۔

اس نے کہا۔ حضرت! یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں اور پھر تمام خزانہ اور سامان اندر چھپائے بیٹھے ہیں۔ اگر وہ تمام مال و اسباب اور خزانہ دے دیں تو آپ کی رعایت سے انہیں معافی دے دوں گا۔ اس پر حضرت مطمئن ہو گئے۔ آپ کو

یقین تھا کہ لنگاہ مال و اسباب کو اپنے اوپر سے تصدق کر کے پھینک دیں گے لیکن افسوس کہ انہوں نے مال و دولت دینا گوارا نہ کیا اور مقبرہ کی قلعہ نما فصیل کو مضبوط کر کے ڈٹ گئے۔

محب ترخان نے بلطائف الحیل لنگاہوں کو مقبرے سے نکالنے کی کوشش کی۔ اور جب اس طرح کامیابی نہ ہوئی تو اس نے منجنیقوں کے ذریعے احاطۂ خانقاہ میں نواڑ اور بوریوں کو تیل میں تر کر کے اور ان میں آگ لگا کر پھینکنا شروع کیا۔[۱] جب لنگاہوں کے سامان کو آگ لگی تو مقبرے میں کہرام برپا ہو گیا۔ کسی نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا، جس سے مغل اندر گھس گئے۔ اور انہوں نے پناہ گزینوں سے کہا کہ وہ اپنی تلاشی دے دیں، انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ لیکن لنگاہوں نے لڑنے مرنے کے لئے تلواریں سونت لیں۔ جس سے خانقاہ کے احاطہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بے شمار لنگاہ قتل ہوئے، اور جو بچے اسیر کر لئے گئے۔ اور اب جو سامان کا جائزہ لیا تو جواہرات کی چمک دمک اور زرق برق کے پارچات کی بھڑک سے مغلوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ محب خاں نے تمام مال و اسباب، دربار عام میں لے جا کر بادشاہ کے آگے ڈھیر لگا دیا۔ اس میں نفیس جواہرات بھی تھے، اور سونا چاندی کے انبار بھی قیمتی پارچات کے اتنے صندوق پیش ہوئے کہ شاہ حسین حیران رہ گیا۔ اب شاہ حسین کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اس نے عفو عام کا اعلان کر کے شہر میں امن قائم

[۱] حضرت قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے کے اندرونی حصے کا جو چوبی سامان اس آتشبازی میں جل اٹھا تھا۔ وہ اسی حالت میں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ محراب اور دروازوں پر اس آتش زنی کے نشانات موجود ہیں۔

کرا دیا۔ شہر اور قلعہ میں جگہ جگہ لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ حکم دیا کہ انہیں اٹھا کر غاروں اور کھڈوں میں دفن کر دیا جائے، اور آئندہ کوئی شخص کسی کے مزاحم نہ ہو۔

سلطان حسین خاں لنگاہ اپنی ہمشیرہ سمیت حضرت مخدوم بہاء الدین سجادہ نشین بارگاہِ غوثیہ کے محل میں جا کر پناہ گزیں ہوا تھا۔ ہر طرف اس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔ اور وہ بیچارے سہمے جاتے تھے۔ حضرت نے انہیں تسلی دی، اور مرزا سے کہلا بھیجا کہ فاتح سلاطین مغلوب سلاطین سے ہمیشہ اچھے سلوک سے پیش آئے ہیں۔ اگر آپ بھی اس کمسن اور یتیم سلطان کو جان کی امان دے سکیں تو میں انہیں پیش کر دوں۔ ورنہ وہ میرے ہاں آ کر پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ میں ان کی ہر قیمت پر حفاظت کروں گا۔

شاہ حسین نے جواب میں یقین دلایا کہ مجھے حضرت کی سفارش کا احترام ہے انہیں کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔

حضرت سلطان حسین اور اس کی ہمشیرہ کو محل سرائے سلطانی میں مرزا کے پاس لے گئے۔ خدا کی قدرت، جہاں چند یوم پہلے سلطان حسین خاں بیٹھ کر حکم چلایا کرتا تھا۔ اب وہاں شاہ حسین ارغون کا طوطی بول رہا تھا۔ محل کی ہر چیز پرائی نظر آتی تھی۔ سلطان ہزاروں تفکرات کے ساتھ شاہ حسین کے سامنے پیش ہوا! بادشاہ نے ان پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ اس وقت اتفاق سے اس کا مشہور سردار مسکین ترخان پاس بیٹھا تھا۔ مرزا نے ان دونوں کو اس کے حوالے کر کے سفارش کی کہ ان کی بیش اولاد کی تربیت کرنا[1]۔ مسکین خاں نے شہزادی سے تو شادی کر لی اور سلطان

[1] "دختر و پسر سلطان محمود را بمسکین ترخان دادہ تا ہر دو را بہ پیوند جگری دفرزندی مختص سازد۔" (تحفۃ الکرام)

کو اپنا فرزند بنا لیا۔ لیکن سلطان اس ذلت کی تاب نہ لا سکا اور چند سالوں کے اندر ملکِ عدم کو رخصت ہو گیا۔

لنگاہوں کے عہد پر ایک نظر

لنگاہ غاصبانہ حیثیت سے اس ملک کے مالک بنے تھے۔ لیکن جب ان کا تسلط قائم ہو گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو نہایت مدبّر اور منتظم ثابت کیا۔ سلطان قطب الدین اور سلطان حسین خان اوّل میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جو کامیاب سلاطین میں ہونا ضروری ہیں۔ انہوں نے اپنے اخلاق سے رعایا کا دل موہ لیا تھا۔ اور وہ لوگ جو انہیں غاصب اور اپنا دشمن سمجھتے تھے بہت جلد ان پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔

سلطان حسین خاں نے کالاباغ سے بکھر تک بلوچوں کی بفر سٹیٹ قائم کر دی تھی۔ جس سے وہ نہ صرف مغربی حملوں سے محفوظ ہو گیا تھا بلکہ ایک ایسی شجاع اور بہادر قوم اس کے ہاتھ آگئی تھی جو ضرورت کے وقت سینہ سپر ہو جاتی تھی۔ اور یہ قوم لنگاہوں کے آخر عہد تک مخلص اور وفادار رہی ہم دیکھتے ہیں کہ جب محمود خاں لنگاہ مرزا سے ٹکر لینے کے لئے ملتان سے روانہ ہوا ہے اسّی ہزار تیغ زن کا لشکرِ جرار اس کے جلو میں تھا۔ اور اُن میں زیادہ تر رِند، جت کورائی، دودائی اور چانڈیہ بلوچ تھے۔ افسوس ہے کہ اس خاندان میں سلطان حسین خاں اوّل جیسا پھر کوئی مدبّر پیدا نہ ہوا، اور لنگاہ امرا نے اپنے فرض کا احساس نہ کیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ عیّاش تھے، بلکہ انہوں نے ظلم اور طغیان کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ دن دہاڑے راہ چلتوں کو قتل کر دینا ان کا عام شیوہ تھا۔ ساتھ ہی ان کے دماغ میں کبر و نخوت کی ہوا بھر گئی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یہ

خاندان جس سرعت سے اُبھرا تھا، اُتنا جلد فنا ہو گیا۔ یہاں تک کہ سلطان حسین خاں کا فلک بوس مقبرہ بھی مولراج کے زمانے میں بارود سے اڑ گیا۔ اس میں تمام اکابر لنگاہ دفن تھے۔ آج ملتان اپنے وسیع و عریض قبرستانوں کے باوجود اس خاندان کی قبریں تک دکھانے سے قاصر ہے۔

علماء اور مشائخ کی ملتان سے مہاجرت

لنگاہ سلطنت کی ابتدا جس طرح علماء، مشائخ، تجار اور صنعت کاروں کی مہاجرت سے ہوئی تھی۔ اس کا انجام بھی اسی نہج پر ہوا۔ مولانا فتح اللہ علیہ الرحمۃ کا خاندان قدیم سے اس شہر میں آباد تھا۔ جب لشکر ارغونیہ نے ملتان کے قلعے کو فتح کیا تو ایک دستہ فوج کا مولانا کے گھر میں بھی گھس گیا۔ مکان کے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر انہوں نے اسے کسی امیر کا محل تصور کر لیا اور علامہ فتح اللہ کے معمر فرزند علامہ ابراہیم جامعی کو جنہوں نے عنفوانِ شباب سے پنیسٹھ سال تک مسندِ فیض رسانی پر بیٹھ کر قسم قسم کے علوم طلبا، کو از بر کرائے تھے، گرفتار کر کے قید خانے میں لے گئے۔ اور دولت حاصل کرنے کے لئے ان کی اہانت شروع کی۔ ان کے بعد مرزا اسعد اللہ کو جو اُن کے جوان سال فاضل صاحبزادے تھے، گرفتار کر کے وزیر کے پاس لے گئے اور اس کے حکم سے وزیر کے چوبیں تخت سے مضبوط باندھ دیا گیا۔ مرزا فرماتے ہیں کہ:-

"اُس وقت میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے باپ کو یاد کر کے زار زار رو رہا تھا، اور وفورِ گریہ سے اشکِ مسلسل میری آنکھوں سے جاری تھے، تھوڑی دیر بعد وزیر نے قلمدان طلب کیا اور قلم درست کر کے کچھ لکھنا

چاہتا تھا۔ اُس وقت میرے دل میں خیال گزرا کہ اگر یہ وزیر تجدیدِ وضو کے بعد لکھنے بیٹھے تو بہتر ہوگا۔ خدا کی قدرت کہ وہ اُٹھ کر صحت خانہ میں داخل ہُوا۔ اور کوئی شخص وہاں موجود نہ تھا۔ میں تخت کے قریب پہنچا۔ اور ایک کاغذ پر جو وزیر نے لکھنے کے لئے اپنی خابئں سے نکالا تھا۔ قصیدہ بُردہ کا یہ شعر لکھ کر اپنی جگہ آبیٹھا

فما یغبنیك ان قلت اکففا بهما
وما تصلبك ان قلت اشفق بهم

تجدید وضو کے بعد وزیر موصوف اپنی مسند پر آ بیٹھا، اور اس کاغذ پہ لکھنے کا کچھ ارادہ کیا۔ جب اس بیت کو لکھا پایا تو مکان کی اطراف میں گھُور گھُور کر دیکھنے لگا۔ اور جب میرے سوا اُسے اور کوئی نظر نہ آیا تو مجھ سے متوجہ ہو کر پوچھا کہ "کیا یہ شعر تُو نے لکھا ہے ؟"

میں نے کہا۔ "ہاں !"

میں نے اپنی اور اپنے باپ کی سرگزشت بیان کی۔ جوں ہی اُس نے میرے باپ کا نام سُنا، فوراً اُٹھا اور اپنے ہاتھ سے زنجیر میرے پاؤں سے نکالی اور اپنا پیراہن مجھے پہنایا۔ اُسی وقت سوار ہُوا اور مجھے اپنے ہمراہ شاہ حسین ارغون کے دیوان خانہ میں لے گیا۔ اور مجھے پیش کر کے میرے باپ کا حال عرض کیا۔ میرزا نے فوراً میرے باپ کو طلب کیا۔ جب میرے والد مرزا کے سامنے آئے۔ اتفاق سے اُس وقت میرزا کی مجلس میں ہدایہ کے کسی عنوان پر بحث جاری تھی۔ میرزا کے حکم سے مجھے اور والد بزرگوار کو خلعت عطا ہوئے۔ اور میرے والد نے پریشانی اور تفکرات کے باوجود فقہ کا مسئلہ اس عمدگی سے پیش کیا کہ حاضرینِ دربار عش عش کر اُٹھے۔ اور چاروں طرف سے

تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگے۔
میرزا نے اُسی وقت خزانچی کو حکم دیا کہ "مولانا کا جو کچھ نقصان ہُوا ہے فوراً پورا کرو، اور جو چیز میسّر نہ آئے اس کی قیمت سرکار سے ادا کی جائے۔" یہ کہہ کر میرے باپ کو اپنی مصاحبت میں سندھ چلنے کے لئے کہا۔ والدِ بزرگوار نے فرمایا کہ حیاتِ مستعار کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب وقتِ سفرِ آخرت ہے، نہ وقتِ مصاحبت۔ انجام کار وہی ہُوا جو فرمایا تھا، اور آپ اس واقعہ کے دو ماہ بعد اعلیٰ علیّین کو رخصت ہو گئے۔"
مرزا سعد اللہ کی آپ بیتی ختم ہوئی۔
مولانا ابراہیم الجامعی، مولانا فتح اللہ الملتانی علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے تھے۔ ان کی وفات پر مرزا سعد اللہ تو لاہور چلے گئے اور سعد اللہ لاہوری مشہور ہوئے۔ یہاں اُنہوں نے بہت بڑا مدرسہ قائم کیا۔ جس سے ہزاروں طلباء فیضیاب ہوئے تھے۔
دُوسرے صاحبزادے ابوالفتح شمس الدین محمد تھے۔ یہ احمد آباد بیدر تشریف لے گئے اور علم و فضل اور زہد و ورع کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ ہمایوں شاہ بہمنی کے زمانہ میں بعمر ۷۳ سال فوت ہوئے۔ ان کا مقبرہ بیدر میں ہے۔
مولانا شمس الدین کے چار بیٹے تھے، اور چاروں آسمانِ علم و ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ان کے ایک صاحبزادے مولانا ابراہیم نے معدن الجواہر نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اور اس میں والدِ بزرگوار کے حالات درج کئے۔ یہ خاندان بیدر میں بڑا پھلا پھولا، اور اس نے خلقِ خدا کو صراط المستقیم ___ اور سبیل الرشاد پر چلانے میں بڑا کام کیا۔

مولانا الہ داد سلطان پوری

مولانا الہ داد کا خاندان صدیوں سے ملتان میں آباد تھا۔ آپ کا شمار علمائے کبار میں سے ہوتا تھا۔ ارغون کے حملے میں سلطان پور منتقل ہو گئے۔ عمر بھر وہیں رہے، اور سلطان پوری مشہور رہوئے۔ آپ نے فلسفہ کی کتابیں سید میر شریف اور زین الدین علی جرجانیؒ سے پڑھی تھیں۔

مولانا برہان الدین ملتانیؒ

مولانا حنفی عالم تھے۔ فقہ اور عربی ادب میں خاص مقام رکھتے تھے۔ جب ملتان پر افتاد پڑی تو جھالاور کو منتقل ہو گئے۔ اور درس تدریس کا سلسلہ قائم کیا۔ شیخ عبداللہ بن بہلول گجراتی نے آپ سے عربی ادب اور تفسیر کی کتابیں پڑھیں اور اپنے ہمراہ اُستاذِ مکرم کو گجرات لے گئے۔

مولانا معزّ الدین محمدؒ

مولانا معزّ الدین محمد ملتان کے مسلّمہ مفتی، اپنے مدرسہ کے صدر الصدور اور مہتمم تھے۔ مؤلف مقاماتِ داؤدی نے اس مدرسے کی بڑی تعریف کی ہے۔ لکھتا ہے کہ

"جس وقت مدرسہ معز الدین محمد ملتان میں مرجع طالبانِ علم بنا ہوا تھا۔ سیّد فتح اللہ شاہ (شاہ داؤد کرمانی کے والد) ۹۲۰ھ کر اس میں داخل ہوئے اور اکثر مطالب و فوائد ان کے دستخطوں سے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔"

مولانا ارغونی حملے میں ملتان سے بجانب دیپال پور ہجرت فرما گئے اور ساتھ ہی ان کا مشہور عالم مدرسہ بھی دم توڑ گیا۔

مولانا عزیز اللہ الملتانیؒ

ایک اور عالم ربانی اسی نام کے خاص ملتان شہر کے باشندے تھے۔ حضرت

مخدوم العلماء شیخ فتح اللہ الملتانی کے شاگرد اور ان کے صاحبزادے علامہ ابراہیم الجماعی کے ہمدرس تھے۔ بعض حضرات نے مولانا عزیز اللہ تلمبی اور انہیں فرد واحد سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ مولانا عزیز اللہ تلمبی لنگاہوں کے ابتدائی دور میں دہلی تشریف لے گئے تھے اور یہ بزرگوار سلطان محمود لنگاہ کے زمانے میں ملتان میں موجود تھے۔ جب آپ کے علم و فضل اور زہد و ورع کی شہرت بوئے گل کی طرح "شور" میں پہنچی تو اس شہر کے حاکم جام بایزید نے آپ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ شاہی مہمان خانے میں لے جا کر نعدام کہا کہ مولانا کے ہاتھ دھلوا کر مستعملہ پانی برکت کے لئے عمارت کے چاروں کونوں میں چھڑک دو۔ مولانا مدت تک شور میں رہے۔ پھر جام کے وزیر علامہ جمال الدین سے ناموافقت کی بنا پر شور سے چپکے سے نکلے اور ملتان آپہنچے[1]۔

مولانا عبدالرحمٰن ملتانیؒ

مولانا عزیز اللہ کے صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن بھی اس دور میں یگانۂ روزگار عالم تھے۔ ارغونی حملے میں والد کے ہمراہ ملتان کی سکونت ترک کر کے لاہور تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر باپ بیٹے نے علم و ادب کی شمعیں روشن کیں۔ دونوں بزرگوار علوم عقلیہ اور شرعیہ کا درس دیتے تھے۔ مولانا منور اور شیخ سعد اللہ ملتانی الاران جیسے بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ مولانا عزیز اللہ کے بعد مولانا عبدالرحمٰن لاہور میں خوب چمکے۔ جواہر اسمٰعیل کے مصنف شیخ منور عالم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ وہ مولانا عبدالرحمٰن کے شاگرد تھے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ :-

---

[1] نزہتہ الخواطر

"شیخ منور عالم بن شیخ عبد المجید بن شیخ عبد الشکور بن شیخ سلیمان لاہوری کو پانچویں واسطہ سے حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ سے فیض حاصل تھا۔ دوسری طرف شیخ منور کو مولانا عزیز اللہ کے فرزند مولانا عبد الرحمن ملتانی کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ شیخ منور عالم صورت وسیرت میں دلفریبی، زبان وبیان میں دلربائی بہت کچھ تھی۔ اپنے زمانہ کے علماء کے اجلاس میں اپنے حسن تقریر سے مناظرہ کو پیچیدگی اور الجھاؤ سے نکال کر تحقیق کے درجے میں پہنچا دیتے تھے۔"

مولانا منوّر اتنے متبحّر عالم تھے کہ اُن کے فضل وکمال کا سکّہ علامہ میر فتح اللہ شیرازی بھی مانتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ارغونی حملے نے ملتان کو کتنی عظیم علمی وادبی شخصیّتوں سے محروم کر دیا تھا۔

ملتان پر تین حاکموں کی حکومت

سلطان محمود خاں لنگاہ کے زمانے سے ہی ملتان کا نظم ونسق بگڑ چکا تھا۔ شاہ حسین خاں ثانی نے لنگاہوں کو اتنا سر چڑھایا کہ اُن کا ہر آدمی اپنے آپ کو ملتان کا بادشاہ سمجھنے لگا۔ ارغون کے حملے نے بچی کھچی کسر پوری کر دی۔ شاہ حسین ارغون نے روانہ ہوتے وقت اپنے تین امراء، دولت آخوند، خواجہ شمس الدین اور لنگر خاں بلوچ کو ملتان کے انتظام پر مقرر کیا تھا۔ خواجہ نے سید شجاع الملک بخاری کو خوب جھنجھوڑا اور اس کا تمام مال ومتاع لوٹ لیا۔ اسی طرح لنگاہ امراء کا بھی اچھی طرح سے صفایا کیا۔ گیارہ مہینے ملتان ان تین حاکموں کے نیچے دبا رہا۔ خواجہ تو اہلِ ملتان کا آپریشن کرتا رہا۔ مگر لنگر خاں خاموشی سے شہر کی مرمت، اور

اہلِ شہر کی دلجوئی میں مصروف رہا۔ لوگ خواجہ شمس الدین سے جتنا متنفر تھے لنگرخاں سے اس سے کئی گنا زیادہ محبت کرتے تھے۔ جب اس کا اہلِ شہر سے رابطہ بڑھ گیا، اور اس نے خاصی قوّت پیدا کرلی، تو ایک دن اس نے خواجہ شمس الدین کو نکال کر ملتان پر قبضہ کر لیا۔

نواب لنگرخاں بلوچ

سہ حاکمان کی افراتفری کے بعد نواب لنگرخان نے ملتان کا انتظام سنبھالا تو عوام نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو لوگ ارغونی مار دھاڑ میں ملتان چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر واپس آگئے۔ اور شہر کے کاروبار میں گویا جان پڑ گئی۔ ان دنوں اُوچ کی قادریہ مسند پر حضرت مخدوم سید عبدالقادر ثانی رونق افروز تھے۔ اگرچہ موصوف گوشہ نشین بزرگ تھے؛ اور امراء و رؤسا کے ہاں آنا جانا خاندانی روایات کے خلاف جانتے تھے، مگر اب ملتان شہر پہ نحوست وادبار کے دل بادل منڈلا رہے تھے۔ جن کا دفع کرنا آپ کا اہم فریضہ تھا۔ کیونکہ ملتان کی غالب آبادی آپ سے گہری عقیدت رکھتی تھی۔ جب بھی آپ ملتان تشریف لاتے، آپ کی آمد سے اس اُجڑے دیار کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ مساجد کی رونقیں بڑھ جاتی تھیں اور لوگوں کی دینداری میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا تھا۔

نواب لنگرخاں اور اس کی پوری قوم کو حضرت مخدوم سے دلی عقیدت تھی۔ لنگرخاں کی سیاسی پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی کہ وہ ملتان کا مطلق العنان حکمران بن بیٹھتا۔ وہ اپنے عرصۂ حکومت کو عبوری دور خیال کرتا تھا۔ اگرچہ لنگاہوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی، مگر بدرم سلطان بود کی کیفیت باقی تھی۔

میر جہان خاں لنگاہ کی بغاوت

میر جہان خاں لنگاہ کی اگرچہ لنگاہ حکمرانوں

سے بنی ہوئی نہ تھی۔ تاہم وہ بحیثیت لنگاہ ملتان پر اپنا حق فائق سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے نہ تو لنگر خاں بلوچ کی اطاعت قبول کی اور نہ ہی سرکاری مواجبات ادا کئے۔ چونکہ یہ شخص حضرت مخدوم ثانی رح کا مرید تھا۔ اس لئے لنگر خاں نے حضرت سے رجوع کیا۔ حضرت مخدوم رح نے میر جہان خاں اور اس کے حلیف سرداروں کو طلب کر کے ان دونوں کے درمیان صلح کرا دی۔ بایں ہمہ جہان خاں کا غبار خاطر اپنی جگہ سے نہ ہٹا، اور اس سے ایسی حرکتیں ظہور میں آئیں، جن سے بغاوت کی بُو آتی تھی۔ ایک مرتبہ نواب لنگر خاں کو پرچہ نویسوں کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ میر جہان خاں دریائے چناب کے ایک ٹاپو میں جمعیت اکٹھی کر رہا ہے اور ملتان پر شب خون مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چونکہ رائے سہرہ نے اسی طرح مخدوم یوسف سے حکومت چھینی تھی، اس لئے نواب لنگر خاں نے مختصر مگر رزم آزما لشکر کے ساتھ اس پر تاخت کی۔ جہان خاں کے ایک قریبی رشتہ دار حاجی خان کو اطلاع ہوئی تو وہ گھبرا کر حضرت مخدوم ثانی رح کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی پگڑی حضرت کے قدموں میں ڈال کر فریاد کی کہ حضرت ملتان کے قریب غافل بیٹھے ہیں اُدھر لنگر خاں لشکر لے کر جہان خاں کے سر پر پہنچ چکا ہے۔ حضرت مخدوم کو لنگر خاں کا یہ اقدام پسند نہ آیا۔ جبینِ اقدس پر تردد کے آثار ظاہر ہوئے۔ فوراً پانی منگوا کر وضو کیا اور حجرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے تو چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ فرمایا:۔

"میر حاجی خاں! غم نہ کرو، تسلی رکھو، جہان خاں کا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور لنگر خاں نادم ہو کر واپس لوٹ آئے گا۔"

آخر ایسا ہی ہوا۔ جب لنگر خاں کی کشتیاں جہان خاں کی قیام گاہ کے قریب پہنچیں تو

دلدل میں پھنس کر رہ گئیں۔ اور جہان خاں مطلع ہو کر فوراً اپنی کشتیوں کے ذریعے جان سلامت لے گیا۔ لنگر خاں بھی انجام کار بعد حسرت و یاس کشتیوں کو دلدل سے نکلوا کر ملتان لوٹ آیا۔

حاجی خاں لنگاہ کی گرفتاری

واپس آکر جب لنگر خاں کو پتہ چلا کہ حاجی خاں نے ہی اس کا بنا بنایا کھیل بگاڑا ہے تو اس نے اُسے کسی بہانے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ جب کافی عرصہ اس حالت میں گزر گیا اور قید خانے کی زندگی اس کے لئے عذاب جان بن گئی تو اس نے مخدوم ثانی رح علیہ الرحمۃ کو کہلا بھیجا کہ حضور توجہ فرمائیے۔ اب تو صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اسی اثنار میں ایک کوّا دیوار پر آبیٹھا، اور کائیں کائیں کرنے لگا۔ حضرت مخدوم ثانی رح نے اپنے ایک ملازم کو ارشاد کیا کہ میر حاجی سے کہو کہ یہ پرندہ کہتا ہے کہ تو عنقریب رہا ہو جائے گا۔ اسی دن لنگر خاں نے قید خانے سے حاجی خاں کو طلب کر کے خلعت پہنائی اور اعزاز و اکرام سے رخصت کیا۔

نواب لنگر خاں اگرچہ ملتان کا خود مختار حاکم تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ بابر اور ارغون کی موجودگی میں اس کی شمع دیر تک روشن نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اس نے ست گھرہ کے حاکم خانِ اعظم میر چاکر خاں رند سے مشورہ کیا۔ خانِ اعظم نے لکھا۔ بہتر ہے کہ ہم تم دونوں مل کر یہاں بلوچ سلطنت قائم کریں۔ میں آپ کو وزیر بنا لوں گا۔ اور اگر خدا نخواستہ یہ صورتِ حال آپ کے لئے قابلِ قبول نہ ہو تو پھر تم ملتان بابر کے حوالے کر دو۔ میں جانوں اور وہ جانے۔ لنگر خاں نے دوسری صورت کو پسند کیا اور وہ بابر کی خدمت میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ساون کے دن تھے، بڑے زور کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ ملتان سے لاہور

جانا ہفت خوانِ رستم طے کرنے سے کم نہیں تھا۔ اتفاق سے حضرت مخدوم ثانی قدس سرہٗ نے بھی لاہور جانے کا ارادہ فرمایا۔ نواب لنگر خاں بھی اپنے لشکر کے ہمراہ شریکِ سفر ہو گیا اور حضرت سے عرض کی۔ دُعا فرمائیں تاکہ راستے میں بارش کی وجہ سے لشکر کو کسی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حضرت مخدوم نے قلم دوات طلب کر کے ایک تعویذ تحریر فرمایا اور لنگر خاں کے حوالے کرتے ہوئے ارشاد کیا کہ پُورے قافلے میں منادی کرا دو کہ اس تعویذ سے قریب تر ہو کر چلیں۔ انشاء اللہ بادو باراں سے محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ دائیں بائیں بارش ہوتی رہی مگر لشکر اور قافلے پر ایک بوند تک نہ پڑی۔ یہاں تک کہ حضرت مخدوم اور نواب لنگر خاں لاہور پہنچ گئے[1]۔ یہاں مرزا کامران سے لنگر خاں نے اپنی پیشکش کا ذکر کیا اور پھر دہلی پہنچ کر بابر بادشاہ کے حضور باریاب ہُوا۔

بابر لنگر خاں کی اس پیشکش پر بہت خوش ہُوا۔ چونکہ پنجاب اور کابل اس نے مرزا کامران کو دے رکھے تھے۔ اس لئے ملتان بھی اسے عنایت کیا۔ مرزا محمد کامران نے ملتان کو تو اپنے مقبوضات میں شامل کیا اور لنگر خاں کو کابل کی صوبیداری مرحمت کی۔ مرزا نے سلاطینِ سلف کے قاعدے کے مطابق لنگر خاں کو لاہور میں آباد ہونے کی ہدایت کی۔ چنانچہ لنگر خاں اہل و عیال کو لاہور میں چھوڑ کر کابل کو روانہ ہو گیا۔

لاہور میں لنگر خاں کو جو وسیع رقبہ محلات تعمیر کرنے کے لئے عطا ہُوا تھا نواب مذکور نے اس قطعۂ ارضی میں اپنے لڑکوں اور عزیزوں کے لئے محلات تعمیر کرائے اور ان کے گرداگرد ایک محلہ آباد کیا۔ جس کے مکین زیادہ تر بلوچ تھے۔ یہ تمام آبادی گذر لنگر خاں کہلاتی تھی۔ لنگر خاں کے پیرِ طریقت سیّد محمد غوث بالا پیر علیہ الرحمۃ

---

[1] بحر السرائر

ست گھرہ میں رہتے تھے۔ لنگر خاں نے انھیں بھی لاہور میں قیام کرنے کی درخواست کی اور اپنے محل کے متصل ان کے لئے مکانات تعمیر کرائے۔ اس آبادی کو حضرت مخدوم نے رسول پور سے موسوم کیا[1]۔

سید محمد غوث رح لاہور اور ست گھرہ دونوں مقامات میں رہائش رکھتے تھے آپ نے ست گھرہ میں انتقال فرمایا، اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کے صاحبزادے سید عبدالوہاب کا مزار بھی آپ کے پہلو میں ہے۔ سید عبدالوہاب کے فرزند سید عبدالرزاق الملقب بہ شاہ چراغ رح نے مستقل طور پر لاہور میں سکونت اختیار فرمائی اور انتقال کے وقت یہیں دفن ہوئے۔ چنانچہ آپ کا مقبرہ ہائی کورٹ کی عمارت کے پہلو میں زیارت گاہِ خلائق ہے[2]۔

مخدوم سید عبدالرزاق جیلانی رح | حضرت مخدوم ثانی رح بعمر ۸۷ سال ۱۸ ربیع الاول ۹۴۰ھ کو بمقام اُچ عالم جاودانی کو رخصت ہوئے اور والدِ بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ کے صاحبزادے مخدوم سید

---

[1] نقوش، لاہور نمبر [2] لنگر خاں کے انتقال کے بعد اس کا خاندان سکھوں کی بر چھا گردی تک اس محلے میں بڑے طنطنے سے آباد رہا۔ سکھوں نے میر نصیر خاں نوری (خان آف قلات)، کے حملے کے بعد انتقام لینے کی غرض سے اس محلے پر ہلہ بول دیا۔ بلوچوں کو قتل و غارت کیا اور سونے چاندی کے لالچ میں محلات کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ انگریزوں نے اپنے عہد میں اس جگہ کو سپاٹ میدان بنا کر سرکاری عمارتیں تعمیر کرائیں۔ گویا ہائی کورٹ، اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر اور اسٹیٹ بنک کی عمارتیں بلوچوں کی ہڈیوں پر ایستادہ ہیں۔ یہ ساری جگہ وہی ہے جہاں نواب لنگر خاں نے اپنی قوم کے لئے محلہ آباد کیا تھا۔
(استفادہ از تحقیقات چشتی، تاریخ لاہور، از مسٹر لطیفی)

عبدالرزاق رح کسی ضروری کام کے لئے ناگور گئے ہوئے تھے۔ اپنے والد ماجد کے وصال کے وقت موصوف اپنے احباب کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ دفعتہً چہرۂ اقدس پر تردّد کے آثار ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ "ابّا حضور مجھے پکار رہے ہیں"[1] فوراً خدام کو کوچ کا حکم دیا۔ اوچ پہنچے تو حضرت مخدوم کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد ماجد کی وصیّت کے مطابق رونق آرائے مسندِ قادریہ ہوئے، مگر افسوس کہ عمر بہت کم پائی تھی، اور والد ماجد کے دو سال بعد ۵ رجمادی الآخر ۹۴۲ھ کو آپ بھی عالمِ قدس کو تشریف لے گئے۔

مخدوم سیّد حامد جہاں بخش رح

حضرت مخدوم سید عبدالرزاق رح کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے مخدوم سیّد حامد جہاں بخش رح صاحب سجّادہ ہوئے۔ حضرت کے علوِّ مرتبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ سید الاولیاء شاہ داؤد کرمانی اور مخدوم سیّد شیر شاہ جیسے فخرِ روزگار مشائخ آپ کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔ داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ خانقاہِ معلّٰی کی آمد بہت زیادہ تھی، سلاطینِ وقت کی طرف سے بھی معافیات اور جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ روزانہ ہزاروں روپے آتے اور سینکڑوں من اجناس کی صورت میں وصول ہوتے لیکن عمر بھر نصاب نامی کے مالک نہ بن سکے۔ جو آتا خدا کی راہ میں دے دیا جاتا۔ اپنے جدِ امجد مخدوم عبدالقادر ثانی رح کے مرید تھے۔ عظمت و جلال کی یہ کیفیت تھی کہ کسی کو آپ کے سامنے فقر و ولایت کے دعویٰ کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ جسے آپ حلقۂ ارادت میں داخل کرتے، برملا فرما دیتے، کہ تجھے دونوں جہانوں کی سلطنت کا مالک بنا دیا۔ آپ کی خدمت میں شاہ و گدا سب حاضر ہوتے اور مرادیں

---

[1] بحر السرائر

لے کر جاتے۔ کئی آپ کے جذب و جلال کے منتظر رہتے۔ اور خاص وقت میں حاضر ہو کر فیوضاتِ ظاہری و باطنی سے مالامال ہوتے۔

میر میراں۔ ملتان کا بلوچ گورنر

خانِ اعظم میر چاکر خاں رند بلوچ ست گھرہ میں بیٹھا، ملتان پر قبضہ کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اس کا ایک بیٹا میر میراں اوچ میں مقیم تھا۔ جو باپ کے نائب کی حیثیت سے بلوچ قبائل کے ساتھ رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ بڑا بہادر اور خوبرو نوجوان تھا۔ میر چاکر خاں اور ست گھرہ کے دوسرے سینکڑوں بلوچ سردار مخدوم سیّد محمد غوث بالا پیرؒ کے مرید تھے، جو سیّد زین العابدینؒ کے بیٹے اور مخدوم ثانی (سیّد عبدالقادر ثانیؒ) کے پوتے تھے۔ انہیں میر چاکر خاں منت سماجت کر کے ست گھرہ لے گئے تھے، اور وہاں انہیں خانقاہ تعمیر کرا دی تھی۔ حضرت مخدوم صبح کی نماز ست گھرہ کی جامع مسجد میں تشریف لا کر پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر غلام محمد خاں مرحوم (ست گھرہ) کی روایت کے بموجب بلوچوں کی ۱۲۰ پالکیاں مسجد کے دروازے پر اترتی تھیں۔ عوام کا تو شمار ہی نہ تھا۔ لیکن جو بلوچ کوٹ چاکر اُچ، اور ملتان کے گرد و پیش آباد تھے، یہ سب مخدوم سیّد حامد جہاں بخش کے مرید تھے، چنانچہ میر میراں بھی حضرتؒ سے ارادت رکھتا تھا۔

ملتان می فروشم کسے خریدار ہست؟

ایک مرتبہ جیلانی دربار کا ایک صاحبِ حال درویش میاں جادہ آدھی رات کے قریب دبے پاؤں حضرت مخدوم سید حامد جہاں بخش کے حجرۂ خاص میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ حضرتِ مخدوم پر غلبۂ احوال کی کیفیت طاری ہے، ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف جاتے اور زیرِ لب کچھ گنگنا رہے ہیں۔ شیخ جادہؒ

دست بستہ حجرے کے ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ حضرت کی نظر پڑی تو فرمایا۔ "جادہ! ملتان می فروشم کسے خریدار ہست؟" (ملتان بیچتا ہوں کوئی خریدار ہے؟) شیخ جادہ نے سوچا کہ یہ وقت قبولیت کا ہے۔ کیا عجب کہ کسی خوش نصیب کی قسمت چمکنے والی ہو۔ اس وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ سردار میر میراں بلوچ سے اس کی اچھی بنی ہوئی تھی۔ چپ چاپ حجرے سے نکلا اور بے تحاشا ہانپتا کانپتا میر میراں کے دروازے پر پہنچا اور چلّا کر کہا۔ "میر میراں! جلدی باہر آؤ!"

میر میراں گھبرا کر باہر نکلا اور پوچھا۔ "خیر تو ہے، آدھی رات کے وقت کیسے آئے؟"

کہا۔ "فوراً حضرت مخدوم کے ہاں پہنچو، کیونکہ یہ جہان بخشی کا وقت ہے جو زبان سے نکلے گا وہی ہو کر رہے گا!" اور پھر تمام صورتِ حال اس کے سامنے رکھی۔

میر میراں نے فوراً ایک طبق مٹھائی سے بھر کر ساتھ لیا اور حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ابھی تک شیخ پر وہی کیفیت طاری تھی۔ میر میراں چپ چاپ حجرے کے گوشے میں کھڑا ہو گیا کہ دیکھیے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

شیخؒ نے فرمایا "کون ہے؟"

عرض کی "آپ کا غلام!"

فرمایا "آگے بڑھ!"

میر میراں نے آگے بڑھ کر اپنا سر شیخ کے قدموں میں ڈال دیا، اور نیاز پیش کی۔ ارشاد ہوا۔ "میر میراں! تو نے سستے داموں ملتان خرید لیا ہے۔ جاؤ تم ملتان کے بالاستقلال حاکم ہو گئے[1]!"

[1] بحر السرائر

حضرت کے اس ارشاد فیض بنیاد کو چند یوم ہی گزرے تھے کہ نواب میر میراں ملتان کے صوبیدار قرار پائے۔ واقعات اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء میں لنگر خاں کے جانے پر جونہی ملتان مرزا کامران کے قبضۂ اقتدار میں آیا، میر چاکر خاں نے بلاتوقف حملہ کر کے مرزا کے نائب کو مار بھگایا۔ ملتان پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا اور اپنے بیٹے میر میراں کو اپنی طرف سے اس صوبے کا گورنر مقرر کیا۔

ملا سعد اللہ قادری لکھتے ہیں کہ نواب میر میراں نے برسرِ اقتدار آتے ہی مخدوم سید حامد جہاں بخش علیہ الرحمۃ کو تقریباً نوّے[۹۰] ہزار بیگھہ اراضی اخراجاتِ لنگر کے لیے نذر کی۔ بعض کہتے ہیں کہ اراضی چوراسی[۸۴] ہزار بیگھے تھی۔ نقد روپیہ علاوہ تھا۔ ملا سعد اللہ کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"پس از مرورِ ایامِ معدود چناں شد کہ حضرتش فرمودہ بود تمام ولایتِ ملتان در تحت تصرف و حکومت او شد و مواضع اوقاف اراضی و نقود قریب نود ہزار بیگھہ و اشہر ہشتاد و چہار ہزار بیگھہ در تصرف ملازمان حضرت شیخ شد"[۵]

یہ اراضی حضرت مخدوم کے نام کی نسبت سے حامد پور مشہور ہوئی۔ سوری اور مغل سلاطین نے بھی اس اراضی کو جیلانی مخادیم کے نام پر بحال رکھا۔ اس کی تصدیق اکبر اعظم کے اس فرمان سے ہوتی ہے۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ:۔

"مقام آچ بشیخ موسیٰ تعلق داشتہ باشد و شیخ عبدالقادرؒ در حامد پور اقامت نماید۔"

اب بھی موضع حامد پور گیلانی حضرات کے تصرف اور ملکیت میں ہے۔

۵؎ بحر السرائر ص ۱۷۰، ۱۷۱ قلمی

سنہ ۹۳۴ھ سے سنہ ۹۴۸ھ

ملتان میں بلوچ ریاست کا قیام

جن ایام میں خانِ اعظم میر چاکر خاں رند نے ملتان پر قبضہ کیا تھا۔ بابر صوبہ بہار کی مہمات میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ ادھر متوجہ نہ ہو سکا۔ اور چاکر خان کو چودہ برس تک ریاست ملتان پر حکومت کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ خافی خاں لکھتا ہے کہ

"انہی دنوں صوبہ بہار سے سلطان محمود کی بغاوت اور ملتان میں بلوچوں کی فتنہ انگیزی کی خبریں ملیں، بابر نے ملتان کے فتنہ پر شرقی علاقے کی بغاوت کو مقدم جانا کیونکہ اُس طرف ہر سال اور ہر ماہ فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ بادشاہ نے ولایت بہار کی طرف کُوچ کا حکم دے دیا۔"[1]

خانِ اعظم میر چاکر خاں بلوچوں کا بیباک، نڈر، بہادر اور اولوالعزم جرنیل تھا۔ اس کی ہمت مردانہ کے آگے لنگاہ سلطنت کی کیا بساط تھی۔ وہ ملتان فتح کرنے کے بعد آگے دہلی کی جانب بڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر جن سرباز رفیقوں نے رند لاشار جنگ میں مردانگی کے جوہر دکھائے تھے، وہ آگے چلنے پر رضامند نہ ہوئے[2] خانِ اعظم میر چاکر خاں کے اپنے چچازاد بھائی میر ابراہیم خاں اور میر محمد خاں اس معاملے میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے واپس بلوچستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کچھی کے ارادہ سے وزیری کے مقام سے آگے بڑھے اور محمد واہ میں پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے۔ اور در پردہ خانِ اعظم کے فوجی افسروں کو اپنے ہمراہ واپس بلوچستان چلنے کی دعوت دینے لگے۔

---

[1] منتخب اللباب (اردو)، [2] تاریخ بلوچستان از رائے بہادر ہتو رام

خانِ اعظم کو عم زادگان کے تازہ ارادوں کا پتہ چلا، تو وہ بہت برہم ہوئے۔ اور گرج کر کہا، کوئی ہے جو محمد واہ پہنچ کر ان باغیوں کو قرار واقعی سزا دے؟ لیکن اس وقت میر محمد خاں وغیرہ کی عسکری قوّت اتنی بڑھ چکی تھی کہ کسی نے اس مہم پر جانے کا بیڑہ نہ اُٹھایا۔ انجام کار دو دوائی بہادر تیار ہو گئے۔ انہوں نے محمد واہ پہنچ کر میر محمد خاں وغیرہ سے شدید جنگ کی جس میں میر محمد خاں اور میر بشیر خاں جو میر ابراہیم خاں کا بہادر بیٹا تھا قتل ہو گئے۔ نیز محمد ابراہیم خاں بھی زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا۔ میرو خاں پسر میر محمد خاں اور میر آدم خاں پسر میر ابراہیم خاں کو کوہِ سلیمان کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔

خانِ اعظم کو اپنے عم زادگان کے قتل کا علم ہوا تو وہ سخت نادم ہوئے دو دوائیوں کو طلب کر کے سخت سرزنش کی کہ تم نے میرے بھائیوں کو کیوں قتل کیا انہوں نے کہا کہ آپ کا ہی حکم تھا۔ خانِ اعظم نے فرمایا میں نے تو کہا تھا کہ انہیں خوف دلاؤ، انہیں منتشر کر دو، ان کی طاقت توڑ دو، نہ کہ انہیں قتل کر دو۔ خانِ اعظم غصہ سے بے قابو ہو گئے۔ چونکہ میر محمد خان کی لڑائی میں ستر[1] افراد قتل ہوئے تھے۔ ان کے بدلے ستر[1] دو دوائی تہِ تیغ کرا دیئے۔ کچھ عرصہ خانِ اعظم میر چاکر خاں نے ملتان میں قیام کیا۔ اور پھر اپنے بیٹے میرن خاں بلوچ کو ملتان کا نظم و نسق سپرد کر کے ست گھرہ کی طرف روانہ ہو گیا[1]۔ افسوس ہے کہ اب اُن کی عسکری طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ بلوچ بہادروں کا وہ عظیم لشکر جو سبی سے سیلاب کی طرح پانچ دریاؤں کی سرزمین کی طرف بڑھا تھا اس وقت کئی ٹکڑیوں میں بٹ چکا تھا۔ میر ہیبتان اور میر بجار پھر جو بلاشبہ میر چاکر خاں کے دست و بازو تھے میر محمد خاں وغیرہ کے قتل کے واقعہ

---

[1] و [2] دامن ڈوسکی کا تاریخی پس منظر

سے مشتعل ہو کر خانِ اعظم سے الگ ہو چکے تھے۔

خانِ اعظم نے میر بجار کو رام کرنے کی ہر چند کوشش کی، مگر اس کے غیظ و غضب کا وہی عالم رہا اور اس نے کہلا بھیجا کہ جو اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتا ہے، وہ میرا بھی کسی وقت خاتمہ کر سکتا ہے۔ اب میرا آپ کے ساتھ کسی صورت نباہ نہیں ہو سکتا۔ میر چاکر خاں نے یہ پیغام سن کر فرمایا کہ "بجار مری ہے، اسے زیادہ مجبور نہ کرو"۔ اس دن سے "بجار مری" مشہور ہو گیا۔ اور اس کی قوم بھی اسی نام سے موسوم ہوئی۔ مری بلوچی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں "جٹ" یعنی بجار جٹ ہے۔ دوسرے لفظوں میں "ضدی آدمی ہے"۔[1]

خانِ اعظم تن بہ تقدیر آگے بڑھے۔ ابھی ملتان کے مضافات میں ہی تھے کہ نواب حاجی خاں فرمانروائے ڈیرہ غازی خاں کا قاصد خط لے کر حاضر ہوا۔ جس میں اس نے ان حملہ آوروں کا ذکر کیا جو میر ہیبتان کی سرکردگی میں ڈیرہ تک بڑھ آئے تھے۔ خانِ اعظم نے ہیبتان کو پیغام بھیجا کہ خدا کا ملک وسیع ہے اگر ہمارے ساتھ موافقت نہیں کر سکتے تو کسی اور طرف نکل جاؤ لیکن اپنے بھائیوں کو تنگ نہ کرو۔ مگر ہیبتان کا تو اس چھیڑ چھاڑ سے مقصد ہی خانِ اعظم کے راستے میں کانٹے بکھیرنا تھا۔ اس نے میر چاکر خاں کے پیغام سے کوئی اثر قبول نہ کیا اور بڑی شدت سے دودائیوں پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔

میر ہیبتان کی وحشیانہ حرکتیں

خانِ اعظم تلمبہ میں خیمہ زن تھے کہ انہیں میر ہیبتان کے حملوں کی اطلاع ملی۔ انہوں نے امرائے دربار کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ کوئی ایسا ہے جو واپس جا کر میر ہیبتان کی گوشمالی کرے۔ رند ائیوں کے سردار میر باطل خاں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں

اپنے قبائل کو واپس لے جاکر اس سے جنگ کروں گا۔

خانِ اعظم میر باطل خاں کی جرأت و بسالت پر خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے بیٹے میر شہک اور میر بجار نامی ایک سردار کو جو رند و لاشار کی جنگ میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا، اس کے ہمراہ کر دیا۔

دریائے سندھ کو عبور کر کے دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں، میر ہیبتان نے شدید حملہ کر کے باطل خاں کی فوج کو منتشر کر دیا۔ میر بجار خاں اور میر شہک مارے گئے۔ ہیبتان نے اس موقع پر ایسی درندگی کا مظاہرہ کیا کہ جب تک دنیا قائم ہے لوگ اس پر لعنتیں بھیجتے رہیں گے۔ اس نے خانِ اعظم کے حسین و جمیل شہزادے میر شہک (اسحٰق) کی لاش منگوائی اور اس کے سینے کا گوشت کاٹ کر کباب بنایا۔ اسی طرح اس نے میر بجار خاں کی لمبی ڈاڑھی کی چنوری بنائی۔ لیکن اس حرکت کے بعد وہ بھی انتقام سے خوفزدہ رہنے لگا۔ اُس نے اپنی لمبی ڈاڑھی اس خیال سے منڈوا ڈالی کہ کہیں اس سے بھی وہ سلوک نہ ہو، جو وہ خود میر بجار سے کر چکا ہے۔

بیٹے کا انتقام

خانِ اعظم دیپالپور کے قریب پہنچ چکا تھا کہ اُسے اِس وحشت ناک واقعہ کی خبر ملی۔ اُس نے آگے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ خانِ اعظم نے فوراً اپنی تلوار بے نیام کر لی اور انتقام! انتقام! کا نعرہ بلند کیا۔ وہ قشونِ قاہرہ کے ساتھ بگولے کی طرح سندھ کے کنارے آ پہنچا اور دریا عبور کرنے کے بعد پوری شدت سے ہیبتان پر ٹوٹ پڑا۔ گھمسان کا رَن پڑا مگر کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ کیونکہ دُشمن بھی پُوری طرح سے تیار تھا۔ آخر کار خانِ اعظم نے ایک جنگی چال کے تحت اپنی فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جسے ہیبتان نے

خانِ اعظم کی عام پسپائی پر محمول کیا۔ سرکنڈوں کے جنگل میں خانِ اعظم کا نامور جرنیل میر شاہنواز خاں مزاری چھ ہزار سواروں کے ہمراہ دُشمن کی گھات میں تھا۔ جب ہیبتان کا لشکر صفیں توڑ کر آگے بڑھا تو میر شاہنواز خاں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ادھر خانِ اعظم نے جوابی حملہ کیا۔ جس پر ہیبتان کا لشکر تباہ ہو کر بھاگ گیا۔ ہیبتان جان بچانے کے لیے پہاڑ کی طرف بھاگا مگر کسی غار میں گر کر مر گیا۔ ایک سرگانی مزاری جو اس کے تعاقب میں تھا، غار میں اُترا اور اس کا سر کاٹ کر خانِ اعظم کے پاس لے آیا۔ خانِ اعظم نے کہا:

"اے جوان! تُو نے کیا کیا کہ اس کی لاش کو وہیں چھوڑ آیا۔ جب سے شہک کی پسلیوں کے کباب بننے کی خبر سُنی ہے، میری ایک ایک پسلی کباب بن رہی ہے۔ اچھا، اس کا سر توڑ کر کھوپڑی آگے لاؤ!"

خدام نے فوراً سر توڑ کر پیالہ نما کھوپڑی آگے بڑھائی۔ خانِ اعظم کی آنکھیں جوشِ انتقام سے شعلۂ جوالہ بن رہی تھیں۔ اس نے کھوپڑی میں پانی ڈال کر چند گھونٹ نوش جان کیے اور پھر کھوپڑی باہر پھینک دی[1]۔

خانِ اعظم اپنے فرزندِ دلبند اور پُرانے رفیقِ کار کے خون اور اہانت کا بدلہ لینے کے بعد دوبارہ دہلی کی طرف بڑھا۔ اس بار میر بجار پھر سنگِ راہ بن گیا۔ میر حاجی خاں نے لکھا کہ میر بجار نے کوہِ سلیمان کے بلوچوں کی مدد سے میرے ملک کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی جمعیت کافی ہے اور میں تن تنہا اس کا

[1] خان عبدالقادر خاں لغاری ایم ایس سی نے اپنے مقالے میں ہیبتان بلوچ کو ہیبت خان اعظم ہمایوں سمجھ لیا ہے۔ جو کہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ تاریخ میں ہیبت خان اعظم ہمایوں کا سلیم شاہ سوری کے دور تک زندہ رہنا ثابت ہے۔ (بلوچی دُنیا بابتہ جولائی و اگست ۱۹۶۵ء ص ۲۶)

مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خانِ اعظم نے بجار کو پیغام بھیجا کہ حاجی خاں ہمارا بھائی ہے اس سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کرو۔ ممکن ہے میر بجار اس تہدید و تخویف سے رُک جاتا۔ لیکن اس کے حلیفوں (کوہِ سلیمان کے قدیم بلوچ قبائل) نے صورتِ حال کچھ ایسی پیدا کر دی کہ لڑائی ناگزیر ہو گئی۔ اور ڈیرہ جات کے تمام سرداروں نے خواہ وہ کلاچی تھے یا دودائی، لُنڈ تھے یا میرانی سب نے بجار کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔

میر بجار کی بہادری اور شجاعت کی بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اس مردِ میدان نے تن تنہا چار حکمرانوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا، اور اُن کے چھکے چھڑا دیئے۔ الغرض میر بجار اور ڈیرہ جات کے سرداروں کے مابین یہ جھڑپیں جاری تھیں کہ ست گھرہ سے خانِ اعظم میر چاکر خاں عظیم لشکر لے کر دودائیوں کی مدد کو آپہنچے۔ شدید جنگ کے بعد میر بجار کو شکست ہوئی۔ وہ بستی کی طرف پسپا ہو گیا اور خانِ اعظم واپس ست گھرہ لوٹ گئے۔

شہنشاہ نصیر الدین محمد ہمایوںؔ

بابر بادشاہ نے ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی کے تخت پر جلوس کیا تھا۔ اس نے رانا سانگا جیسے حریف کو شکست دی۔ چندیری کا مضبوط قلعہ بھی فتح کر لیا اور جون پور سے بنگال تک کے صوبے اس کے قبضے میں آگئے۔ اس نے صرف پانچ برس حکومت کر کے ۹۳۷ھ میں ملکِ عدم کی راہ لی۔ نصیر الدین محمد ہمایوں باپ کے بعد دہلی کے تخت پر بیٹھا اور باپ کی لاش کو اس کی وصیّت کے مطابق کابل میں لے جا کر دفن کیا۔ پنجاب کا صوبہ بدستور کامران مرزا سے متعلق رہا۔

ہمایوں نے آٹھ برس نہایت اطمینان سے حکومت کی۔ مگر ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں فرید خاں نام بہار کا ایک زمیندار باغی ہو گیا اور اس نے اتنا فروغ پکڑا کہ ہمایوں کو جان کے لالے پڑ گئے اور وہ پریشان حال آگرہ سے دہلی ہوتا ہوا لاہور پہنچا مگر کسی بھائی نے اس کی مدد نہ کی اور فرید خاں عظیم لشکر کے ساتھ اس کے تعاقب میں چلتا رہا۔ ہمایوں ناامید ہو کر راجپوتانہ کے راستے سندھ پہنچا۔ امرکوٹ میں مقیم تھا کہ اکبر پیدا ہوا۔ مشک نافہ جو اس نے کمر میں باندھ رکھا تھا۔ لوگوں میں تقسیم کیا۔ جس کی خوشبو نے گرد و پیش کو معطر بنا دیا۔ اس سے لوگوں نے اچھا شگون لیا۔

ہمایوں کی صحرا نوردی

ہمایوں کا ارادہ ایران جانے کا تھا۔ صحرا نوردی کرتے ہوئے جب وہ کوہستان مری میں پہنچا تو یہاں اس کی ملاقات خان اعظم میر چاکر خاں سے ہوئی۔ اس نے شہنشاہ کو بلوچوں کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا، اور یہ بھی کہا کہ میں چند دنوں میں پچاس ہزار سواروں کا لشکر پیش کر سکتا ہوں۔ مگر ہمایوں فرید خاں سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ وہ یہ مشورہ قبول نہ کر سکا، اور آگے بڑھ گیا۔

ہمایوں کا مختصر سا تھکا ہارا قافلہ ایران کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ ایک رات راستہ بھول گیا۔ اس کے ساتھ چالیس سوار ہندوستانی اور دو عورتیں تھیں۔ ایک حضرت مریم مکانی بیگم صاحبہ اور دوسری ایک بلوچ خاتون تھی جو ترجمان کا کام دیتی تھی۔ یہ سب لوگ رات بھر چلتے رہے۔ جب انہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں تو بادشاہ نے کہا کہ یہاں آبادی ہوگی۔ اتنے میں بلوچوں نے آکر راستہ روک لیا۔ بادشاہ نے کہا، ہم ان سے بات چیت کریں گے۔

بلوچوں نے پوچھا "آپ کون ہیں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں ہمایوں بادشاہ ہوں!"

اس پر بلوچ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ ملک خطی یہاں موجود نہیں، بادشاہ آپہنچا اب ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ ملک کے آنے تک بادشاہ کو یہاں روکے رکھیں۔ اس کے بعد انہوں نے عرض کی "حضور نیچے تشریف لے آئیں ہم کسی کو بھیج کر ملک خطی کو اطلاع دیتے ہیں۔"

بادشاہ نے بلوچ خاتون سے پوچھا کہ "یہ لوگ آپس میں کیا کہہ رہے ہیں؟"

اُس نے عرض کیا کہ ان لوگوں کا سردار ملک خطی یہاں موجود نہیں ہے جب تک وہ آنہ جائے، یہ بادشاہ سلامت کو یہاں ٹھہرانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور اس مسند پر تشریف لے آئیں جو انہوں نے حضور کے لئے بچھایا ہے۔

یہ سُن کر بادشاہ، حضرت بیگم اور ترجمان خواجہ عنبر مسند پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں قلعہ کے تمام لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے ادب سے مصیبت زدہ بادشاہ کو سلام کیا۔

صبح نمودار ہوئی۔ بادشاہ نماز فجر کے لئے کھڑا ہوا۔ ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ اتنے میں ملک خطی بھی آتا ہوا دکھائی دیا۔ بادشاہ نے دل میں خیال کیا کہ اگر وہ اچھی نیت سے آیا ہے تو اُسے سیدھی جانب سے آنا چاہیے۔ وہ ٹھیک سیدھی جانب سے آیا اور سلام کیا۔

بادشاہ نے اس کی خیریت دریافت کی۔ عرض کی کہ تین روز قبل مرزا کامران کا فرمان آیا تھا کہ اگر بادشاہ ادھر سے گزرے تو اسے روک لیا جائے، چونکہ بادشاہ سلامت اب تشریف لا چکے ہیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ حضور سوار ہو کر روانہ ہو جائیں، تاکہ میں قبلۂ عالم کو اپنی سرحد تک بحفاظت تمام پہنچا دوں!"

بادشاہ بلا توقف اپنی جماعت سمیت روانہ ہُوا، اور بلوچ سردار نے سو میل تک اس کا ساتھ دیا۔ سرحد ختم ہونے پر بادشاہ نے اُسے رخصت کیا۔ اس کے بعد گرم سیر علاقے میں داخل ہُوا۔

یہ تذکرۃ الواقعات کا متن ہے، جسے جوہر آفتابچی کا روزنامہ کہنا چاہیئے۔ یہ بادشاہ کے ان وفادار ملازمین میں سے تھا جو آخیر تک صدق وصفا کی راہ پر گامزن رہے۔ اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک خطی ایک علاقے کا حاکم تھا اور اس کے قلعہ سے سو میل مغرب تک اس کی ریاست پھیلی ہوئی تھی۔ کم و بیش اتنا علاقہ مشرق کو بھی ہونا چاہیئے۔

میر رحیمداد مولائی شیدائی کی تصریحات

میر رحیم داد خاں مولائی شیدائی کی تحقیق یہ ہے کہ ملک خطی خاں ضلع چاغی کے ریگستان کا حاکم تھا۔ جس کی سرحدات گرم سیر اور سیستان سے ملتی تھیں خطی خاں ہمایوں سے مستونگ میں آکر ملا اور ۱۶ رجب ۹۵۰ھ مطابق اکتوبر ۱۵۴۳ء جب ہمایوں مستونگ سے روانہ ہُوا اُس وقت خطی خاں ہی اس کا محافظ تھا۔ جس کی مدد سے ہمایوں گرم سیر کے قلعہ "باباحاجی" میں سلامتی سے پہنچ گیا۔ ہمایوں کے پاس خزانہ نہ تھا، مگر خوش قسمتی سے مرزا عسکری کا خزانچی خواجہ جلال الدین محمود مع خزانہ ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ خطی خاں کو مرزا عسکری کی طرف سے جو خطوط موصول ہوتے رہے تھے وہ سب ہمایوں کے سپرد کر دیئے۔

ملک خطی نے باوجود مرزا عسکری کے احکامات کے غریب الوطن شہنشاہ کی مدد کر کے جس بلند اخلاقی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا یہ کارنامہ ابدالآباد تک پورے بلوچستان کے لئے سرمایۂ صد فخر و مباہات بنا رہے گا۔

ست گھرہ تاریخ کے صفحات میں

خانِ اعظم میر چاکر خاں کو اگر اس وقت کوئی دھڑکا تھا تو دہلی کا۔ اس لئے اُس نے بجائے ملتان کے ست گھرہ[1] کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ یہ شہر ہندوؤں کا تیرتھ تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے ہندو یہاں آتے اور اشنان کرتے تھے۔ خانِ اعظم میر چاکر خاں نے پرانے شہر کے قریب ہی نئے شہر کی بنیاد رکھی۔ مضبوط فصیل، عالی شان محلات، دیوانِ عام و دیوانِ خاص تعمیر کرائے۔ دریا سے نہریں نکالیں۔ دلکشا باغات اور بہترین اثمار کے پودے لگوائے۔ خوشنما پھولوں کے تختے سجائے، اور اس شہر کو بہشتِ بریں کا نمونہ بنا دیا۔

دُنیا کا شروع سے یہی دستور چلا آیا ہے کہ جب کوئی چھوٹی طاقت جہد للبقا کی مرتکب ہوتی ہے تو بڑی طاقتیں اسے فتنہ انگیزی اور بغاوت پر محمول کرتی ہیں۔ لیکن جب کوئی بڑی طاقت اس فعل کا ارتکاب کرتی ہے تو اسے کشور کشائی کا نام دیا جاتا ہے۔ شیر خاں کی ابتدائی جنگیں فتنہ انگیزی سے تعبیر ہوئیں۔ مگر جب وہ دلّی کا تاجدار بن بیٹھا۔ تو اس کی بقیہ جنگوں نے کشور کشائی کا نام پایا۔ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتی آئی ہیں۔ اس کا اطلاق صرف غیاث الدین بلبن، محمد تغلق اور علاء الدین خلجی پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ ناصر الدین محمود، بہلول لودھی اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے خدا یاد اور دیندار سلاطین بھی اس طور کی ہم آہنگی

[1] ست کے معنی سچا۔ ست گھرہ یعنی سچا گھر۔ پاک گھر۔

سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے۔ امورِ مملکت میں تمام شہنشاہوں کا ضابطہ یکساں رہا ہے۔ چنانچہ جب لنگاہ ختم ہو گئے۔ اور خانِ اعظم میر چاکر خان نے ملتان پر قبضہ کیا تو بابر نے اسے فتنہ انگیزی کا نام دیا۔ اب ایک اور کجکلاہ کی سنیئے، جس نے ایک سلطان بن سلطان بن سلطان سے ابھی ابھی تخت چھینا ہے۔ جس کے دامن پر لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کے خون کے دھبے ہیں۔ وہ بھی بلوچوں کی نشاۃ ثانیہ کو گوارا نہیں کر سکا۔ اور اپنے جرنیل کو لکھتا ہے کہ:۔

"ملک ملتان را کہ بلوچاں تحت تصرف خود آوردہ اند خلاص سازد
و تمردانِ ایں دیارت را بکیفر کردار رساند۔ و نیز ملتان کہ ویران کردہ
اند در آباد سازند۔"

شیر شاہ بلوچوں کو دو تہمتوں سے متہم کرتا ہے۔ ایک یہ کہ انھوں نے سرکشی کی۔ دوسرے یہ کہ ملک کو ویران کیا۔ حالانکہ صرف تاریخیں ہی نہیں، بلکہ قلعوں کے کھنڈرات بھی اس حقیقت کے شاہد ہیں، کہ خانِ اعظم میر چاکر خاں نے قدیم ستگھرہ کے پہلو میں جدید ستگھرہ تعمیر کرایا۔ اس کے گرد و پیش خانِ اعظم کے دو صاحبزادوں کے محلات اور باغات نظر آنے لگے۔ پچیس پچیس میلوں کے فاصلے پر میر شہداد میر شہک، میر اللہ داد میر شاہو خاں اور دوسرے سرداروں کے قلعے تعمیر ہوئے۔ ہر جگہ امن قائم ہوا، اور رعایا مسرت و شادمانی سے ہمکنار ہو کر امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگی۔

ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں مقالات داؤدی کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ الہامی کتابوں کے بعد صدق و دیانت کے اعتبار سے اہل اللہ کے ارشادات کا درجہ ہے۔ کیونکہ انہیں نہ لومۃ لائم کا خوف ہوتا ہے۔ اور نہ ہی کسی

کے تعلق کا ان پر اثر پڑ سکتا ہے۔ جو دیکھتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں۔ وہی کرتے ہیں۔ مقاماتِ داؤدی حضرت مخدوم شاہ داؤد بندگی قادری علیہ الرحمۃ کا ملفوظ ہے۔ جسے علامہ عبدالباقی نے حضرت شاہ ابوالمعالی قادری قدس سرہٗ کے مشورے سے فوائد الفواد کے اسلوب میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۰۵۶ھ میں یہ صحیفۂ صدق تکمیل کو پہنچا۔ یعنی خانِ اعظم میر چاکر خاں کی وفات سے صرف پوراسی[۸۴] سال بعد۔ خانِ اعظم کے پوتے یقیناً زندہ موجود ہوں گے۔

علامہ عبدالباقی لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں ملتان دارالوبال بنا ہوا تھا اور شاہ حسین ارغون کے حملے نے اہلِ ملتان کو گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا صرف ست گھرہ ہی ایک ایسا شہر تھا۔ جسے دارالامن سمجھ کر علماء و مشائخ اکنافِ عالم سے کھچے چلے آتے تھے۔ چنانچہ ملتان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اکثر مردم ازاں جلاوطن شدہ بدر رفتہ وبسے از اعزہ آں دیار فرار اختیار کردہ الخ"

اور پھر ایک مقدس قافلے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"بصوب ست گھرہ روانہ شد"

ست گھرہ کی امنیت اور فارغ البالی کا ذکر ملاحظہ ہو:۔

"دراں عصر معمورہ دائرہ میر چاکر خاں بلوچ کہ آبادانی آں الآن بہ ست گھرہ مشہور و معروف است۔ نقطہ پرکار دولت و مرکز ادوار جمعیت اکابر و اشراف ہر دیار بود چند ہزار سوار از اعیان و اہالی قصبات جوار جاگیر میر چاکر بودند"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:۔

"سید رحمت اللہ و حضرت ایشاں بسے حیراں و پریشاں دائرہ میر چاکر خاں را دار سفیان انگاشتہ و آں مسکن مامون را جودی سفینہ امن و امان پنداشتہ بہ صفتے غریب و حالتے عجیب پرساں پرساں بمقصد رسیدند!"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"چندیں دیگر از اقربا آمدہ دریں دائرہ امن توطن گزیدند و روزگارے بعزّو کامرانی گذرانیدند۔"

یعنی چند اور قریبی رشتہ دار بھی اس امن کے گھوارے میں آئے اور انہوں نے اسے اپنا وطن بنایا اور عزّت و کامرانی سے زندگی بسر کی۔ "روزگارے بعزّو کامرانی گذرانیدند" میں ست گھرہ کی امنیت اور شہریوں کی باعزّت اور کامیاب زندگی کی پوری کیفیت آجاتی ہے۔ ایک اچھے حاکم اور ایک اچھے شہر کی اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہوسکتی ہے۔

ان اقتباسات کی روشنی میں کسی کے لئے یہ تسلیم کئے بغیر اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ بلوچوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا یہ زمانہ خواہ وہ کتنا مختصر کیوں نہ ہو عوام کے لئے آیۂ رحمت سے کم نہیں تھا۔ اُس زمانہ میں نہ تو کہیں چوری چکاری کا نام تھا اور نہ ہی تاریخوں میں کسی قسم کی بدامنی کا سراغ ملتا ہے۔ مگر تقدیر کے آگے کسی انسان کی، خواہ وہ کتنا شجاع اور پختہ کار کیوں نہ ہو کچھ نہیں چلتی۔ خانِ اعظم میر چاکر خان بھی جو منصوبے بنا کر سبّی سے چلا تھا۔ جس توقع کے تحت اُس نے ملتان فتح کرکے اپنی حکومت کا اعلان کیا تھا، یہ تمام آرزوئیں، یہ تمام منصوبے اب خاک میں ملتے دکھائی دے رہے تھے۔ شیر خاں ہمایوں کو ملک سے باہر نکال

کر شیر شاہ بن چکا تھا۔ اور اب وہ بلوچوں کے درپے ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک تجربہ کار جرنیل خواص خاں کو اس مہم پر مقرر کیا۔ وہ بڑے لاؤ لشکر سے بلوچوں پر حملہ آور ہوا۔ مگر خانِ اعظم نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور مار مار کر بھگا دیا۔ پھر اس نے ہیبت خاں نیازی کو بلوچوں کے استیصال پر تعینات کیا۔ خانِ اعظم نے اپنے بیس سالہ مگر شجاع فرزند میر میراں خاں بلوچ کو جو ملتان کا گورنر بھی تھا، دشمن کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ ہڑپہ کے مقام پر میر میراں خاں المعروف بلوچ خاں کو ہیبت خاں کے مقابلے میں فتح عظیم حاصل ہوئی۔ وہ فتح و نصرت کے پھریرے اڑاتا ملتان پہنچ کر والدِ بزرگوار کے قدمبوس ہوا۔ خانِ اعظم کو یقین تھا کہ ہیبت خاں اب نچلا نہیں بیٹھے گا۔ اور پوری طاقت سے حملہ کرے گا۔ اس لئے بلا توقف ڈیرہ غازی خاں کو روانہ ہوا، تاکہ اپنے بلوچ بھائیوں کو آنے والے خطرے کے لئے تیار کرے، مگر یہ معلوم کر کے اس کی تمام توقعات پر اوس پڑ گئی کہ میر حاجی خاں، جام اسمٰعیل خاں، اور فتح خاں سب خوشاب پہنچ کر شیر شاہ کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں۔ خانِ اعظم ان سرداروں کو اپنا دست و بازو خیال کرتے تھے۔ خاص کر میر حاجی خاں کی خاطر تو خانِ اعظم نے اپنے دو بڑے امیروں سے جنگ کی تھی اور اپنا پیارا بیٹا میر شہک اس مہم کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ شیر شاہ کی اطاعت قبول کر کے ڈیرہ جات کے سرداروں نے اپنے گرد شہنشاہیت کی حمایت کا حصار قائم کر لیا تھا۔ مگر اس سے بلوچی قوت کو جو دھچکا لگا اس کا مداوا نہ ہو سکا اور خانِ اعظم نے بلوچ سلطنت کا جو خواب دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اگر ڈیرہ جات کی عسکری قوت خانِ اعظم کو دھوکا نہ دیتی تو خدا معلوم بلوچی فتوحات کا سیلاب کہاں جا کر رکتا۔

خانِ اعظم کی پریشانیاں

حفاظتی تدبیریں

خانِ اعظم میر چاکر خاں نے جب دیکھا کہ پانسہ بدل گیا ہے۔ اور ایسے حالات میں آگے بڑھنا اپنی قوم کو تباہ کرنا ہے، تو اس نے اعلان کیا کہ تمام بلوچ سردار میدان خالی کر کے پہاڑ کی جانب آجائیں اور اپنے قلعوں میں برائے نام چند آدمی رہنے دیں جو شیر شاہی حکام کے آنے تک ضبط و نسق کو قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ بلوچ جس سرعت سے بڑھے تھے، اتنی تیزی سے رجعت قہقری کرتے ہوئے کوہِ سلیمان کے دامن میں گھس گئے۔ خانِ اعظم کی شہنشاہ ہمایوں سے برابر خط و کتابت جاری تھی۔ اُسے امید تھی، کہ وہ بہت جلد آئے گا اور ہم لوگ اس کے ساتھ مل کر دُشمن کو قرار واقعی سزا دے سکیں گے۔ خانِ اعظم نے ملتان سے دیپال پور تک کا دورہ کیا اور بلوچوں کے لئے خوراک کا اِس قدر ذخیرہ کر لیا، جو اُن کے لئے دس سالوں تک مکتفی ہو سکتا تھا پھر ستگھرہ پہنچ کر اس نے اپنے تمام اعزّہ و اقارب اور سامان و اسلحہ وغیرہ کو ملتان روانہ کیا، اور اپنے وکیل فتح خاں کمبوہ کو ہیبت خاں کے پاس بھیجا۔ اور اُسے اطلاع کی کہ ہم لوگ آپ سے لڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ آپ خوشی سے اِس ملک پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ شیر شاہ کا حکم ہیبت خاں کو مل چکا تھا کہ وہ قبولہ کے فتح خاں کو گرفتار کرے اور ملتان کو بلوچوں کے دستِ تصرف سے آزاد کرائے اس حکم کے پہنچتے ہی ہیبت خاں نے خانِ اعظم کے وکیل سے کہا کہ اپنے سردار کو اطلاع دو کہ میں اس طرف آرہا ہوں اور ان کی فوج کا جائزہ لوں گا۔

ہیبت خاں کو خانِ اعظم کی اصل کارروائی کا علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی میر صاحب نے اپنے ارادے کو کسی پر ظاہر کیا تھا۔ ہیبت خاں نے یہی خیال کیا تھا کہ خانِ اعظم نے شیر شاہ کی اطاعت قبول کر لی ہے اور وہ اپنی فوج بادشاہ کے حوالے کرنا چاہتا

ہے۔ اس لئے فوج کا جائزہ لینے کی غرض سے بڑھا چلا آرہا تھا۔ اور ادھر یہ کیفیت تھی کہ فوج بجائے خود رہی، اسلحہ اور سامان تک منتقل کیا جا چکا تھا۔ اس لئے میر چاکر خاں کو سخت فکر لاحق ہُوا، کیونکہ نہ فوج موجود تھی اور نہ ہی مختصر وقت میں ہیبت خاں کے لشکر کی راشننگ کا کوئی انتظام ہو سکتا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنی زندگی کا فکر الگ تھا۔ چنانچہ وکیل السلطنت فتح خاں کمبوہ کا بیان ہے کہ جب میں نے خانِ اعظم کو ہیبت خاں کا پیغام دیا تو وہ سخت فکر مند ہوئے کہ اتنے تھوڑے سے عرصہ میں فوج کس طرح جمع کی جا سکتی ہے اور نہ ہی فوری طور پر راشننگ کا انتظام ممکن ہے۔ تاریخ شیر شاہی کے الفاظ یہ ہیں :۔

"دوئم روز خبر آمد کہ ہیبت خاں از ست گھرہ دوازدہ کردہ آمد میر چاکر خاں ازیں خبر سراسیمہ شد کہ من ہنوز لشکر جمع نہ کردہ ام و نہ مہمانی کہ لائقِ حال او باشد، تیار کردہ ام۔ چہ خواہد شد۔"

دُوسرے دن صبح سویرے مخبر نے اطلاع دی کہ ہیبت خاں آ پہنچا۔ ایسے عالم میں تھوڑی دیر کے لئے خانِ اعظم کی پیشانی پر تردّد کے آثار ظاہر ہوئے مگر بہت جلد افکار و اضطرار کی یہ گھٹا چھٹ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ خانِ اعظم نے کوئی حل سوچ لیا ہے۔ وہ فی الفور گھوڑے پر سوار ہُوا اور اپنے چند رفیقوں کے ہمراہ ہیبت خاں کی پیشوائی کو پہنچ گیا۔ ہیبت خاں نے اس جلیل القدر سردار کو دیکھا تو اس کی تمام رعونت و نخوت اس کی شخصیت کے آگے جُھک گئی اور دیکھتے ہی بولا :۔

"خانِ اعظم! محلہ در دیپال پور خواہم کرد مبادا فتح خاں بگریزد"
یعنی آپ کی فوج کا جائزہ دیپالپور میں لوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ فتح خاں بھاگ جائے۔

یہ کہا اور قبولہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

خانِ اعظم "آمدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کے مصداق ست گھرہ واپس پہنچے۔ شہر کا انتظام اپنے کسی معتمد (غیر بلوچ) کو سونپا۔ اُسے چند ہدایات دیں اور نوبت بجواتے ملتان کو روانہ ہو گئے۔

میر مندو خاں کی گرفتاری

اُن دنوں پاک پٹن میر مندو خاں کی تحویل میں تھا۔ اس نے بھی بلوچوں کو سردار کے حکم کی تعمیل میں کوہِ سلیمان کی طرف بھیجوا دیا تھا۔ صرف چند اقربا اور بال بچے باقی رہ گئے تھے جنہیں روانہ کرنے کی سوچ رہا تھا کہ دفعتہً فتح خاں پہنچ گیا، اور پناہ کا طالب ہوا۔ اگرچہ مندو خاں کے پاس تین چار سو سے زیادہ جنگجو آدمی نہیں تھے۔ تاہم اس نے ایک در پر آئے ہوئے پناہ گیر کو مایوس کرنا اپنی حمیت کے خلاف جانا۔ اور قلعے کا دروازہ کھلوا کر اُسے اندر بُلا لیا۔ ہیبت خاں کی فوجیں پہنچ گئیں اور انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور طرفین کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ عین اُس وقت جبکہ بلوچ اپنی جمعیت کے کم ہونے کے باوجود مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ فتح خاں کمبوہ نے اپنے محسنوں کو جنہوں نے محض اس کی خاطر جنگ مول لی تھی دشمن سے تنہا نبرد آزما ہونے کے لئے چھوڑ دیا اور اُس نے حضرت شیخ الاسلام فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمتہ کے صاحبِ سجادہ شیخ ابراہیم رح کے ذریعے ہیبت خاں سے صلح کی بات چیت شروع کر دی اور انجام کار اپنے آپ کو شیخ کی وساطت سے ہیبت خان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ تاریخ افاغنہ کے مصنف نعمت اللہ سے سُنئے لکھتا ہے:۔

"محاصرے کے دوران رات کے وقت بلوچستان کا سردار جس کا نام مندوخان بلوچ تھا، اپنے قلعے کی حفاظت کے لیے انتہائی پامردی سے لڑتا رہا۔ لیکن جب اُسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے وہی کچھ کیا جو غیور اور مجبور لوگ ایسے اوقات میں کر گزرتے ہیں یعنی بلوچوں نے بے عزتی کے خوف سے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور مندوخان مع اپنے تین سو رفیقوں کے قلعہ سے باہر نکل آیا اور محاصرین پر شدت سے ٹوٹ پڑا۔ اس نے نہایت شجاعت سے جنگ کی اور بزورِ شمشیر اپنا راستہ بنا کر فرار ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو افغانوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ معزز خواتین تو اپنے غیور وارثوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر چکی تھیں، لیکن بچے کھچے لوگوں کو ہیبت خاں نے قید کر لیا۔"

یہ واقعہ پاک پٹن کا نہیں، بلکہ فتح پور کے قریب ایک اور قلعہ تھا۔ مندوخاں مع اہل وعیال اس میں رہتا تھا۔ اور فتح خاں کمبوہ بھی اسی قلعے میں پناہ گزین ہوا تھا۔ عباس خاں سروانی لکھتا ہے کہ جب فتح خاں شیخ ابراہیمؒ کی وساطت سے ہیبت خاں کی خدمت میں پیش ہوا تو اس نے شیخ ابراہیمؒ سے کہا کہ میں شیر شاہ کا نوکر ہوں، جو اس کا حکم ہو گا اس پر عمل کروں گا اور فتح خاں کو قید کر لیا۔

تاریخ افاغنہ کے مؤلف نعمت اللہ نیز لکھتے ہیں کہ میر مندوخاں لڑتا بھڑتا بخشو خاں لنگاہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ دیر سستانا چاہتا تھا، مگر بخشو خاں نے دھوکہ اور فریب دے کر اُسے گرفتار کر لیا۔ اور بعد ازاں ہیبت خاں کے حوالے کر دیا۔

ملتان پر حملہ

خانِ اعظم میر چاکر خان جب ملتان سے گزر رہے تھے تو انہوں نے میرن خاں بلوچ گورنر ملتان کو ہدایت کی تھی کہ شہر اور ملک کا انتظام کسی ہوشیار اور پختہ کار شخص کے سپرد کر کے روجہان چلا جائے۔ ایسے حالات میں ایسے جانبدار شخص کو ملک اور شہر کا انتظام حوالے کیا جاتا ہے جو ملک چلانے کا تجربہ رکھتا ہو تاکہ نئے حاکم کے آنے تک شہر کا نظم و نسق قائم رکھ سکے۔ اس طرح جنگ کی نوبت نہیں آتی۔ شہر کے چارج کا لین دین سکون سے ہو جاتا ہے، اور عوام کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ چنانچہ خانِ اعظم میر بلوچ خاں کے اہل و عیال اور اعزا و اقارب کو لے کر روانہ ہو گئے۔ اور چند یوم بعد ہیبت خاں، فتح خاں اور میر مندو خاں کو گرفتار کرنے کے بعد ملتان آ دھمکا۔ اُمرا نے میرن خاں بلوچ کو مشورہ دیا کہ مٹھی بھر رفیقوں کے ساتھ شاہی لشکر سے ٹکر لینا خودکشی کے مترادف ہے۔ بہتر ہے کہ جیسے خانِ اعظم کا حکم ہے۔ آپ روجہان چلے جائیں اور پھر وہ جس طرح مناسب سمجھیں اُسی پر عمل کریں۔ مگر چونکہ ہیبت خاں نے آتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا تھا اور ابھی چند بلوچ سردار شہر اور قلعے میں موجود تھے اس لئے میرن خاں بلوچ نے بزدلوں کی طرح بھاگ کر جان بچانا پسند نہ کیا اور گنتی کے چند رفیقوں کے ہمراہ میدان میں ڈٹ گیا۔ اس غیر مساوی مقابلے میں ہیبت خاں کامیاب ہوا اور بخشو خاں لنگاہ نے میرن خاں کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا۔ ہیبت خاں نے شیر شاہ کو فتح نامہ تحریر کیا تو وہ بڑا خوش ہوا اور اس نے ہیبت خاں کو مسندِ عالی کا منصب اور "اعظم ہمایوں" کا خطاب مرحمت کیا۔ نیز حکم دیا کہ فتح خاں

کمبوہ، مندو خاں اور میراں خاں المعروف بلوچ خاں کو قتل کردو[1]۔ اور بخشو لنگاہ یا اُس کے بیٹے کو اپنی خدمت میں رکھو۔ ہیبت خاں نے حکم ملتے ہی میراں خاں کو شہید کر دیا[2] اور فتح جنگ کو قائم مقام چھوڑ کر فوراً لاہور پہنچا، اور وہاں اس نے فتح خاں کمبوہ اور میر مندو خاں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

میراں خاں بلوچ کی شہادت پر متضاد بیانات

میراں خاں بلوچ کی شہادت کو مؤرخین نے مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے۔ میر عبدالرحمٰن خاں گرد لکھتے ہیں کہ ہیبت خاں نے اس بیس سال کے نازنین شہزادے کو خنجر مار کر شہید کیا تھا[3]۔ تاریخ افاغنہ کا مؤلف رقمطراز ہے، کہ میراں شاہ کو شیر شاہ کے حکم سے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا[4]۔ خان عبدالقادر خاں لغاری ایم ایس سی کا بیان ان دونوں سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

---

[1] اعظم ہمایوں کے خطاب سے دراصل شہنشاہ ہمایوں کی خفت اور اہانت مقصود تھی۔ گویا جیسے یہ خطاب دیا جا رہا ہے وہ ہمایوں سے بھی بڑھ کر ہے، یا یہ کہ ہمایوں سے بھی زیادہ شان و شوکت کے انسان شیر شاہ کے نوکر ہیں۔ [2] میراں خاں بلوچ کو اس کے سرباز رفیقوں نے سنوری باغ کے قریب دفن کر دیا تھا جب چاکر خاں کو اطمینان نصیب ہوا تو اس نے اپنے بہادر بیٹے کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کرایا سکھوں کے حملے میں مقبرہ تو منہدم ہو گیا۔ البتہ اس کے آثار اور میراں شاہ کی قبر اچھی حالت میں موجود ہے۔ قبرستان خاصہ بڑا تھا اور سنگ محراب دودائی سے لے کر بڑے بڑے بلوچ یہاں دفن ہوتے چلے آئے تھے۔ مگر اب اس کا بیشتر حصہ سڑکوں اور ملحقہ عمارات نے لے لیا ہے۔ قبریں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ میراں شاہ بلوچ کے لوح مزار کو بھی چراغ کی سیاہی نے اپنی پیٹ میں لے لیا ہے۔

[3] ہمارا کاروان

[4] تاریخ افاغنہ مترجمہ ڈاکٹر ڈورن

"ہیبت خاں ایک نڈر اور دلیر دشمن کی قدر نہ کر سکا۔ پچھلی شکست کے انتقام نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بلوچ خاں نہایت عاجزی سے جان بخشی کی درخواست کرے گا۔ چنانچہ جس وقت بلوچ خاں زنجیروں میں جکڑا ہوا ہیبت خاں کے روبرو پیش کیا گیا، تو اس نے قہقہہ لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑایا۔ پابہ زنجیر بلوچ سردار بھی اُسے حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ جواب دیتا رہا جس کی فاتح کو توقع نہ تھی۔ کمین دشمن کی بے باکی اور شاہی استغنا دیکھ کر اس کے غصے کا جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ اُس نے گورنر ملتان کے لئے جو سزا تجویز کی اس پر انسانیت ہمیشہ غم کے آنسو بہاتی رہے گی۔ اس کے حکم سے میرن خاں بلوچ کی ٹانگیں گھوڑی کی زین کے ساتھ باندھ دی گئیں۔ ایسے عالم میں جبکہ میرن خاں کا خوبصورت سر زمین پر گھسٹ رہا تھا اور معطر زلفیں گرد آلود ہو رہی تھیں گھوڑے کو چابک مار کر دوڑایا گیا۔ گھوڑا اپنے پیچھے اس بوجھ کو دیکھ کر بھڑک اٹھا اور تھوڑی سی دیر میں بلوچ خاں کی روح عالم قدس کو پرواز کر گئی۔ وہ سر جو خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکا تھا اب ریزہ ریزہ ہو کر ملتان کی گلیوں اور سڑکوں میں بکھر چکا تھا۔"

اس کے بعد خان عبدالقادر خاں لغاری ایم ایس سی نے سیت پور کی جنگ کے عنوان سے خانِ اعظم میر چاکر خان اور ہیبت خاں کی ہولناک لڑائی کی تفصیلات درج کی ہیں مگر یہ صحیح نہیں۔ چاکر خاں نے بلاشبہ ہیبت خاں سے اپنے بیٹے کا انتقام لیا تھا، مگر وہ ہیبت خاں نہ تو یہ ہیبت خاں ہے اور نہ وہ بیٹا یہ بیٹا ہے۔ اس جنگ کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے، اور ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ ہیبت خاں نامی ایک بلوچ سردار نے خانِ اعظم میر چاکر خاں کے بیٹے میر شہک کو قتل کر کے اس کی پسلیوں کے

کباب بنائے تھے، اور سر چاکر اعظم نے اس ہیبت خاں کو قتل کر کے اس کی کھوپڑی میں پانی پی کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا تھا۔ اس واقعہ کو میراں شاہ کے انتقام سے منسوب کرنا امرِ واقعہ کے خلاف ہے، میراں شاہ کا انتقام صرف چاکرِ اعظم نے نہیں، بلکہ پوری قوم نے لیا۔ مگر سر ہند کے میدان میں۔ اور سوڑہ خاندان کو صفحۂ دہر سے بالکل ناپید کر دیا۔

خانِ اعظم میر چاکر خاں سوائے معدودے چند نفوس کے پوری قوم کو بچا کر لے گیا۔ لیکن نیازی پٹھانوں پر کیا گزری اور بلوچوں کے قتل و غارت کا انہیں کیا انعام ملا۔ عوام نے دونوں اقوام کو کس نظر سے دیکھا۔ اس دور کے علماء و مشائخ کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی۔ یہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ گزشتہ صفحات میں مقاماتِ داؤدی کی رائے بلوچوں کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں ست گھرہ کی شان و شوکت، امنیت، رفاہیت، میر چاکر خان اور اس کے عملے کے عمدہ نظم و نسق کی تعریف جن الفاظ میں مولانا عبدالباقی نے کی ہے رایسی بہت کم حاکم قوم کے بارے میں پڑھنے میں آئی ہے۔ لنگاہوں کو چند سال حکومت کرنے کا موقع ملا، مگر عنانِ اختیار سنبھالتے ہی انہوں نے جو گل کھلائے اور جن الفاظ میں مؤرخین نے ان کا ذکر کیا ہے، وہ آپ کے مطالعہ سے گزر چکا ہے۔ مقامات داؤدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نیازی بے حد ظالم واقع ہوئے تھے۔ بلوچوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ان کی زیادتیوں سے محفوظ نہ تھے۔ جب حضرت مخدوم شاہ داؤد کرمانی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں نیازیوں کے ظلم و ستم کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ آج سے نیازیوں۔ کا سلطنتِ افاغنہ سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ مقامات کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

"خادم حقیقت و بے ادبی و تعدی افغاناں بعرض رسانید، فرمودند
کہ سررشتہ دولتِ نیازیان با سلطنت افغاناں از امروز بریدہ شد۔"

توبہ توبہ۔ کتنا تنفر اور کتنی بے زاری کا اظہار ہے، اور پھر ایک دنیا دار کی زبان سے نہیں، بلکہ یہ الفاظ ایک ولی اللہ کے ہیں۔ انجام کار خدا پرستوں کی دعائیں رنگ لائیں اور نیازیوں پر ادبار چھا گیا۔ شیخ کمال فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ اسلام خاں نے اعظم ہمایوں کو اس کے بھائیوں سمیت قتل کر دیا۔ نظام الملک خافی خاں ہیبت خاں اعظم ہمایوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"سلیم شاہ نے مانکوٹ تک تعاقب کیا۔ وہاں شجاع خاں، اعظم ہمایوں اور عیسیٰ خاں سب نے مل کر بیس ہزار سوار فراہم کئے اور سلیم شاہ سے مقابلہ کیا۔ لیکن ان کو میدان چھوڑ کر محصور ہو جانا پڑا۔ آخر سلیم شاہ نے انہیں شکست دے کر منتشر کر دیا۔ اس لڑائی میں اعظم ہمایوں، ہیبت خاں کی ماں اور اس کے اہل و عیال سلیم شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔"

پھر لکھتا ہے کہ آخر کار نیازیوں کو پھر شکست اٹھانا پڑی، اور وہ حاکمِ کشمیر کی پناہ میں چلے گئے۔ وہاں اعظم ہمایوں (ہیبت خاں)، سعید خاں اور شہباز خاں کو قتل کر دیا گیا، اور حاکمِ کشمیر نے ان کے سر سلیم شاہ کے پاس بھیج دیئے۔

لیکن بلوچوں کا ذکر صاحبِ مقامات نے بڑے پیارے انداز میں کیا ہے۔ خیر، وہ تو بلوچوں کے جاہ و جلال کا زمانہ تھا۔ آج بھی جبکہ پنجاب کا بلوچ ہر جگہ محکومی کی زندگی بسر کر رہا ہے، ست گھرہ کے لوگ بڑے فخر سے اپنے آپ کو بلوچوں کی رعایا ظاہر کرتے اور ہر نووارد کو اپنا سردار جان کر عزت کرتے ہیں۔ جب ہم لوگ پہلی مرتبہ

ست گھرہ گئے، تو اس جگہ کے ایک ممتاز شہری ڈاکٹر غلام محمد خان نے فرمایا، کہ یہ شہر تو بلوچوں کا ہے، اور ہم بلوچوں کی رعایا ہیں۔ اسی طرح سیّد خادم حسین شاہ نے بھی، جن کا خاندان خانِ اعظم میر چاکر خاں کے زمانے سے ہی اس شہر میں آباد چلا آتا ہے۔ بلوچوں کا ذکر بڑے احترام سے کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ست گھرہ کے بلوچ حکام کے اخلاقِ جمیلہ کا ہی اثر ہے۔ کہ صدیاں گزر گئیں، مگر ست گھرہ کے لوگ "بلوچ" کے نام پر جان دیتے اور خانِ اعظم کے مقبرہ کی عزّت کرتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

اسی طرح پنڈی کی شیخ موسیٰ میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے ایک علم دوست اور ادب نواز رئیس پیر حیدر علی شاہ نے ہمیں انتہائی محبت سے اپنے ہاں ٹھہرایا اور گھوڑوں پر سوار کر کے اس مقام پر لے گئے۔ جہاں چاکر اعظم کا ولی عہد نواب میر شہداد خاں ابدی نیند سو رہا تھا۔ ملتان کا شہید بلوچ گورنر نواب میراں شاہ بلوچ فاتحانہ انداز میں پیر خورشید احمد صاحب قریشی کی کوٹھی کے جنوب غربی گوشے میں مرتفع سطح پر محوِ خواب ہے۔ صدیوں سے اس کی قبر پر خادم چراغ جلاتا اور جاروب کشی کرتا ہے۔ اکّے دُکّے زائرین بھی فاتحہ پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا اللہ داد خاں گرمانی بلوچ کا مقبرہ ملتان سٹی اسٹیشن کے قریب مہبطِ انوار بنا ہوا ہے۔ سچ ہے اچھے لوگ چلے جاتے ہیں مگر ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے ؎

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

مخدوم شیخ بہاء الدین ثانیؒ کا سفرِ آخرت

۱۲ ربیع الاول ۹۵۰ھ کو حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کے صاحب سجّادہ اور ملتان شہر کے مرنجان مرنج رئیس مخدوم شیخ بہاء الدین ثانی انتقال فرما گئے۔ آپ کی ذات والا صفات اپنے آباء کرام کی طرح اہلِ ملتان کے لئے آیۂ رحمت تھی۔ آپ کی ساری زندگی حضرت شیخ الاسلام کے آستانۂ قدس پر گزری اور ہزاروں ارواح صادقہ نے آپ سے استفاضہ کیا۔ آپ کی شادی خانہ آبادی مخدوم الملک خواجہ پیر نوری ولد قطب العارفین حضرت پیر علی قتال علیہ الرحمۃ کی معصومہ بی بی فاطمہ سے ہوئی تھی۔ اس کے بطن عفت سے دو صاحبزادے تولّد ہوئے۔ ایک شیخ محمد یوسف الملقب بہ لعل علیینؒ اور دوسرے شیخ کبیرؒ جو آپ کے جانشین قرار پائے۔

شیر شاہ ملتان میں

شیر شاہ کو ہمایوں کے ناسازگار حالات کا پوری طرح اندازہ تھا۔ اس لئے وہ خواہ مخواہ اس سے جنگ کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب وہ بلوچستان سے ایران کی جانب کوچ کر گیا تو اس نے جوڑ توڑ کر کے ڈیرہ جات کے بلوچ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملتان آسانی کے ساتھ فتح ہو گیا۔ اور یہ فاتحانہ وار خوشاب سے یلغار کرتا ملتان آپہنچا۔ خانِ اعظم میر چاکر خاں روجھان میں بیٹھے حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ اور وہ خاموش بیٹھے رہے۔ شیر شاہ نے بھی انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور ملتان میں داخل ہو کر حضرت شیخ الاسلام

بہاءالدین زکریاؒ، قطب الاقطاب شاہ رکن عالم اور مخدوم شاہ محمد یوسف گردیزؒ رحمہم اللہ علیہم کے مقابر پر حاضری دی۔ تینوں آستانوں پر روغنی اینٹوں سے مساجد تعمیر کرائیں اور پھر ملتان پر مضبوط گورنر مقرر کر کے لاہور لوٹ گیا۔ ۹۵۲ھ میں شیر شاہ کا انتقال ہو گیا۔

شیر شاہ نہایت عادل اور منتظم حکمران تھا۔ اگرچہ اُسے صرف پانچ سال حکومت کرنے کا موقع ملا اور اس دوران وہ برابر ملک فتح کرنے میں مصروف رہا بایں ہمہ اس نے اتنے اچھے کام کئے، جو دُوسرے سلاطین اپنی پوری عمر میں انجام نہیں دے سکے۔ اس نے پشاور سے بنگال اور آگرے سے مالوہ تک عظیم شاہراہیں تعمیر کرائیں اور سایہ کے لئے دونوں اطراف میں درخت لگوائے۔ ہر کوس پر پختہ سرائے، مسجد اور کنواں بنوا دیا۔ سرائے میں ہر قوم اور ہر مذہب کے مسافروں کو بادشاہ کی طرف سے کھانا ملتا تھا۔ صحیح صحیح فاصلہ معلوم کرنے کے لئے کوس منارے بھی بنوائے تھے۔ اس نے پہلے پہل بندوبست، مالگذاری اور اراضی کا طریقہ جاری کیا۔ جو آگے چل کر اکبر اعظم کے زمانے میں زیادہ باقاعدہ ہو گیا۔ زمین کی پیمائش کر کے جمع مشخص کی گئی۔ رعایا کو اختیار دیا گیا کہ ادائیگی زرِ مالگذاری میں خواہ وہ غلہ دیں یا نقد۔ یہ ایک بڑا اہم کام تھا جس میں سرکار اور رعایا دونوں کا فائدہ تھا شیر شاہ اگرچہ بڑی سلطنت کا شہنشاہ تھا، لیکن بے کار بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا، اور ہر وقت سلطنت کے کاروبار میں لگا رہتا تھا۔ شیر شاہ کا سلوک ہندوؤں اور مسلمانوں سے یکساں تھا۔ اور اس نے عہدہ داروں سے رشوت ستانی اور زیادہ ستانی کلیۃً بند کرا دی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ شیشے میں اپنا مُنہ دیکھتا تو کہتا کہ بڑھاپے اور شام کی نماز کے وقت حکومت ملی، ورنہ دُنیا دیکھتی کہ میں کیا کرتا۔

شیر شاہی گورنر

ملتان کی صوبیداری شیر شاہ نے فتح جنگ کو عنایت کی تھی۔ اس نے شہر کا اچھا انتظام کیا۔ ارغون کے حملے سے ملتان کی عمارتوں کو جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تلافی کی۔ شیر شاہ کی یاد میں شیر گڑھ نامی ایک قصبہ آباد کیا۔ ملک فتول خاں جویہ، جو فتح پور کا سردار تھا۔ اس نے صوبیدار کو بھائی کو سرکاری واجبات ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ صوبہ دار اس وقت قصبہ شنناب گڑھ میں رہتا تھا۔ علی حسین صوبیدار نے فتوحل خاں (فتح علی خاں) پر حملہ کیا، اور حلیم کھچی کے مقام پر اور بروایت دیگر فتح پور میں دونوں سردار ایک دوسرے کے مقابل ہوئے، اور بہادرانہ وار لڑتے ہوئے مارے گئے۔

سلطان سلیم شاہ سوری

شیر شاہ کے بعد اس کا لڑکا سلیم شاہ تخت پر بیٹھا اور ۹ سال تک حکومت کی۔ دہلی میں سلیم گڈھ کا قلعہ اس کی یادگار ہے۔ سلطان سلیم شاہ ملتان بھی آیا۔ اس نے بزرگان دین کے مقابر پر حاضری دی۔ حضرت مخدوم شیخ محمد یوسف گردیزی علیہ الرحمۃ کی ڈیوڑھی شکستہ ہو رہی تھی۔ اسے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ شاہی خرچ پر بعد تعمیر درج ذیل عبارت اس ڈیوڑھی پر کندہ کرائی گئی۔

"عمارت خانقاہ عالی جاہ قدوۃ الواصلین عمدۃ المحققین قطب الاقطاب
بندگی حضرت شاہ یوسف گردیزہ در عہد سجادہ حضرت شیخ المشائخ صدرالدین
راجو بفرمان سلطان السلاطین اسلام شاہ فی سنہ ۹۵۶ھ بپرداخت۔"
سیادت پناہ سید احمد حسین راجا الحسینی الواسطی

سلاطین سور کا آخری دور

سلطان سلیم شاہ کے بعد امراء نے اس کے کم سن بچے فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ مگر اس کے ماموں مبارز خاں نے اس معصوم کو قتل

کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور سلطان محمد عادل شاہ کے نام سے ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء
میں دہلی کے تخت پر جلوس کیا۔ اور احمد خاں سور جو شیر شاہ کا داماد اور بھتیجا تھا،
سلطان سکندر کے لقب سے ملتان، سندھ اور دوسرے ملحقات پر قابض ہو بیٹھا
اسی زمانے میں ہمایوں کابل سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔

افاغنہ کے زوال کی پیشگوئی

ابھی ہمایوں کی واپسی کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا تھا، اور سور خاندان کافی طاقت میں تھا
کہ گیلانی خاندان کے بہت بڑے بزرگ حضرت مخدوم سید حامد جہاں بخش قدس سرہٗ
نے افاغنہ کے زوال کی پیشینگوئی فرمائی۔ یہ واقعہ مُلّا سعد اللہ قادری نے اس طرح
بیان کیا ہے کہ شیخ المشائخ حضرت حافظ سید جمال الدین موسیٰ پاک شہیدؒ اور مولانا
شیخ عبد الحق محدث دہلوی بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مخدوم کا اجلاس گرم
تھا۔ دائیں بائیں دُور تک ارادت مندوں کی صفیں چلی گئی تھیں۔ دفعتہً گھوڑوں کی
کربناک آوازیں بلند ہوئیں۔ حضرت نے پُوچھا "یہ شور کیسا ہے؟"
لوگوں نے عرض کیا کہ "سرکاری کارندے گھوڑوں کو داغ لگا رہے ہیں"۔
خدام کا اتنا عرض کرنا تھا کہ چہرۂ اقدس متغیر ہو گیا۔ اسی عالم اضطراب میں
فرمایا:۔

"بارگاہِ الٰہی میں گھوڑوں کی فریاد قبول ہو گئی۔ فرمان جاری ہوا ہے
کہ افغانوں سے ہندوستان کی سلطنت ضبط کر لی جائے"۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات پر مخفی نہ ہو گا کہ شیر شاہ نے گھوڑوں کو داغ
لگانے کا حکم جاری کیا تھا۔ اور یہ سلسلہ سور خاندان کے اخیر دور تک جاری رہا،
اس سے گھوڑوں کو سخت اذیت پہنچتی تھی۔ ان بے زبان جانوروں پر ظلم و تشدد

ہونے کے باعث قضا و قدر کا یہ فیصلہ منکشف ہو گیا۔ جس کی اطلاع آپ نے حاضرین کو دی۔ ساتھ ہی ارشاد کیا کہ حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ کی سفارش پر ہمایوں کو خلعتِ پادشاہی مرحمت ہوئی ہے اور دستار بندی کو رویتِ ظاہری پر موقوف کیا گیا ہے۔

ہمایوں حضرت مخدوم سیّد حامد جہاں بخشؒ کی خدمت میں

ہمایوں جب ہندوستان سے ایران پہنچا تو شاہِ ایران نے اس کی بڑی دلجوئی کی۔ ہمایوں کچھ عرصہ وہاں رہا۔ ۹۵۲ھ (۱۵۴۵ء) میں شاہ ایران سے چودہ ہزار فوج لے کر قندھار پہنچا۔ پھر اس نے بدخشاں، کابل اور سیستان کو فتح کیا۔ ۹۶۲ھ میں جب اسے تمام بھائیوں کی طرف سے اطمینان کلّی ہو گیا تو وہ پندرہ ہزار سوار سے ہند کی سرحد میں داخل ہُوا۔

بلوچی اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ خانِ اعظم میر چاکر خاں نے جب دیکھا کہ سوری خاندان سے تن تنہا نبٹنا اس کے بس کی بات نہیں۔ تو اس نے پھر ہمایوں سے نامہ و پیام شروع کیا۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ چاکر اعظم نے خود ایران جاکر شہنشاہ سے ملاقات کی تھی۔ اور اُسے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے اُبھارا تھا۔ دُوسری بار وہ قندھار میں بادشاہ سے ملا۔ اور ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) میں ہمایوں ہندوستان پر حملہ آور ہُوا تو خانِ اعظم میر چاکر خاں چالیس ہزار لشکرِ جرّار جلَو میں لئے اس کے ہمراہ تھا۔ لاہور تک کا علاقہ بغیر لڑے بھڑے ہاتھ آگیا۔ مگر سر ہند میں خوب میدانِ کارزار گرم ہُوا۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ سکندر شاہ اسّی ہزار فوج اور بے شمار ہاتھی لے کر مقابلے میں نکلا تھا۔ ہمایوں نے بیرم خاں کی اتالیقی میں شہزادہ محمد اکبر کو جس کی عمر اس وقت

بارہ سال تھی۔ سکندر شاہ کے مقابلے میں روانہ کیا اور خود حضرت مخدوم سید حامد جہاں بخش علیہ الرحمۃ کی خدمت میں دعا طلبی کے لئے اُچ کی جانب روانہ ہوا۔ بادشاہ دین دار اور علم پرور انسان تھا۔ اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک کسی مردِ کامل کی دعا شاملِ حال نہ ہوگی مشکل کشائی محال ہے۔ اُس زمانے میں حضرت مخدوم کی شہرت کابل سے گزر کر بلخ۔ بخارا کی دیواروں تک پہنچ چکی تھی۔ اس لئے قطعِ مسافت کرتا سیدھا اوچ پہنچا۔ اکابر علماء، اور مشائخ سلام کو حاضر ہوئے، مگر مخدوم تو اپنی دنیا کے آپ بادشاہ تھے، باوجود اطلاع کے سلام کو حاضر نہ ہوئے۔ ایک دن صبح کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو بادشاہ کے معتمد وزیر خواجہ جہاں کو مع خلعت فاخرہ کے حاضر پایا۔ اس نے عرض کی کہ بادشاہ زیارت و دعا طلبی کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ حضور یہ خلعت زیبِ تن فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جو لباس معبودِ حقیقی کی عبادت سے مشرف ہو چکا ہے، اُسے مجازی بادشاہ کی ہم نشینی کے لئے بدلا نہیں جا سکتا۔ الغرض حضرت مخدوم نے اسی لباس میں بادشاہ سے ملاقات فرمائی، اور گھر سے دستار منگوا کر پیش کی کہ اسے باندھ لیجئے۔ بادشاہ نے باندھنی شروع کی سات پیچ ہوئے تھے کہ بادشاہ رُک گیا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا، باقی حصہ کاٹ دو۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پیچ ہوں۔ کیونکہ ہر پیچ سے بادشاہی کی ایک پُشت وابستہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے اب سات پشتوں تک تیری اولاد میں حکومت رہے گی آئندہ خدا مالک و مختار ہے۔ ہمایوں حضرت مخدوم کی دعاؤں کے سائے میں رخصت ہوا، اور شب و روز یلغار کرتا سرہند پہنچ گیا۔ اگرچہ غنیم کافی طاقت ور تھا، اور بہت بڑا لشکر لے کر مقابلے میں نکلا تھا، مگر درویش کی دعا اور بلوچوں کی کمک نے اس کے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ سخت خونریز جنگ ہوئی۔ کشتوں کے پشتے لگ

گئے، اور سکندر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ بلوچوں نے اس جنگ میں اپنی شجاعت کے بڑے جوہر دکھائے تھے۔ اپنی قوم کے عظیم لشکر کی کمان خود نواب میر چاکر خاں کر رہا تھا۔ اس کا ولی عہد نواب میر شہداد خاں اس جنگ میں شریک تھا اور اس نے بڑی بہادری دکھائی تھی۔ چونکہ وہ ایک شجاع جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کا قادر الکلام شاعر بھی تھا جو کچھ اس نے جنگ میں دیکھا، اسے بلوچی زبان میں موزوں کر دیا۔ اس جنگنامہ کو مسٹر ایل ڈیمز (M.L. Dames) نے اپنی مشہور کتاب The Popular Poetry of Balochies کے صفحہ ۳۲ پر درج کیا ہے۔

میر شہداد بن چاکر خان کا جنگ نامہ

میر شہداد خان اپنی آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتا ہے :-

"میر چاکر خاں رند نے اپنا لشکر جمع کیا۔ دو تلواروں والے لنگاہ ماہر اور کنگ[1] فاتحانہ جذبے سے سرشار اس کے جھنڈے کے نیچے روانہ ہوئے!

دودائی بھی تلواروں سے مسلح ان کے ہمراہ تھے۔ ان کے خوبصورت کندھوں پر نرم اور خوشبودار ہراتی چمڑے لپٹے ہوئے تھے اور ان کی تلواریں سبز رنگ کی پیٹیوں سے آویزاں تھیں۔

میر چاکر خاں کا لشکر چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ تیس ہزار میر عالی، بلیدی اور دس ہزار رادوچی[2] مزید برآں تھے۔ دشمن کی فوج چار لاکھ نفوس

---

[1] کنگ سہو کتابت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ "لانگ" ہوگا [2] اسی طرح "رادوچی" اس ملک میں کوئی قوم نہیں، "کلاچی" بلوچوں کا ایک زبردست قبیلہ ہے۔ ان کے نام ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ایک تحصیل بھی ہے۔ چاکر خاں کے زمانہ میں کلاچی قوم کی ایک ریاست تھی جس کا پایۂ تخت کوٹ فتح خاں تھا

سے کہیں زیادہ تھی[۱]۔

● طلوعِ آفتاب کے وقت دہلی کی لاتعداد فوج نمودار ہوئی۔ نیزوں کی چھاؤں نے زمین کو ڈھانپ دیا تھا۔ انسانوں اور گھوڑوں سے کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔

● جب جنگ کا طبل بجا تو چالیس ہزار بلوچ حملہ آور ہوئے، جن کے دل خوف سے آشنا نہ تھے۔ وہ تیز ہتھیاروں سے آگے بڑھے۔

● جنگ چھوٹی توپوں کی باڑ سے شروع ہوئی جن کو خاکستری رنگ کے گھوڑوں پر رکھا ہوا تھا۔ ذرا سی دیر میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں!

● اچانک چاکر اعظم کے جھنڈے سے غبار اُٹھتا دکھائی دیا۔ خانِ اعظم کے بائیں جانب بلیدی پسپا ہو رہے تھے۔ اور کئی اپنی جگہ سے بھاگ چکے تھے، میسرہ پیچھے ہٹ آیا۔ رِدّی والے شدّت سے آگے بڑھے۔

● اُس وقت خانِ اعظم میر چاکر خاں کی شیر دل بہن مائی بانڑی ہاتھی کے ہودج میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے طلائی زیورات اتار کر جمع کر لئے اور ایک ایک رند پہلوان کا نام لے کر نچھاور کرنے شروع کئے۔ وہ کہہ رہی تھی:-

● بلوچ بہادرو! تمہاری ماؤں، بیٹیوں، بیویوں، بہنوں اور تمہارے ملک و وطن کی عزت و عصمت خطرے میں ہے۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ ایک بار پانسہ مٹھی میں لے کر پھینک دو۔ یا سب کچھ ہار جاؤ

---

۱ معلوم ہوتا ہے عام تاریخوں میں پیدل فوج نہیں دی گئی۔ میر شہداد نے سوار اور پیادہ تمام فوج کی تعداد بیان کی ہے۔

یا سب کچھ جیت لو!"

میر شہداد کہتا ہے ـــــ "لوگوں نے اپنے باعظمت سروں کی بازی لگا دی۔ یہاں تک کہ ہم کابلیوں سے گتھم گتھا ہو گئے۔ گرم گرم سبز چمکدار تلواریں جو تازہ تازہ سان پر سے چڑھ نکلی تھیں، جوانوں کے سروں اور کندھوں پر کھبنے لگیں۔

•۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جنگجو افغان (شیر شاہی) پیٹھ دے کر بھاگنے لگے اور دلّی کے نمک حرام ترکوں میں بھگدڑ پڑ گئی۔ دُشمن کے دس ہزار آدمیوں کو ہم نے شیر نر کی طرح پھاڑ کر رکھ دیا، یا فنا کی چکّی میں پیس ڈالا۔

•۔ کافر (افغانوں کی غیر مسلم فوج) قتل ہوئے۔ ان کے گھوڑے چھین لئے گئے۔ ان کی نازک اندام بیویاں لونڈیاں بنالی گئیں، اور دہلی کے خزانے لُوٹ لئے گئے۔

•۔ ہم نے دہلی پہنچ کر چار راتیں اس میں گزاریں، تاکہ ہمارے بہادر آرام کریں۔ گھوڑوں کی تھکان دُور ہو اور ان کے پیروں کی سُوجن رفع ہو۔

•۔ ہمارے لشکر سے سات ہزار آدمی کام آئے۔ تین سو بلوچ بھی مارے گئے جن میں علن بھی شامل تھا جو ڈینگیں مارنے والے دُشمن پر حملے میں ہمیشہ پہل کرتا تھا۔

•۔ اس کے علاوہ فوج جو نوحک کے ہمراہ آیا تھا۔ اور بالش، جو خاندانِ شاہی میں سے میر کے ہمراہ آیا تھا، مارے گئے اور میں اپنے

گھرانے کے اٹھارہ نوجوانوں میں سے نو مر گئے اور نو کے ساتھ واپس لوٹ رہا ہوں۔ خدا میر چاکر خان کو سلامت رکھے اور اس کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔"

ہمایوں دہلی کے تخت پر

جب سر ہند سے دشمن شکست کھا کر بھاگ گیا تو ہمایوں فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا دہلی کو روانہ ہوا۔ اور رمضان المبارک ۹۶۲ھ میں اس شہر میں داخل ہوا اپنے آبائی تخت پر جلوس کر کے رفیقوں اور دوستوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ شہنشاہ نے چاکر اعظم کو دہلی سے آگرے کا درمیانی علاقہ، اور ست گھرہ کی ریاست مرحمت فرمائی۔ چاکر اعظم نے اپنے رفیقوں کو تو بلند شہر میرٹھ، تھانہ بھون، غازی آباد وغیرہ سیر حاصل مقامات میں آباد کیا اور اپنے فرزندوں میں سے میر نوح کو دہلی سے آگرہ جانے والی سڑک پر ایک جاگیر مرحمت فرمائی۔ پھر باگڑ خاں (باقر خاں) کو متھرا کے قریب شاہ پور میں میر اللہ داد کو بھی جمنا کے کنارے آباد کیا۔ میر شہداد خاں نے "پنڈی میر شہداد" اور میر شاہو خاں نے "شاہو بلوچ" کے نام سے شہر اور قلعے تعمیر کئے۔ خانِ اعظم میر چاکر خاں کثیر الاولاد تھے۔ ان کے تمام صاحبزادوں کی تعداد معلوم نہیں، اتنا علم ہے کہ رند لاشار جنگ میں میر چاکر کے اٹھارہ بیٹوں نے حصہ لیا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس جنگ میں کتنے کام آئے اور کتنے بچ گئے۔ بہر حال وادیٔ پنجاب میں انہی فرزندوں کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ بلوچوں نے جہاں ڈیرے ڈالے اُس خطۂ ارضی کو بہشتِ بریں کا نمونہ بنا دیا۔ قطاع الطریق، اور چور اُچکے ڈر کر بھاگ گئے۔ پہلے قافلوں کو بھی یہاں سے گزرنے کی ہمت نہیں

مقبرہ حضرت مخدوم محمد غوث بالا پیر قادری

بلوچ قوم کے پیر و مرشد

(ست گھرہ)

پڑتی تھی، لیکن اب بڑھیا زر و جواہر کا تھال اُٹھائے بے خطر سفر کر سکتی تھی۔

سلطان میراں مرزا حسین گورنر ملتان

ترکی امیر البحر سید علی کی مشہور تصنیف "مراۃ الممالک" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ ہمایوں نے دہلی کے تخت پر جلوس کرنے کے بعد سلطان میراں مرزا حسین کو ملتان کا گورنر مقرر کیا تھا۔ وہ ۹۶۱ھ میں اُچ سے ملتان آیا۔ وہ اپنے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"رمضان المبارک میں ہم دریا کے کنارے پہنچے جسے ہم نے کشتی کے ذریعے عبور کیا۔ دریا کی دوسری جانب تقریباً پانچ سو جاٹ ہماری گھات میں بیٹھے تھے لیکن ہمارے پاس آتشیں اسلحہ موجود تھا اس لئے وہ ڈر کر بھاگ گئے۔ ہم بلا روک ٹوک آگے بڑھے اور ۱۵ / رمضان کو ملتان شہر پہنچ گئے۔ یہاں ہم حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ، حضرت شاہ صدر الدین عارفؒ اور قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے مزاراتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرّف ہوئے اور حاکمِ شہر سلطان مرزا حسین سے پروانۂ راہداری حاصل کر کے لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔"

سلطان میراں مرزا حسین کوئی چغتائی شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمایوں کابل فتح کرنے کے بعد جونہی ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا ہوگا تو اس نے پنجاب کو فتح کر کے اپنے خاص معتمد آدمی اس جانب کے عظیم شہروں پر تعینات کئے ہوں گے۔

حضرت مخدوم سیّد حامد جہاں بخشؒ کے لمحاتِ آخر

حضرت مخدوم سیر و سیاحت کے دلدادہ تھے، اُچ میں بہت کم رہتے تھے۔ مقاماتِ داؤدی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کئی بار لاہور جاتے ہوئے ست گھرہ سے گزرے۔ ملتان تو ویسے بھی سیاست اور روحانیت

کا مرکز تھا، اور لاہور، دہلی کے راستے میں بھی تھا۔ یہاں حضرت مخدوم اکثر و بیشتر تشریف لاتے تھے۔ آپ بالعموم سادہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ

"مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ وہ مخلوق کے لئے اس طرح کے کارنامے پیش کرتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے باعتبار ثابت ہوں لیکن کار با خلاق است با خلق چہ کار؟"

وحدتِ وجود کا مسئلہ ہر وقت پیشِ نظر رہتا تھا اور فرماتے

"سالک اعمال ظاہر را بہ شریعت نماید اما وصول بحق کار باطن است و آں بگفت و شنید راست نمی آید۔"

فقہا کے قول الغنا ینبت النفاق پر تعجب کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ غنا اور نفاق میں کیا نسبت! جو شخص اپنی ہستی سے بے خبر ہو جاتا ہے اسے نفاق و سماع میں کیا تمیز ہو سکتی ہے؟ ہاں، اگر اس گروہ کے ساتھ مخصوص ہو جو بیکار اور تابعِ شہوات ہیں تو اور بات ہے۔

آخر عمر میں طبیعت پر خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہو گیا تھا۔ بڑا گریہ کرتے اور فرماتے کہ جب خدا تعالیٰ کی کبریائی اور بے نیازی پر نظر پڑتی ہے تو تمام طاعات و عبادات بے وزن معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کیا معلوم کہ انجام کیا ہو گا۔ رحلت کے قریب گریہ و قلق اتنا بڑھ گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بے اختیار پُر آب ہو جاتی تھیں۔ حضرت مخدوم نے ۱۹، ذی قعدہ ۹۷۸ھ بعد غروب آفتاب جان جان آفرین کے سپرد کی ؂

شیخ حامد گنج بخشِ دو جہاں ٭ شد بملکِ خلد زایں فانی سرا
شیخ محبوب است سال وصل او ٭ نیز حامد شاہ سیّد مقتدا

جلال الدّین محمد اکبر شہنشاہِ ہند

سنہ ۹۶۳ھ (سنہ ۱۵۵۶ء) میں سلطان نصیر الدین محمد ہمایوں کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اور اس کی جگہ کلانور کے مقام پر جلال الدین محمد اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت ۱۳ برس ۹ ماہ تھی۔ بیرم خاں اس کمسن بادشاہ کا سپہ سالار اور اتالیق مقرر ہوا۔ تمام مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ملکی اور جنگی نظام میں اکبر کے پایہ کا پھر کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ بندوبست، مالگزاری کے عمدہ قوانین اگرچہ شیر شاہ کے زمانے میں ہی بن گئے تھے، لیکن ان پر صحیح طور پر عملدر آمد اکبر کے عہد میں ہی ہوا۔ اکبر بڑا ذہین، بہادر اور اپنی عادتوں کے لحاظ سے نہایت اعتدال پسند بادشاہ تھا۔ اگرچہ وہ معمولی نوشت و خواند جانتا تھا۔ لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث مشکل سے مشکل امور کی بابت صحیح رائے قائم کر لیتا تھا۔ گو آخری عمر میں اس کے مذہبی خیالات بہت کچھ بدل گئے، لیکن انجام کار ایک صحیح الاعتقاد مسلمان کی موت مرا۔

جہانگیر نے اپنے جلیل القدر باپ کے لمحاتِ آخر کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا ملخّص یہ ہے کہ جب اکبر اعظم کو یقین ہو گیا کہ اس کا وقت آخر قریب ہے تو اس نے تمام امراء کو طلب کر کے مرتعش آواز میں فرمایا:۔

"میرے جاں نثار رفیقو! میں نے ایک عرصہ تمہارے ساتھ بسر کیا۔ اب ملکِ عدم کا سفر درپیش ہے۔ جہاں نیک اعمال کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں جا سکتا۔ اس لئے خوشی خوشی مجھے رخصت کرو، اور اگر میں نے تمہارے ساتھ زیادتی یا کمی کی تو معاف کر دو!"

پھر اکبر میراں صدر جہاں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا :۔

" اب تک مجھے امید تھی کہ حیات بخش لم یزل مجھے حیاتِ تازہ عنایت فرمائے گا اس لئے کلمۂ شہادت پڑھوانے میں تامّل کیا، مگر اب یقین ہو چکا ہے کہ رفیقِ اعلیٰ کا حکم آپہنچا ہے۔ اس لئے آگے آؤ اور کلمۂ شہادت پڑھو! "

میراں صدر آگے بڑھ کر دو زانو ہو بیٹھا اور کلمہ پڑھنے لگا۔ اکبر نے بلند آواز سے کہا

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

پھر فرمایا، اے میراں صدر! اب تو میرے سرہانے بیٹھ کر سورۂ یٰسین اور دُعائے عدیلہ پڑھ!

میراں صدر نے تلاوت شروع کی اور اکبر ہمہ تن گوش ہو کر سُننے لگا۔ اِدھر دُعا ختم ہوئی اُدھر بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور رُوح اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی۔

صُوبہ ملتان کی وسعت

اکبر اعظم کے زمانے میں صوبہ ملتان سلطنت دہلی کے ماتحت تھا، مگر ڈیرہ جات پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔ صوبہ ملتان کی حدود کیچ مکران سے ملتی تھیں۔ اور اس کی لمبائی کیچ تک ۶۶۰ کوس ہو گئی تھی۔ اس وقت مشرق کی جانب سرکار ہند، مغرب کو کیچ مکران، شمال کی طرف پرگنہ کوہستان تک جنوب میں صوبہ اجمیر تک صوبہ ملتان پھیلا ہوا تھا۔ آئینِ اکبری اور خلاصۃ التواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مغل دور میں ملتان مُلکِ ہند کا بہت بڑا اور عظیم صوبہ تھا۔ اس کے تین حصے تھے۔ سرکارِ خاص ملتان، سرکار بھکر، سرکار دیپال پور جن میں ۸۸ پرگنے تھے۔ صوبہ سے صوبہ، سرکار سے کمشنری یا ضلع اور پرگنہ سے ذیل تصوّر ہوتی تھی۔

آئینِ اکبری کے مطابق پیمائش ۳۲ لاکھ ۷۳ ہزار ۹ سو ۲۲ بیگھہ مروجہ درج ہے۔ جمع نقدی پندرہ کروڑ ۱۴ لاکھ ۳ ہزار ۶ سو ۱۹ درم تھی۔ اور چھ دریا اس صوبہ کو سیراب کرتے تھے۔ سندھ، چناب، جہلم، راوی، بیاس، گھارہ اس صوبہ کی حدود سلطنتِ مغلیہ کے محمد شاہی دور تک یہی قائم رہی۔

ڈیرہ جات کی بلوچ ریاستیں

"انڈیا آف اورنگزیب" کا فاضل مصنف ایم سی سرکار صفحہ ۲ میں لکھتا ہے، کہ راجہ ٹوڈرمل نے عہدِ حاضر کی پالیسی کے مطابق ہند اور خراسان کے درمیان ایک بفر سٹیٹ قائم کردی تھی۔ جس کی بنا پر دین کوٹ سے سیت پور کا علاقہ معمولی حقوق کے بدلے بلوچوں کے حوالے کر دیا تھا۔ جس کی بدولت خراسان اور ہند کے درمیان دو سو سال کے لئے ایک زبردست دیوار کھڑی ہوگئی یہی مؤلف اسی کتاب میں خلاصۃ التواریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"ملتان سے پانچ کوس کے فاصلے پر چناب سے پرے بلوچوں کا ملک ہے وہاں دو سردار ہیں، ایک دودائی جس کے پاس تین ہزار گھوڑسوار اور ۵۰ ہزار پیادہ فوج ہے۔ دوسرا ہوت جس کے تحت ۲۰ ہزار سوار اور ۳۰ ہزار پیادہ فوج ہے، ان کے سفیر ملتان میں رہتے ہیں۔ شہنشاہ کے احکام بجالاتے ہیں اور صوبائی گورنر کی راہنمائی میں کام کرتے ہیں، بلوچوں کی یہ ریاستیں آبادی اور پیداوار فصلات کی کثرت کے سبب مشہور ہیں۔ یہاں دولت کی بڑی فراوانی ہے اور یہ علاقہ چوروں اور ڈاکوؤں سے پاک ہے[1]۔"

ملتان کے اکبری گورنر

۱۵۶۱ء میں مغل حکومت نے بہرام کو شکست دی اور صوبہ ملتان محمد قاسم خاں نیشاپوری کو

[1] INDIA OF AURANGZEB

بر اگیر کے طور پر دیا گیا۔ ۱۵۷۰ء میں خان جہان لودھی کو ملتان کی گورنری عنایت ہوئی۔ ۱۵۷۳ء میں محمد سلطان مرزا ایک مغل سردار نے اکبر کے خلاف سرکشی کی اور وہ پنجاب سے گزرتا ہوا ملتان پہنچا۔ تلمبہ کے قریب اسی خاندان کا ایک سردار ابراہیم حسین مرزا شکار سے واپس آ رہا تھا کہ شاہی فوج سے اس کی مٹھ بھیڑ ہو گئی، جس کے دوران اس کا بھائی گرفتار ہو گیا۔ ابراہیم حسین پسپا ہوا۔ دریائے گھارا عبور کر رہا تھا کہ ماہی گیروں کی قوم جھبیل میں سے کسی شخص نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ گلے کے پار ہو گیا۔ چنانچہ اس حالت میں اسے گرفتار کر کے ملتان بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد سید خاں چغتائی صوبہ دار مقرر ہوا۔ ۱۵۸۶ء میں عبدالصمد خاں کو ملتان کا دیوان بنایا گیا۔ ۱۵۹۱ء میں صوبہ ملتان خان خاناں کی جاگیر میں دے دیا گیا۔ ۱۵۹۳ء میں اس کا بیشتر حصہ مرزا رستم صفوی کو عنایت ہوا۔ ۱۵۹۶ء میں یہی جاگیر مرزا عزیز کوکلتاش کے نام منتقل ہوئی۔ ۱۶۰۲ء میں سعید خاں چغتائی کو ملتان کی صوبیداری تفویض ہوئی۔

اکبر اعظم کے زمانے میں یہاں ایک ٹکسال بھی قائم ہوئی تھی۔ جس میں چاندی اور تانبے کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔

قطب زماں شیخ کبیر سہروردیؒ

حضرت غوث زماں شیخ بہار الدین ثانی قریشی علیہ الرحمۃ کے بعد بالاتفاق حضرت شیخ کبیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے سجادہ نشین قرار پائے۔ آپ نے نعمت باطنی اپنے والد ماجد سے پائی تھی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ آپ کے چہرے سے عجب شکوہ ٹپکتا تھا اور ملتان کے لوگ ان کے اس قدر معتقد تھے کہ اگر یہ چاہتے تو ایک دن میں ہزار سوار بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کے پاس جمع

ہو جاتے۔ ذکر و شغل اس قدر فرماتے کہ ان کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سُرخ رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے عوام انہیں مغلوب الحال خیال کرتے تھے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ میں نے شیخ کو حسن خاں ٹکریہ کے ہمراہ فتح پور سیکری میں دیکھا تھا۔ حضرت نے ۹۹۵ھ میں دارِ فانی سے عالمِ قدس کو انتقال فرمایا اور اپنے آبار کرام کے مقبرے میں سپردِ خاک ہوئے۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کا فتح پور سیکری تشریف لے جانا کس سلسلے میں تھا۔ اکبری دربار میں سہروردیہ سلسلے کے بے شمار خدّام موجود تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی استدعا پر بادشاہ کی اصلاح کے لئے تشریف لے گئے ہوں، جیسا کہ مآثر الامرار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہباز خاں کنبوہ کی دین کے معاملے میں بادشاہ سے سخت جھڑپ ہوئی تھی اور اکبر بے تحاشا بے دینی کی طرف کھچا چلا جا رہا تھا۔ حسین خاں ٹکریہ، شہباز خاں کمبوہ، مولانا جمالیؒ کے فرزند شیخ گدائی اور ان جیسے ہزاروں ارادت مند اس نواح میں موجود تھے۔ نیز ان کا اپنا خاندان بھی یہیں آباد تھا۔ شیخ بہاء الدین قریشیؒ، مفتی اعظم آگرہ اور ان کے صاحبزادے شیخ جنیدؒ کی بڑی شہرت تھی اور شیخ ابوبکر حاکمیؒ کا آستان بھی روحانی دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا تھا، مگر افسوس ہے کہ ان کی علمی اور روحانی مصروفیتوں کا کسی تذکرے میں سراغ نہیں ملتا۔

صاحب خزینۃ الاصفیار نے عبدالرحیم خان خاناں سے متعلق ایک ایسا واقعہ درج کیا ہے۔ جس سے حضرت کے کشف کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتا ہے کہ جب عبدالرحیم خان خاناں بادشاہ کے حکم سے سندھ کی مہم پر مقرر ہوا تو وہ لاہور میں شیخ حسین کی خدمت میں باریاب ہوا اور پانچ سو روپے نذر گزار کر دعا کی

درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا کہ :۔

"ملک ٹھٹھہ را بپانصد روپیہ نزد تو فروختیم۔ مظفر و منصور خواہی شد اما بعد ازیں از کسے ولی استمداد نکنی ______!"[1]

یعنی ہم نے ملک ٹھٹھہ پانچ سو روپیں تیرے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ انشاءاللہ تو مظفر و منصور آئے گا۔ لیکن اس کے بعد کسی دُوسرے ولی سے امداد طلب نہ کرنا۔

عبدالرحیم خانخاناں لاہور سے روانہ ہو کر ملتان پہنچا اور حضرت شیخ الاسلام ذکریا ملتانی قدس سرہٗ کے آستان قدسی نشان پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھا اور مخدوم شیخ کبیر علیہ الرحمۃ کی خدمت میں مبلغ یکصد روپے نذر گزارے۔ حضور نے نذرانہ قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "ملک ٹھٹھہ از پیش گاہ حسین لاہوری بتو عطا گردیدہ است حالا حاجت نذرانہ گرفتن نیست"۔ یعنی ملک ٹھٹھہ آپ کو شیخ حسین لاہوری کی سرکار سے عنایت ہو چکا ہے۔ اس لئے نذرانہ قبول کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس واقعہ سے حضرت کے روحانی مرتبہ کی نشاندہی ہوتی ہے ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۱۴۵

شمس العارفین، سلطان السالکین

مخدوم سیّد حافظ

ابو الحسن محمدؐ جمال الدّین پیر موسیٰ پاک شہید

علیہ الرحمۃ والغفران

ولادت
۹۵۲ سنہ ہجری

وفات
۲۳ شعبان ۱۰۱۰ سنہ ھ

مزار شریف
ملتان

نسب نامہ حضرت مخدوم ابوالحسن جمال الدین موسیٰ پاک شہیدؒ

سیدنا غوث الاعظم

↓

سیدنا سیف الدین عبدالوہابؒ ← شیخ ابونصر صفی الدین عبدالسلامؒ

مخدوم سید محمد غوثؒ ← سید شمس الدین محمدؒ ← سید شاہ میرؒ ← سید علیؒ ← سید مسعودؒ ← سید احمدؒ

مخدوم عبدالقادر ثانیؒ ← مخدوم سید عبدالرزاقؒ

مخدوم سید حامد جہاں بخشؒ

سید نظام الدین عبدالقادرؒ — مخدوم جمال الدین سید محمد موسیٰؒ پاک شہیدؒ

مخدوم سید حامد گنج بخشؒ — سید جان محمدؒ — سید علیؒ — سید یحییٰؒ

مخدوم سید فتح علی المعروف نولے موسیٰ پاک دین

مخدوم سید عبدالقادر ثالثؒ — سید حامد — سید حسین

سید اسمٰعیلؒ

مخدوم سید محمد غوثؒ — سید غلام نبی شاہ

سید فتح محمد شاہ — سید دین محمد شاہ الملقب سید حامد بخش ثالثؒ — سید گل محمد شاہ

سید کمال الدین — سید جمال الدین الملقب بہ سید عبدالقادر چہارم

سید صدرالدین شاہ الملقب بہ سید محمد غوث ثالثؒ — سید محمد شاہ — سید احمد شاہ

مخدوم سید محمد غوث ثالثؒ

پیر نور شاہ الملقب بہ مخدوم حامد گنج بخش چہارم — سید غوث بخش شاہ — سید محسن شاہ

پیر ولایت شاہ الملقب بہ مخدوم شیخ عبدالقادر خامس — سید شادی شاہ — سید پیر شاہ

الحاج مخدوم سید صدرالدین شاہ حسنی الحسینی — سید راجن بخش شاہ — سید شبیر شاہ

الحاج مخدوم زادہ غلام یٰسین شاہ — مخدوم سید غلام مصطفےٰ شاہ ←

سید مختار حسین شاہ ← سید محمد رضا شاہ

سید حامد رضا شاہ

مخدوم سید غلام مصطفےٰ شاہ

سید محمد ولایت حسین شاہ — مخدوم سید شوکت حسین شاہ سجادہ نشین

سید محمد علمدار حسین شاہ ← سید رحمت حسین شاہ ← سید فیض مصطفےٰ شاہ

حضرت مخدوم سید حامد جہاں بخش علیہ الرحمۃ کے دو صاحبزادے تھے۔ سیّد نظام الدین عبد القادر اور سیّد جمال الدین موسیٰ (رحمہما اللہ تعالیٰ) دونوں کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ بڑے صاحبزادے کی طبیعت میں جلال کا جذبہ زیادہ تھا۔ مگر چھوٹے صاحبزادے جمال ہی جمال تھے۔ حضرت مخدوم کو چھوٹے صاحبزادے سے بڑی محبت تھی۔ یعنی یعقوبؑ اور یوسفؑ کا ہی معاملہ تھا۔ بڑے صاحبزادے نے چھوٹے بھائی پر جب اس قدر نوازشات مبذول ہوتی دیکھیں تو ان میں ایک قسم کا رشک سا پیدا ہو گیا۔ اور اس کوشش میں رہنے لگے کہ آپ مخدوم صاحب کی پیشی میں نہ رہ سکیں اور سجّادگی کی وصیت میرے حق میں ہو۔ چنانچہ حضرت کو مجبور کر کے سیّد جمال الدین موسیٰؒ کو سندھ کی جاگیر پر بھجوا دیا۔ حضرت موسیٰ پاک علیہ الرحمۃ نے اپنے والد ماجد کے لمحاتِ آخر کا جو نقشہ اپنے قلم سے کھینچا ہے، وہ بڑا دلچسپ اور مفصل ہے۔ ہم بجنسہٖ اسے یہاں درج کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"میرے ساتھ حضور کو خاص محبت تھی۔ مجھے اکثر اوقات فرماتے تھے مجھے تیرے ساتھ باپ بیٹے کی محبت کے ساتھ ایک اور محبت بھی ہے اور وہ محبت الٰہی اور عنایت لایزالی ہے۔ چنانچہ حضور نے اپنی زندگی میں ہی مجھے اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ اور خلافت و سجادگی عنایت فرما دی تھی۔ یہ سب معاملہ با اشارۂ

روحانی حضرت غوث صمدانی قدس سرہ العزیز انجام پذیر ہوا۔

حضرتِ والد ماجد نے مرض الموت میں مجھے یاد فرمایا۔ میرا بڑا بھائی عبدالقادر نہ چاہتا تھا کہ میں آؤں۔ کسی بہانے سے انہیں علیحدہ کر کے رقعہ لکھ کر مجھے بُلایا۔ جب میں حاضر ہُوا تو حضرت مخدوم رونے لگے۔ مجھ پر بھی گریہ طاری ہُوا اور والد بزرگوار کی چھاتی سے چمٹ گیا۔ جب ذرا سکون ہُوا تو فرمایا:۔

"بابا، میں نے تمہارے ساتھ خلوت میں کچھ باتیں کرنی ہیں"۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ حضرت مخدوم کی حالت اس قدر نازک تھی کہ دیکھی نہ جاسکتی تھی، آپ کی تکلیف کو دیکھ کر کئی بار مجھ پر بے ہوشی طاری ہوئی۔ آپ مراقبہ میں سرنگوں تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کی کہ صاحبزادہ دفورِ غم سے گھلا جا رہا ہے۔ آپ نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور فرمایا:۔

"بابا! خیر ہے، تسلّی کرو۔ میری حالت نسبتہً اچھی ہے"

تکیہ اپنے دست مبارک سے آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا:۔

"نورِ چشم! ذرا آرام کر لو، ایسا نہ ہو کہ تکان کی وجہ سے
تکلیف ہو جائے، اور میرے لئے زیادہ پریشانی کا موجب بنے"۔

میں آپ کے اصرار پر لیٹ تو گیا، مگر نیند کہاں! میں پھر اُٹھ بیٹھا اور نصائح و وصایا سے مشرف ہوتا رہا۔ وفات سے دو یوم پہلے تمام کنبہ کو بلایا اور میری موجودگی میں میری والدہ، خالہ اور بھائی بہنوں کی طرف علیحدہ علیحدہ نظر اُٹھا کر توجہ فرمائی۔ پھر ارشاد ہُوا کہ

"جاؤ! میں نے تمہیں خدا تعالیٰ کے سپرد کیا، تم بھی مجھے اللہ
تعالیٰ کے سپرد کر دو!"

آخری شب کو میرا ہاتھ پکڑا اور صبح تک پکڑے رہے۔ بعض وقت مجھے دیکھ بھی لیتے۔ اللہ اللہ وردِ زبان تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں جمعہ کا سارا دن اسی حالت میں گزرا۔ صرف نماز کے وقت سکون ہو جاتا۔ پھر وہی بے چینی اور پریشانی کا عالم طاری ہو جاتا۔ انجام کار ۱۹ ذی قعدہ ۹۷۸ھ شنبہ کی رات کو مغرب کے بعد، کہ سُرخی ابھی افق پر موجود تھی، بآوازِ بلند "اللہ اللہ" کہتے ہوئے حضرت نے پاؤں دراز فرمائے اور جان جان آفرین کے سپرد کی۔"

نزاعِ جانشینی

اگرچہ حضرت سیّد جمال الدین موسیٰ پاک قدس سرّہٗ کو والد بزرگوار اپنی زندگی میں ہی جانشین نامزد فرما چکے تھے، لیکن آپ کے بڑے بھائی سیّد عبد القادر نے اس سلسلے میں نزاع پیدا کیا کہ سجادگی میرا حق ہے۔ چنانچہ یہ امر دربارِ شاہی تک جا پہنچا۔ اُن دنوں دہلی کے تخت پر جلال الدین محمد اکبر بادشاہ رونق افروز تھے۔ دربار سے ان بزرگوں کو فتح پور سیکری میں حاضر ہونے کا حکم ہُوا۔ جس پر بُرجِ معرفت کے یہ شمس و قمر کئی کوسوں کا سفر طے کر کے بہزار دِقّت دار الحکومت میں حاضر ہوئے۔ اکبر نے علماء و قضاۃ اور رؤسائے ملّت کو تفتیش و تحقیق پر مامور کیا۔ تفتیش کے دوران سیّد عبد القادر نے حضرت والد ماجد کا قرآن شریف، مجموعہ اوراد اور چند تبرکات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر چھوٹے بھائی صاحب ولی عہد ہوتے تو یہ چیزیں ان کے پاس ہوتیں۔ طے پایا کہ اس بارے میں خود قرآن مجید سے مشورہ لیا جائے۔ چنانچہ مصحف مبارک کو کھولا گیا تو پہلے پہل یہ آیت کریمہ نظر آئی:

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ

چونکہ یہ آیہ کریمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب تھی، اس لیے اراکین

مجلسِ شوریٰ نے فیصلہ آپ کے حق میں لکھ کر دربار میں پیش کیا۔ جس پر بادشاہ نے آپ کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس واقعہ سے دونوں بھائیوں میں تلخی پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے اکبرؔ نے مصلحتہً سیّد عبدالقادر کو تو اپنے پاس رکھا اور حضرت موسیٰؒ کو فوجی افسر بنا کر دکن کی طرف جہاد پر بھیج دیا۔

ملّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کو اکبری دربار میں رہتے ہوئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک دن جبکہ اکبر دربار میں پوست پی رہا تھا، سیّد عبدالقادرؒ تشریف لائے۔ اکبر نے بے محابا یہ شغل جاری رکھا، بلکہ آپ کو بھی پوست نوشی کی دعوت دی۔ آپ بے حد جوشیلے درویش تھے۔ غصّہ سے کانپ اُٹھے اور فرمایا

"اے مردِ ناحق شناس! تو خود بھی گناہوں سے ملوّث ہو رہا ہے اور مجھے گناہوں کی دلدل میں پھنسانا چاہتا ہے۔ کیا ایسا کرتے ہوئے تجھے خدا سے شرم نہیں آتی!"

اس وقت تو اکبرؔ خاموش ہو رہا۔ لیکن اور موقع پر جبکہ آپ دیوانِ عام میں نوافل ادا کر رہے تھے، مخاطب کر کے کہا:-

"حضرت! آپ کا یہاں نوافل ادا کرنا آدابِ دربار کے خلاف ہے"۔

آپ نے "الملک للہ" کا نعرہ لگایا اور اس قدر غضب ناک ہوئے کہ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ اکبر پر غیظ و غضب کی نگاہ ڈالتے ہوئے فرمایا:-

"اچھا اپنے دربار میں خدائے ذوالجلال کا ذکر بھی گوارا نہیں، سُنو اکبر! یہ حکومت، جس پر تمہیں اس قدر ناز ہے، بہت جلد تمہارے خاندان سے چلی جائے گی!"

اتنا کچھ کہا اور دربار سے باہر نکل آئے۔

اکبر شیخ کی بد دعا سے کانپ اٹھا۔ آپ کو منانے کے لئے ہزار جتن کئے سواری اور پیادوں کا بندوبست بھی کیا، مگر آپ راضی نہ ہوئے اور پیرانِ پیر کے گھرانے کا یہ شیر ٹڑاں گہ جتا بوستا اُچ کو روانہ ہو آیا۔

اکبر کو جب سید عبدالقادر کے منانے میں کامیابی نہ ہوئی تو حضرت موسیٰ کو دکن سے واپس بُلا بھیجا اور شاہ صاحب کی گرم کلامی کا ذکر کر کے دُعا طلبی کی التدعا کی۔

آپ نے فرمایا کہ فقیر سید عبدالقادر کا تیر تو واپس نہیں لا سکتا۔ البتہ عرصہ حکومت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ آپ تسلّی رکھیں کہ پانچ پشتوں تک آپ کی اولاد سے حکومت نہ جائے گی۔ اس کے بعد چند ایام آپ نے بھی دربار میں گزارے، مگر فتح پور کا رنگین ماحول آپ کو پسند نہ آیا، اور اجازت لے کر ملتان کا عزم کیا۔

اکبر فقراء اور مشائخ کا بے حد معتقد تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ جیسے صالح اور زاہد درویش کے وجود سے دربار خالی ہو جائے۔ مگر آپ کے اصرار پہ پانصدی کا منصب عطا کر کے نہایت عزّت و احترام کے ساتھ رخصت کیا اور سرکاری طور پر آپ کے سفر کا انتظام بھی کر دیا۔

حضرت مخدوم موسیٰ پاکؒ کا علمی و روحانی مقام

آگرہ سے مرخص ہو کر آپ دہلی وارد ہوئے۔ یہاں عہدِ آخر کا غزالی اور دُنیائے علم و ادب کا شہریار مولانا شیخ عبدالحق محدّث دہلوی جو گوشۂ عافیت میں بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا۔ رات کو عالمِ خواب میں رسالت

پناہی سے اشارہ پاکر ۲۱ شوال ۹۸۵ھ کی صبح کو حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے درجۂ کمال کو پہنچا۔ مولانا نے اپنی بیعت کا واقعہ خود اپنے قلم سے اخبار الاخیار کے تتمے میں درج کیا ہے یہ اتنا دلچسپ اور ایمان افروز ہے کہ اس کا ملخّص یہاں درج کرنے پر قدرتاً مجبور ہو رہا ہوں۔ اگرچہ یہ مولانا کے متن کا اردو ترجمہ ہے۔ اور اصل و ترجمہ میں جو فرق ہوتا ہے، وہ بہر حال یہاں بھی ہے، تاہم اس سے شیخ کی عقیدت اور حضرت موسیٰ پاکؒ کی علمی اور روحانی حیثیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"میں تاج البلاد دہلی میں بیٹھا لوگوں کو علمِ حدیث کی تعلیم دے رہا تھا۔ ہزارہا تشنگانِ علوم میرے حلقۂ درس میں شریک ہو کر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دلوں کو گرما رہے تھے۔ لیکن میرا اپنا دل سیماب وار بے قرار تھا اور میری آنکھیں بیضۂ چشم میں بے تابی سے کسی مردِ کامل کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسی سچی تڑپ اور طلبِ صادق میں میرے لیل و نہار بسر ہو رہے تھے۔ آخر کار میری نیت کا پودا بار آور ہوا اور میرے سر پر ایک عیسیٰ نفس آپہنچا جس کا ہر نفس آسمانِ معرفت کا مائدہ نازل اور ہر کرشمہ اواخر و اوائل کے لئے عید و سرور تھا۔

موسیٰ مقام، کہ جس کے حسن و جمال کی چمک شجرِ توحید سے ضو فشاں تھی! جس قدر مناقب و کلام حضرت کلیم اللہ کے حق میں وارد ہوئے ہیں۔ اس پاکباز پر صادق اور اس کے حال پر موافق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہدِ قدرت نے اس ذاتِ پاک کو قلبِ موسیٰؑ پر پیدا کیا ہے۔ یہ منقبت افزوں ہے کہ یہ جگر گوشۂ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ اگرچہ وہ مقتدائے اولیاء عالی مرتبت رسول اور پیغمبر ہے ؎

اے دیدہ بیا لقائے منظور ببیں   آں جُبّہ و آں جمال و آں نُور ببیں
در وادیٔ ایمن بمحبت بگزر   موسیٰ و ہم درخت و ہم طُور ببیں

یہ ذات ایسی حمیدہ صفات، جانشین حامد اور مقام محمود کی وارث واقع ہوئی ہے کہ اگر کوئی بڑے سے بڑا ثناخواں ان کے محامد و محاسن کو شمار کرنا چاہے تو گنتے گنتے بے اختیار کہ اُٹھے کہ یہ کام میرے امکان سے باہر ہے۔

الحاصل جونہی یہ آفتاب دین و دولت طلوع ہُوا۔ میری آنکھیں اس کے نُورِ جمال سے روشن، دل منوّر اور جان باغ و بہار ہو گئی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی دل بے قابو ہو گیا، پائے عزّت کو بوسہ دے کر یوں عرض گزار ہُوا ؎

مدّتے بود کہ مشتاقِ لقایت بودم
لاجرم روئے ترا دیدم و از جا رفتم

اس کے بعد اپنے مقصد کو خدمتِ اقدس میں عرض کرنے کے لیے زبان کو حرکت دی مگر وہ توصفائی باطن سے میرا ظاہر باطن سب جانتے تھے اور مقصد و مقصود سمجھے ہوئے تھے۔ میری سچی پیاس کی تحقیق و تفتیش کی غرض سے امتحان کے طور پر فرمایا

"اے تشنہ کام! ہم تم سب ایک دریا کی نہریں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم سمندر کے طلبگار بن کر آئے ہو، اور میری حالت یہ ہے کہ میں بھی دُوسروں کی طرح خود کو اس بحرِ بیکراں کی ایک نہر جانتا ہوں۔ تم جس نہر کو زیادہ شیریں اور اس کے پانی کو زیادہ صاف شفاف سمجھو، اس کی طلب میں کوشش کرو، اور اگر یہ نہیں چاہتے کہ اپنے اختیار کو کام میں لاؤ اور صرف امتحان مدِ نظر ہو تو پھر خود کو سمندر کے حوالے کر دو

اور اس کی توجہ کے منتظر رہو۔ تاکہ وہ تمہیں جس راہ سے چاہے بلائے اور جہاں چاہے پہنچا دے۔"

یہ سُن کر میری بے ساختہ چیخ نکل گئی اور عرض کیا کہ

"میں حیران و پریشان
ساحلِ حیرت پر کھڑا ہوں
سمندر کو مجھ سے کیا واسطہ جو میری آواز سُنے
اور اس کو کیا پڑی ہے کہ میری چیخ و پکار پر کان دھرے۔ میں نے اپنے آپ کو حضرت کے حوالے کر دیا ہے، آپ جہاں چاہیں پہنچا دیں۔"

ارشاد فرمایا۔

"اے عزیز! مایوس نہ ہو، تم کو سمندر سے خاص واسطہ اور تعلق ہے۔ اگر بفرضِ محال اس سے کوئی شناسائی نہ بھی ہو
تب بھی وہ دریائے رحمت تمام پر محیط ہے
چاہے کوئی چھوٹا ہو یا بڑا
ناقص ہو یا کامل
یاد رکھو!
وہ ضرورت کے وقت فریاد سُنتا اور تنگی کے وقت دستگیری فرماتا ہے۔"

غرضیکہ میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا اور پہلی ہی رات میں میرا مطلب حاصل ہُوا۔ چنانچہ کہنے والے نے کہا کہ یہی مطلوب ہے اسے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دُرِ مقصود ہاتھ میں آچکا ہے۔ اگر ضائع کر دیا تو ساری عمر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔

صبح سویرے میں خدمتِ عالیہ میں حاضر ہُوا۔ بے تحاشا ان کے قدموں میں

گر پڑا، اور اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ ۶ شوال ۹۸۵ھ کا واقعہ ہے والحمد للہ رب العالمین!"

الغرض شیخ عبدالحق اور ان جیسے صدہا متلاشیانِ حق کو اپنے حلقۂ ارادت میں لے کر حضرت آگے بڑھے۔ راستے میں جہاں کہیں موقع ملا ساکنانِ خطۂ ارضی کو وہ شرف و کمال بخشا کہ فلک الافلاک کے ملائکہ بھی رشک کھا اُٹھے۔

بالآخر اس طویل سفر کو ختم کر کے حضور بخیر و خوبی اپنے محبوب والد ماجد کی آخری آرام گاہ پر اُچ میں حاضر ہوئے اور مرقدِ اطہر کی خاکِ پاک کو آنکھوں کا سُرمہ بنایا اور پھر اُن کے عطا کئے ہوئے خرقہ اور بوریہ کو زینت دے کر رُشد و ہدایت کا دروازہ کھول دیا۔ ہزاروں فاسق و بدکار آپ کی توجہ سے قطب اور ابدال بنے۔ سینکڑوں نے بایزیدؒ و جنیدؒ کا درجہ پایا۔

حضرت محدّث علیہ الرحمۃ کی خود نوشت سوانح حیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مخدوم کچھ عرصہ کے بعد مستقل طور پر ملتان منتقل ہو گئے تھے۔ ۹۸۶ھ میں حضرت محدّث پیرِ طریقت کی قدمبوسی کے لئے اس جانب تشریف لائے تو حضرت مخدوم ملتان میں تھے۔ ۹۸۷ھ میں توفیق ایزدی اُنہیں پھر ملتان لے آئی اور چار سال مرشد کے قدموں میں پڑے رہے۔ ۹۹۵ھ میں حضرت محدّث حج کی غرض سے ارضِ مقدس کو تشریف لے گئے اور پانچ سال دیارِ حبیبؐ میں رہ کر پانچ حج کئے ۱۰۰۰ھ میں واپسی ہوئی تو پہلے ملتان حاضر ہو کر حضرت شیخ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر دہلی تشریف لے گئے۔ مگر مرشد کی محبت قلب و دماغ پر کچھ اس طرح سے مستولی ہو چکی تھی کہ ہر وقت ملتان کا تصور آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ حضرتِ عشق کا ہی فیضان ہے جو دیارِ محبوب کا ہر کانٹے کو پھول سے زیادہ حسن و جمال عطا

کرتا اور اُسے عاشق کی نگاہوں میں دُنیا و مافیہا سے حسین تر بنا دیتا ہے۔ دہلی میں کس چیز کی کمی تھی۔ اس کے سر بفلک قلعے، حسین و جمیل محلات، مشائخ و فقراء کے پُر شکوہ مقابر، علماء و صوفیاء کے بابرکت اجتماعات، قال و حال کی مجلسیں، پھر حضرت محدث کا اپنا علمی حلقہ کیا کم تھا۔ مگر پیرِ دستگیر کی کشش نے شیخ کی نگاہوں میں ان سب کو ہیچ بنا دیا۔ علم و فضل کی نخوت پر حضرتِ عشق کا سوز و گداز غالب آیا۔ اور آپ ہر وقت مرشد کے ہجر و فراق میں اپنے جذبات کا اظہار اشعار میں کرنے لگے۔ اس وقت آپ کی نگاہوں میں ملتان سے حسین تر ین اور کوئی شہر نہ تھا چنانچہ بادِ نسیم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اے باد گذر کن بدیارِ ملتان　　زیں راہ نشیں خاکسارِ ملتان

ایں تحفۂ جاں ببر بیارِ ملتان　　یک جان چہ ہزار جاں نثارِ ملتان

یعنی اے بادِ نسیم! اس خاکسار کی طرف سے ملتان شہر کی جانب گزر کر، اور میری جان کا یہ تحفہ ملتانی محبوب کی خدمت میں لے جا۔ ایک جان کیا چیز ہے۔ اگر ہزار جانیں ہوں تو بھی ملتان پر قربان کر دوں۔

ایک اور مقام پر ملتان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ملتان چہ عجب کہ دلپذیر افتادہ است　　چوں منزلِ پیرِ دستگیر افتادہ است

دہلی است اگر چہ مکہ خورد و لے　　ملتان چو مدینہ صغیر افتادہ است

یعنی۔ ملتان بھی کتنا دلپذیر مقام ہے۔ جب اس میں میرے پیر دستگیر قیام فرما ہیں وہ مجھے اچھا کیوں نہ لگے، بلاشبہ اگرچہ دہلی مکہ خورد[۱] ہے۔ لیکن ملتان بھی روحانی

---

[۱] اُس زمانے کی دہلی کچھ اور شے تھی۔ مسلمان مورخین اس کا ذکر حضرتِ دہلی کہہ کر کرتے تھے۔ جہانگیری جاہ و جلال کا حامل، مشرقی ایشیا کا عظیم شہر جو اسلامی شان و شوکت اور ہزاروں علماء اور مشائخ کا مدفن

(باقی صفحہ ایضاً)

عظمت کے اعتبار سے چھوٹا مدینہ ہے۔

ہر وہ چیز جو محبوب سے کسی قسم کی نسبت رکھتی ہو، محب کو عزیز ہوتی ہے۔ اس لئے اگر حضرت محدث کو ملتان جان سے بھی عزیز معلوم ہوتا ہے تو اس میں تعجب کیا ہے۔ لہذا وہ خود ہی فرماتے ہیں۔ کیونکہ یہ شہر میرے پیر دستگیر کی جائے سکونت ہے اس لئے مدینہ و بغداد کے بعد ملتان ہی میرے دل و جان کی جائے قرار ہے۔ ملتان کا قیام اس وجہ سے بھی تھا کہ نواب میر میراں بلوچ گورنر ملتان نے اپنے والد ماجد خانِ اعظم میر چاکر خاں رند کی منظوری سے ۹۰ ہزار بروایتِ دیگر ۸۴ ہزار بیگھہ اراضی جو نذر کی تھی وہ ملتان سے صرف سات آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھی، جو اب بھی حامد پور سے موسوم ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے حضرت مخدوم کا ملتان میں رہنا ضروری تھا۔

شہادت علّامہ مفتی محمد بقار فاروقی المُلتانی روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کی زبان سے سُنا ہے کہ حضرت مخدوم اپنی اراضیات میں گئے ہوئے تھے۔ ایک گاؤں میں قیام تھا۔ چند روز کے بعد جب واپسی کا ارادہ ہُوا تو حضور نے لشکر، ملازمین اور ارادت مندوں کو پہلے روانہ کر دیا اس وقت کو غنیمت جان کر لنگاہوں کے ایک گروہ نے آپ کے مریدوں کی اس بستی پر حملہ کر دیا۔ آپ اوراد و اذکار میں مصروف تھے۔ اطلاع ملی تو فرمایا

"اشارہ صحیح ہُوا رحلت کا وقت آپہنچا!"

بقیہ حاشیہ ص۱۰۸:۔ تھا۔ اور حضرت محدث کے زمانہ میں بھی سینکڑوں بڑے محدث، مفسر، فقیہ اور فقراء اس شہر کی زینت تھے۔ اس لئے حضرت محدث اس کے فضل و کمال کے پیشِ نظر اسے نگہ خورد کہتے ہیں۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ مشبہ بہ بہرحال مشبہ سے برتر و افضل ہوتا ہے۔

اُسی وقت ہاتھی پر سوار ہو کر چند رفیقوں کے ہمراہ ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوئے، مگر جوں ہی ان بدکاروں نے آپ کی سواری دیکھی بھاگ اُٹھے۔ مگر سلطان نامی ایک مردود لنگاہ نے جس کی قسمت میں آپ کا قاتل ہونا مقدّر ہو چکا تھا اس نے چُھپ کر ایسا تیر مارا جو حضرت کے پہلو میں پیوست ہو کر رہ گیا اور اسی صدمہ سے علومِ دینیہ کے ماہر، کلامِ ربانی کے واقفِ اسرار، حقیقت و طریقت کے دانائے رموز حضرت موسیٰ پاک شہید علیہ الرحمۃ ۲۳ر شعبان ۱۰۱۰ھ کی رات کو رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعُون ط

قاتلین کا حشر

مفتی محمد بقا نیز روایت کرتے ہیں کہ اس واقعہ کے چند روز بعد بدبخت سلطان لنگاہ ایک مرض میں مبتلا ہو گیا، زبان اس کی متورم ہو کر دہن سے باہر نکل پڑی۔ اس سے پیپ جاری ہو گئی۔ اس کا پیٹ سوج گیا، اور اس کے ہاتھ اور پاؤں مبروص ہو گئے، نیز اس کے تمام ساتھی بھی گوناگون امراض کے شکار ہو کر جہنم رسید ہوئے اور ان کی نسل سے کوئی زندہ نہ بچا۔[1]

تدفین

پہلے حضرت کو اپنے والد بزرگوار کے قدموں میں سپردِ خاک کیا گیا۔ لیکن بعد میں حضور کی اولاد کو عالمِ رویا میں القا ہوا کہ تم نے اپنے زمانہ کے قطب الاقطاب کو میری پائنتی میں دفن کر دیا ہے جس سے مجھے بے حد تکلیف ہو رہی ہے۔ اس اشارہ پر آپ کے صاحبزادگان سید یحییٰ و سید عیسیٰ رحمہم اللہ نے جناب کو وہاں سے نکلوا کر موضع منگے ہٹی میں دفن کرایا۔ پندرہ برس بعد حضرت مخدوم سید حامد گنج بخش کو خیال پیدا ہوا کہ حضرت کو ملتان خاص میں منتقل کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے جو اراضی زیادہ مناسب تھی، وہ رند بلوچوں کی حویلی تھی۔ انہیں معلوم ہوا تو

[1] بحر السرائر قلمی صہ ۱۸۰
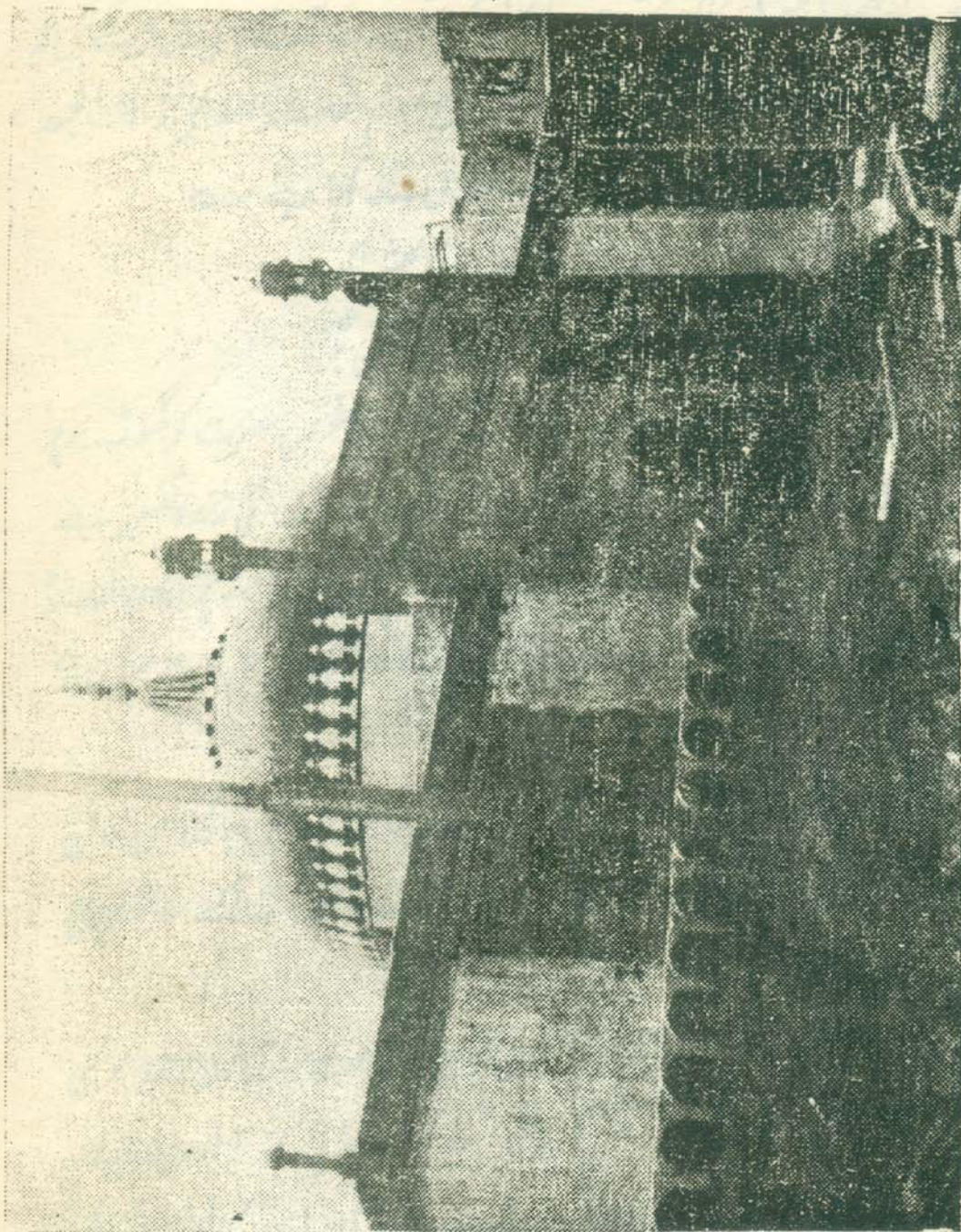
مقبرہ حضرت مخدوم جمال الدین سید موسیٰ پاک شہید علیہ الرحمۃ

دربار پیر پیران ملتان

انہوں نے از خود اپنی سالم حویلی حضرت مخدوم کو نذر کر دی۔ جس پر حضرت پیر موسیٰ پاک شہیدؒ کے جسدِ اطہر کو منگے ہٹی سے نکال کر ملتان لے آئے۔ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت کا جسد قبر سے نکالا گیا تو وہ بالکل صحیح سالم تھا۔ رحمۃ اللہ علیٰ ذالک الجسد شاید ایسے نفوس قدسیہ کے لئے ہی کسی صاحبدل نے کہا ہے ؎

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
ہُوا اِک موئے تن مَیلا نہ اِک تارِ کفن بگڑا

صاحب بحر کی روایت کے بموجب صاحب سجادہ نے اعجازی طور پر حضرت کو گھوڑے پر سوار کیا۔ اور اسی حالت میں حضرت الاان اولیاء اللہ لا یموتون کی زندہ تفسیر بنے ملتان ورود فرما ہوئے[1]۔ جس دروازہ سے آپ کا اعجازی طور پر داخلہ ہوا۔ وہ پاک دروازہ سے موسوم ہوا اور جس دروازے سے آپ کی مستورات داخل ہوئیں وہ حرم دروازہ کہلانے لگا۔

حضرت کے جسدِ پاک کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ سرزمین پاک میں دفن کر کے اوپر شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ جو اب تک اسی حشمت و شوکت کے ساتھ مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یوں تو حضرت مخدوم سید جمال الدین موسیٰ پاک شہید قدس سرہٗ کے ہزاروں مرید تھے مگر ان میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کے فضل و کمال

---

[1] گویند کہ عنانِ اسپ را بدست مبارکش دادہ بودند و خاص و عام مشاہدہ مے کردند۔ و مے گفتند کہ بہ بینید کہ نعش مبارک بعد از پانزدہ سال برآمدہ بر اسپ سوار شدہ میرود و ہرگز رنگ روئی و وجود عرفان آلودِ حضرتش تغیر نشدہ بود۔ (بحر الاسرار ص ۱۸۰)

سے ہی پتہ چلتا ہے کہ حضرت مخدوم فقر و ولایت میں کیا مقام رکھتے تھے۔ حضرت محدّث اکبری عہد کے بہت بڑے عالم تھے، اور ایسے دَور میں منظرِ عام پر آئے تھے جبکہ دار السلطنت لادینی تحریکات کا مرکز بن رہا تھا۔ حضرت مجدّد اور حضرت محدّث رحمہم اللہ علیہم کی مساعی جمیلہ کا ہی فیضان تھا کہ اس پُر آشوب دَور میں نہ صرف یہ کہ قصرِ اسلام محفوظ رہا، بلکہ اسی خاندان میں شاہجہاں اور اورنگ زیب جیسے راسخ الاعتقاد مسلمان حکمران پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنی تمام زندگیاں اسلام کے لئے وقف کر دیں۔ شیخ کو اپنے پیرِ بیعت سے بڑی محبت تھی اور حضرت مخدوم بھی انہیں دل سے چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بیعت کے دن میں ہی آپ کو خلافت کے اعزاز سے سرفراز کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ" بہ نیابت ما کار کُن و ایں نعمت را بہر خواہی اظہار کُن" آپ مُرشد سے ملنے کے لئے کئی بار ملتان آئے۔ سالہا سال دربارِ قادریہ سے منسلک رہے۔ اور مدارج النبوۃ اور اخبار الاخیار ایسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں کہ چار صدیاں گزرنے کے باوجود اپنی افادیّت کے سبب آج بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتیں حضرت محدّث وہ پہلے بزرگ ہیں جو برّصغیر پاک و ہند میں علمِ حدیث کی ترویج کا باعث بنے۔ حطۃ فی ذکر صحاح الستہ میں آپ کی علمی خدمات کو اس طرح سراہا گیا ہے:-

"اَوَّلُ مَنْ جَآءَ بِعِلْمِ الْحَدِیثِ فِی الھند و افاضہ علیٰ سکانہ فی احسن تقویم"

اپنے مرشدِ طریقت کی یاد میں کھوئے رہتے تھے۔ کبھی خواب میں زیارت ہو جاتی، تو دل کو سکون آ جاتا، لیکن پھر وہی بے چینی اور اضطراب۔ چنانچہ اپنے حضرت کو مخاطب کر کے عرض کرتے ہیں ؎

در خواب ہمیشہ در خیال تو خوشم　　　　بیدار بدیدن جمال تو خوشم

القصّہ چہ در خواب وچہ در بیداری   اے مُردم دیدہ بوصالِ تو خوشم

جیلانی مخادیم نے اپنے ابتدائی دَور میں اُچ اور ملتان میں اصلاحِ احوال اور اشاعتِ اسلام کا جو گراں قدر کام کیا تھا، اس کا اعتراف حضرت محدّثؒ اپنے اشعار میں اس طرح سے فرماتے ہیں ؎

آں نُور کہ از مشرقِ جیلاں تابید   بس عالم و آدم ہمہ روشن گردید
زو مشرق و مغرب شدہ روشن آخر   از اوچہ و ملتان ہمہ گشت است پدید

اخبار الاخیار ختم کرنے لگتے ہیں تو زبان سے بے اختیار مُرشد کی درازئ عُمر اور جیلانی خاندان کی ترقی و اقبال کی دُعائیں نکلنے لگتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"حق سُبحانہٗ و تعالیٰ ظلّ آں آفتاب حقیقت را تا ابدالدہر ممدود و مبسوط گرداناد و ما سوختگانِ ہجران و محترقانِ نارِ فراق را دراں سایہ جائے دہاد ؎

بادیارب تا قیامت دولتِ جیلانیاں
کم مباداز قدرتِ حق صولتِ جیلانیاں

بلاشبہ حضرت محدّث، مفسّر، مؤرخ اور صاحبِ طرزادیب ہونے کے ساتھ اپنے زمانے کے بہت بڑے صوفی اور مذہبِ اہلسنّت والجماعت کے زبردست ستون تھے۔ آپ نے بزمانۂ شاہجہاں ۲۱ ربیع الاوّل ۱۰۵۲ھ کو انتقال فرمایا۔ مقبرہ پُرانی دہلی میں زیارت گہِ خاص و عوام ہے۔

اولادِ امجاد | حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے چار صاحبزادے تھے۔ بڑے فرزندِ ارجمند حضرت مخدوم سید حامد گنج بخش تھے۔

۲۔ دُوسرے سیّد جان محمدؒ تھے۔ جنہیں حضرت محدّث دہلوی اپنے ہمراہ دہلی

لے گئے تھے۔ ان کا مزار گوہر بار دہلی میں ہے۔

۳۔ تیسرے صاحبزادے سیّد عیسیٰؒ تھے۔ مقبرہ شاہ عنایت ولایتؒ کے جانب شمال ایک احاطے میں آپ کا پختہ مزار ہے۔ آپ بڑے پاکباز، صاحبِ مقامات، عارف ربّانی اور محبوبِ یزدانی تھے۔ آپ کے مزار کے جنوب میں حسین وجمیل مقبرے میں آپ کے دو صاحبزادے سیّد عنایت شاہؒ اور سیّد ولایت شاہؒ مدفون ہیں۔ دُرجِ سیادت کے یہ شمس و قمر صاحبِ کرامات باعمل عالم اور شب بیدار زاہد تھے۔

۴۔ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے سید یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ نہایت متقی، پارسا اور عبادت گزار درویش تھے۔ جہانگیر اعظم اور شاہجہان کے زمانے میں علی التواتر صوبہ دار ملتان مقرر ہوئے۔ چونکہ سخاوت میں حاتم ثانی تھے، اس لئے "نواب سخی" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ "راجن کو شک" کے عقب میں ایک نامکمل مگر سربفلک مقبرہ نظر آتا ہے۔ یہی حضرت کی آخری آرامگاہ ہے۔

حضرت مخدوم لعل عیلین

صاحبِ اذکار قلندری لکھتے ہیں کہ مخدوم شیخ محمد یوسف الملقب بہ لعل عیبن علیہ الرحمۃ حضرت غوث الملک شیخ بہار الدین ثانیؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اس لئے شیخ الاسلام کی سجادگی کے حقدار تھے۔ شیخ کبیرؒ عمر میں چھوٹے تھے۔ لیکن ایک دفعہ جبکہ ان کی عمر چار سال کے قریب تھی، انہوں نے حضرت والد ماجد کی دستار کو ہاتھ لگا دیا۔ جس پر حضرت غوث الملکؒ نے فرمایا کہ "بیٹا! تو بھی صاحبِ دستار ہوگا۔ جب دونوں بھائی بڑے ہوئے، اور حضرت مخدوم بہار الدین ثانیؒ عالمِ قدس کو انتقال فرما گئے تو ان میں سجادگی پر تنازع برپا ہوا۔ ایک بیٹا بڑا ہونے کی وجہ سے حقدار تھا اور دوسرا والد ماجد کے ارشاد کو سند بتاتا تھا۔ معاملہ حکومت تک پہنچا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ ملتان شہر کے علماء اور مشائخ

فیصلہ کریں۔ چنانچہ اس معاملے میں کافی غور و فکر ہوتا رہا۔ مگر کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہ ہو سکا۔ انجام کار طے پایا کہ دونوں صاحبزادوں کی پگڑیاں روضہ مبارکہ میں مقفل کر دی جائیں۔ جس کی دستار بندھی ہوئی ہو گی وہی سجادگی کا حقدار قرار پائے گا۔ صبح کو دیکھا تو دونوں پگڑیاں بندھی پڑی تھیں، مگر روضہ مبارکہ کی چابی شیخ کبیرؒ کے حوالے کی گئی۔ اس پر حضرت لعل عیسن آزردہ خاطر ہو کر مقبرہ میں داخل ہوئے۔ ادب سے جدامجد کے مزار پر انوار کو بوسہ دیا۔ اور اُن کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا قرآن مجید جو مزار کے سرہانے رکھا تھا، اُٹھا خاموشی سے باہر نکل گئے۔ آپ ملتان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کے جا رہے تھے۔ اور یہ علم نہیں تھا کہ منزل کہاں ہو گی۔ ایک گاؤں میں رات کو قیام ہوا۔ خواب میں شیخ الاسلامؒ کی زیارت ہوئی، فرمایا:۔

"بیٹا! تم اتنے غمگین کیوں ہو، کوٹ کروڑ جہاں ہمارے آباء کرام نے صدہا سال تک علم و عرفان کی شمعیں روشن کی تھیں، پھر اس پر بے دینی کی گھٹا ٹوپ ظلمت چھا چکی ہے۔ قدرت کو یہی منظور ہے کہ تم وہاں پہنچ کر بھٹکی مخلوق کو راہِ ہدایت پہ لے آؤ۔ کوٹ کروڑ میں تم میرے سجادہ کی حیثیت سے کام کرو گے اور تمہارے دم قدم سے لاکھوں بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچے گا۔"

اس بشارت سے حضرت مخدوم لعل عیسنؒ باغ باغ ہو گئے اور دلجمعی سے کوٹ کروڑ کو روانہ ہو گئے۔

حضرت مخدوم کوٹ کروڑ میں

حضرت مخدوم لعل عیسنؒ جب علاقے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ تمام ملک قحط کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارش کے لئے دعا کی

درخواست کی۔ حضرت نے دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے۔ خُوب بارش ہوئی۔ گندم بونے کا وقت تھا، مگر گندم نایاب ہو چکی تھی۔ حضوُر نے فرمایا کہ اگر گندم نہیں تو بھوسہ بو دو! پیر دستگیر کے فرمان پر لوگوں نے بے تحاشا بھوسہ چھڑکنا شروع کیا۔ خدا کی قدرت سے بھوسہ کی گٹھلیاں پھوٹ پڑیں اور اُن سے گندم اُگ آئی۔ ہر طرف کھیت لہلہانے لگے، اور قحط دُور ہو گیا۔ ان دنوں کروڑ کے گردو پیش بالخصوص اور دین کوٹ سے سیت پور تک دریائے سندھ کے دونوں اطراف میں بلوچ آباد تھے۔ اور انہوں نے بڑے بڑے شہر آباد کر لئے تھے۔ کوہ سلیمان کے دامن سے دریائے چناب تک اُن کا ہی طوطی بول رہا تھا۔ یہ فوجی قسم کے لوگ تھے۔ ان میں خال خال تعلیم یافتہ تھے۔ اکثریت ان پڑھ لوگوں کی تھی۔ اس وقت ان کی طاقت کے تین مرکز تھے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں، ڈیرہ غازی خاں اور منکیرا۔

آپ نے تھوڑے سے عرصہ میں ہی اپنے اخلاقِ فاضلہ سے عوام کے دلوں کو موہ لیا نواب اسمٰعیل خاں بانیٔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں، نواب فتح خاں بانیٔ کوٹ فتح خاں اور نواب غازی خاں بانیٔ ڈیرہ غازی خاں، تینوں بلوچ سردار آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ حضرت مخدوم نے کوٹ کروڑ میں ایک بڑی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ جس میں حضرت خود بھی تعلیم دیتے تھے۔ بلوچ فرمانرواؤں نے حضرت کے حجرے کے قریب ہی مدرسہ کے لئے متعدد مساجد نما عمارتیں تعمیر کر دیں۔ جن میں علمائے ربانی علوم متداولہ کی تعلیم اور سہروردیہ مسلک کے مطابق تربیت دیتے تھے۔ حضرت مخدوم امربالمعروف و نہی عن المنکر کی بجا آوری کے لئے لاڑکانہ اور ٹھٹھہ تک دریائی سفر فرمایا کرتے تھے ایک دفعہ تلہار کے مقام پر آپ کی میاں آدم شاہ کلہوڑہ سے عارفانہ ملاقات ہوئی حضرت مخدوم کا کوٹ کروڑ میں انتقال ہُوا۔ آپ کے مزار پر انوار پر بلوچ فرمانرواؤں

نے نہایت پُرشوکت مقبرہ تعمیر کرایا۔ جو حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم قدس سرہٗ کے مقبرہ کی طرزِ تعمیر کا حامل ہے۔ تینوں بلوچ نواب آپ کے قدموں میں سو رہے ہیں اور ان کے کتابے حسب ذیل ہیں:۔

نواب اسمٰعیل خاں بانی ڈیرہ اسمٰعیل خاں
نواب فتح خاں بانی کوٹ فتح خاں
نواب غازی خاں بانی ڈیرہ غازی خاں

افسوس ہے کہ حضرت کا آستانِ عالی شان اب قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ مساجد نمگسارتیں، جن میں سینکڑوں طالبانِ دین اکتسابِ علوم کرتے تھے۔ آج حیرت سے منہ کھولے گزرے ہوئے قافلے کا راہ تک رہی ہیں درس تدریس تو بجائے خود رہی ان میں کوئی نماز تک نہیں پڑھتا۔ بقول حضرت اقبالؒ

؎ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے!

مولانا وجیہہ الدین عراقیؒ

مولانا وجیہہ الدین عراقی اپنے دَور کے بہت بڑے عالم اور مولانا عراقی کی اولاد سے تھے ملتان سے ان کے آباء کرام کا جو روحانی اور نسبی تعلق تھا، وہ انہیں کشاں کشاں اس بلدِ عظیم میں لے آیا۔ مولانا کاشانی کی یونیورسٹی ابھی تک کافی رونق پہ تھی۔ آپ اس درسگاہ کے مدرس مقرر ہوئے اور ایک دُنیا کو علم کے فیضان سے مستفیض کیا۔ ارغون کے حملے میں جب تنگاہوں کے قتل و غارت سے ایک قیامت برپا تھی اور علماء و مشائخ لاہور اور دہلی کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔ مولانا وجیہہ الدین بھی مع اہل و عیال خراسان تشریف لے گئے۔ یہاں شیخ عبدالکریم اور شیخ عبدالرحیم ان کے دو صاحبزادے تولد ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود ملتان کی یاد دہ رہ کر

ان کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ اس لئے انہوں نے دوبارہ ملتان کا رُخ کیا، اور اپنی قدیم جگہ میں سکونت اختیار کی۔ اگرچہ علم و ادب اور شریعت و طریقت کی مجلسیں سُونی پڑ چکی تھیں اور مدرسہ ناصریہ کو بھی خزاں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بایں ہمہ مولانا کی وضعداری نے کسی دُوسری درسگاہ سے منسلک ہونا پسند نہ کیا اور اسی درس گاہ میں بدستورِ سابق کام کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری مرحلے تک قائم رہا۔ ۹۷۱ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ معتقدین نے اس تعلقِ خاطر کے سبب جو حضرت کو علامہ کاشانی اور ان کی درس گاہ سے تھا۔ آپ کو ان کے پہلو میں دفن کر دیا۔ ملا نادرؔ آپ کا ذکر مثنوی میں اس طرح سے کرتے ہیں ؎

بُود آں علّامۂ دورِ زماں — بحرِ فیضِ علم زو گشتہ رواں
درس گفت و عالمے شد فیضیاب — خود نظیرِ خویش بُد عالی جناب
بعد ازاں آورد او، در مولتاں — بود درس قاضی قطب الدین دراں
اندراں بنہاد رخت و شد مقیم — عالمے را داد او فیضِ عمیم
عارفہ بود از قریشی خانداں — شیخ اندر عقد خود آورد آں

اور غزن کے حملہ آور ہونے پر ؎

پس ز ملتاں کرد رُو سوئے وطن — صاحبِ اولاد شد آں شیخ زمن
اوّلیں فرزند او عبد الکریم — بود دوئم حضرت عبد الرحیم
ہر یکے شاں صاحبِ اولاد شد — ہر یکے از زمرۂ اوتاد شد
پس وجیہ الدین چوں شد پیر سال — باز آمد سوئے ملتاں با کمال
گشت نازل در ہماں جائے قدیم — ہر یکے کردیش تعظیمِ عظیم
آخر اندر نہصد و ہفتاد و یک — جانِ پاکش بُرد در جنت ملک

سوئے مشرق دار مدرسہ جائے او
متصل قاضی قطب ماوائے او

علم و عمل کے ان مہر و ماہ کا مقبرہ نہایت پُر شوکت اور قابل دید تھا۔ آٹھوں پہر زائرین کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اس کے پاس ہی سلطان حسین خاں لنگاہ کا مقبرہ، جامع مسجد اور علامہ کاشانی کی یونیورسٹی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں جب انگریزوں نے قلعہ پر گولے برسانے شروع کئے تو یہ تمام عمارتیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ صرف علامہ کاشانی اور مولانا عراقی کے مزارات مثالی درس گاہ کے قریب قلعہ کہنہ پر موجود ہیں۔ اور حسین آگاہی سے بخوبی نظر آ سکتے ہیں۔

ملتان میں خوگانی افاغنہ کی آمد

صاحب تذکرۃ الملتان کے اندازہ کے مطابق تقریباً ۹۹۱ھ میں خوگانی قبائل ملک شہپال کی سرداری میں ملتان وارد ہوئے۔ ان کا وطن ہرات اور قندھار کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کی جو لڑائیاں اپنے بھائیوں یا قندھار کی مہم میں ایرانی صوبیداروں سے ہوئیں۔ ان سے ملک شہپال کا خاندان بھی متاثر ہوا۔

جن دنوں افغانوں کا یہ بہادر قبیلہ ملتان شہر میں وارد ہوا۔ حضرت مخدوم شاہ محمد یوسف گردیزی علیہ الرحمۃ کے صاحب سجادہ حضرت شیخ حامد گردیزی تھے۔ ملک شہپال ان سے پہلے متعارف تھے۔ اس لئے ایک گھوڑی، ایک قیمتی تلوار اور ایک سفید باز بطور تحفہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت مخدوم بہت خوش ہوئے، اور انہوں نے آپ کو ملتان میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ ملک شہپال دہلی کا عزم لے کر چلے تھے اور وہ شہنشاہ ہمایوں سے مل کر فوج میں کوئی اچھا منصب حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ مگر شہنشاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور اکبر اعظم سے ان کی شناسائی نہ تھی

اس خیال کے پیشِ نظر کہ خدا معلوم نوجوان تاجدار متوجّہ ہو یا نہ ہو۔ نیز خاندان کے بعض افراد جو سفر کی کلفتوں سے گھبرا اُٹھے تھے، وہ مزید چار سو میل آگے چلنے کو تیار نہیں تھے۔ ابھی یہ لوگ کچھ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ان کے بیش بہا گھوڑوں کی شہرت سُن کر ڈاکوؤں نے شب خون مارا اور ان کا سامان اور گھوڑے لُوٹ کر لے گئے۔ ملک شہپال نے مخدوم گردیزی سے رجُوع کیا، اور ابھی وہ چوروں کی گرفتاری کے لئے کوئی انتظام کر ہی رہے تھے کہ ملک شہپال اپنی قوم کے سرباز اور منچلے نوجوانوں کو ہمراہ لے برق رفتاری سے چوروں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا اور انہیں راستے میں جا للکارا۔ چور تعاقب کرنے والوں پر غضب ناک ہو کر پلٹے۔ تلواریں بے نیام ہوئیں اور دونوں فریق گتھم گتھا ہو گئے۔ کچھ چور مارے گئے اور باقیوں کو ملک شہپال گرفتار کر کے لے آئے۔ حضرت مخدوم گردیزی کو اطلاع ہوئی تو وہ خوگانیوں کی بہادری پر بڑے خوش ہوئے اور انہیں ملتان شہر کے مغرب میں کافی اراضی عنایت کی جس میں خوگانیوں کا قبیلہ آباد ہُوا یہ محلہ کرّی افغاناں کلاں کہلاتا ہے۔

سُلطان نُورالدّین محمّد جہانگیر شہنشاہِ ہند

شہنشاہ جلال الدین محمدؒ اکبر کی وفات کے بعد، ۳۷ سال کی عمر میں شہزادہ سلیم ۱۴ر جمادی الاوّل ۱۰۱۴ھ کو نُورالدین محمدؒ جہانگیر کے نام سے تخت نشین ہُوا۔ اور ۲۱ سال ۸ ماہ بادشاہی کر کے ۲۸ر صفر ۱۰۳۶ھ کو فوت ہُوا۔ جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں ہے۔

جہانگیر[1] ہندوستان کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ خوش مذاق تھا۔ اُسے فطری چیزوں سے خاص لگاؤ تھا۔ عجیب عجیب چیزیں جمع کرتا تھا۔ مختلف شکل و صورت کے جانور اُس نے جمع کر رکھے تھے۔ اپنے جدِ امجد بابر کی طرح علمی ذوق سے بھی اُس نے بہرہ وافر پایا تھا۔ تزکِ جہانگیری اس کا خود نوشت روزنامچہ ہے۔ جسے تاریخی حقائق اور ندرت کے اعتبار سے خاص مقام حاصل ہے۔ اس کی بیگم نورجہاں بھی بڑی علم دوست تھی۔ تکلف اور آرائش کی نئی نئی چیزوں کی ایجاد کا اُسے بڑا خیال رہتا تھا۔ گلاب کا عطر اور چاندنی کا فرش اُسی کی ایجادات میں سے ہیں۔

مخدوم سیّد حامد گنج بخش جیلانیؒ

مخادیم جیلان کے خاندانی ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ عرصہ نواب عیسیٰ گیلانی ملتان کے گورنر رہے تھے۔ اُن کے زمانے میں ہی مخدوم سیّد حامد گنج بخش قدس سرہٗ نے حضرت موسیٰ پاک شہید علیہ الرحمۃ کے جسدِ اطہر کو منگے ہٹی سے ملتان خاص میں منتقل کرایا

---

[1] جہانگیر کا مقبرہ نورجہاں بیگم نے اپنی نگرانی میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ اکبر اعظم کے مقبرہ کی مانند کئی منزلوں میں تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہ مقبرہ جنرل ونٹورہ کو الاٹ کر دیا تھا۔ جنرل مذکور مقبرہ کی بالائی مرمریں منازل میں رہتا تھا اور عیاشی کرتا تھا۔ لاہور کے مسلمانوں کا وفد مہاراجہ کی خدمت میں عرض گزار ہوا کہ شہنشاہ کے مقبرہ کا احترام کیا جائے۔ اگر اس بارہ دری کے بغیر حکومت کا گزارہ نہیں ہو سکتا تو اسے اتار لیا جائے، مگر مقبرے پر فحاشی کی اجازت نہ دی جائے۔ مہاراجہ تو دل سے یہی چاہتا تھا۔ اس نے بالائی بارہ دری کو اکھڑوا کر قلعے اور مسجد کے درمیان منتقل کرا دیا۔ یہ ٹکڑہ حضوری باغ سے موسوم تھا۔ چنانچہ اب تک یہ بارہ دری شاہی مسجد کے آگے موجود ہے۔ اس کی بالائی منزلیں زلزلے سے گر گئی تھیں۔ صرف نچلی منزل اپنی اصلی حالت میں ہے اور شہنشاہ کا مقبرہ جسدِ بے سر ہو کر رہ گیا ہے۔

۱۶۰۸ء میں حضرت مخدومؒ کا انتقال ہو گیا اور والد ماجد کے پہلو میں دائیں جانب دفن ہوئے۔ آپ اپنے زمانے کے بڑے سخی بزرگ تھے۔ باوجودیکہ جاگیرات اور نذر و نیاز سے کافی آمد ہوتی تھی۔ مگر آپ سب خرچ کر دیتے تھے۔ صاحب بحر کی روایت کے بموجب آپ کبھی مالکِ نصاب نہیں ہوئے۔ طالبانِ علم و ادب پر خاص توجہ ہوتی تھی۔ انہیں انعام و اکرام سے اس قدر نوازتے کہ زندگی تک پھر وہ کسی کے دستِ نگر نہ ہوتے۔ جس مُرید پر توجہ ہوتی، فرماتے: "جا تجھے گنج معرفت نصیب ہوگا۔" آپ کے ارشادِ گرامی کی برکت سے اسے وہ ترقی ہوتی کہ وہ دینوی اور دُنیاوی دولتوں سے مالا مال ہو جاتا۔ مؤلف "غوث الاعظم" نے آپ کے لقب کی وجہ تسمیہ یہی لکھی ہے۔ آپ جیّد عالم تھے۔ درس و تدریس آپ کا محبوب مشغلہ تھا جسے آپ نے زندگی تک قائم رکھا۔ "استقامت علی الحق" آپ کا مقام اور "قل اللہ ثم ذرہم" آپ کا معمول تھا۔ بقول "مرقع ملتان" آپ نے اُج کی سجادگی از خود اپنے چچازاد بھائی کے حوالے کر دی تھی۔ آپ کے چار صاحبزادے تھے (۱) سیّد فتح علی موسیٰ (۲) سیّد جان علی (۳) سیّد یار علی، یہ دونوں بھائی بے اولاد فوت ہوئے۔ چوتھے سیّد دوست علی تھے۔ ان کے بارے میں سیرت کی تمام کتابیں خاموش ہیں۔

۱۶۱۴ء میں مسٹر سٹل اور مسٹر کروڈر نامی دو انگریز سیاح اجمیر سے اصفہان جاتے ہوئے ملتان سے گزرے۔ ۱۶۱۹ء میں جہانگیر نے ملتان کی نظامت پر خان جہاں کا تقرر کیا۔

یہ بڑا مدبّر اور منتظم حکمران تھا۔ اس نے نہ صرف قلعے اور شہر کی فصیلوں کی مرمت کی، بلکہ شہر کے گرد و پیش باغات لگوا کر اس خطہ کو فردوس بریں کا نمونہ بنا دیا۔

سلطان شہاب الدین شاہجہان شہنشاہ ہند

جہانگیر کے انتقال پر ۱۰۳۷ھ میں شاہجہان تخت نشین ہوا۔ اسے عمدہ عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ تاج محل کا شمار تو دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان کی مالگزاری ۲۴ کروڑ تھی۔ اتنی بڑی آمدنی سلطنت کے امن و امان کی علامت خیال کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے زمانے کو عہدِ زرّیں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ نے اپنی عملداری کے ابتدائی ایّام میں قلیج خان کو ملتان کا صوبیدار مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد قلیج خان کو قندھار کی مہم پر روانہ کر دیا۔ اور یہ صوبہ اپنے سب سے چھوٹے فرزند شہزادہ مراد بخش کو عنایت کیا۔ اس نے اپنی گورنری کے زمانے میں بڑے اچھے کام کئے۔ قلعہ اور شہر کی فصیلوں کو پختہ اینٹوں سے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ قلعے

شہزادہ مراد بخش

کے اندر مسجد جامع کی مرمت کرائی۔ اور لوہاری دروازہ کے باہر جو پل شہر کو قلعہ سے ملاتی تھی۔ اسے خشت و آہک سے پختہ تعمیر کرایا۔ اور پاس ہی ایک مسجد بنوائی جس میں ایک چاہ اور کئی حمام بھی تھے چاہک اور حمام تو دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئے، مگر مسجد موجود ہے اور حمام والی مسجد کہلاتی ہے۔ دولت دروازہ کے باہر ایک وسیع و عریض باغ لگوایا اور اس کے شرقی جانب محلّات، آبشاریں اور آرام گاہیں بنوائیں۔ ساتھ ہی ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی۔ جس کا تہائی حصہ انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی کے دوران منہدم ہو گیا۔ باقی عمارت جوں کی توں موجود ہے اور اب اہل حدیث حضرات کے تصرّف میں ہے۔ انہوں نے اس کے وسیع صحن میں مدرسہ کے لئے مفید مطلب کمروں کا اضافہ تو کر لیا

ہے، مگر مسجد کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور کس مپرسی کی حالت میں نوحہ کناں نظر آتی ہے۔

لوہاری دروازہ کے باہر نصف میل کے فاصلہ پر بھی شہزادہ نے ایک اور باغ لگوایا تھا، جو حضوری باغ سے موسوم تھا۔ الغرض شہزادہ مُراد کا دور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مواضعات ایلم پور اور لنگانہ جو قدیم سے تیل چراغ کے طور پر حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا علیہ الرحمۃ کی خانقاہ مبارک کے حق میں وقف چلے آتے تھے سابقہ حکام نے اپنی صوبیداری کے زمانہ میں ضبط کر لیئے تھے۔ شہزادہ نے دوبارہ اس آستانِ پاک کے نام واگزار کر دیئے۔ اسی طرح خانقاہ شیخ محمد یوسف گردیزی کے نام موضع ڈیرہ وراجس کو اب گھوڑہ کہتے ہیں اور موضع ساہیئل واگزار کئے۔ اور سجادگان کے نام پٹہ معافیات کی تجدید ہوئی جو اب تک اُن کے خاندانوں میں بطور ریکارڈ محفوظ چلے آتے ہیں۔

شہنشاہ شاہجہاں کو جب شہزادہ مُراد کی ان سرگرمیوں کا علم ہوا تو اس خیال کے پیشِ نظر کہ شہزادہ کہیں بغاوت نہ کردے، اُسے دکن کی جانب تبدیل کر دیا، اور اس کی جگہ نجابت خاں کو ملتان کا صوبے دار مقرر کیا۔

نجابت خاں

نجابت خاں نہایت خدا ترس اور شفیق حاکم تھا۔ اُس نے سابق صوبیدار کی تمام معافیات کو قائم رکھا اور خلق خدا کو احسانات سے ممنون کیا۔ قصبہ کوٹلی نجابت (واقع تحصیل شجاع آباد) اس کی یاد اب تک تازہ کئے ہوئے ہے۔ انگریزی دور میں یہ قصبہ ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ مگر انتقالِ آبادی کے بعد اس کی تمام آبادی فوجی مہاجرین پر مشتمل ہے۔

شجرۂ نسب اولاد امجاد شیخ کبیر قریشی علیہ الرحمۃ

سجادہ نشین شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتان

- شیخ کبیرؒ
  - شیخ شہر اللہ — جدِّ قریش بیٹ کچھ
  - شیخ محمد قائم — جدِّ قریش قادر پور راں
    - شیخ کبیر ثانی
      - شیخ بہاء الدین
        - شیخ محمد قائم — متوفی سنہ ۱۰۹۳ھ لاولد
      - شیخ ضیاء الدین
        - شیخ بہاء الدین
        - محمد زکریا
          - شیخ کبیر
            - شیخ محمد زکریا ×
            - شیخ حسین شاہ ×
      - شیخ محمد زمان
        - شیخ محمد غوث
          - شیخ محمد زمان ×
          - شیخ بہاء الدین
            - شیخ محمد غوث
              - شیخ یوسف شاہ
              - مخدومہ بی بی مانو
            - شیخ ولایت شاہ
              - باغ شاہ
              - پیرے شاہ
              - بی بی رانیؒ
              - بی بی راجیؒ
            - شیخ قائم شاہ
      - شیخ وجیہ الدین
        - شیخ کبیر المعروف دریایا
          - ھنگو شاہ
      - شیخ محمد باقر ×
    - شیخ شمس الدین محبوب خدا ×
    - شیخ فتح دین — جدِّ قریش دھونکل
  - شیخ فتح محمد — جدِّ قریش غوث پور
  - شیخ فیض اللہ — لاولد فوت شد

شیخ محمد قائم قریشی صاحب سجّادہ آستانہ زکریّا ملتان

شیخ کبیرؒ کے چار صاحبزادے تھے۔ شیخ شہر اللہ، شیخ محمد قائم، شیخ فتح محمد، اور شیخ فیض اللہ حضرت کے وصال کے وقت شیخ شہر اللہ مریدوں کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ شیخ فتح محمد شاہ نے جانشینی کا حق شیخ محمد قائم کو تفویض کر دیا۔ شیخ فیض اللہ کا پہلے سے انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے شیخ محمد قائم سجّادہ قرار پائے۔ جب شیخ شہر اللہ سفر سے واپس آئے تو انہوں نے سجّادگی کا دعویٰ کیا۔ لیکن شیخ محمد قائم بڑے دھڑتے کے انسان تھے اس لئے شیخ شہر اللہ کا تمام اثر و نفوذ ان کی جلالتِ شان کے آگے ماند پڑ گیا۔ اور وہ آبار کرام کی مسند شیخ محمد قائم سے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اگرچہ شیخ شہر اللہ نے آپ کی کافی مخالفت کی تھی، بایں ہمہ شیخ محمد قائم نے بڑے تدبّر کا ثبوت دیا۔ انہوں نے شیخ شہر اللہ اور ان کی اولاد کو اپنی کچہری میں دائیں جانب بیٹھنے کا شرف بخشا —— اور مسندِ سجّادگی میں برابر کا شریک کر لیا لہٰذا شیخ شہر اللہ بطورِ نائب سجّادہ جملہ امور سرانجام دینے لگے۔ جب شیخ محمد قائم کا وقتِ آخر قریب آیا تو انہوں نے وصیّت کی کہ جب تک بھائی صاحب زندہ رہیں میری اولاد میں سے کسی کو سجادہ نشین نہ بنایا جائے چنانچہ شیخ شہر اللہ کو زندگی کے آخری لمحات تک سجّادہ نشین کی حیثیت حاصل رہی، اور تولیّت کے تمام فرائض بلاشرکتِ غیرے انجام دیتے رہے۔

شیخ محمد قائم علیہ الرحمۃ بڑے عابد انسان تھے۔ بلاشبہ آپ حضرت شیخ الاسلام کی سجّادگی کے لئے زیادہ موزوں تھے اور انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ مسندِ غوثیہ کے حصول کی مساعی فخر و نمود کے لئے نہیں بلکہ خدمتِ خلق اور سہروردیہ مسلک کو فروغ دینے کی نیّت سے تھی۔ وہ صرف مُریدوں کے نہیں بلکہ ملتان کے تمام باشندگان کے

ملجاو ماوی تھے۔ اہلِ ملتان اپنی تکالیف اور تنازعات حضرت کی خدمت میں پیش کرتے اور آپ کے فیصلے سے مطمئن ہو کر جاتے تھے۔

شیخ کبیر ثانیؒ

شیخ شہر اللہؒ کی وفات کے بعد بموجب معاہدہ سجادگی پھر شیخ محمد قائم علیہ الرحمۃ کے گھرانے میں منتقل ہو آئی اور بالاتفاق آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ کبیر ثانیؒ مسند آرا ہوئے۔ آپ بڑے خدارسیدہ اور باکرامت انسان تھے۔ سلسلۂ سہروردیہ کو آپ کے زمانے میں کافی فروغ ہوا۔ ۱۷ شعبان ۹۵۳ھ کو آپ نے عالمِ قدس کا سفر اختیار فرمایا اور اپنے آبا کرام کے پہلو میں دفن ہوئے۔

شیخ شمس الدین محبوبِ خدا

اس دور کے زاہد مرتاض اور حضرت شیخ کبیر ثانی علیہ الرحمۃ کے برادرِ خورد شیخ شمس الدین محبوب الٰہی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ قریشی خاندان کے گوشہ نشین بزرگ تھے۔ آپ کے زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ آپ کی حویلی میں پانی کی مشکیں ہر وقت بھری رہتی تھیں۔ ہر نماز کے وقت غسل کرتے اور کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ ہر وقت باوضو رہتے تھے۔ چونکہ شاہجہانی سکّے پر کلمہ شریف اور خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی منقش تھے۔ اس لئے بغیر وضو اس سکّے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ اپنی دُنیا کے آپ بادشاہ تھے۔ ان کے ہاں ہر وقت اوراد، نوافل اور تلاوتِ قرآن پاک کا چرچا رہتا تھا۔ بدن سے خوشبوؤں کی لپٹیں آتی تھیں۔ آپ زندگی بھر مجرّد رہے، اس لئے اولاد کا سلسلہ نہیں چلا۔ عوام ان کا بے حد احترام کرتے اور محبوبِ خدا کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں، مزارِ پُرانوار حضرت قطب الاقطاب شاہ رُکنِ عالمؒ کے روضۂ مطہرہ میں ہے۔

مخدوم شیخ بہاء الدین قریشیؒ

شیخ کبیر ثانی علیہ الرحمۃ کے پانچ صاحبزادے تھے مخدوم شیخ بہاء الدین، شیخ ضیاء الدین محمد، شیخ

محمد زمان، شیخ وجیہہ الدین، شیخ محمد باقر۔ مؤخر الذکر لاولد فوت ہوئے۔ باقی تمام صاحبزادوں کو بترتیب مراتب سجادگی کا شرف نصیب ہوا۔ شیخ بہاء الدین چونکہ اپنے والد کے سب سے بڑے بیٹے تھے اس لئے ان کے انتقال پر سجادہ نشین قرار پائے۔

حضرت مخدوم شیخ بہاء الدین اپنے آباء کرام کی طرح بڑے باخدا اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ جس بیمار پر کچھ پڑھ کر دم کرتے وہ شفایاب ہو جاتا۔ اہل ملتان کو آپ پر بڑا اعتقاد تھا۔

صوبہ ملتان اورنگ زیب کی جاگیر میں

شاہجہان بادشاہ نے شہزادہ مراد کے بعد صوبہ ملتان شہزادہ اورنگ زیب کی جاگیر میں دے دیا۔ اور اُس نے اپنی طرف سے نواب سید موسٰی گیلانیؒ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ وہ قندھار کی مہم پر گئے تو بھی حضرت اس صوبہ کے ناظم رہے۔ شہزادہ نے سید زین العابدین واقع سرور شکوٹ اور حضرت خالق ولی کے مقابر کی مرمت کرائی۔ نیز صوبہ ملتان کے مشہور قصبات میں سرکاری خرچ سے جامع مساجد تعمیر کرائیں۔ چنانچہ جلالپور پیروالا، دُنیاپور اور رووانی میں اس دور کی مسجدیں ابھی تک موجود ہیں۔ اور جامع شاہجہانی کہلاتی ہیں۔ شہزادہ نے حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم قدس سرہٗ کے فلک بوس مقبرے کے پاس بھی ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جو پختگی، نفاست اور دیدہ زیبی میں اپنی نظیر آپ تھی۔

بلوچ ریاستوں سے معاہدات

اس زمانے میں ہوت اور دودائی بلوچوں کی ریاستیں خاصی طاقت ور ہو چکی تھیں۔ ۱۶۴۷ء میں جب اورنگ زیب نے اس صوبہ کی عنانِ اقتدار سنبھالی تو اگرچہ اس نے ہوت

نوحانی اور نہمردی بلوچ سرداروں سے کئی جنگیں کیں، مگر ڈیرہ غازی خان کے بلوچ حکمران سے اس نے دوستانہ روابط قائم کرنے میں ہی فائدہ دیکھا۔ چنانچہ ایک عرضی میں جو کہ وہ شہنشاہ کو لکھتا ہے رقمطراز ہے کہ :-

"پیر دستگیر من سلامت! ولایت متعلقہ بلوچاں خیلے معمور و آباداں بنظر در آید۔ زراعت سیلابی و چاہی بسیار خوب مے شود۔ اکثر جا مرغزار ہائے دلکشا با صفا..... "الیٰ آخرہ!

ایک اور خط میں لکھتا ہے کہ :-

"حاجی خاں و جام جمعہ اعیانِ آں سرزمین کہ از عہد ترخانیہ تا حال رجوع نداشتند، سر ایشاں بہ خطِ فرمان نہادہ" الخ

یعنی حاجی خان اور جام جمعہ جنہوں نے عہدِ ترخانیہ سے اب تک کسی کی اطاعت قبول نہیں کی تھی انہیں مطیع کر لیا گیا ہے۔" اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور ڈیرہ غازی خاں کی بلوچ ریاستیں نہ صرف عہدِ ترخانیہ سے شاہجہان کے دور تک سلطنتِ ہند کے اقتدار سے آزاد رہیں، بلکہ وہ اتنی مضبوط اور خوشحال تھیں کہ مغل بادشاہ ان سے دوستانہ روابط قائم کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے تلوار کی بجائے حکمتِ عملی سے بلوچ سرداروں کو اپنا مطیع بنایا۔ اس ملک کا انتظام بہر گونہ قابلِ تعریف تھا۔

سدوزئی قبائل کی آمد سدوزئی قبائل کا مورثِ اعلیٰ امیر سدو خاں خراسان کا صوفی مذاق حکمران بیان کیا جاتا ہے۔ یہ اکبر اعظم کا معاصر تھا اور اسے شاہ عباس صفوی شہنشاہِ ایران نے امیر افغانستان کا خطاب مرحمت کیا تھا۔ اس نے ہرات کے قریب ایک شہر تعمیر کیا، اس کا نام صفا رکھا اور اسے اپنا دارالسلطنت

بنایا۔ سلطان سدو خان کے بعد ان کا بیٹا سلطان مودود خان تخت نشین ہوا جو ۱۰۵۳ھ میں میر یحییٰ دیوان ناظم کابل کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا۔ اور سلطان حسین خان باپ کی جگہ شہر صفا میں مسندِ شاہی پر متمکن ہوا، لیکن ان کے چچا زاد بھائی سلطان خدا داد خان المعروف سلطان خدکہ نے ان کی حکومت کو تسلیم نہ کیا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد سلطان حسین خان کو شکست ہوئی اور سلطان خداداد نے شہر صفا پر قبضہ کر لیا۔ سلطان حسین شب و روز یلغار کرتا قندھار پہنچا۔ اور خواص خان حاکم قندھار سے طالب امداد ہوا۔ خواص خان نے سلطان حسین خان کی بڑی عزت افزائی کی۔ اور فوج کا ایک دستہ اس کے ساتھ کر دیا۔ جس کی مدد سے سلطان حسین نے سلطان خداداد کو مار بھگایا۔ اور شہر صفا پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ سلطان خداداد نے ایران کی راہ لی اور اصفہان پہنچ کر شاہ عباس صفوی کو قندھار پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اور افغان قوم کی طرف سے مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ شاہ عباس کی تو خواہش ہی یہی تھی۔ اُس نے بلا تامل ۱۰۵۸ھ میں لشکرِ جرار روانہ کیا جس نے آتے ہی قندھار کو محاصرے میں لے لیا۔ اس وقت سدوزئی قبائل دو عظیم گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ سلطان حسین خان مغلوں کی حمایت میں اپنی قوم کے سرباز بہادروں کو لڑا رہا تھا اور سلطان خداداد شاہ عباس صفوی شہنشاہِ ایران کے زیرِ علم دادِ شجاعت دے رہا تھا۔ صفوی حکومت کا ستارہ عروج پر تھا۔ اُسے فتح ہوئی اور ۱۰۵۹ھ میں ایرانی جرنیل نے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی صفا بھی سلطان حسین سے سلطان خداداد نے چھین لیا۔ ان دنوں مغل شہنشاہ شاہجہان کابل آیا ہوا تھا اور اسے اپنی قلمرو سے قندھار کے نکل جانے کی اطلاع مل چکی تھی۔ سلطان حسین شہنشاہ سے جا کر ملا اور اسے قندھار پر دوبارہ حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ شاہجہان نے ایک لشکر اورنگ زیب کی سرکردگی میں قندھار روانہ کیا۔ سلطان حسین بھی اپنے زیر اثر قبائل کے ہمراہ مغل

فوج کے ہمراہ ہو گیا۔ اورنگ زیب کافی عرصہ اس شہر کا محاصرہ کئے پڑا رہا۔ مگر چونکہ موسم سرما شباب پر آچکا تھا۔ ہر طرف برفباری ہو رہی تھی۔ یخ نے رہی سہی کمی پوری کر دی، جس سے ہندوستانی فوج بلبلا اٹھی اور شہزادہ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ سلطان حسین کی حالت اس وقت سخت قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کا معاملہ تھا۔ صفا سلطان خداداد کے قبضے میں تھا۔ ایرانی لشکر اس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ اس لئے اورنگ زیب نے اسے اپنے ہمراہ ملتان چلنے کی دعوت دی چنانچہ جب ہندوستانی لشکر جان بچی لاکھوں پائے کے مصداق اس مہم کو نا تمام چھوڑ کر واپس روانہ ہوا تو سلطان حسین خان بھی اپنے قبائل کے ہمراہ اس کے ساتھ چلا آیا۔ ملتان جنت نشان نو صد ہا سال سے مغربی قافلوں کو خوش آمدید کہتا چلا آیا ہے اور یہ عظیم شہر راوی اور چناب کے سنگھم پر ایسے زخم خوردہ اور خانماں برباد مہاجرین کے لئے ہمہ وقت بازو پھیلائے اہلاً و سہلاً کہتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس نے شاہ حسین اور اس کے قبائل کو بھی سینے سے لگایا اور انہیں ایسا سکون و اطمینان بخشا کہ انہیں وطن بھول گیا اور وہ ملتان میں ایسے جذب ہوئے کہ ملتانی بن کر رہ گئے۔

ان دنوں اورنگ زیب ہی صوبہ ملتان کا گورنر تھا۔ اس نے سلطان حسین خان کا ڈیڑھ سو روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر کیا۔ اور رنگ پور میں سیر حاصل جاگیر عنایت کی جہاں سلطان حسین خاں نے عارضی طور پر اپنے قبائل کو آباد کیا۔ اور خود بھی یہیں سکونت اختیار کی۔

داراشکوہ کا تقرر

جب صوبہ ملتان کی آبادی اور سرسبزی کی شہرت دارالخلافے میں پہنچی تو سلطان داراشکوہ کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ یہ صوبہ اُسے جاگیر میں عنایت کیا جائے۔ شاہجہان کو اس

بیٹے سے بڑی محبت تھی اور وہ اس کی خواہش کو ہمیشہ مقدم رکھتا تھا چنانچہ اورنگزیب کو پھر قندھار کی مہم پر جانے کا حکم ہوا، اور ملتان دارا شکوہ کو دے دیا گیا۔

اورنگ زیب نے بلا چون و چرا حکم شاہی کی تعمیل کی۔ اپنے اہل و عیال کو اس نے ملتان میں چھوڑا اور خود لشکر شاہی کے ہمراہ قندھار روانہ ہو گیا۔ اور سلطان حسین خان سدوزئی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن اس دفعہ بھی لشکر شاہی کو ناکامی ہوئی۔ اورنگزیب واپس روانہ ہوا۔ ابھی وہ ملتان نہ پہنچا تھا کہ اُسے بُرہان پور میں بدلی کے احکامات موصول ہوئے۔ چنانچہ اورنگ زیب بُرہان پور روانہ ہو گیا، اور یہ صوبہ بدستور دارا شکوہ کی تولیت میں رہا۔ ۱۰۶۲ھ میں سلطان حسین بھی اورنگ زیب کے ہمراہ دکن گیا اور لشکر سُلطانی سے وابستہ ہو کر خدمات ہائے شائستہ انجام دیں۔ وہاں سے دربارِ شاہی میں حاضر ہوا۔ شاہجہان نے قدر افزائی کے طور پر اسے ہفت ہزاری منصب اور وفادار خاں کا خطاب مرحمت کیا اور اس کی انگوٹھی کا سجع مقرر کیا۔[۱]

به لطف و عنایاتِ شاہِ جہاں
خطابِ حسین شد "وفادار خاں"

چونکہ سلطان حسین خان اپنے قبائل کو خاص ملتان میں آباد کرنے کا متمنی تھا۔ اس لیے دربارِ شاہی سے ڈنگ پور کی بجائے خاص ملتان میں ایک لاکھ روپے کی جاگیر عنایت ہوئی۔ چنانچہ حسین خاں نے ملتان پہنچ کر شاہ عبدالجلیل گردیزی سے شہر کے مغرب میں اراضی حاصل کی۔ اور ایک بستی معروف بہ کھی شاہ حسین خاں سدوزئی آباد کی۔ اس میں مسجد تعمیر کرائی اور اپنی رہائش کے لئے ایک محل موسومہ شیش محل بنوایا، اور مع اپنی برادری کے امن و آسائش سے رہنے لگا۔

---

[۱] Saddozais in Multan by Umar Kamal Khan Adv. Page 2 ol

نواب شیخ موسیٰ گیلانی

سلطان دارا شکوہ چونکہ فقیر دوست شہزادہ تھا اور قادری سلسلے میں حضرت مُلّا شاہ کا مُرید تھا۔ اس بنا پر اُسے ملتان کے جیلانی مخادیم سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ جب اُسے ملتان کی جاگیر ملی تو اس نے بھی حضرت نواب شیخ موسیٰ گیلانی علیہ الرحمۃ کو اس منصب پر بحال رکھا کیونکہ خود شہزادہ ولی عہدِ سلطنت ہونے کے سبب شہنشاہ کے پاس آگرہ میں رہتا تھا۔

نواب شیخ سیّد موسیٰ گیلانی علیہ الرحمۃ حضرت مخدوم سیّد حامد گنج بخش قدس سرّہٗ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اصل نام سیّد فتح علی تھا، عبدالقادر، محمد غوث، حامد اور موسیٰ چونکہ اس خاندانِ جلیلہ کے اکابرین کے اسمائے گرامی تھے۔ اس لئے جب بھی کسی بزرگوار کو سجادگی کا منصب عطا ہوتا تو بطور لقب ان اسماء میں سے کوئی نام تبرکاً و تیمناً اسے عنایت کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سیّد فتح علی کو جدِ امجد سیّد جمال الدین موسیٰ کی نسبت سے مخدوم موسیٰ گیلانی کا لقب مرحمت ہوا۔ آپ بڑے زاہد اور عابد انسان تھے۔ آپ کی دینی اور دُنیاوی صلاحیتوں کے پیشِ نظر حضرت مخدوم سید حامد گنج بخش علیہ الرحمۃ نے اپنی زندگی میں ہی خلافت اور سجادگی آپ کو تفویض کر دی تھی۔ آپ کافی عرصہ صوبہ لاہور کے دیوان رہے اور پھر جب دارا شکوہ کو صوبہ ملتان ملا تو اُس نے حضرت کو اپنا نائب مقرر کیا۔

۱۰۶۷ھ میں شاہجہان سخت بیمار ہو گیا۔ دارا شکوہ نے بحیثیت ولی عہد سلطنت کا تمام نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس وقت تمام شہزادے دارالخلافہ سے دُور اپنی اپنی جاگیروں میں تعینات تھے۔ دارا شکوہ نے اُنہیں بادشاہ کی علالت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہزادوں کو اپنے باپ کے انتقال کا یقین ہو گیا اور وہ اپنی فوجوں کے ہمراہ آگرہ کو روانہ ہوئے۔ دارا شکوہ نے اس سیلاب کو روکنے کی بڑی کوشش کی مگر اُسے کامیابی نہ ہوئی اور بُری طرح سے شکست کھا کر دہلی اور لاہور

ہوتا ہوا ملتان پہنچ گیا۔ مفتی محمد بقا ملتانی سے روایت ہے کہ دارا شکوہ کے ادبار کا حضرت نواب شیخ موسیٰؒ کو کشف کے ذریعے پہلے سے علم ہو گیا تھا۔ پندرہ یوم بعد جب دارالخلافہ سے آنے والوں نے اس ارشاد کی تصدیق کی تو لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ سکہ[1] تو مراد بخش کا چل رہا ہے، اورنگ زیب کی حکومت کیسے چلے گی۔ تھوڑے دنوں بعد یہ خبر بھی آ گئی کہ شہزادہ مراد بخش کو گرفتار کر کے قلعہ گوالیار بھیج دیا گیا ہے۔

اورنگ زیب ملتان میں

دارا شکوہ ملتان پہنچا تو حضرت نے اُسے تسلی دی اور فرمایا کہ "اگر آپ یہاں رہیں تو پھر کسی کی طاقت نہیں کہ آپ کا بال بیکا کر سکے۔ اگر میری داڑھی خون سے رنگین ہو گئی تو بھی آپ کا کچھ نہ بگڑے گا"۔ لیکن جب اورنگ زیب کی آمد آمد ہوئی تو دارا شکوہ اتنا گھبرایا کہ اُسے حضرت کے قول کا خیال نہ رہا اور رات کی تاریکی میں ٹھٹھہ کو فرار ہو گیا۔

اورنگ زیب ۷ محرم ۱۰۶۸ھ کو ملتان کے قریب پہنچا اور تین کوس کے فاصلے پر جہاں راوی اور چناب کا سنگم تھا خیمہ زن ہوا۔ نواب شیخ موسیٰ گیلانی کی طبع مبارک پر دارا شکوہ کے ادبار کا اتنا گہرا اثر پڑ چکا تھا کہ انہوں نے ملتان کی نظامت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ آپ نے شہزادے کی آمد پر سیّد عزت خاں اور سیّد مسعود بارھہ کے ہمراہ حاضر ہو کر نظامتِ ملتان سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ اورنگ زیب نے پوچھا،

"دارا بے شکوہ کجا رفت؟"

آپ نے بغیر کسی جھجک کے بے ساختہ کہا

"دارا با شکوہ آمدہ بود ولے بے دستوری رفت، رفت!!"

---

[1] شہزادہ مراد بخش نے اپنی گورنری کے زمانہ میں ملتان میں اپنا سکہ رائج کیا تھا اور ابھی تک یہی سکہ چل رہا تھا۔

شہزادے کو "باشکوہ" کا لفظ کھٹکا۔ جبینِ شاہی پر شکن پڑ گئی۔ برافروختہ ہو کر کہا
"کیا آپ نے دارا سے کہا تھا کہ آپ ملتان چھوڑ کر نہ جائیں۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا؟"

نواب گیلانی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے ایسا کہا تھا۔ شہزادہ دارا شکوہ میرا ولی نعمت تھا اور اس کی مدد میرا فرض منصبی تھا۔"

"کیا تم ہمارے مقابلے میں نکلتے؟" شہزادے نے برہم ہو کر کہا

"اس میں شبہ ہی کیا ہے۔ اگر میرا ولی نعمت لڑتا تو میں سب سے پیش پیش ہوتا۔" شیخ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اگر کوئی اور امیر ایسی سیف گوئی کا مرتکب ہوتا تو عتابِ سلطانی اُسے یقیناً اپنی گرفت میں لے لیتی۔ مگر حضرت کی روحانیت شوکتِ شاہی پر غالب آگئی۔ بادشاہ کافی دیر تک گہرے فکر میں کھویا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے سر اُٹھا کر شیخ کے سراپا پر نظر ڈالی اور فرمایا

"محابا رسول اللہ عزیز است بخشیدم۔"

عالمگیر نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ شہزادہ نے حضرت مخدوم موسیٰ گیلانی کا استعفا قبول کر کے آپ کی اسپ خاص اور خلاعِ فاخرہ سے عزت افزائی کی اور بڑے اعزاز و اکرام سے رخصت کیا۔[1] مخدوم گیلانی کے مستعفی ہونے پر اورنگ زیب نے لشکر خاں گورنر کشمیر کو ملتان کی صوبیداری پر فائز کیا۔ اور حکم دیا کہ جب تک لشکر خاں یہاں نہیں پہنچتا، عالم خاں بطور قائم مقام گورنر کام کرے۔ پھر شہزادہ مشائخ ملتان کی زیارت کے لئے شہر میں داخل

---

[1] "شیخ سید موسیٰ گیلانی را و اسد کاشی ہر یک را بعنایت اسپ دلیاری از بندہائے عقبۂ خلاف بعطائے خلعت سرافرازی اندوختند" (عالمگیر نامہ ص ۲۲۸)

ہوا۔ عالمگیر نامہ میں شہزادے کا مشائخ کرام کے مقابر پر حاضری دینے کا حال اس طرح سے درج ہے :-

"و دفعۂ دیگر شہنشاہ یزدان پرست حق آگاہ بقصد زیارت روضۂ فیض آئین جناب قدوۃ الاولیاء الواصلین عارف صمدانی قطب ربانی شیخ بہاء الدین ملتانی قدس اللہ سرہ العزیز بشہر کرامت بہر ملتان شرف قدوم بخشیدہ فیض اندوز مزار برکت آثار آں مقرب درگاہ احدیت گردیدند و استمداد ہمت و استفاضۂ انوار توجہ از باطن پر فتوح آں مقدم کبرار عارفین فرمود۔ شیخ بہاء الدین صاحب سجادۂ آں پیشوائے اولیائے عظام و خدمۂ مجاوران آں مقام قدسی احترام را از فیض انعام عام بہرہ ور ساختند و در رفتن و آمدن از زر فشانی دست خود و عطا خلعے انبوہ را نقد آرزو بدامن اُمید افتاد"[1]

یعنی دوسرے دن شہنشاہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کے روضۂ منورہ کی زیارت کے ارادے سے شہر ملتان میں داخل ہوا اور بڑی عقیدت و ارادت سے حضرت کے مزار پُر انوار پر فاتحہ پڑھی۔ حضرت کے صاحب سجادہ اور تمام خدام درگاہ کو انعام و اکرام سے خورسند فرمایا اور آتے جاتے وقت اپنے ہاتھ سے فقراء اور مساکین پر روپوں کی بارش کی گئی۔

منشی محمد کاظم نے وقائع عالمگیری میں اس رقم کی تفصیل بھی درج کی ہے، جو بادشاہ نے حضرت شیخ الاسلام کے مقبرۂ عالیہ میں تقسیم کی تھی۔ لکھتا ہے کہ :-

"یک ہزار روپیہ بشیخ بہاء الدین صاحب سجادہ کہ از اولاد کرام آں پیشوائے اولیائے عظام است و یک ہزار روپیہ بخدمہ و مجاوران آں مقام قدسی احترام انعام نمودند"[2]

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۲۰۹ [2] وقائع عالمگیری ص ۲۰۹

یعنی ایک ہزار روپے حضرت مخدوم بہاء الدین صاحب سجادہ کو اور ایک ہزار روپیہ خدام درگاہ میں تقسیم فرمایا تھا۔ پھر حضرت مخدوم شاہ یوسف گردیزی علیہ الرحمتہ کے آستان پر حاضر ہوئے۔ اور فاتحہ پڑھنے کے بعد خدام و مجاوران کو نقود و انعامات سے نہال کیا اور صاحب سجادہ کو خلعت فاخرہ اور مادہ فیل سے سرفراز فرمایا۔ منشی محمد کاظم کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔

"محمد یوسف از اولادِ کرام عزیز مصر کرامت عزیزی شاہ یوسف گردیزی
کہ مرقد شریفش در بلدۂ طیبہ ملتان است بمرحمت خلعت و مادہ فیل سرمایہ اعتبار
اندوختند۔"[1]

اورنگ زیب ملتان میں بمشکل پانچ روز قیام کر سکا۔ کیونکہ پرچہ نویسوں نے اطلاع بھیجی تھی کہ دارا شکوہ کی ترغیب و تحریص سے سلطان شجاع لشکر جرار کے ساتھ دارالخلافہ کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ ۱۲ر محرم کو کوکبہ اجلال حرکت میں آیا اور بادشاہ دہلی کی طرف عازم ہوا۔ اس روز ڈیرہ غازی خاں کے بلوچ سردار نواب حاجی خان کو ملاقات کا شرف عطا ہوا۔ اسے بھی بادشاہ نے اسپ خاصہ فیل مع ہودج اور خلعت فاخرہ سے مفتخر کیا۔ ۲۵ر محرم کو لشکر خاں نے تحائف کشمیر کے ساتھ لاہور میں بادشاہ کا نیاز حاصل کیا۔ اور خلعت فاخرہ سے سرفراز ہو کر ملتان کو روانہ ہوا۔

ملتان عالمگیری دور میں

لشکر خاں نے ملتان پر دو سال تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس کی مہر کا سجع یہ تھا ؎

مرید شاہِ اورنگ زیبِ عادل
ہمہ اند جانست لشکر خاں از دل

[1] وقائع عالمگیری ص ۲۱۷

اس کے بعد تربیت خاں ناظم مقرر ہوا۔ اس نے بھی نیک نامی سے وقت گزارا۔ ازاں بعد سیف خاں تعینات ہوا۔ اس کے بعد یہ صوبہ شہزادہ معظم شاہ کو جاگیر میں دے دیا گیا۔

نواب گیلانی کا سفرِ آخرت

نواب شیخ موسیٰ گیلانی جو مستعفی ہونے کے بعد گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔۔ ۲۳، جمادی الاول ۱۱۰۱ھ کو انتقال فرما گئے۔ صاحب بحر السرائر لکھتے ہیں کہ آپ کے جنازہ پر ایک لاکھ سے زیادہ آدمی جمع ہو گئے تھے۔ کئی دنوں تک پورے شہر پر سوگواری کی سی کیفیت طاری رہی۔ آپ کی تاریخ وفات ایک رباعی میں اس طرح دکھائی گئی ہے۔

؎ چو آں شیخ زماں کا داد قدسی بود زیں دُنیا
بملک قدس رحلت یافت گردوں کرد تقدیمش
من از پیر خرد تاریخ سالِ رحلتش جُستم،
خرد زالہام قدسی گفت "شیخ قدس تاریخش"

آپ کے خوارق وکرامات بکثرت ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے کے مصداق صرف دو واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد بقا بن عبد الملک فاروقی روایت کرتے ہیں کہ جن دنوں آپ دہلی میں مقیم تھے۔ عیسائیوں کا بہت بڑا پادری حاضرِ خدمت ہوا۔ بولا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں اس وقت کیوں حاضر ہوا ہوں!"

فرمایا "ہاں ہمیں معلوم ہے کہ تم حضرت عیسیٰ روح اللہ کی طرف سے مامور ہو کر حاضر ہوئے ہو!"

پادری نے بے اختیار آگے بڑھ کر زمینِ خدمت کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ مجھے عرصہ سے مسلمان ہونے کا شوق تھا۔ لیکن یہ تمنا تھی کہ کسی بلند شخصیت کے دستِ حق پرست پر اسلام

قبول کیا جائے۔ آج رات حضرت عیسیٰ خواب میں تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ "سید موسیٰ گیلانی سے کون افضل ہوگا۔ جس کے خلق اور خُلق کا سکّہ تمام دُنیا مانتی ہے"۔ چنانچہ اُسی وقت آپ کے دستِ مبارک پر مسلمان ہو کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا اور نصرانیت کی جتنی کتابیں اس کے پاس تھیں سوائے انجیل اور توریت کے سب دریا میں بہا دیں۔

یہ بھی حضرت علامہ مفتی محمد بقا سے روایت ہے کہ ایک دن بادشاہ کے مصاحبوں میں سے کسی نے حضرت کی دعوت کی۔ حضور نے قبول فرما لیا۔ شکار کھیلتے ہوئے مقررہ وقت پر امیر کے ہاں پہنچے۔ اس نے بڑے تپاک سے حضور کا استقبال کیا اور قسم قسم کے کھانے دستر خوان پر ترتیب دے کر حضور سے بسم اللہ کی التماس کی۔ آپ نے کھانے کو مشتبہ سمجھ کر اپنے شکاری کُتّوں کو اس میں سے کچھ اُٹھوا کر ڈلوایا باوجودیکہ کُتّے سخت بھوکے تھے، مگر انہوں نے اسے مُنہ تک نہ لگایا۔ حضرت نے امیر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "جس طعام کو میرے کُتّے بھی مُنہ نہ لگائیں، میں بزرگوں کی اولاد ہو کر کیسے کھا سکتا ہوں؟" امیر سخت شرمندہ ہوا۔

آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ شیخ سیّد عبد القادر، سیّد حامد اور سیّد حسین۔ اوّل الذکر دو صاحبزادے مخدومہ خیر النساء امۃ الاول کے بطنِ عفت سے پیدا ہوئے، اور تیسرے سیّد حسین ایک راجپوت بی بی سے تولّد ہوئے تھے۔ بے حد حسین نوجوان تھے۔ عین عالمِ شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سیّد خضر علی نام ایک بچہ یادگار چھوڑا جو شکل و صورت میں اپنے والد کے مشابہ تھا۔

سیّد حامد قادری گیلانی

یہ حضرت کے دوسرے صاحبزادے تھے نہایت مرتاض اور خدا یاد بزرگ تھے۔ شجاعت و سخاوت میں بے مثل اور اذکار و اشغال میں اپنے برادرِ

یعنی سید عبد القادر ثالثؒ سے مستفیض تھے۔ حکومت کی طرف سے آپ کو صدر پنجاہ کا منصب حاصل تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا دل کبھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہوا۔ جب وقتِ آخر قریب آیا، آپ کے بڑے بھائی سیّد عبد القادر، سیّد محمد یوسف رابع گردیزی واسطی کی معیّت میں تشریف لائے۔ بھائی کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"کیوں بھائی! فقیروں کی دوستی کام آئی؟"

سیّد حامدؒ نے عرض کی۔ حضور کے وجودِ مسعود کی برکت سے بندہ کو عشاقِ شہداء کی صف میں جگہ دے دی گئی ہے۔ اسی اثنا میں مخدوم گردیزیؒ نے بھی طبع پرسی کی۔ فرمایا، الحمد للہ اچھا ہوں ع　گر شود جامہ بدل شخص مبدل نہ شود

زاں بعد بذکرِ "ھُو" مشغول ہوئے۔ یہاں تک کہ طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ آپ کی وفات ۱۶۷۰ء میں واقع ہوئی[۱]۔

شہزادہ معظم شاہ اورنگ زیب کے زمانے میں لشکر خاں، تربیت خاں اور سیف خاں کے بعد شہزادہ معظم شاہ کو صوبہ ملتان مرحمت ہوا۔ یہ شہزادہ کافی عرصے تک ملتان میں مقیم رہا۔ اس کی عادتیں بہت شستہ اور اخلاق نہایت عمدہ تھے۔ یہ شہزادہ اکثر بھیس بدل کر رات کو شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرتا تھا۔ ایک رات مخدوم شاہ محمد یوسف گردیزیؒ کے آستان پر حاضر رہ کر صاحبِ سجّادہ کی عبادت و طاعت کا مشاہدہ کرتا رہا۔ صبح کو دربار میں فخر کے طور پر اس واقعے کا ذکر کیا اور اسپ خاصہ و پانچ سو روپے نقد نذر کے طور پر مخدوم شیخ محمد یوسف صاحبِ سجّادہ کی خدمت میں بھجوائے۔

نواب محمد سعید قریشی کچھ عرصہ سے ملتان شہر میں ایک قریشی رئیس مقیم تھا۔ اس نے اندرونِ دہلی دروازہ محلہ کمنگراں کے متصل ایک باغ لگوایا

---

[۱] آپ کا مزار جدِ امجد کے مقبرے میں ہے۔ جنوبی دالان کی غربی جانب پہلا مزار آپ کا ہے!

اس میں مسجد اور اپنے لئے مقبرہ تعمیر کرایا اور روز پنجشنبہ اواخر رمضان ۱۰۸۷ھ میں فوت ہو کر اپنے ہی بنا کردہ مقبرے میں دفن ہوا۔

نواب محمد سعید خان کے اوائل حال کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ اس وقت لوگوں کے سامنے آیا جب وہ سلطان مراد بن شاہجہان کا مصاحب بن کر احمد آباد گجرات گیا۔ تھوڑے سے عرصہ میں ہی شہزادہ کا مقرب بن گیا اور اس کی مدح میں بلند پایہ قصائد لکھے۔ وہ سخنوری کے سب اقسام کا ماہر تھا۔ روزمرّہ کا صاف اور طرزِ کلام ایسا تھا کہ ملوک و خوانین ایک لمحہ کی صحبت میں اس پر فریفتہ ہو جاتے تھے۔ اس لئے کہ وہ حاضر جواب بدیہہ گو، تعبیر و علمِ فراست کا ماہر تھا۔

ایک دفعہ عید کے موقع پر جشن مسرّت منایا جا رہا تھا اور تمام شعرائے دربار اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے۔ شہزادہ مراد نے چشم و ابرو کے اشارہ سے محمد سعید خاں سے پوچھا کہ آپ نے بھی کچھ لکھا ہے؟ خان صاحب کچھ لکھ کر نہ لائے تھے۔ لیکن موقع ایسا آ گیا تھا کہ انکار و ابا گستاخی و توہین کی صورت اختیار کئے جا رہے تھے۔ اس لئے خان صاحب نے خاموشی سے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شہزادے کا اشارہ پاتے ہی اسے سامنے کر کے پڑھنا شروع کیا ؎

روزِ سعید است لب خشک می آلود کنید　　چارۂ کارِ خود اے تشنہ لباں زود کنید

دیر گاہ است کہ اندر مثال دور ترم　　زود باشید بہ کفِ جام می آمود کنید

حرف بے حرفہ واعظ نتواں کرد بگوش

گوش بر زمزمہ چنگ و نے و عود کنید

شہزادے کو محمد سعید خاں کا یہ کلام بہت پسند آیا اور اُن سے کہا کہ یہ کاغذ ہمیں دے دو۔ کاغذ ہاتھوں میں لے کر جو دیکھا تو بالکل صاف تھا۔ کہیں ایک حرف بھی اس پر لکھا ہوا نہ تھا۔ اس وقت

سب کو معلوم ہوا کہ نواب صاحب گھر سے کچھ لکھ کر نہ لائے تھے۔ انہوں نے جو کچھ پڑھا تھا فی البدیہہ پڑھا تھا۔ شہزادہ اور تمام درباری انگشت بدنداں رہ گئے۔

اس واقعہ کو تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ بادشاہ کو شہزادے کی غفلتوں کی شکایت پہنچی تو اس نے اپنے ایک معتمد منصب دار علی نقی کو شہزادے کا دیوان بنا کر احمد آباد بھیجا، اور شہزادے کو تاکیدی فرمان میں حکم دیا کہ دیوان کی صلاح و صوابدید سے تجاوز و انحراف نہ کرے۔ دیوان نے تھوڑی سی مدت کے بعد نواب محمد سعید کو موقوف کرا دیا وہ شاہجہان آباد پہنچ کر کچھ روز دارا شکوہ کی ملازمت میں رہا، لیکن جب وہ قتل ہوا تو شہنشاہ اورنگ زیب کی سرکار میں ملازم ہو گیا، اور گو منصب کچھ اتنا زیادہ نہ تھا، مگر مقرب ایسا بنا کہ بڑے بڑے امراء کو اس پر رشک آنے لگا۔ آخر بادشاہ کے حکم سے وہ ملتان آیا اور ۱۰۸۷ھ[1] میں فوت ہو کر پیوندِ خاک بنا، جس محلے میں یہ نامور امیر محوِ خواب ہے وہ اس کے نام پر محلہ سعید خاں قریشی کہلاتا ہے۔

نواب محمد سعید خاں کا کلام "کلیاتِ سعید خاں" سے موسوم ہے جو ۲۴۶ اوراق پر مشتمل ہے تقطیع ۱۰×۶ انچ سطور ۱۹ خطِ نستعلیق متوسط، تاریخ کتابت ۱۱۳۰ھ (سنہ ۷ جلوس فرخ سیر) کلیات کے شروع میں مصنف کا اپنا دیباچہ ہے۔ یہ مجموعہ قصائد، رباعیات، مثنویات، قطعات، دیوان غزلیات مرتب غرض مختلف اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔

سعید خاں ایک پختہ کلام شاعر ہے تعجب ہے کہ اس کا کلام اب تک طبع نہیں ہوا سوائے ایک نفیس قصیدے کے جو حضرت امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام کی منقبت میں ہے اور جسے شیر خاں لودھی نے اپنی کتاب مراۃ الخیال میں درج کیا ہے، اور تین شعر جو اوپر درج ہیں "شمع انجمن" میں طبع ہو چکے ہیں۔

نواب محمد سعید خاں حسباً و نسباً قریشی ہے اور اسے حضرت شیخ الاسلام سے بے پناہ ارادت ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا حضرت زکریا علیہ الرحمۃ کے خاندانِ عالی شان سے نسبی

---

[1] مقبرے پر تاریخہائے وفات "دخل جنات" اور "داخل شدہ جنت سعید خاں" مرقوم ہے۔ اور نیچے ۱۰۸۸ھ درج ہے۔

تعلق بھی تھا یا نہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کی شان میں اس نے ایک قصیدہ اپنی کلیات میں درج کیا ہے۔ جس سے اس کی حسنِ ارادت کا عکس ٹپکتا ہے۔ لکھتا ہے ؎

شہ ممالکِ حق الیقیں بہاء الدیں	کہ رحمتے است بعالم ز کردگارِ رحیم
زدو سے فخر زند نوبتِ شہنشاہی	ز فیضِ مقدم او مولتاں بہفت اقلیم
شہے کہ خاک درش را ز فخر جا دادند	شہاں بر افسر و دیہیم خود چوں دُرِ یتیم
تراست ملک و مِلک ہر دو بندۂ قرباں	تراست دین و دنیا ہر دو خانہ زاد قدیم
کسے کہ پیرو خلق حمیدہ تو بود	منزّہ آمد چو روح از صفات ذمیم
مرا کہ کعبۂ مقصود شد حریم درت	خدا نصیب کند طواف آں خجستہ حریم

بجز جناب تو دار الشفا نمے داند
دلم کہ از مرضِ یاس گشتہ است سقیم

قریشی اپنے آپ کو پیرو ِ "شیخ عراقی" کہتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے کلیاتِ نواب محمد سعید خاں کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے:-

"در اوائل حال پُر اختلال کہ درد طلب گریبان گیر خاطر ایں حقیر درد طلب شد اکثر اوقات از طواف مزارات متبرکہ کہ مشائخ دار الامان خطۂ ملتان کہ مسقط الراس ایں احقر الناس است، اکتساب انواع سعادات و اقتباس اقسام برکات نمودہ بجہت استفادہ و استفاضہ بسا ایام و لیالی بصد ہزار درد نالی دراں اماکن فیض مواطن می گذرانید خصوص بآستان بوسی روضہ منورۂ مطہرہ قدوۃ الاولیاء برہان الاصفیاء قطب الاعظم غوث الاکرم حضرت شیخ بہاء الدین زکریا و حضرت شیخ رکن الدین ابو الفتح فیض اللہ قدس سرہما کہ والی والائے گروہ سعادت پژوہ اولیائے آں ولایت اند۔ سعادت اندوز دائمی و چراغ افروز دولت ابدی بود"

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ نواب محمد سعید خاں قریشی کا اصل وطن ملتان ہے۔ وہ شروع سے فقر و تصوف کی طرف مائل تھے اور حضرات مشائخ سہروردیہ رحمہم اللہ علیہم کے مقابر کی زیارت اور ان کی ارواح صادقہ سے استفاضہ کرتے رہتے تھے۔ آگے لکھتے ہیں کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ الاسلام کے سجادہ نشین مخدوم شیخ بہاء الدین ان کے گھر میں تشریف لے آئے ہیں اور فرماتے ہیں اپنا دیوان مرتب کرو۔ چنانچہ اس فرمان کی تعمیل میں اس نے تمام کلام کو کلیات کی صورت میں مرتب کیا۔

نواب محمد سعید خاں کا مقبرہ ایک باغ میں واقع تھا۔ پاس ہی ایک مکتب اور مسجد تھی۔ اب صرف مقبرہ رہ گیا ہے۔ خالصہ دور میں باغ میں مکانات تعمیر کر لئے گئے۔ ریا ایک کونے میں مسجد یادگار کے طور پہ باقی رہ گئی ہے جو مقبرہ کے احاطہ کی نشان دہی کرتی ہے۔ مقبرہ خستہ حالت میں ہے۔ اس کی چاروں اطراف میں آیات قرآنی کی الواح پیوست ہیں۔ اصل قبریں نگی ہیں اور تہ خانہ میں ہیں۔ اوپر دوہری قبریں بنی ہوئی ہیں۔ غالباً میاں بیوی کی ہیں۔ بیرونجات سے علم دوست سیاح آتے ہیں تو انہیں اس مقبرہ کی تلاش میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ خود ہمسایہ لوگوں کو بھی معلوم نہیں کہ اس مقبرہ میں کس پایہ کی شخصیت آرام فرما ہے۔

بلوچوں کی بغاوت

۱۱۱۱ھ میں اورنگ زیب کو اطلاع ملی کہ بلوچوں نے بارہ ہزار فوج جمع کر لی ہے اور آمادۂ فساد ہیں۔ شہزادہ معز الدین جو بعد میں جہاندار کے نام سے تخت پر بیٹھا، اس بغاوت کو فرو کرنے پر مامور ہوا۔ یہ لڑائی دراصل بلوچوں کی جنگِ آزادی تھی۔ وہ طوقِ غلامی کو جو سالہا سال سے ان کے گلے میں ڈالا گیا تھا، نکال پھینکنا چاہتے تھے۔ حفیظ اللہ خاں صوبیدار ٹھٹھہ نے شہزادے کی مدد کی۔ اس کے باوجود شاہی فوجوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ افواجِ دہلی کے متعدد جرنیل کام آئے۔ بڑی مشکل سے شہزادہ اس بغاوت پر قابو پا سکا۔[۱]

[۱] عالمگیر نامہ جلد دوم

وفات حضرت مخدوم بہار الدینؒ

حضرت مخدوم بہار الدین قریشی سجادہ نشین شیخ الاسلامؒ ۱۸ جمادی الثانی ۱۰۹۰ھ کو راہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ ان کا ایک ہی فرزند تھا، قائم الدین اور وہی آپ کے بعد سجادہ نشین ہوا۔

مخدوم شیخ قائم الدین قریشیؒ

مخدوم شیخ قائم الدین المعروف مخدوم قائم شاہ اپنے نامور باپ کے انتقال پر سجادہ نشین قرار پائے غیر محتاط تذکرہ نویسوں نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کی قلندرانہ طبیعت تھی اور ملامتی مسلک رکھتے تھے۔ اپنے اس مفروضے کے ثبوت میں ایک کہانی بھی اختراع کر رکھی ہے کہ کسی نے اورنگ زیب کو یہ خبر پہنچائی کہ مخدوم قائم الدین شراب پیتے ہیں۔ شہزادے نے خواجہ سرا کو حکم دیا کہ مخدوم کے خلوت خانے میں جا کر بوتل کو مہر کر دے۔ اور پھر اس بوتل کو مع مخدوم صاحب حاضر دربار کرے۔ خواجہ سرا نے شاہی حکم کی تعمیل کی اور حضرت مخدوم دربار میں حاضر کئے گئے۔ بادشاہ نے اس بوتل کو حضرت مخدوم کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ اسے کھولئے۔ حضرت مخدوم نے بوتل کی مہر توڑ دی اور شراب کو ایک پیالے میں انڈیل دیا۔ شراب دودھ کی مانند ہو گئی۔ بادشاہ نے اسے چکھا تو وہ میٹھا دودھ تھا۔ یہ کہانی جتنی دلچسپ اور حیران کن ہے اتنی بے اصل بھی ہے۔ کیونکہ اورنگ زیب صرف شہزادگی کے زمانے میں ۷ محرم ۱۰۶۸ھ کو ملتان آیا تھا۔ ان دنوں شیخ الاسلامؒ کے سجادہ نشین حضرت بہار الدین قریشی تھے۔ اس کے بعد تا زندگی اورنگزیب کو اس جانب آنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بالخصوص ۱۰۹۰ھ سے ۱۰۹۴ھ کا مختصر سا زمانہ جو مخدوم قائم الدین کی سجادگی کا زمانہ ہے، شہنشاہ اورنگ زیب دکن کی مہمات میں مصروف تھا۔ مولانا ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ میں سوانح شاہی کا جو نقشہ دیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰۹۲ھ میں بادشاہ برہان پور میں تھا۔ یہاں سے اورنگ آباد گیا۔ ۱۰۹۳ھ میں اس نے

قلعہ رام سیج پر دھاوا کیا۔ ۱۰۹۴ھ میں اورنگ زیب گولکنڈہ کی مہمات میں مصروف تھا۔
ہمارے خوش اعتقاد دوست جب اس قسم کی روایات غیر ذمہ دار لوگوں سے سنتے ہیں تو بغیر تحقیق یقین کر لیتے ہیں، حالانکہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قریشی قدس سرہ کی مسند ہمیشہ ملامتی قسم کے سجادہ نشینوں سے پاک رہی ہے۔ یہاں تک کہ مخدومہ ماتو جیسی عارفہ متوبہ کے تقرر پر دربار کابل میں اعتراض ہوا کہ رشد و ہدایت کی اتنی بڑی مسند پر پردہ نشین خاتون کا تقرر فیض رسانی خلق کے دروازے کو بند کرنا ہے۔ وہاں ایک ملامتی شخص کو کیسے گوارا کیا جا سکتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام مذہب اہلسنّت کے امام تھے۔ ان کی مسند صرف ایسے شخص کو تفویض کی جا سکتی تھی جو شریعت مطہرہ کا سختی سے پابند ہو۔ اس لئے مخدوم قائم الدین پر ملامتی مسلک کا الزام محض تہمت ہے۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ مخدوم قائم الدین لاولد تھے۔ اس لئے ان کی وفات کے بعد شیخ ضیاء الدین محمد ثانی مسند نشین ہوئے۔ شیخ ضیاء الدین محمد کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک شیخ محمد زکریاؒ اور دوسرے عماد الدین محمد!

مخدوم محمد زکریا اپنے والد ماجد کے انتقال پر سجادہ نشین قرار پائے۔ آپ کا صرف ایک فرزند تھا، جو آپ کی زندگی میں ہی عالم بقا کو رخصت ہو گیا۔ ان کے دو معصوم بچے مخدوم محمد زکریا اور علیین شاہ بھی صغر سنی میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ خدا کی شان، جس پاک شخصیت کا اپنا بھرا بھرایا گھرانہ رخصت ہو گیا۔ جس وجودِ گرامی کا اپنا گلشن خزاں کی نذر ہو گیا، وہ دوسروں کے لئے اُمید گاہ اور دُکھی دلوں کا سہارا تھا۔ لوگ آتے، دُعائیں کراتے اور شاد کام رخصت ہوتے تھے۔ مخدوم زکریا کے انتقال پر شیخ الاسلام کی مسند ان کے چھوٹے بھائی شیخ عماد الدین کے حصے میں آئی۔ آپ سلسلہ سہروردیہ کے بڑے صاحب اثر بزرگ تھے۔ پیر ناصر علی قریشی علیہ الرحمۃ کی بیعت کا سلسلہ ان کے واسطے سے مخدوم زکریا علیہ الرحمۃ

سے ملتا ہے۔ انہوں نے حضرت کی شان میں مدح سرائی کرتے ہوئے اس کرب اور درد کا اظہار کیا ہے کہ کوئی مؤرخ یا شاعر ایسے خدا یاد درویشوں کے حالات جمع کرنے پر متوجہ نہیں ہوا۔ اس لئے دُنیا ان کے علم و فضل اور کمالاتِ روحانی سے ناواقف ہے کوئی فیضیؔ ہوتا کہ ان کے فیوض و برکات کو حیطۂ تحریر میں لے آتا۔ مولانا رومؔ جیسا کوئی صاحبِ دل ہوتا تو ان کے کارہائے زرّین کو مثنوی کے رنگ میں اجاگر کرتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

از بزرگان فضلہا دارم بسے — از خوارق ہاش گفتہ ہر کسے

گر نمایم شمۂ از وے بیاں — ہمچو شاہنامہ شود جلدے کلاں

مولوی رومؔ باید تا کند — شرحِ آں در مثنوی یکیک شد

اندریں دوراں بودے عطّار کو — تا نویسد اندک از اوصاف او

انوری باید کہ آرد در قلم — وصف پیرِ پاک دامن زیبا شیم

حیف قاآنی کہ مردہ پیش ازیں — ورنہ بنوشتے صفات پاک دیں

عرفی معروف اندر روزگار — مینوشتے مدح پیرِ نام دار

گر فیضیؔ زندہ بودے در جہاں — فیض او را شرحِ دادے از بیاں

بیدلؔ از تمدیح او دلدادہ است — قید در کہنش اسیر افتادہ است

دید چوں شوکت ز شانِ شوکتش — در بخارا ماندہ اندر حیرتش

عصمت از معصومیش متحیر است — وصفش از افکار صائب برتر است

ناصرِ دینِ خدا شد آں ولی — عاجز از اوصاف او ناصر علی

یا الٰہی صد تحیّت صد درُود
بر مزارش ساز از بندہ درود

"بزرگوں سے مجھے فضل و کمال حاصل ہے، ان کے خوارق کا ہر ایک نے ذکر کیا ہے
اگر میں اُن کے خوارق کا تھوڑا سا ذکر بھی کروں تو شاہنامہ کی طرح ایک ضخیم جلد
تیار ہو جائے۔ مولانا روم جیسا صاحبِ کمال چاہیئے جو ان کے فضل و کمال، اور
خوارق کا مثنوی کے رنگ میں ذکر کرے۔ اِس زمانے میں کوئی فرید الدین عطار جیسا
صاحبِ قلم ہوتا جو ان کے اوصاف کو حیطۂ تحریر میں لے آتا۔ انوری جیسا کوئی علامہ ہونا
چاہیئے جو میرے پاک مرشد کے اوصاف کو قلمبند کرے۔ افسوس کہ خاقانی پہلے مر
گیا۔ ورنہ اس پاک دینی ہستی کی صفات کو اپنے رنگ اور اسلوب میں نظم کرتا۔ عرفی
ہوتا تو میرے نامور شیخ طریقت کے حالات سپردِ قلم کرتا۔ اگر فیضی جہان میں زندہ
ہوتا تو ان کے فیوض و برکات کی شرح کو تحریر کرتا۔ بیدل اس کی مدح پر جان
دیتا اور اس کی محبت میں گرفتار رہے۔ شوکت بخاری نے جب حضرت کی
عظمت و شوکت کا مشاہدہ کیا تو وہ بخارا میں حیران رہ گیا۔ اس دل نے دین
الٰہی کی نصرت فرمائی۔ ناصر علی کا قلم ان کے اوصاف بیان کرنے سے عاجز ہے۔"

پیر صاحب کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ عماد الدین علیہ الرحمۃ بڑے مخیّر انسان تھے
ان کے جود و سخا سے ایک جہان مالا مال تھا۔

شیخ ضیاء الدین محمد ثالثؒ

شیخ عماد الدین علیہ الرحمۃ کے تین فرزند تھے۔ شیخ ضیاء الدین، شیخ باقر شاہ اور شیخ محبوب شاہ۔ شیخ نے اپنے بھائی مخدوم زکریاؒ سے نعمتِ باطنی پائی تھی۔ ان سے یہ نعمت ان کے بڑے صاحبزادہ شیخ ضیاء الدینؒ کو ملی۔ پیر قادر بخشؒ نے ان کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ پیر صاحب اپنے دَور کے بہت بڑے رئیس تھے۔ لیکن ان کا دل ہر وقت اپنے مولیٰ کی یاد میں محو رہتا تھا۔ دُنیا میں رہتے ہوئے دُنیا سے بے خبر تھے۔

ان کا طائر خیال ہمیشہ عالم ملکوت کی سیر میں مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ملک و مال و دولت بسیار داشت — لیک با حق در دل خود کار داشت
کار پردازان بکارش مشتغل — او بحق مشغول غیر از غش دغل
ظاہر او سالکانہ مے نمود — باطنش را جذبہ مولا ربود
بود در دُنیا ز دُنیا بے خبر — سیر ملکوتش بخاطر جلوہ گر

سیّد میر عالم سہروردی رح

سیّد میر عالم شیخ شہر اللہ کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے شریعت مصطفوی کے عاشق زار اور اپنے دور کے بڑے عابد انسان تھے۔ جود و سخا میں حاتم ثانی اور زہد و ورع میں دوسرے بایزیدؒ تھے۔ ان کی زندگی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ایک مرید قادر بخش قریشی رح کو مشائخ سہروردی کے حالات منظوم کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ پیر صاحب اپنی کتاب گل بہار کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ؎

میر عالم مظہر فیض و کرم — سید والا ہمم زیب اشیم
کرد فرمائش ز ذرّہ پروری — بندۂ منشی را شفیع قادری
کہ بدانش شہرۂ ہندوستاں — طوطیٔ شیریں نوائے بوستاں
شجرۂ پیران پاک سہروردی — می بباید مرترا تحریر کرد
اندک اندک از کرامات ہمہ — بر نویس اوصاف و درجات ہمہ
خلعت و نعمت عنایت ساز مت — صد مرّت صدر عنایت سازمت

حسب ارشاد مربی ایں کتاب
کردہ ام تصنیف از بہر ثواب

اپنے شیخ طریقت کا پیر صاحب نے اس طرح ذکر کیا ہے ؎

میر عالم، فیض مظہر مہرباں　　کامیاب و کام بخش و کارداں
در جوانی پیر او را دیدہ ام　　مثل او در دہر کم بشنیدہ ام
روز و شب اندر قیام و در قعود　　کار او ہرگز نباشد جز درود
ہمتش چوں حاتم از وے ہم فزوں　　وصف او از دانش و عقلم فزوں
کار او در روز و شب جود و سخاست　　ایں چنیں توفیق کو دیگر کہ راست
تابع شرع محمد مصطفےٰ است　　دوستدار چار یار باصفا است

نور رویش شہر را گلشن نمود
کوچہ و بازار را روشن نمود

پیر قادر بخش علیہ الرحمۃ دہلی کے اندر خانقاہ میں مدفون ہوئے۔ پیر صاحب کے تین صاحبزادے تھے، مگر ایک پشت کے بعد سب کا سلسلہ نسبی منقطع ہو گیا۔ پیر قادر بخش سید میر عالم سہروردی کے مرید تھے۔ ان کے ارشاد فیض بنیاد کی تعمیل میں آپ نے مشائخ سہروردیہ کے حالات منظوم کئے۔ اس گلدستہ کی تدوین میں پیر صاحب نے خاصی محنت سے کام لیا ہے۔ گل بہار کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ حضرت محبوب سبحانی قطب ربانی سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے حالات و کرامات پر مشتمل ہے اور اسے مصنف نے ۱۱۸۴ھ میں ختم کیا ہے۔ دوسرا حصہ مشائخ سہروردیہ رحمہم اللہ کے حالات و کرامات پر محیط ہے اور اسے پیر صاحب نے ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۱۸ھ یعنی پہلے حصہ کے ۳۴ برس بعد نظم کیا ہے۔ اس مجموعہ کے کل اشعار ۱۷۷۵ ہیں۔

حضرت قطب العالم سید عبدالقادر ثالث پانؒ

اسی زمانے میں حضرت پیران پیر علیہ الرحمۃ کی مسند پر جناب مخدوم قطب العالم سید عبدالقادر ثالث رونق افروز تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ بیان

کی جاتی ہے۔ آپ مادر زاد ولی تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ سے منقول ہے کہ جب میں اس مولود مسعود سے حاملہ تھی تو بعد نفخ روح یہ حالت تھی کہ جب میں قرآن شریف تلاوت کرنے لگتی تو میرے شکم میں جنبش پیدا ہوتی تھی۔ اگر پڑھتی پڑھتی رُک جاتی تو جنبش بھی رُک جاتی۔ مولانا شبیر محمد بن شیخ ابوالفتح فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالقادرؒ میرے قبلہ گاہؒ کی خدمت میں پڑھنے کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور حضرت میرے قبلہ گاہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کئے پڑھ رہے تھے دفعتہً موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ حضرت نے سبق پڑھتے ہوئے ہاتھ بلند کر کے اشارہ کیا۔ اسی وقت بارش تھم گئی۔

عبدالرحیم رنگساز بیان کرتے ہیں کہ ایک رات مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ دیکھا کہ حضرت مخدوم سید عبدالقادر آپ کی بغل میں ہیں اور حضرت ان کے سر اور پیشانی کو چومتے ہیں۔ صبح کو میں مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، چاہتا تھا کہ رات کے خواب کا تذکرہ کروں۔ بے تحاشا آپ کے منہ سے نکلا۔ سچ ہے نا اہل کو محرم اسرار نہ بنانا چاہیئے۔ میں سمجھ گیا کہ اس سے مراد عدم اظہار ہے۔ پس میں قدمبوس ہو کر رخصت ہوا۔ اور دل میں کہا کہ مجھے اسرار کے اظہار کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے بلند آواز سے فرمایا۔ "شاباش! اس راہ میں ایسا ہی ہونا چاہیئے!"

آپ نے ۱۶۷۲ء میں انتقال فرمایا۔ چونکہ تمام فرزند آپ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس لئے آپ کا پوتا شیخ محمد غوث ثانیؒ آپ کا جانشین ہوا۔

نواب مکرم خاں صوبہ دار ملتان

محمد معظم شاہ کے بعد اس صوبہ کی نظامت شہزادہ محمد اکبر اور الہ یار خاں سے متعلق رہی۔ ان کے بعد نواب مکرم خاں کا اس منصب پر تقرر ہوا۔ یہ بڑا عادل اور رعایا پرور حاکم تھا، اور

فقراء سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ اُس نے سیّد معین الدین بلگرامی کو اس صوبے کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ شاہ صاحب نے اس منصب کو انتہائی عدل و انصاف سے انجام دیا۔ اور ۱۳ شعبان ۱۱۰۳ھ کو فوت ہو کر اسی شہر میں دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادہ سیّد کرم اللہ نے "یدخلہ جنّت" سے تاریخ وفات نکالی ہے ان کی قبر روضہ حضرت موسیٰ پاکؒ کے احاطہ میں گنبد کے داخلی دروازہ کی سیڑھیوں سے متصل بائیں جانب واقع ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ جب میں سیوستان کے سفر سے ۱۱۴۷ھ میں واپس آرہا تھا تو سیّد معین الدین صاحب کی قبر پر حاضر ہو کر فاتحہ ادا کی۔ مآثر الکرام کے الفاظ یہ ہیں:۔

"چوں نواب مکرم خاں بہ ایالت صوبہ ملتان منصوبہ گشت، سید معین الدین را خدمت عدالت صوبہ بہ مسطور تفویض نمود سید ایں منصب نازک را براستی و درستی پرداخت و وضیع و شریف شہر را بہ عدل و احسان از خود راضی ساخت دہم در ملتان سیزدہم شعبان ۱۱۰۳ھ بہ گل گشت فردوس بریں خرامید۔ قبرش در ہماں شہر در حریم روضہ شیخ موسیٰ جیلانی قدس سرہٗ متصل زینہائے دروازہ گنبد مبارک جانب یسار داخل واقع شدہ۔ کاتب الحروف ہنگام مراجعت از سفر سیوستان در حدود سندھ سبع و اربعین و مائتہ و الف بہ زیارت مرقد شریف و فاتحہ مستعد گردید"۔　　(ص ۳۷۸)

سیّد معین الدین علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی علیہ الرحمۃ (جو اپنے زمانے کے ولی کامل اور عالم اجل تھے)، کے چچا زاد بھائی تھے۔ سیّد صاحب کے تبحّر علمی کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ علاّمہ مرحوم انہیں عقلِ مجسّم کہتے تھے، سید احمد اور سیّد معین الدّین دونوں بھائی یک جان دو قالب تھے۔ تمام عمر ان کی شوکت و عظمت سے گزری۔ لوگوں میں یہ مثال مشہور تھی "مدا موناں سدا سوناں" سید احمد کا عرف مدآ اور سیّد معین الدین کا

سونتال تھا۔ ان کے تدین کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب نواب مکرم خاں دہلی کے محلات
کے ناظم قرار پائے، تو انہوں نے ان دونوں بھائیوں میں سے ایک کو حاکم اور دوسرے
کو خزانچی مقرر کیا۔ (مآثر الکرام ص ۲۸۷)

شاہ حسین سدوزئی پر عتاب شاہی

شاہ حسین خراسان کا خود مختار حکمران رہ چکا تھا۔ اس لئے شہنشاہ اور شہزادوں کے
بعد کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ناموافق حالات اور صبر آزما مصائب و آلام نے اسے
چڑچڑا سا بنا دیا تھا۔ ایک دفعہ یہ شہنشاہ اورنگ زیب سے ہمکلام تھا کہ ایک اور شخص
نے اس کی بات کاٹ کر بادشاہ سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی۔ شاہ حسین نے بادشاہ
کے سامنے اُسے ڈانٹا۔ اور جب اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تو شاہ حسین نے آداب
شاہی کا خیال کئے بغیر اس پر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ اس پر
اورنگ زیب سخت برہم ہوا۔ اگر اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ نہ ہوتا تو شاید قصاص میں قتل
کرا دیا جاتا۔ لیکن پھر بھی گرفت سے بچ نہ سکا۔ سلام شاہ سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا گیا۔
اور حکم ہوا کہ ملتان میں رہے، دربار میں کبھی نہ آئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد شاہ حسین
نے ملتان میں وفات پائی اور اپنی تعمیر کردہ مسجد کے جنوب میں دفن ہوا جس پر نواب عابد
خاں نے شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔

جب شاہ حسین معتوب ہو کر گھر میں معتکف ہو بیٹھے تو سدوزئی خاندان کے
معتبرین نے مصلحت وقت کے پیش نظر شاہ حسین کے چھوٹے بھائی سردار الہ داد خاں
کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیا۔ اس نے اپنی قوم کو خوب سنبھالا، اور دربار شاہی سے از سر نو
تعلقات قائم کئے۔ اس کی وفات کے بعد قوم کی سرداری مرحوم الہ داد خان کے
صاحبزادے عابد خاں کے تفویض ہوئی اور مغل حکومت کی طرف سے اُسے وفادار خانی

کا خطاب بھی مرحمت ہوُا۔ اُس نے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے اچھے اچھے کام کئے۔ اور دریائے چناب کے کنارے ایک شاندار باغ لگوایا۔ جس میں ساون بھادوں میں ہر جمعہ کو میلہ لگا کرتا تھا۔

سلطان حیات خاں کی صفا سے مہاجرت

شاہ حسین کے ملتان چلے آنے پر سلطان خداداد ۱۰۷۸ھ تک بلا غل وغش حکومت کرتا رہا۔ جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کا لڑکا سلطان حیات خاں تخت نشین ہوُا۔ اس نے اپنے والد کی پالیسی کے علی الرغم صفوی سلاطین سے تعلقات ختم کر کے اورنگ زیب عالمگیر سے روابط وابستہ کر لئے۔ اس نے مغل فوج کے ساتھ مل کر قندھار کے ایرانی گورنر شاہ نواز خاں کو شکستِ فاش دی اور اکتیس جنگیں لڑنے کے بعد تمام خراسان کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

مغل افواج تو فتح ونصرت کے شادیانے بجاتی دہلی کو روانہ ہو آئی۔ مگر سلطان حیات خاں خراسان میں اکیلا رہ گیا۔ ایران کا تاجدار قندھار کے چھن جانے کا صدمہ بھولا نہیں تھا۔ اس نے ۱۰۹۱ھ میں دفعتًہ سلطان حیات خاں پر اتنی شدّت سے حملہ کیا کہ یہ جم نہ سکا اور شکست کھا کر صفا کی حکومت اپنے بھتیجے جعفر سلطان کے سپرد کی۔ اور خود مع اہل و عیال ملتان چلا آیا۔ شہزادہ علی محمد خاں مصنف تذکرۃ الملوک نے اس کی ملتان میں آمد ۱۴ شوّال ۱۰۹۳ھ درج کی ہے۔ اورنگ زیب نے اسے بھی سیر حاصل جاگیر مرحمت کی۔ اور یہ اس جگہ آباد ہوُا جہاں اب ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی ہے۔ اس نے اپنی رہائش کے لئے خوبصورت محل اور پاس ہی مسجد تعمیر کی۔ اور ایک باغ لگوایا۔ یہ آبادی گڑھی خدکہ اور باغ گلستان خدکہ سے موسوم تھا۔ بلدیہ کے قدیم ریکارڈ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے سلطان حیات خاں کی تحریک پر مغل افواج نے ایک دفعہ شہزادہ معز الدین کی کمان

میں قندھار پر حملے کئے۔ سلطان حیات خاں نے دونوں مہمات میں خوب جاں فشانی دکھائی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور وہ اپنی آباد کردہ کڑی میں خاموش زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سلطان حیات خاں کو اورنگ زیب نے دس ہزار روپے ماہانہ کا وظیفہ دینا منظور کیا۔ جو مغل اصطلاح میں التمغہ کہلاتا تھا۔

اورنگ زیب تاریخ کی روشنی میں

اگرچہ اورنگ زیب نے ۱۰۶۹ھ میں ہی ہندوستان کی بادشاہت کا تاج سر پر رکھ لیا تھا۔ مگر جب تک شاہجہان زندہ رہا، وہ اپنے آپ کو بادشاہ کا نائب ہی سمجھتا رہا۔ امورِ مملکت میں باقاعدہ باپ سے مشورے لیتا اور ان پر عمل کرتا تھا۔ ۱۰۷۶ھ میں شاہجہان کا انتقال ہو گیا۔ تو رمضان ۱۰۷۶ھ میں اورنگ زیب نے حسب ضابطہ تختِ شاہی پر جلوس کیا۔ سیّد عبدالرشید ٹھٹھوی نے اس آیتِ کریمہ سے تاریخ جلوس نکالی "وَ اَطِیْعُوا اللّٰہِ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ"۔ ہندوستان میں تاریخی زمانہ سے لے کر آج تک کوئی ایسا بڑا بادشاہ نہیں گزرا جیسا کہ اورنگ زیب تھا۔ اس کی سلطنت آسام سے بلخ اور کشمیر سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور پورے پچاس سال اس نے طنطنہ اور شوکتِ اجلال سے فرمانروائی کی۔ اس نے نوّے برس کی عمر پائی تھی۔ اخیر عمر تک بینائی اس کی درست رہی۔ پانچوں حواس اچھی طرح سے کام کرتے رہے اور ساری عمر جہاد بالسیف کی نذر کر دی۔ وہ خدا ترس، عابد، زاہد اور عالم شہنشاہ تھا۔ قرآن مجید پہلے حفظ تھا۔ تختِ شاہی پر قدم رکھا تو صحاح ستّہ بھی ازبر کر لیں۔ اپنی ذات کے لئے خزانۂ شاہی سے کچھ قبول نہیں کرتا تھا۔ کلام اللہ کی کتابت سے ساڑھے تیرہ سو روپے جمع ہوئے تھے۔ وہ سب غرباء میں تقسیم کرا دیئے۔ ٹوپیاں کاڑھنے سے پانچ روپے مہینے کی بچت ہوتی تھی۔ یہی رقم اس نے تجہیز و تکفین کے لئے رکھی۔ آخری وقت تک کوئی نماز

قضا نہیں ہوئی۔ دم نکل گیا مگر تسبیح ہاتھ میں رہی۔ اورنگ زیب نے ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ کو وفات پائی۔ اور وصیت کے مطابق حضرت زین الدین قدس سرہٗ کی درگاہ شریف کے جنوب مغربی گوشے میں دفن ہوا۔ شہنشاہ کا مزار بالکل سادہ اور کچا ہے۔ قبر بظاہر مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ مگر اس کی کچی قبر میں وہ کشش ہے کہ لاکھوں پکّی قبریں اور گنبد اس پر سے صدقے جائیں۔ اس سادگی کے باوجود قبر سے اتنا جلال ٹپکتا ہے کہ جو بھی زیارت کو جاتا ہے۔ اس پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ خدام اور چوبدار ہر وقت حاضر رہتے ہیں اور اب بھی نگاہ روبرو، ادب سے، تفاوت سے، آداب بجالاؤ پکارتے رہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ شہزادہ اعظم نے باپ کے کئی اعراس خود کیئے اور کئی سالوں تک نواب حمید الدین خاں فرمانروائے بھوپال قبر پر جاروب کشی کرتے رہے۔

سلطان محمد معظم بہادر شاہ اوّل

یہ بادشاہ باپ کے انتقال پر ۱۱۱۹ھ میں تخت پر بیٹھا اور پانچ سال حکومت کرکے بمقام لاہور فوت ہو گیا۔ اس بادشاہ کے زمانے میں شہزادہ معزّ الدین جہاندار شاہ بدستور ملتان کا گورنر رہا۔ یہ عیاش شہزادہ تھا۔ لال کنور نامی ایک کسبی عورت کو گھر میں ڈال رکھا تھا۔ شہزادے نے ملتان شہر کے جنوب میں ایک بڑا باغ لگوایا اور اس میں خوبصورت محلات تعمیر کرائے۔ یہ باغ اور محلات شہزادہ نے لال کنور کو دے دیئے تھے۔ اب نہ یہ باغ رہا ہے اور نہ ہی محلات کا کوئی نشان ملتا ہے۔ البتہ یہ مقام اب بھی "باغ بیگی" سے موسوم ہے اور ملتان سٹی اسٹیشن کو بھی مقامی لوگ باغ بیگی ہی کہتے ہیں۔

عبداللہ خاں کی خراسان کو مراجعت

عبداللہ خان سلطان حیات خاں کا بہادر اور اولوالعزم فرزند ارجمند تھا، اور وہ ملتان کی سکونت پر خوش نہ تھا۔ جب اسے جعفر خاں حاکم صفا کے فوت ہونے اور سرداری کے مسئلہ پر خراسان میں

سخت خانہ جنگی کی اطلاع ملی تو وہ قسمت آزمائی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے بیٹے اسداللہ خاں اور زمان خاں کے ہمراہ خراسان کو روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر ایسے سیاسی جوڑ توڑ کیئے کہ تمام ابدالی افغان اس کی سرداری پر راضی ہو گئے۔ اور ۱۱۲۰ھ میں یہ طالع آزما جوان صفا پر قابض ہو گیا۔ اسی سال اس نے خراسان کے ایرانی گورنر حسین ویردی خاں کو شکست دی اور اپنے بیٹے اسداللہ خان کو ابدالیوں کی ایک بڑی فوج دے کر ہرات کی جانب روانہ کیا۔ جسے اسداللہ خاں نے فتح کر لیا۔ اور حیات اللہ خاں نے بعمر ۹۰ سال ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی۔ خدکہ باغ میں دفن کر کے اس کی قبر کے گرداگرد چوبی کٹہرہ بنایا گیا۔ جو ۱۱۸۶ھ میں جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ کے حملے کی نذر ہو گیا۔ اب سلطان موصوف اور ان کے اعزہ و اقارب کی چند قبریں ملتان چھاؤنی کی حدود میں نظر آتی ہیں۔ ان پر پیلو کے درختوں نے سایہ کر رکھا ہے۔ کبھی کبھار سدوزئیوں کے ان خاموش ٹھکانوں پر چراغ بھی جلتا نظر آتا ہے۔

زمان خاں کا قتل

عبداللہ خاں کی طرح اس کا بیٹا اسداللہ خاں بھی بڑا بہادر تھا۔ ہرات کی مہم میں اس کی شجاعت اور حربی صلاحیتوں کا بڑا دخل تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے بارے میں امیر افغانستان احمد شاہ ابدالی کہا کرتے تھے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو تمام ابدالی پہاڑوں میں بکریاں چراتے نظر آتے۔

زمان خاں کو امیر عبداللہ خاں نے علاقہ زنجان کی حکومت دے رکھی تھی شعبان ۱۱۳۲ھ میں اس نے مزید ایرانی مقبوضات کو فتح کرنے کی غرض سے اپنے لشکر کو قلعہ غور کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور زمان خاں کو زنجان سے بلا کر ہرات کا حاکم بنایا۔ قلعہ غور کو فتح کرنے کے بعد امیر عبداللہ خاں آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ انہیں ہرات سے زمان خاں کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ عبداللہ خاں نے ایرانی علاقہ کی تسخیر کا ارادہ ترک

کر کے واپس ہرات کا رُخ کیا۔ ادھر زمان خاں بھی غافل نہ تھا۔ وہ عبداللہ خاں کی آمد سُن کر قلعہ بند ہو بیٹھا۔ عبداللہ خاں نے محافظینِ قلعہ کی مدد سے ہرات فتح کر لیا اور زمان خاں اپنے ساتھیوں سمیت اس دار و گیر میں مارا گیا۔

ولادت احمد شاہ ابدالی

زمان خاں کے بقیۃ السیف اعزّہ و اقارب اور رفقاء جو افغانوں کے جذبۂ انتقام سے واقف تھے عبداللہ خاں کی خون آشامی سے سخت خائف تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں جس کا جدھر سینگ سمایا اس نے اُدھر کا رُخ کیا۔ زمان خاں کے دو بیٹے ذوالفقار خاں اور علی مراد خاں نفسا نفسی کی اس حالت میں مامن تلاش کرتے پھرتے تھے۔ اور چھوٹی بیگم، جو حمل سے تھی اس قیامتِ صغریٰ میں نہیں جانتی تھی کہ کدھر کا رُخ کرے۔ آخر کار اس نے اپنے بھائی جلال خاں سدوزئی کے پاس ملتان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کسی نہ کسی طرح یہ بی بی اپنے بھائی کے ہاں ملتان پہنچ گئی۔

جلال خاں سدوزئی شاہ حسین کی کڑی میں رہتا تھا۔ اس کے گھر میں زمان خاں کے قتل کے چار ماہ بعد اس بیوہ اور بے کس خاتون کے بطنِ عفت سے وہ دُرِ شاہوار پیدا ہوا جس کی چمک دمک سے بڑے بڑے جرنیلوں اور کشور کشاؤں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ دُرِ یتیم احمد شاہ تھا۔ جو ذی الحج ۱۱۳۲ھ میں ابدالی روڈ کے اسی مقام پر عالمِ شہود میں آیا جہاں اب اس کی پیدائش کا کتبہ نصب ہے۔

احمد شاہ شکمِ مادر ہی میں تھا کہ والد تہ تیغ ہو گیا۔ اور ابھی اس دُنیا میں آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ والدہ اپنے خاوند کے غم میں گھل گھل کر فوت ہو گئی اور اس دُنیا میں ابدالی خاندان کے گُل سر سبد کا سوائے خداوندِ کریم کے کوئی پُرسانِ حال نہ رہا۔ سدوزئیوں کی صدری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ زمان خان کی اہلیہ کے انتقال پر

نواب زاہد خاں خاں سدوزئی کی ایک بیوی نے جو نومولود کی رشتے میں خالہ ہوتی تھی۔ اس نور العین کو اپنی تولیت میں لے لیا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ احمد شاہ اور نواب شجاع خاں رضاعی بھائی تھے۔ اور یہ روایت زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ خاندانی رقابتوں کے باوجود احمد شاہ نواب شجاع خاں پر ہمیشہ مہربان رہے۔

احمد شاہ سات برس تک ملتان میں رہا۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابتدائی تعلیم اس نونہال نے اسی مسجد میں پائی ہوگی جو مقبرہ شاہ حسین کے شمال میں واقع ہے۔ تذکرۃ الملوک کی روایت کے بموجب ۱۱۳۹ھ میں زمان خاں کے خاندان کی قسمت نے انگڑائی لی اور ذوالفقار خان و علی مردان خاں پسران زمان خاں معجزانہ طور پر منظرِ عام پر آئے۔ اور ایک سخت جد و جہد کے بعد انہوں نے قوم میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ فراح اور پامرد کے علاقے پر متصرف ہوگئے۔ اس اثنا میں انہوں نے اپنے کمسن بھائی احمد خاں کو بھی ملتان سے منگوا لیا۔ اس نوجوان نے گھوڑا دوڑانے، تلوار چلانے، کمند پھینکنے، نیزہ مارنے اور بندوق چلانے میں ایسی مشق پیدا کر لی تھی کہ سپاہیوں کی نگاہیں پڑنے لگی تھیں۔ ۱۱۳۹ھ سے ۱۱۴۴ھ تک پانچ سال زمان خاں کے بیٹوں کا نیرِ اقبال عین نصف النہار پر چمکتا رہا۔ ہرات سے مشہد تک ان کا ہی حکم چلتا تھا۔ انہوں نے نادر شاہ کے بھائی ابراہیم خاں کو بھی چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا تھا۔ دو دفعہ نادر شاہ افشار کو بھی ان کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن بُرا ہو خانہ جنگی کا، ذوالفقار خاں اور اللہ یار خاں خدکہ نے جب ایک دُوسرے کا گلا کاٹنا شروع کیا تو نادر شاہ نے بڑھ کر ہرات پر قبضہ کر لیا۔ ممکن ہے کہ یہ نوجوان قسمت آزمائی کے لیے مزید جد و جہد کرتے، لیکن شاہ محمود غلزئی حاکم قندھار نے انہیں سانپ بن کر ڈس لیا۔ جب یہ سابقہ خدمات کی بنا پر اس سے امداد لینے گئے، تو

اس نے انہیں قید کر دیا۔ احمد شاہ بھی اپنے بھائیوں کے ہمراہ اس شہر کے زندان خانے میں چھ سال کامل قید رہا جہاں اس نے تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کرنی تھی۔ علی مردان خاں اسی قید و بند میں قید ہستی سے آزاد ہو گئے۔ ۱۱۵۰ھ میں احمد شاہ نے قندھار فتح کیا تو ذوالفقار خاں اور احمد خاں کو بھی اس طویل قید سے نجات ملی۔ نادر شاہ نے ان دونوں بھائیوں کا وظیفہ مقرر کر کے ماژندران میں جلا وطن کر دیا۔ ۱۱۵۵ھ میں ذوالفقار خاں فوت ہو گیا اور احمد شاہ بھرے یار و مددگار رہ گیا۔ جب اسے گزر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نظر نہ آیا تو اس نے نادر شاہ کی فوج میں ملازمت کر لی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے طفیل تھوڑے سے عرصہ میں ہی "قراچی باشی" (چیف آف باڈی گارڈ) کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گیا۔ اس زمانے میں آمد و رفت کے وسائل اتنے آسان نہ تھے اور نہ ہی ڈاک کا کوئی ایسا انتظام تھا، جس سے ایک ملک کا خط دوسرے ملک میں جا کر تقسیم ہوتا۔ بالخصوص ایسے افراد کے بارے میں جن کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ چنانچہ احمد شاہ قندھار کی قید سے نکل کر فوج کے اتنے بڑے عہدہ پر بھی پہنچ گیا۔ مگر ملتان کے سدوزئیوں کو اس کی بابت کچھ علم نہ ہو سکا۔ اور نہ ہی احمد شاہ اپنی بابت اپنے رشتہ داروں کو کوئی اطلاع دے سکا۔ اس وقت احمد شاہ بھر پور جوان تھا اور اس کے ہاں بڑا بیٹا تیمور خاں بھی پیدا ہو چکا تھا۔

سلطان معزالدین جہاندار شاہ | شہزادہ معزالدین جہاندار شاہ ۱۱۲۴ھ میں تخت پر بیٹھا اور چند ماہ بعد اپنے بھتیجے کے ہاتھوں شکست کھا کر معزول ہوا۔

سلطان محمد فرخ سیر | یہ بادشاہ شہزادہ عظیم الشان کا فرزند تھا۔ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کی مدد سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ ملتان شہر میں چوک بازار کے

قریب ایک مسجد اس کے حکم سے تعمیر ہوئی جو مسجد پھلاں ہٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس بادشاہ نے تقریباً سات برس تک حکومت کی۔ اس کے آخری دور میں سادات بارھ کا زور بہت بڑھ گیا۔ سلطنت کے سیاہ و سفید پر حاوی ہو گئے، دربار کے پرانے امرا تک سب دم بخود تھے۔ خود بادشاہ بھی ان کے ہاتھ سے تنگ آ گیا قطب الملک سید عبداللہ تمام معاملے کو بھانپ گیا۔ اس نے ۱۱۳۱ھ میں فرخ سیر کو قید کر کے مار ڈالا۔ اور بہادر شاہ کے پوتے رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا۔ مگر وہ تین ماہ بھی حکومت نہیں کر پایا تھا کہ بعارضہ دِق رہگرائے عالم جاودانی ہوا۔ سید برادران نے اس کے بعد رفیع الدولہ کے سر پر تاج رکھا۔ لیکن یہ بھی دو ماہ کے بعد مر گیا۔ ملک میں ہر طرف انتشار پھیل گیا اور تمام صوبہ دار خود مختاری کا خواب دیکھنے لگے۔ شہنشاہ فرخ سیر کے زمانے میں ملتان کی نظامت نواب خان زمان خاں کو بعدہٗ نواب شیر افگن خاں کو ملی۔ ان کے بعد عقیدت خان، پھر حسین خاں ملتان کے ناظم مقرر ہوئے۔

سلطان روشن اختر محمد شاہ

یہ شہزادہ اگرچہ قید میں تھا۔ لیکن دُنیا جہان کے جھگڑوں سے آزاد امن و امان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتہً ستارۂ اقبال چمکا۔ اُمرائے سلطنت حاضر ہوئے اور عرض کی کہ باپ دادا کا تخت حاضر ہے۔ تشریف لے جا کر اپنے قدوم سے اسے زینت دیجئے۔ شہزادہ تو خاموش رہا، مگر ماں پردہ سے نکل آئی اور پرقعے میں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی، کہ خدا کے واسطے اس یتیم کی جان بخشی کیجئے۔ ہمیں تخت کی ضرورت نہیں۔ مگر امراء نے بڑے قول و قرار دیئے، اور آخر کار وہ روشن اختر محمد شاہ بادشاہ غازی کے لقب سے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کی والدہ نواب قدسیہ بیگم بڑی عاقلہ اور دانا

خاتون تھی۔ بادشاہ حیران تھا کہ یہ عجیب بادشاہت ہے کہ محل سے تخت اور تخت سے محل تک آنا جانا پڑتا ہے۔ نہ کوئی حکم نہ اختیار۔ عجب کٹھ پتلی کا کھیل ہے کہ وہ تار پر ناچتی ہے اور یہاں وزیر بادشاہ کو نچاتے ہیں۔ آخر ماں کے مشورہ سے وزیروں میں پھوٹ ڈلوادی اور سب کو یکے بعد دیگرے حکمت عملی سے رخصت کیا۔ جب یہ خرخشہ مٹ گیا تو دلجمعی سے رنگ رلیوں میں مصروف ہوا۔ ہر وقت شراب و کباب کا دور چلنے لگا۔ اور تمام امیر و وزیر دختِ رز کی محبت میں مست الست ہو گئے۔ فوج کی قواعد، پریڈ رخصت ہوئی۔ سب اپنے گھروں میں آرام سے سوتے تھے۔ روشن اختر محمد شاہ ۱۵ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ کو بعمر ۱۸ سال تخت نشین ہوا تھا۔ بیس سال حکومت کی تھی کہ ایران کا قہار تاجدار نادر شاہ اس ملک پر چڑھ آیا۔ محمد شاہ کو شکست ہوئی اور نادر شاہ دہلی میں داخل ہو کر محمد شاہ کا مہمان بنا۔ بعض سپاہیوں کی بے اعتدالی سے شہر میں غدر برپا ہو گیا۔ جس پر سات روز تک دہلی میں قتل عام ہوتا رہا۔ انجام کار نادر شاہ پندرہ کروڑ نقد، کوہِ نور ہیرا، اور شاہجہاں کا بنوایا ہوا تختِ طاؤس لے کر ایران کو واپس ہوا۔ ایران اور ہندوستان کی حدِ فاصل دریائے سندھ قرار پائی گویا دریائے سندھ کا غربی حصہ مملکتِ ہند سے منقطع ہو گیا۔

نواب محمد باقر خاں

محمد شاہ کے زمانے سے پہلے شیر افگن کو ملتان کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد نواب محمد باقر خاں کا تقرر ہوا۔ اس نے اپنی صوبیداری کے ایام میں ملتان شہر سے دو میل مشرق کی طرف ایک پکا قلعہ تعمیر کرایا، اور اس میں پختہ مسجد بنوائی۔ چونکہ طغیانی کے دنوں میں ملتان شہر کے لوگ قدیم عیدگاہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لئے وہ یہاں آ کر نماز ادا کرتے تھے اب قلعہ اور قصبہ کا نشان تو نہیں رہا، البتہ مسجد اپنے بانی کا نام زندہ کئے کھڑی ہے۔

نوابِ محمد باقر خاں کی فقراء سے عقیدت

نواب محمد باقر خاں کو حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے خانقاہ کے مغرب میں ایک کنواں بھی کھدوایا تھا۔ ساتھ ہی بہت بڑا تالاب تھا۔ جس سے لوگ وضو کرتے تھے۔ جب نواب صاحب کے انتقال کا وقت آیا۔ اس نے وصیت کی کہ مجھے حضرت شیخ الاسلام کے داخلی دروازے کے عین درمیان دفن کیا جائے۔ تاکہ جو بھی اندر سے فاتحہ پڑھ کر نکلے، میری قبر پر سے ہو کر گزرے۔ نواب باقر خاں نے فرمایا کہ میرا اعتقاد ہے کہ جو بھی حضرت کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر باہر نکلتا ہے، اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے قدموں کی برکت سے میری بھی مغفرت ہو جائے گی۔ چنانچہ نواب مرحوم کو عین دروازہ میں دفن کیا گیا، مگر اس کا تعویذ برآمدے میں قدرے مغرب کو رکھا ہے۔ تاکہ زائرین کو آنے جانے میں تکلیف نہ ہو۔

نواب باقر خاں کے بعد سید حسن خاں کو ملتان کی صوبیداری تفویض کی گئی۔ اس کے بعد شیر افگن خاں کو دوسری مرتبہ عزّ الدولہ کے خطاب سے ملتان کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔

نواب عبد الصمد خاں

نواب عبد الصمد خاں لاہور کے گورنر تھے۔ بندہ بیراگی کی بغاوت فرو کرنے میں انہوں نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی تھیں شیر افگن کے تبدیل ہونے پر بادشاہ نے انہیں لاہور اور ملتان دونوں صوبوں کی گورنری مرحمت کی۔ نواب عبد الصمد خاں کافی مدت تک ملتان میں تعینات رہے، انہوں نے بہت سے اچھے کام کئے۔ ان کا بڑا کارنامہ عید گاہ کی تعمیر ہے۔ ان سے پہلے عید گاہ صرف چار دیواری پر مشتمل تھی۔ بارش اور دھوپ کی صورت میں

نمازیوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نواب ممدوح نے پرانی دیواروں کو گرا کر از سرِ نو مسقف عید گاہ تعمیر کرائی جو ۱۷۳۵ء میں تکمیل کو پہنچی۔ ۱۱۴۸ھ میں نواب کا ملتان میں انتقال ہو گیا۔ ان کے فرزند نواب زکریا خاں باپ کی طرف سے لاہور میں نائب تھے۔ وہ نواب مرحوم کی لاش لاہور لے گئے، اور بیگم پورہ میں دفن کیا۔

نواب زکریا خاں

نواب زکریا خاں والد ماجد کے انتقال پر لاہور، اور ملتان کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ کبھی ملتان میں اور کبھی لاہور میں قیام فرماتے تھے۔ لیکن ان کا فرزند نواب حیات اللہ خاں مستقل طور پر ملتان میں رہتا تھا۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت دونوں باپ بیٹا دہلی جا کر فاتح اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور پھر واپسی کے وقت اس کے ہم رکاب رہے۔ نادر شاہ ان کی خدمات شائستہ سے بڑا خوش ہوا۔ اس نے حیات اللہ خاں کو شاہنواز خاں کا خطاب اور دو تین گھوڑے، جن میں سے ایک کا نام صبح دولت اور دوسرا شاہ عنایت تھا مرحمت کئے علاوہ ازیں خلاع فاخرہ اور زرِ نقد سے بھی عزت افزائی کی۔

نواب زاہد خاں سدوزئی

مالک خاں سدوزئی کے انتقال پر ملتان کے پٹھانوں میں سرداری پر جھگڑا پیدا ہو گیا۔ سلطان حیات خاں خدکہ جو اسی سال صفا کی حکومت چھوڑ کر ملتان منتقل ہو آیا تھا۔ اس نے زاہد خاں کے حق میں فیصلہ دیا۔ نواب زاہد خاں شیش محل واقع عربلی شاہ حسین میں متمکن ہوا۔ ۱۱۵۰ھ میں نواب عبد الصمد خاں صوبیدار لاہور کی وفات پر نواب زکریا خان ناظم لاہور نے اسے ملتان میں اپنا نائب مقرر کیا۔ محمد شاہ کی عیش کوشی نے نظام سلطنت کی چولیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ کوئی صوبیدار یا حاکم شہر اپنی ملازمت کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ بالعموم ایک صوبیدار پروانے کر اپنی جائے تقرری پر پہنچتا ہی نہیں تھا کہ دوسرے

شخص کو اسی منصب پر تعینات کر دیا جاتا۔ چنانچہ زاہد خان کو بطور نائب گورنر کام کرتے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ خواجہ اسحٰق ملتان کی صوبیداری کا پروانہ لے کر آ گیا۔ نواب زاہد خاں نے بلا پس و پیش ملتان کا چارج اس کے حوالے کیا اور خود دہلی روانہ ہو گیا علی محمد خاں روہیلہ سے اس کے مراسم چلے آتے تھے۔ اس کی سفارش سے قمرالدین وزیر سلطنت تک رسائی حاصل کر لی، اور ملتان کی گورنری کا پروانہ لے کر براستہ مارواڑ ملتان پہنچ گیا۔ خواجہ اسحٰق نے چارج دینے سے انکار کر دیا اور قلعہ بند ہو بیٹھا۔ زاہد خاں نے تمام پٹھانوں کو متحد کر کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔۔۔ خواجہ اسحٰق کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اور خود بدستورِ سابق بطورِ صوبہ دار حکومت کرنے لگا۔

احمد شاہ ابدالی امیرِ افغانستان

احمد شاہ نادر شاہ کے ماتحت عزت و آبرو سے زندگی بسر کر رہا تھا کہ ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا۔ جس نے اس کے خیالات کی دُنیا کو پلٹ ڈالا۔ یعنی جو سپاہی جاں نثاری اور مردانگی کے جوہر دکھا رہا تھا، اب بادشاہی کے خواب دیکھنے لگا۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن احمد شاہ بادشاہ سے اجازت لے کر اپنے گھر گیا۔ واپسی پر زیارت کے لئے حضرت امام علی رضاؑ کے روضۂ مقدس پر حاضر ہُوا۔ دیکھا کہ آستان کے قریب ایک مجذوب نے بچوں کے کھلونے کی طرح چھوٹا سا خیمہ بنا رکھا ہے۔ احمد شاہ ٹہلتا ٹہلتا قریب پہنچا اور پوچھا۔

"اے درویش! یہ کیسا خیمہ ہے؟"

درویش نے سر اُٹھا کر دیکھا اور کہا۔۔۔ "کیا احمد ابدالی تُو ہی ہے؟"

کہا "ہاں!"

جواب دیا۔ "یہ وہ خیمہ ہے جو نادر شاہ کے مرنے پر گرے گا، اور تو اس کی جگہ بادشاہ بنے گا!"

احمد شاہ نے اپنے ایک ملازم کو وہیں چھوڑا کہ درویش کی صحبت میں رہے اور خیمے کا خیال رکھے۔ جونہی گرے، وقت اور تاریخ نوٹ کرلے اور خود گھوڑے پر سوار ہو، نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور جب نادر شاہ مارا گیا۔ احمد شاہ اپنی خاص فوج کو ہمراہ لے کر لشکر سے بھاگا، اور مشہد مقدس میں آ کر اپنے ملازم سے خیمے کا حال دریافت کیا۔ اس نے وہی وقت بتایا جس میں نادر شاہ قتل ہوا تھا۔ احمد شاہ کو اس واقعہ سے درویش کی صداقت پر یقین آ گیا، اور سلطنت کا اُمیدوار بن کر افغانستان کو روانہ ہوا۔

قندھار میں بادشاہ کے انتخاب کے لئے قومی جرگہ کا اجلاس طلب ہوا۔ اس میں احمد شاہ بھی شریک ہوا۔ مگر ایک تماشائی کی طرح۔ اس نے نہ تو خود کو بطور امیدوار پیش کیا اور نہ کنایتہً یا اشارةً کسی سے اس امر کی خواہش ظاہر کی۔ اسے درویش کی پیشینگوئی پر یقین کامل تھا۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک عارف کی زبان سے نکلی ہوئی بات کیسے پوری ہوتی ہے۔ آٹھ روز مسلسل جرگہ کے اجلاس ہوتے رہے ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ بادشاہت اس کے اُمیدوار کو ملے۔ انجام کار سرزار محمد جمال خاں محمد زئی کا نام سرِ فہرست آیا۔ اس نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے۔ مگر عین اس وقت افغانستان کے ایک بااثر بزرگ صابر شاہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ "بادشاہت کے لائق تو احمد خاں ابدالی ہے۔ ویسے تمہاری مرضی جسے چاہو تخت پر بٹھالو!" اس نام کے سامنے آنے کی دیر تھی کہ سب امیدواروں نے ہتھیار ڈال

دیئے۔ اور سردار محمد جمال خاں نے بھی قومی مفاد کی خاطر اپنا نام واپس لے لیا۔ اور اس طرح احمد شاہ متفقہ طور پر افغانستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ نادر شاہ کی اولاد میں سخت جھگڑے ہوئے، مگر وہ اس کی تخت نشینی میں مزاحم نہ ہوئے، بلکہ ان فسادات کے سبب احمد شاہ کو حکومت بڑی آسانی سے حاصل ہوئی۔

پنجاب پر حملہ

محمد شاہ شہنشاہِ ہند نے ۱۷۴۰ء میں صلح کے وقت نادر شاہ کو جہاں دہلی کا سارا خزانہ نذر کیا تھا، وہاں پنجاب، کابل اور سندھ کے وہ علاقے بھی پیش کئے تھے۔ جن کا روپیہ کابل کی فوج پر صرف ہو جاتا تھا۔ اب جو اس نے نادر شاہ کے مرنے کی خبر سنی۔ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ ۱۷۴۵ء میں نواب زکریا خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کے بڑے بیٹے شاہنواز خاں نے لاہور پر اپنا عمل دخل جمایا۔ احمد شاہ پنجاب پر قبضہ کرنے کے لئے پشاور کے قریب پہنچا تو اس نے نواب زاہد خاں صوبیدار ملتان کو ملاقات کے لئے طلب کیا۔ مگر چونکہ نواب موصوف مغل سلطنت کی طرف سے ملتان کا گورنر تھا۔ اس لئے نہ تو احمد شاہ کے خط کا جواب دیا اور نہ ہی اس کی ملاقات کو حاضر ہوا کیونکہ اس سے دہلی دربار میں اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ احمد شاہ کے بارے میں ابھی یہ رائے قبل از وقت تھی کہ اسے استقلال نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔ ملتان کے سدوزئیوں نے بھی اس خبر کو انتہائی حیرت سے سنا کہ احمد خاں جو کہ ایک یتیم و بیسر ۲۴ کا تھا۔ اس قدر کم عمری میں بادشاہت کے مرتبے پر پہنچ گیا ہے[1]۔

احمد شاہ پشاور سے روانہ ہو کر لاہور کے قریب پہنچا۔ شاہنواز خاں نے نکل کر مقابلہ کیا۔ مگر جب اس نے غنیم کی لشکری طاقت کو زیادہ پایا تو اس لشکر سے جو دہلی سے

[1] احمد شاہ ابدالی ص ۴۵

بڑھا چلا آرہا تھا۔ جا ملا۔ سرہند کے مقام پر دونوں لشکروں کے مابین شدید جنگ ہوئی۔ جس میں مغل افواج کا پلہ بھاری رہا اور احمد شاہ لاہور میں سردار جلال الدین خاں قصوری کو اپنا نائب مقرر کر کے واپس لوٹ گیا۔ جلال خاں نے دیوان کوڑا مل کو ملتان روانہ کیا۔ تاکہ زاہد خان سے چارج سنبھالے۔ زاہد خاں نے کوڑا مل کی آمد آمد سُنی تو بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ ہر چند افغانوں نے سمجھایا، مگر باز نہ آیا۔ انجام کار تمام لوگ، حتیٰ کہ اس کے بیٹے بھی اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ صرف سردار عبدالرحیم خاں سدوزئی اپنے آدمیوں کے ہمراہ اس کے ساتھ ڈٹا رہا۔ متی تل کے قریب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ نواب زاہد خاں نے کافی نقصان کے بعد شکست کھائی۔ اور بمشکل جان بچی۔ وہاں سے بھاگ کر سید پور ہزاری میں جا چھپا۔ ۱۹ لاکھ روپے سرکاری مواجبات ان کے ذمہ تھے۔ مہاراجہ کوڑا مل نے ان کی وصولی کے لئے نواب کی حویلی کو جا گھیرا۔ نواب صاحب کی بہو بیٹیاں اپنے محل سے نکل کر نواب باقر خاں کی حویلی میں جا چھپیں۔ چونکہ مہاراجہ نواب باقر خاں کے ملازم کا بیٹا تھا، لحاظ کر گیا۔ لیکن نواب کی ایک کنیز ہیرا نامی پر جو کہ تمام خزانہ کی کنجی بردار تھی، کافی جھگڑا ہوا۔ اور کڑی نواب باقر خاں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ لیکن بعد میں مہاراجہ پُرانے تعلقات کو دیکھ کر چپ ہو رہا۔ اور نواب عبدالعزیز خاں خدکہ کو ناظم ملتان مقرر کر کے لاہور چلا گیا۔ اسی اثنا میں خبر اُڑی کہ شاہنواز خاں دربارِ دہلی سے گورنری کے تازہ احکامات لے کر ملتان کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ اس نے نواب زاہد خاں کو اپنی آمد سے مطلع کیا نواب اُس کے استقبال کے لئے حدودِ داؤد پوترہ (ریاست بہاول پور) تک گیا۔ وہاں سے جمعیت بنا کر ملتان آئے۔ نواب عبدالعزیز خاں خدکہ نے جب اپنے اندر مقابلے کی طاقت نہ دیکھی تو وہ لاہور روانہ ہو گیا۔ اور ادھر نواب شاہنواز خان اور

نواب زاہد خاں دونوں ملتان پر قابض و متصرف ہو گئے۔

نواب عبدالعزیز خاں کی شہادت

جب نواب عبدالعزیز خاں لاہور پہنچا تو مہاراجہ کوڑا مل نے اس کی ہمت بندھائی اور ایک بڑا لشکر اس کے ہمراہ کر دیا۔ چنانچہ نواب عبدالعزیز خاں دوبارہ خم ٹھونک کر لشکر جرار جلو میں لئے ملتان کو روانہ ہوا۔ نواب شاہنواز خاں نے مقبرہ شاہ شمس اور رزی کے قریب دشمن کو خوش آمدید کہی۔ دونوں فریقوں کے درمیان سخت خونریز جنگ ہوئی۔ مگر نواب زاہد خاں بڑھاپے کے سبب جنگ میں شریک نہ ہوا اور قلعہ ملتان کے دیدبان پر سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ شاہنواز خاں کو فتح ہوئی اور نواب عبدالعزیز خاں نے شہادت کا جام نوش کیا۔ جب نواب زاہد خاں کو نواب عبدالعزیز خاں کے مارے جانے کی خبر ملی تو بہت خوش ہوا کہ ہمارا جانی دشمن ہم سے پہلے گیا ہے۔ نواب عبدالعزیز خاں کو خدکہ افغانوں نے ان کے آبائی قبرستان میں سلطان حیات خاں کے پہلو میں دفن کیا۔

نواب زاہد خاں کے تعلقات پہلے تو شاہنواز خاں سے خوشگوار رہے، مگر بلیساکھی کے میلے پر جب شاہنواز خاں کے کسی سپاہی نے ایک افغان عورت کی بے عزتی کی تو اس سے عام بلوہ ہو گیا اور زاہد خاں نے پٹھانوں کو جمع کر کے شاہنواز خان کی فوج پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دے کر ملتان کی حدود سے نکال دیا۔

نواب شاہنواز خاں زاہد خاں سے ٹکر لینے کے لئے لشکر تیار کر رہا تھا کہ مغل حکومت کی طرف سے اُسے برطرفی کی اطلاع ملی۔ اور ساتھ ہی وزیر الممالک قمرالدین خاں کا بڑا لڑکا میر معین الملک اس کی جگہ لاہور اور ملتان کا صوبیدار مقرر ہو کر آ بھی گیا۔

شاہنواز خاں کا قتل

میر معین الملک نے لاہور پر قبضہ کرتے ہی دیوان کوڑا مل کو اپنی طرف سے نائب مقرر کر کے شاہنواز خان کے مقابلہ

میں ملتان روانہ کیا۔

ملتان کے مضافات میں کوڑا مل اور شاہنواز خاں کے درمیان شدید جنگ ہوئی کوڑا مل کو شکست ہوئی اور نواب شاہنواز خاں کا لشکر لوٹ مار میں مصروف ہوگیا۔ کچھ لشکر بھگوڑوں کے تعاقب میں آگے نکل گیا۔ نواب شاہنواز خاں چند سواروں کے ہمراہ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً اُسے اطلاع ملی کہ دیوان کوڑا مل مع چند رفقا گورستان دودانہ لنگانہ میں چھپا ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی نواب شاہنواز خاں باز کی طرح اس کی طرف جھپٹا۔ دیوان کے تمام ساتھی ہاتھیوں پر سوار تھے۔ شاہنواز خاں نے کوڑا مل کے شبہ میں بہت سے ہاتھی سواروں کو مار گرایا۔ کئی ہودے خالی کرنے کے بعد دیوان کوڑا مل کی طرف لپکا۔ اس دن شاہنواز خاں اپنے مشہور گھوڑے "شاہ عنایت" پر سوار تھا۔ ہر ہاتھی پر جونہی حملہ کرتا شاہ عنایت اچھل کر اپنے دونوں پاؤں ہاتھی کے پہلو پر جما دیتا تھا۔ اور شاہنواز تلوار کا ایسا چھانٹا ہاتھ مارتا کہ سوار کا سر کٹ کر ہودے میں جا گرتا۔ تذکرۃ الملتان کا مؤلف راکب اور مرکب کی جرأت اور جلادت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

" الحق دلیری آں مرکب و شجاعت راکب آں از توصیف بیان بیرون است، و دریں مصرعہ مشہور کہ

زہے شاہ مرکب زہے شہسوار

بریں اسپ و سوار آں صادق مے آید " (تذکرۃ الملتان فارسی قلمی ص۹۵)

لیکن چونکہ شاہنواز خاں کی موت کا وقت آچکا تھا اور کوڑا مل کی زندگی ابھی باقی تھی۔ اس لیے شجاعت و بسالت کام نہ آسکی جونہی شاہنواز خان نے کوڑا مل کے ہاتھی پر حملہ کیا۔ شاہ عنایت نے اچھل کر اپنے دونوں اگلے پاؤں ہاتھی کے پہلو پر جما دیئے۔ مگر جب نواب نے کوڑا مل پر تلوار سے بھرپور وار کیا تو وہ تکیہ کے نیچے چھپ گیا۔ اور شاہنواز خان کی

تلوار ہودہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ اس اثنا میں قیصوریہ افغانوں نے جو کوڑا مل کے ملازمین میں سے تھے۔ گولی مار کر نواب شاہنواز خاں کو شہید کر دیا۔ نواب لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ دیوان کوڑا مل نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ گھبرا کر ہاتھی سے اُترا، نواب کے سر کو اپنے زانو پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ کر کہا، "بدبخت قیصوریوں نے مجھے بدنام کر دیا۔ افسوس، تقدیر ایسی تھی"[1]

اُسی وقت نواب شاہنواز خاں نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔ دیوان کوڑا مل اگرچہ دشمن تھا۔ لیکن اس نے کمال وضعداری کا ثبوت دیا کہ عزاداروں کی طرح نواب کے جنازہ کو اُٹھایا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ حضرت شاہ شمس الدین تبریزی کے قریب جانبِ شرق دفن کرا دیا۔ نواب کی قبر اب تک ۲۳ × ۲۳ فٹ پختہ احاطہ کے درمیان واقع ہے۔ اور خشت و آہک سے بنی ہوئی ہے۔ مؤلف "مرقعِ ملتان" نے اس مزار کو سلطان شجاع خاں سے موسوم کیا ہے، اور اسے سہو ہوا ہے۔ یہ مزار سلطان شجاع خان کا نہیں، بلکہ شاہنواز خان کا ہے۔

نواب شاہنواز خاں کی تاریخ وفات مؤلف تذکرۃ الملتان نے اس طرح سے درج کی ہے ؎

حیات اللہ خاں نواب چوں شد شہید	می از دستِ ساقی کوثر چشید
چنیں گفت تاریخ او را کمال	عزیزے شہیدے بجنت رسید

[1] دیوان کوڑا مل نواب شاہنواز خاں کے دادا بزرگوار نواب عبدالصمد خاں کے زمانے میں ملازم ہوا تھا۔ نواب ذکریا خاں نے اس کے منصب میں اضافہ کیا۔ اور نواب میر معین الملک نے اسے اپنا دیوان مقرر کیا۔ چونکہ دیوان کوڑا مل اس خاندان کا دیرینہ ملازم چلا آرہا تھا۔ اس لئے نواب شاہنواز خان کی وفات پر اس نے افسوس کا اظہار کیا۔

مخدوم گیلانی کا سانحۂ ارتحال

۱۷۲۵ء میں حضرت مخدوم سید محمد غوث ثانی گیلانی قدس سرہٗ کا انتقال ہو گیا آپ بڑے باعظمت بزرگ تھے۔ محمد شاہ رنگیلا مقررہ جاگیر کے علاوہ پچاس ہزار درہم سالانہ آپ کو نذر کیا کرتا تھا۔ بحر السرائر آپ کے عہد میں ہی تالیف ہوئی آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ سید فتح محمد شاہ، سید دین محمد شاہ اور سید گل محمد شاہ۔

اوّل الذکر بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ چونکہ ان کا وصال والدِ بزرگوار کی زندگی میں ہی ہوا تھا۔ اس لئے سید دین محمد شاہ فرزندِ ثانی صاحب سجّادہ ہوئے۔ ان کے صاحبزادے سیّد صدر الدین شاہ نے سجّادگی کا دعویٰ کیا، مگر برادری نے اسے درخورِ اعتنا تصوّر نہ کیا۔ اس لئے موصوف ملتان سے اپنی جاگیر جالوالہ میں منتقل ہو گئے۔ سیّد گل محمد شاہ کے صاحبزادے سیّد غلام مہدی شاہ خان گڈھ چلے گئے تھے۔ انہوں نے کافی عرصہ قصبہ مذکور کے مضافات میں ریاضت کی۔ اور وہیں فوت ہو کر دفن ہوئے۔

ان کی اولاد میں مخدوم سید محمد رمضان شاہ صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مخدوم سید مظہر حسین شاہ صاحب ناظم محکمہ اوقاف ملتان زون خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سید غلام مہدی شاہ صاحب کے حقیقی بھائی سید تقی الدین شاہ شیخ پور شجرا میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کا خاندان اب تک اس گاؤں میں آباد ہے جو پیری مریدی کے علاوہ کافی رقبے کا بھی مالک ہے۔ مولانا سید محمد مراد شاہ اس خاندان کے سربراہ ہیں۔ علم و عمل اور زہد و ورع کے اعتبار سے ان کا وجود لبسا غنیمت

شجرہ نسب اولاد مخدوم سیّد محمد غوث گیلانیؒ
مخدوم سید محمد غوث
سید فتح محمد شاہ
(جد سادات جالوالہ)
سید دین محمد شاہ
(الملقب بہ مخدوم شیخ حامد گنج بخش ثالثؒ)
سیّد گل محمد شاہ
(جد سادات خان گڑھ و شیخ پور شجرا)
سید تقی الدین شاہ
(جد سادات شیخ پور شجرا)
سید غلام مہدی شاہ
مخدوم سید محمد رمضان شاہ
مخدوم سید ذوالفقار شاہ
سید ولی محمد شاہ
سید چراغ شاہ
سید لعل شاہ
سید صادق محمد شاہ
سید محمد غوث
سید احمد غوث
سید حاجی شاہ
سید غلام محی الدین شاہ
سید محمد مراد شاہ
سید سردار شاہ
سید بہلول شاہ
سید عالم شاہ
سید فضل حسین
سید نذیر حسین
سید عبدالقادر شاہ
سید ناصر الدین شاہ
سید مظہر حسین شاہ
سید امیر شاہ
سید احمد علی شاہ
مخدوم سید شمس الدین شاہ
سید غلام محی الدین شاہ
سید غلام مہدی شاہ
سید صدر الدین شاہ
سید غلام مصطفےٰ شاہ
مخدوم سید محمد رمضان شاہ
سید غلام دستگیر شاہ
سید غلام مجتبیٰ شاہ
سید عبدالرزاق شاہ
مخدوم سید مظہر حسین شاہ

نواب شاکر خاں گورنر ملتان

نواب شاکر خاں، زاہد خاں کا بڑا بیٹا تھا بعض خاندانی اختلافات کی بنا پر یہ اوائل زندگی میں ہی ناصر خان گورنر کابل کے پاس چلا گیا اور مغل فوج میں شامل ہو کر اس نے بڑا نام پیدا کیا، اور جب دیوان کوڑا مل نے شاہنواز خاں کے ساتھ ملتان کے مضافات میں جنگ کی تو اس نے دیوان کا ساتھ دیا اور وہ اُسے اپنا نائب مقرر کر کے لاہور لوٹ گیا مگر جاتے ہی احمد شاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس لئے نواب شاکر خاں کی جگہ ملتان کی نظامت پر خواجہ حسن خاں کا تقرر ہوا جو ملتان کا آخری مغل گورنر تھا۔

احمد شاہ ابدالی کا دوسرا حملہ

۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ کو محمد شاہ شہنشاہ ہند نے بعارضہ اسہال انتقال کیا۔ اس کے بڑے بیٹے احمد شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی میر معین الملک کو لاہور اور ملتان کی صوبیداری عنایت کی۔ احمد شاہ ابدالی کو علم ہوا تو اس نے ۱۱۶۲ھ میں پنجاب پر قبضہ بحال کرنے کے لئے حملہ کیا۔ میر معین الملک نے لاہور سے نکل کر غنیم سے مقابلہ کیا۔ لیکن دیوان کوڑا مل اور آدینہ بیگ کے دھوکہ دینے کے سبب شکست کھائی۔ اُس وقت اسے یہ خوب تدبیر سوجھی کہ وہ خود احمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور عرض کی کہ میں مغل سلطنت کا ملازم تھا۔ بغیر لڑے بھڑے لاہور حوالے کرنا میرے فرائض کے منافی تھا۔ اب چونکہ آپ غالب رہے ہیں، شہر کی چابیاں حاضر ہیں اور میں بھی وفاداری کا حلف اُٹھاتا ہوں۔ احمد شاہ اس کی تقریر سے بڑا خوش ہوا۔ اسے اپنی طرف سے لاہور اور ملتان کے صوبے عنایت کر کے براہ چولستان قندھار کی طرف متوجہ ہوا۔

احمد شاہ کی سدوزئی افاغنہ سے ملاقاتیں

جب لشکر شاہی ملتان کے قریب پہنچا تو احمد شاہ نے دریائے چناب اور سندھ کے درمیان پڑاؤ کیا، تمام اعزہ و اقارب

اور دیگر سدوزئی پٹھان اور علاقہ کے معتبرین سلام کو حاضر ہوئے۔ زاہد خان بھی حاضر دربار ہوا۔ اگرچہ بادشاہ کے دل میں بڑا غصہ تھا، مگر دربارِ عام میں کچھ نہ کہا۔ لیکن جب ملتان کے سدوزئیوں سے خصوصی ملاقات کی تو انہیں سخت سرزنش کی تمام اعزہ کو ان کے مراتب کے مطابق انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ اور خود براہ ڈیرہ غازی خاں قندھار کو روانہ ہو گیا۔[۱]

احمد شاہ کے رخصت ہونے کے کچھ عرصہ بعد نواب زاہد خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس نے دو بیٹے شاکر خاں اور شجاع خاں وارث چھوڑے۔ زاہد خاں اپنی قوم پر بڑا مہربان تھا۔ اسے تمام عمر عیش و عشرت اور سرود سے نفرت رہی۔ مثنوی مولانا روم اور امام محمد غزالی کی کیمیائے سعادت ہر وقت اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ یہی اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔

نواب شاکر خاں کی وفات

نواب شاکر خاں، جو نواب زاہد خاں کا بڑا بیٹا اور دیوان کوڑا مل کی جانب سے چند سال ملتان کا گورنر رہ چکا تھا، ۱۱۶۵ھ میں بقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔ ابھی وہ بھرپور نوجوان تھا۔ سدوزئیوں نے اس کی وفات پر بڑا سوگ منایا اور اسے مقبرہ شاہ حسین خاں میں دفن کیا۔ اسی سال احمد شاہ ابدالی نے نواب علی محمد خان خوگانی کو اس کی خدمات شائستہ کی بنا پر ملتان کا ناظم مقرر کیا۔

نواب علی محمد خاں خوگانی

نواب علی محمد خاں خوگانی سردار عثمان خاں محسن زئی کے فرزند تھے۔ ان کا نسب نامہ اس طرح صدیق خاں تک پہنچتا ہے:۔

---

[۱] احمد شاہ ابدالی ص ۴۶-۴۷

"نواب علی محمد خاں بن عثمان خاں بن فاروق خاں بن صدیق خاں"۔
چنانچہ نواب کے فرزند نواب غلام نبی خاں کے سجع مہر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ صاحب تذکرۃ الملتان کی روایت کے مطابق سجع کی عبارت یہ تھی ؎

بصدیقؓ و فاروقؓ عثمانؓ علیؓ زجاں صدق دارد غلام نبی

نواب علی محمد خاں بڑا مستعد اور ہوشیار آدمی تھا۔ اپنے مختصر سے عرصے میں اس نے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کئے۔ اپنے نام سے ایک نالہ احداث کرایا، جو غلط العوام ہو کر اب نالہ ولی محمد کہلاتا ہے۔ قلعہ اور شہر کی فصیلوں کو درست کرایا شہر کے عین درمیان میں ایک تالاب تھا۔ جس میں اہل شہر کپڑے دھوتے، اور جانور پانی پیتے تھے۔ نواب نے اُسے غیر صاف پا کر مٹی سے پٹوا دیا اور اس پر ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ ابھی اس کا کام شروع تھا کہ آدینہ بیگ کی شرارت سے مرہٹے اس صوبہ میں گھس آئے۔ ان کا لشکر عذاب الٰہی تھا۔ مرہٹے ٹڈی دل کی طرح ڈیرہ غازی خاں اور اس کے اطراف تک چھا گئے۔ نواب علی محمد خاں تاب مقابلہ نہ لا کر سلطان پور کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور اس صوبہ کی نظامت مرہٹوں کی طرف سے صالح محمد خاں کو مل گئی۔ پنجاب کے اُمراء جب مرہٹوں کے مظالم سے تنگ آ گئے تو انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ایک بار پھر حملہ کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ احمد شاہ اپنی فوج ظفر موج کے ہمراہ عازم ہند ہوا۔ قلات کے نواب نصیر خاں نوری اس لشکر کے سپہ سالار تھے۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ مملکت ہند مرہٹوں کے اثر سے پاک کر کے احمد شاہ نے مغل بادشاہ کے سپرد کی اور صوبہ پنجاب و سندھ اپنے مقبوضات میں شامل کر کے کابل کو لوٹ گیا۔ علی محمد خاں کو دوبارہ ملتان کی نظامت عطا ہوئی۔ مگر کچھ عرصہ بعد

علی محمد خاں کو معزول کر دیا گیا اور عبدالکریم خاں اور الہ یار خان باموزئی یکے بعد دیگرے گورنر مقرر ہوئے۔

نواب محمد شجاع خاں سدوزئی

نواب محمد شجاع خاں نواب زاہد خاں کے صاحبزادے اور نواب شاکر خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے نظامت کا چارج لیتے ہی شہر اور قلعے کی فصیلوں کی مرمت کرائی۔ اور ملتان سے بیس میل جنوب کو جہاں ان کی جاگیر تھی۔ ایک شہر آباد کیا۔ جو اب تک اُن کے نام کو زندہ کئے ہوئے ہے۔ جب احمد شاہ تیسری بار ہندوستان کی طرف مرہٹوں اور سکھوں کو سزا دینے کے لئے گیا تو موقع پاکر علی محمد خان نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور نواب محمد شجاع خاں کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ نواب محمد شجاع خاں کا فرزند مظفر خاں احمد شاہ کے پاس پہنچا اور اسے والد کی گرفتاری اور قید کا حال عرض کر کے دادخواہ ہوا۔ احمد شاہ مرہٹوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ لاہور ہوتا ہوا ملتان کی طرف متوجہ ہوا۔ نواب علی محمد خاں کو یہ اطلاع ملی تو وہ سخت گھبرایا۔ اُس نے فوراً نواب شجاع خاں کو رہا کر دیا۔ چونکہ مدت تک قید رہنے کے سبب نواب محمد شجاع خاں کی ریش و بروت، سر کے بال، اور ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن بہت بڑھ چکے تھے۔ نواب شجاع خاں نے بالوں کو ترشوا اور ناخنوں کو اتروا کر محفوظ رکھ لیا۔ جس وقت احمد شاہ ابدالی ملتان میں داخل ہوا اور تھلہ شجاع خاں کے قریب خیمہ زن ہوا تو رات کو نواب شجاع خاں کی بوڑھی چچی نے بادشاہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اجازت ملنے پر حاضر ہوئی۔ اور سلام کر کے بولی کہ خوگانی نے سدو کے بیٹے کا یہ حال کیا ہے۔ ساتھ ہی شجاع خاں کے بال اور ناخن نکال کر پیش کئے اور تمام حال عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ وہ اپنی سزا کو پہنچے گا۔ اُسی وقت نواب محمد شجاع خاں کو صوبہ داری پر بحال کیا اور

خود قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح کو حکم شاہی کے مطابق نواب علی محمد خاں کا پیٹ چاک کر کے لاش کو اونٹ پر اُلٹا لٹکا کر شہر میں پھرایا گیا۔ تین روز تک نواب مقتول کی لاش پڑی رہی۔ پھر اسے دفن کر دیا گیا۔ نواب علی محمد خاں کی سادہ قبر گورستان حسن پروانہ میں واقع ہے اور اس پر یہ کتبہ پیوست ہے ؎

نسیم فضل وزید از حدائق رضواں　　ز مشک و عنبر و کافور روضہائے جناں
وزید نکہتش از فیض ساقی کوثر　　شمید جان شہید علی محمد خاں

نواب شجاع خاں باردوم ۱۱۷۱ھ

نواب نے عنان اختیار سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ عظیم خاں نامی ڈاکو کو جو تین سو سواروں کے ہمراہ اس ملک میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا۔ لشکر جرار بھیج کر گرفتار کر لیا۔ اور اسے اپنے حضور اتنا پٹوایا کہ وہ مر گیا۔ اس سے ملک پر نواب کا خاصہ رعب بیٹھ گیا۔ خانقاہوں کے تیل چراغ کے لئے مواضعات بحال کئے۔ بعض رسوم کو جو غیر شرعی تھیں موقوف کیا۔ اُن دنوں صوبیداری کو چونکہ ثبات نہیں تھا، اس لئے کچھ عرصہ بعد نواب مذکور معزول کر دیئے گئے، اور ان کی جگہ حاجی شریف سدوزئی کا تقرر ہوا۔ نواب شجاع خاں نے مقابلہ کیا، مگر شکست کھائی اور ملتان سے کوٹ شجاع آباد کی طرف منتقل ہو گئے۔

حاجی شریف خاں بہادر خیل

نواب شجاع خاں کی شکست کے بعد حاجی شریف خاں اطمینان سے قلعہ قدیم میں داخل ہوا۔ اور مثمن برج جو خواجہ حسین خاں کا بنوایا ہوا تھا۔ اس میں قیام کیا۔ حاجی شریف خاں کو ملتان کی نظامت پر مقرر ہوئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ دیوان دھرم جس نامی ایک ساہوکار کی بابت یہ خبر گرم ہوئی کہ وہ احمد شاہ ابدالی کے ہاں جا رہا ہے۔ نواب شجاع خاں

نے اسے بلا کر مشورہ دیا کہ بادشاہ سے اپنے یا میرے لئے صوبہ داری کی درخواست کرنا۔ دھرم جس نے اپنے لئے نظامت کا پروانہ حاصل کر لیا۔ اور وہیں سے شریف بیگ تکلو نامی ایک امیر کو اپنی طرف سے نائب مقرر کر کے ملتان روانہ کیا اور ہدایت کی کہ بمشورہ نواب شجاع خاں ملتان کا انتظام کرے۔ شریف بیگ شجاع آباد حاضر ہوا مگر شجاع خاں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ کیونکہ وہ خود نظامت کا امیدوار تھا اور اُسے یہ امید نہ تھی کہ دھرم جس اسے نظر انداز کر کے اپنے نام پروانہ حاصل کرے گا۔ انجام کار شریف بیگ سوداگروں کے ہمراہ جو ملتان جا رہے تھے۔ روانہ ہوا اور پاک دروازہ سے شہر میں داخل ہو کر خضری دروازہ سے قلعہ میں گھس گیا۔ جب صوبہ دار کی کچہری کے قریب پہنچا۔ پروانۂ شاہی سر پر رکھ کر ایک بڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چونکہ یہ زمانہ طوائف الملوکی کا تھا۔ اور نظامت آئے دن تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے جو ملازم شاہی بھی آتا، از روئے احتیاط شریف بیگ کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ اس طرح ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ حاجی شریف بیگ اس وقت محل میں بیٹھا داڑھی کو خضاب کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو تفحص حال کے لئے بھیجا۔ مگر جو یہاں آتا واپس نہ جاتا آخر اس نے اپنے حجام کو جو خضاب کرنے میں مصروف تھا، حال دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے واپس آ کر کہا کہ نیا صوبہ دار آ چکا ہے۔ تمام عملہ اور سپاہ اس کے پاس جمع ہے۔ یہ وقت غفلت سے بیٹھنے کا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ نئے صوبہ دار سے کوئی بے ادبی آپ کے حق میں سرزد ہو۔ یہ سنتے ہی حاجی شریف خضاب کی صورت میں ہی مکان کی پشت سے نکل بھاگا۔ اور شریف بیگ نے امور نظامت پر کنٹرول کر لیا۔ چونکہ شریف خاں کی نظامت کا عرصہ بے حد قلیل تھا۔ اس لئے عوام میں یہ محاورہ زبان زد ہو گیا کہ "حاجی شریف نہ ربیع نہ خریف"۔

حکومتِ شریف بیگ تکلو

شریف بیگ ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے ملتان کا اچھا انتظام کیا۔ اور رعایا کو ہر طرح سے مطمئن کر دیا۔ دھرم جس کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ وہ بڑی شان و شوکت سے ملتان کو روانہ ہوا۔ اور شریف بیگ کے نام ایک فرمان لکھا کہ دریائے چناب تک استقبال کو حاضر آئے۔ شریف بیگ کے دماغ میں خودسری کی ہوا بھر چکی تھی۔ اس نے اپنے ناظم کے حکم کی کوئی پرواہ نہ کی اور قلعہ میں محصور ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن جو فوج قلعہ سے باہر تھی، وہ سب ناظم کے استقبال کو دریائے چناب پر پہنچ گئی۔ دیوان دھرم جس دل میں پیچ و تاب کھاتا اور بظاہر ہنستا مسکراتا شہر میں داخل ہو کر دیوان منسا رام کے باغیچہ میں مقیم ہوا۔ دوسرے دن ناظم اور نائب کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ بظاہر دھرم جس کا پلّہ بھاری تھا اور شریف بیگ کے کامیاب ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ مگر اس کی قسمت یاور تھی۔ اتفاق سے ایک دن دیوان صاحب مکان کی چھت پر پگڑی باندھ رہے تھے۔ دفعتہً قلعہ سے ایک سپاہی نے تاک کر ایسا نشانہ لگایا کہ دھرم جس اسی جگہ ڈھیر ہو گیا۔ شریف بیگ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے فتح و نصرت کے شادیانے بجوائے اور ظہر کے بعد پالکی پر سوار ہو کر بطریق صوبہ دارانِ سابق شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ۔ قطب الاقطاب شاہ رُکن عالمؒ۔ حضرت شاہ محمد یوسفؒ گردیزی اور حضرت جمال الدین موسیٰ پاک شہید رحمہم اللہ علیہم کے آستانوں پر حاضر ہوا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد مخادیم کو خلاعِ فاخرہ نذر کیں، اور خدّام اور مساکین کو انعام و اکرام سے نوازا۔ چونکہ احمد شاہ کی طرف سے اُسے پروانہ ملنے کی توقع نہ تھی۔ اس لئے اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ ان دنوں بھنگی سکھوں نے کافی طاقت پکڑ لی تھی۔ اس نے اپنے دیوان کے مشورے سے بھنگیوں سے امداد طلب کی اور معاوضہ میں تنخواہ یا جاگیر دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ

بھنگی کمک پہنچی۔ احمد شاہ کو شریف بیگ کی بغاوت کی اطلاع پہنچ گئی۔ اس نے بھاڑو خاں دُرانی یک چشم کو لشکرِ جرار دے کر شریف بیگ کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ بھاڑو خان سے قلعہ تو سر نہ ہو سکا، لیکن شہر کی فصیل کو نقب لگا کر گرا دیا۔ یورش کر کے شہر میں داخل ہو گیا۔ اور لوٹ کھسوٹ کر کابل واپس چلا گیا۔

گنڈا سنگھ کی آمد

شریف بیگ نے بھنگیوں سے جو کمک طلب کی تھی۔ وہ گنڈا سنگھ کی زیرِ کمان ملتان آ پہنچی۔ گنڈا سنگھ نے شہر کے باہر ڈیرہ لگا دیا۔ اور شریف بیگ کو کہلا بھیجا کہ آپ شہر کا ایک دروازہ ہمیں دے دیں۔ ہماری رہائش کے لئے کافی ہے۔ لیکن شریف بیگ نے اس امر کو تسلیم نہ کیا۔ گنڈا سنگھ نے دیوان کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ شہر کا دروازہ نہیں کھولیں گے تو ہم باہر کی آبادی کو تباہ کر دیں گے اور جلا کر خاک سیاہ کر دیں گے۔ دیوان نے گنڈا سنگھ کو خفیہ طور پر کہلا بھیجا کہ چند دن اور صبر کرو۔ عید قریب ہے۔ شریف بیگ بموجب رسم مسلماناں باہر عید پڑھنے کے لئے نکلے گا تو فرصت ملتے ہی تمہارے لئے شہر کا دروازہ کھول دیا جائے گا۔ چنانچہ عید کے دن جونہی شریف بیگ نمازِ عید کی غرض سے عیدگاہ روانہ ہوا۔ دیوان کی مدد سے سکھوں کی فوج شہر اور قلعہ پر قابض ہو گئی۔ شریف بیگ کو اس خبر سے سخت صدمہ پہنچا اور اس نے عیدگاہ سے سوار ہو کر سیتل داس کے باغ میں جا ڈیرہ لگا یا۔ گنڈا سنگھ سے خط و کتابت شروع ہوئی۔ آخر طے پایا کہ شہر، قلعہ اور تمام ملک سکھوں کا تصوّر ہو۔ اور شریف بیگ گزر اوقات کے لئے تلمبہ پر قناعت کرے۔ چنانچہ شریف بیگ نے وقت کے تقاضا کے مطابق اسی کو غنیمت جانا اور ملتان سے تلمبہ کو منتقل ہو گیا۔ اس نے تلمبہ کا قلعہ، جس کی فصیل اب تک باقی ہے تعمیر کیا اور کچھ عرصہ زندگی بسر کرنے کے بعد وہیں فوت ہو گیا۔

نواب محمد شجاع خاں کا ناکام حملہ

گنڈا سنگھ نے کم و بیش نو سال ملتان پر حکومت کی۔ اس نے مسلمانوں سے اراضیات چھین کر اپنے سکھ رفیقوں کو جاگیروں میں دینی شروع کیں۔ بے شمار مسلمان خاندان ملتان چھوڑ گئے، اور جو بچ رہے، وہ سکھوں کا تختۂ مشق بنتے رہے۔ مسجدیں گوردواروں کے طور پر استعمال ہونے لگیں۔ اذان موقوف ہوگئی۔ سرکاری معاملے پر گوردوارہ ٹیکس ایزاد ہوا۔ جو وصول ہو کر سکھوں کے مذہبی امور پر خرچ ہوتا تھا۔ نواب محمد شجاع خاں اور نواب محمد بہاول خاں کو جب اس بوجھ گردی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے لشکروں کے ساتھ سکھوں پر حملہ کیا۔ اور فصیل کو توڑ پھوڑ کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ مگر سکھ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے خوانین داؤدپوترہ اور سدوزئی نے ہر چند کوشش کی، مگر قلعہ فتح نہ کر سکے اور ناکام واپس لوٹ گئے۔ انہی ایام میں کابل گورنمنٹ کی طرف سے علی مددخاں دُرّانی بادشاہ کی طرف سے سکھوں کو ملتان سے نکالنے اور انہیں قرار واقعی سزا دینے کے لئے آیا۔ مگر وہ بھی شہر پناہ کو توڑ پھوڑ کر واپس لوٹ گیا۔ سوءِ اتفاق سے احمد شاہ ابدالی کا انتقال ہو گیا۔ اور نواب محمد شجاع خاں نے بھی کوٹ شجاع خاں میں وفات[1] پائی۔ سکھوں کو کچھ اور مہلت مل گئی۔ گنڈا سنگھ نے دریائے ستلج اور بیاس خشک کا درمیانی علاقہ جس میں دنیاپور کہروڑ اور فتح پور کے پرگنہ جات شامل تھے، ملا علی خاں داؤدپوترہ کو پٹہ پر دے دیئے

---

[1] نواب محمد شجاع کا مزار پُرانوار شجاع آباد سے ایک میل جنوب مغرب کی طرف بستی خیرپور میں واقع ہے۔ نواب مظفر خاں کے والد ماجد کے مزار کے گرد پختہ احاطہ اور قریب ہی قرار اور حفاظ آباد کئے گئے۔ مزار پر قرآن و حدیث کا درس ہوتا تھا۔ نواب لنگے خاں، جس کے نام پر ملتان میں اب تک ایک مختصر سا باغ موجود ہے۔ اس کی قبر بھی نواب شجاع خاں کے مزار کے قریب واقع ہے۔ مگر اس کی مرمت کبھی نہیں ہوئی اس لئے تودۂ خاک بن کر رہ گئی ہے۔

سکھوں کا کوٹ شجاع آباد پر حملہ

نواب محمد شجاع خاں کی وفات کے بعد ان کا بڑا لڑکا نواب مظفر خاں اپنے باپ کی مسند پر رونق افروز ہوا۔ مگر سکھوں کو ان کا اقتدار کب گوارا تھا۔ چنانچہ سکھوں کی فوج "ست سری اکال" کے نعرے لگاتی شجاع آباد پر چڑھ دوڑی۔ نواب مظفر خاں بھی اپنا منتخب لشکر لے کر دشمن کی پیشوائی کو نکلا۔ حسن اتفاق سے افق مغرب سے ایک گھٹا اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے آسمان پر چھا گئی۔ سکھ اس آفت ناگہانی سے گھبرا اٹھے اور جس کا جدھر سینگ سمایا بھاگ کھڑا ہوا۔ نواب مظفر خاں ایک جگہ کھڑے مطلع کے صاف ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ دفعتہً ان کے سپاہی سکھوں کے نقارچیوں کو پکڑ لائے، وہ آتے ہی نواب کے قدموں میں گر پڑے اور عذر خواہی کرنے لگے۔

نواب صاحب نے کہا۔ تمہیں اس شرط پر معافی مل سکتی ہے کہ تم اس نہج پر نقارہ بجاؤ کہ سکھ یہاں جمع ہو جائیں۔ وہ راضی ہو گئے اور نقارہ بجانے لگے۔

نواب مظفر خاں نے اپنے سپاہیوں کو دو قطاروں میں کھڑا کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ پہلی قطار والے اپنی ہیئت بدل لیں اور جونہی سکھ سپاہی پہنچیں انہیں بڑے تپاک سے خوش آمدید کہیں اور حکمت عملی سے پچھلی قطار کے سپرد کرتے جائیں۔ دوسری قطار والوں کو حکم ہوا کہ سکھوں کو بلا تامل قتل کر دیا جائے۔

نقاروں کی آواز سنتے ہی سکھوں کا لشکر اس طرف سمٹنا شروع ہوا۔ آندھی شدت سے چل رہی تھی۔ دوست دشمن کی تمیز مشکل تھی اور سپاہیوں نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ چنانچہ تھوڑی سی دیر میں سکھوں کا غالب حصہ قتل ہو گیا۔ اور باقی صحیح صورت حال سے واقف ہوتے ہی ملتان کو بھاگ گئے۔

ملتان کے تمام پٹھان اپنے اپنے محلات کو چھوڑ شجاع آباد اور ڈیرہ غازی خاں

کی طرف منتقل ہو چکے تھے۔ ان کی جاگیروں اور محلات پر سکھوں کا طوطی بول رہا تھا۔ انہوں نے احمد شاہ ابدالی مرحوم کے فرزند شاہ تیمور کو درخواستیں لکھیں اور اسلامی غیرت کا واسطہ دے کر مدد پر بلایا۔ چنانچہ وہ ۱۱۹۳ھ میں ڈیرہ غازی خاں آ پہنچا۔ ان دنوں عبدالکریم خاں بابر سکھوں کا معتمد علیہ اور سپہ سالار بنا ہوا تھا۔ اس نے تیمور شاہ کو پیغام بھیجا کہ اگر بادشاہ اس سرزمین کو قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمائیں تو ملتان کا قلعہ، شہر اور یہ سارا ملک حضور کی نذر کروں گا۔ شجاع آباد سے نواب مظفر خاں کا مراسلہ پہنچا کہ اگر حضور ملتان تشریف لے آئیں تو فتح و نصرت حضرت کے قدم چومے گی۔ اور ساتھ ہی مقتول سکھوں کے تمام سر کجاووں پر لدے ہوئے پیش خدمت ہوئے۔ جس پر تیمور شاہ اپنے لشکر کو آراستہ کر کے بلا توقف شجاع آباد آ پہنچا۔ یہاں نواب مظفر خاں منتظر کھڑا تھا۔ اس نے بادشاہ کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا اور اپنے لشکر کو بادشاہ کے جلو میں لے کر ملتان کو روانہ ہوا۔

نظامت ملتان پر نواب مظفر خاں کی تعیناتی

اسلامی لشکر اتنی خاموشی سے ملتان پہنچا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ صبح کو سکھوں نے قلعہ کی فصیل پر سے دیکھا تو انہیں عید گاہ کے گرد و پیش حدِ نگاہ تک خیمے ہی خیمے نظر آئے۔ چونکہ انہیں قلعے کی پختگی پر اعتماد تھا، وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ محاصرہ طویل ہو گیا اور تیمور شاہ پڑے پڑے اُکتا گیا۔ اُس نے خفیہ طور پر عبدالکریم خاں بابر اور دوسرے مسلمان افسروں کو شکوہ آمیز پیغامات بھجوائے۔ عبدالکریم خاں کا جواب آیا کہ آپ اپنے لشکر کو قلعہ کے گرداگرد پھیلا دیں اور اپنی قوت کا خوب مظاہرہ کریں تاکہ میں سکھوں کو صلح پر آمادہ کر سکوں۔ چنانچہ تیمور شاہ نے دوسرے دن تمام لشکر کو

عیدگاہ کی طرف سے قلعہ کے گرد پھیلا دیا۔ اور شدت سے اہل قلعہ پر حملہ کر دیا۔ عبدالکریم خاں نے سکھوں کو مسلمانوں کی جمعیت سے ڈرایا اور بتایا کہ ابھی بہاول پور سے انہیں اور کمک پہنچ رہی ہے۔ بہتر ہے کہ ان سے صلح کر لی جائے۔ تیر نشانے پر پڑا اور سکھ ڈر گئے۔ انہوں نے عبدالکریم خاں کی وساطت سے امان طلب کی۔ بادشاہ نے انہیں اپنے سامان سمیت شہر سے نکل جانے کی اجازت دی۔ چنانچہ سکھ ایک دروازے سے اہل و عیال، گھوڑے، شیر دار جانور اور اسلحہ جات کے ہمراہ نکل کر چلے گئے۔ قلعہ کے ساز و سامان کو انہوں نے ہاتھ نہ لگایا۔ اس طرح ملتان بغیر قتل و غارت کے تیمور شاہ کے قبضۂ تصرف میں آگیا۔ اور اس نے اپنی طرف سے نواب مظفر خاں کو اس ولایت کا صوبہ دار مقرر کیا۔ صفدر جنگ کا خطاب اور دو لاکھ روپیہ برائے آبادی ملک اور مرمت شکست و ریخت و عمارات خزانۂ شاہی سے عطا کیا۔

بادشاہ نے چند ایام اس شہر میں بسر کئے۔ ملتان کے مخادیم اور پیرزادگان۔ یعنی مخدوم بہاول شاہ قریشی سجادہ نشین حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ شیخ محمد راجو گردیزی صاحب سجادہ مزار پُر انوار حضرت مخدوم شیخ محمد یوسف گردیزی مخدوم شیخ عبدالقادر گیلانی۔ سید پیر شاہ المعروف شاہ علی محمد رحمہم اللہ علیہم سے بموجب دستورِ سلاطین ملاقات فرمائی۔ اور خانقاہوں کی تیل چراغی کے سلسلے میں وہ تمام مراعات بحال کیں جو سکھوں کے دور میں ضبط ہو گئی تھیں۔ سنہ ۱۱۹۳ھ کے آخیر میں تیمور شاہ کابل لوٹ گیا۔ اور نواب مظفر خاں نے ملک کی آبادی اور رعایا کی آسودگی جیسے رفاہی کاموں میں رنگ بھرنا شروع کیا۔ شہر پناہ کی مرمت ہوئی اور گزشتہ لڑائیوں میں جن غریبوں کے مکانات منہدم ہو گئے تھے انہیں نقد امداد عطا کی۔ نواب کے اعزہ و اقارب نے بھی اپنی اپنی جاگیروں میں گاؤں آباد کئے۔ سکندر خاں نے کوٹ سکندر آباد کیا، اور ساتھ

ہی ایک نہر احداث کرائی۔ جو اب تک تحصیلات ملتان اور شجاع آباد میں اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی بہتی اور اراضیات کو سیراب کر رہی ہے۔ غضنفر خاں نے شجاع آباد کے محاذ میں دریا کے اُس پار ایک حصار اپنے نام پر تعمیر کیا۔ نواب نے مظفر گڑھ اور مظفر آباد نام سے دو قصبے آباد کئے۔ اوّل الذکر اب ضلع کا صدر مقام ہے اور مؤخر الذکر کے پاس پاکستان کی بہت بڑی ٹیکسٹائل ملز قائم ہیں۔ جو ملک کی ½ آبادی کے لئے سرد اور گرم کپڑا تیار کرتی ہیں۔ اسٹیشن کا نام بھی مظفر آباد ہے۔ گزشتہ سالوں میں اس اسٹیشن کا نام تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس پر اہلِ ملتان نے اس شدّت سے احتجاج کیا، کہ محکمہ ریلوے کو فوراً پہلا نام بحال کرنا پڑا۔ نواب مظفر خاں کو درویشوں اور فقیروں سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ چوروں اور قزاقوں کو قرار واقعی سزا دی جاتی تھی۔ جس پر یہ ملک قطاع الطریق سے خالی ہو گیا تھا اور جو افغان خالصہ گردی میں ملتان چھوڑ گئے تھے دوبارہ واپس آکر آباد ہوئے۔

تیمور شاہ کی وفات

۱۲۰۳ھ میں تیمور شاہ نے ڈیرہ آور پر حملہ کیا۔ چونکہ یہ قلعہ نواب بہاول خان سے متعلق تھا۔ اس لئے نواب مظفر خاں نے شاہ تیمور سے سفارش کی کہ اس سے درگزر فرمایا جائے۔ امیر افغانستان کو یہ سفارش ناگوار گزری اور حکم دیا کہ فوراً ڈیرہ آور پہنچ کر اس مہم میں امداد دو۔ ورنہ صوبیداری سے معزول کر دیا جائے گا۔ چنانچہ نواب صاحب طوعاً و کرہاً اس مہم میں شریک ہوئے ڈیرہ آور کی تسخیر کے بعد شاہ تیمور ملتان تشریف لائے اور یہاں بیٹھ کر نواب مظفر خاں کو مع دیگر نوابوں اور نواب زادوں کے منکیرا کی مہم پر روانہ کیا۔

منکیرا جسکانی بلوچوں کا صدر مقام تھا اور اکبر اعظم کے عہد سے یہ ریاست ان سے متعلق چلی آتی تھی۔ نہ تو یہ ملک آباد تھا اور نہ ہی قلعہ مضبوط تھا۔ ان کی عسکری قوت بھی

برائے نام تھی۔ ادھر سے کابل کا شاہی لشکر اور پھر اس نواح کے نواب اور نوابزادے جن میں سردار حکومت خاں الکوزئی کا فرزندِ کلاں، نواب محمد صادق خاں پسر نواب بہاول خاں، قمر الدین خاں نواب ڈیرہ جات، سرافراز خاں پسر شاہ محمد خاں بادوزئی، اور نواب مظفر خاں حکمران ملتان اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ شامل تھے۔ ۹ ماہ تک یہ تمام سرداران ملک پوری طاقت سے ان مٹھی بھر مجاہدوں سے برسرِ پیکار رہے۔ مگر انہوں نے طاقت کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ آخر جب مسلسل لڑائیوں میں ان کے رزم آزما جوان ختم ہو گئے۔ اور قلعہ میں کھانے کو کچھ نہ رہا تو بقیۃ السیف بلوچوں نے قلعہ کا دروازہ کھول آخری مردانہ وار حملہ کیا۔ کئی قتل ہوئے اور کئی گرفتار ہو گئے اور قلعہ فتح ہو گیا[1]۔ ساتھ ہی تیمور شاہ بلوچ مجاہدین کو جامِ شہادت سے شاد کام کر کے کابل واپس لوٹ گیا۔ ۱۲۰۷ھ میں تیمور شاہ پھر دورے پر آیا۔ چونکہ نواب مظفر خاں کافی عرصہ سے ملتان پر حاکم تھا اور کافی طاقت اور قبولیت رکھتا تھا۔ شاہ کو ہر وقت اس سے بغاوت کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس دفعہ اس نے ارادہ کیا کہ نواب کو ہمراہ لے جا کر کابل میں قید کر دے، مگر اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ ابھی وہ پشاور ہی میں تھا کہ بیمار پڑ گیا۔ اور کابل پہنچتے پہنچتے عالمِ بقا کو رخصت ہو گیا۔

تیمور شاہ کی جگہ اس کا لڑکا زمان شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس نے رحمت اللہ خاں سدوزئی وزیر اعظم کی سفارش سے نواب مظفر خاں کو بدستور ملتان کی صوبے داری پر بحال رکھا اور خلعتِ فاخرہ دے کر رخصت کیا۔

---

[1] منکیرہ کا پہلا حکمران بلوچ خان تھا اور چاکر خان کی اولاد سے تھا۔ یکے بعد دیگرے اس ریاست کئی بلوچ حکمران رہے۔ آخری حاکم نواب محمد خاں تھا جس سے یہ جنگ لڑی گئی (مصنف)

کوائف خانقاہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ

تقریباً ۱۱۰۰ھ سے خانقاہ حضرت شیخ الاسلامؒ مخدوم محمد زمان قریشیؒ کے خاندان کی تولیت میں چلی آرہی تھی۔ مخدوم شیخ کبیرؒ اس خاندان کے آخری چشم و چراغ تھے۔ اور بے اولاد تھے۔ ان کے عم محترم شیخ ولایت شاہ کا بھی ۱۱۸۸ھ کو انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے مخدوم محمد زمانؒ کی اولاد امجاد میں ایسا کوئی شخص نہیں رہا تھا۔ جسے سجادگی کا اہم منصب سونپا جا سکے۔ ان کے دُور کے رشتہ داروں میں شیخ محمد اور شیخ غلام صدر الدین موجود تھے۔ لیکن ان کی اپنی چھوٹی بہن رابعہ دوران بی بی ماتو زہد و ورع اور علم و فضل میں ان سب پر فوقیت رکھتی تھی۔ ارادت مندوں کے اصرار و تقاضا پر شیخ کبیر علیہ الرحمۃ نے انہیں اپنے بعد تمام سہروردی خانقاہوں کا متولیہ قرار دے دیا۔ جب شیخ کبیرؒ عالم قدس کو رخصت ہوئے اور مخدومہ بی بی ماتو نے خانقاہوں کی تولیت کا کام سنبھالا تو انہوں نے شیخ محمد کو، جن کا نسب نامہ ساتویں پشت میں ان سے ملتا تھا ان کی مخصوص قابلیت اور دینی صلاحیت کے پیش نظر اپنا مختار عام مقرر کیا۔ چونکہ سلطان تیمور شاہ کے انتقال سے خانقاہوں سے متعلق معافیات کے پٹہ کی تجدید لازمی تھی۔ اس لئے حضرت مخدومہ نے شیخ محمد کو کابل روانہ کیا۔ اور انہوں نے بادشاہ کی خدمت میں ضروری کاغذات تصدیق کے لئے پیش کئے۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر کہا کہ "کیا شیخ الاسلام زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ کی متولیہ ایک بی بی ہے؟ وہ مریدوں کی روحانی تربیت کیسے فرماتی ہیں؟؟" شیخ محمد نے بادشاہ کو مطمئن کرنے کی ہر چند کوشش کی، مگر اس کی تسلی نہ ہوئی!

اس نے کہا کہ جب آپ بھی شیخ الاسلام کی اولاد ہیں اور علم و فضل اور زہد و ورع میں بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ کو سجادہ نشین کیوں نہیں بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے شیخ محمد کے نام سجادگی کا فرمان تحریر کر دیا۔ شیخ محمد واپس آئے اور مخدومہ کو صورتِ حال سے اطلاع کی تو وہ سخت ناراض ہوئیں اور انہوں نے اس فرمان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی ۱۵ رجب ۱۲۰۹ھ کو انہوں نے اپنے ایک اور رشتہ دار شیخ صدر الدین محمد کے نام خانقاہوں کی تولیت کا وصیت نامہ تحریر کر دیا۔ اب بیک وقت حضرت شیخ الاسلام کے آستانِ قدسی نشان کے دو سجادہ نشین منظرِ عام پر آگئے۔ ایک سرکاری تھا اور دوسرا مخدومہ کا مقرر کیا ہوا تھا۔ دونوں میں آہستہ آہستہ مغائرت کی خلیج حائل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد شیخ محمد کا انتقال ہو گیا، جسے عوام الناس نے زہر خورانی کا نتیجہ قرار دیا۔ انہیں حضرت قطب الاقطاب شاہ رکنِ عالمؒ کے مقبرہ کے قریب ہی ایک احاطہ کے اندر دفن کر دیا گیا۔ آپ کے بڑے صاحبزادہ مخدوم آخر بہار الدین اس وقت بارہ تیرہ برس کے تھے۔ مرحوم کی اہلیہ اپنے دونوں کمسن بچوں کو ہمراہ لے کر اپنے والدین کے ہاں احمد پور شرقیہ چلی گئیں۔ بی بی صاحبہ کو برادری کی طرف سے اتنا خوف لاحق تھا کہ وہ روانگی کے وقت سوائے قرآن شریف، شجراتِ انساب، خاندانی ملفوظات اور فرامین شاہی کے اور کوئی چیز ہمراہ نہ لے جا سکیں۔ اب شیخ صدر الدین محمد کے لئے میدان خالی ہو چکا تھا، اور وہ سہروردیہ آستانوں کے بلا شرکتِ غیرے متولی بن سکتے تھے۔ مگر ملتان کا مطلع سیاست کچھ اس قدر غبار آلود ہو چکا تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر ضلع بہاول نگر اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلے گئے۔ اور جب مخدومہ بی بی مانو کا وقتِ آخر قریب آیا تو شیخ صدر الدین محمد ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے تولیت کی وصیت اپنی چچازاد بہن مخدومہ بی بی راجیؒ

کے نام کر دی، جس سے وہ وصیت نامہ جو شیخ صدر الدین محمد کے حق میں لکھا گیا تھا، خود بخود منسوخ ہو گیا۔

مخدومہ بی بی راتی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ جب وہ فوت ہونے لگیں، تو انہوں نے اپنی چھوٹی بہن مخدومہ بی بی راج کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ مخدومہ کے انتقال پر بی بی راج نے آستان ہائے پاک کا انتظام سنبھالا تو انہوں نے اراضیات اور خانقاہوں کی دیکھ بھال کے لیے پیر کوڑا شاہ اور پیر حسن شاہ کو مقرر کیا۔ پیر قادر بخش قریشی نے ان دونوں حضرات کا ذکر اپنے الفاظ میں اس طرح سے کیا ہے:-

"واضح باد کہ الحال بہ سجادہ حضرت بہاء الدین ذکریا مسمات حضرت مستورہ رابعہ ساجدہ مخدومہ بی بی راج سجادہ نشین است و پیر کوڑا شاہ برادر زادہ اوست و پیر حسن شاہ خواہر زادہ وے است۔"

ملتان شہر کے روحانی نظام میں تبدیلیاں

پاک و ہند میں صوفیاء کے جس سلسلے نے سب سے پہلے اشاعت اسلام، اور اصلاح احوال کا کام کیا ہے، وہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ ہے۔ اس کے بعد شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریا ملتان تشریف لائے، اور آپ نے مشائخ سہروردیہ کے شیخ الکل کی حیثیت میں شمالی ہند کے کفرستان میں توحید کی شمعیں روشن کیں۔ حضرت خواجۂ خواجگان فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ آپ کے معاصر اور جگری دوست تھے۔ ان دونوں مشائخ کی مساعئ جمیلہ نے سرزمین ہند کو مطلع انوار بنا دیا تھا۔ بایں ہمہ دونوں سلاسل کا دائرہ کار الگ الگ رہا۔ اجودھن کا غربی حصہ مصر و شام تک سہروردیوں کا جولانگاہ تھا۔ اور اجودھن

سے بنگال تک چشتیوں کا طوطی بول رہا تھا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کو سلطان ناصر الدین قباچہ نے ملتان میں قیام کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ملتان تو برادرم بہاء الدینؒ کی تحویل میں دیا جا چکا ہے۔ ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ ان کے بعد بھی ہزاروں چشتی بزرگ ملتان سے گزرے اور رستا کر آگے بڑھ گئے۔ سہروردیوں نے کشمیر سے گجرات کاٹھیاواڑ تک ہر جگہ تبلیغی مراکز قائم کئے اور اشاعتِ اسلام کا گراں قدر کام کیا۔ میر حسینیؒ نے ہرات میں اور عراقیؒ نے مصر و شام میں فقر و ولایت کے جھنڈے گاڑے۔ ایران، افغانستان، بلخ، بخارا اور نیشاپور تک سہروردی ہی سہروردی نظر آنے لگے تھے۔ حضرت بابا صاحبؒ کے بعد سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ نے دہلی کو اپنی روحانی سرگرمیوں کا شرف و مجد بخشا۔ ان کے نامور خلفاء جنوبی دکن تک پھیل گئے۔ مگر کسی نے اجودھن سے جانبِ شرق جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ حضرت قبلۂ عالم نور محمد مہاروی علیہ الرحمۃ پہلے چشتی بزرگ تھے جنہیں ملتان اور اس کے مضافات میں کام کرنے کی اجازت ملی۔ صورتِ حال یہ بتائی جاتی ہے کہ جب آپ اپنے مرشد حضرت خواجہ فخر جہاںؒ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ اب تک ہمیں ملتان میں کسی کو بیعت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اب شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریا کی سرکار سے اس نواح میں کام کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ جب آپ دہلی سے مہار شریف واپس تشریف لائے تو حضرت حافظ محمد جمال اللہ ملتانیؒ کو حکم ہوا کہ تم مولوی خدا بخش خیرپوری کو اپنے ہمراہ مقبرہ شیخ الاسلامؒ میں لے جاؤ، اور حضرت کے سرہانے بٹھا کر سہروردی سلوک میں ان سے بیعت لو۔ یہی وہ ایام تھے، جبکہ شیخ الاسلامؒ کی متولیہ مخدومہ بی بی مانورجؒ تھیں۔ ایک جانب دربارِ کابل میں انتزاع ہو رہا تھا اور دوسری طرف باطنی طور

پر مسندِ ارشاد حضرت حافظ محمد جمال اللہؒ کے سپرد کی جا رہی تھی۔ جناب حافظ صاحبؒ نے ملتان شہر کے ہر محلّے میں سرگرم کارکن قسم کے خلفاء آباد کئے۔ مساجد میں درسِ نظامی کا اجراء فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملتان کے در و دیوار قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں سے گونج اُٹھے۔ اسی طرح قبلۂ عالم مہاروی کے دُوسرے خلفاء نے بھی اپنے اپنے دائرہ عمل میں دینی مدارس اور لنگر جاری کئے۔ پھر ان کے مریدوں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوٹھوہار سے ٹھٹھہ تک روحانیت کے سینکڑوں سرچشمے اُبل آئے ایسے مرکزوں میں کوٹ مٹھن، تونسہ شریف، سیال شریف اور خان پور قاضیاں زیادہ ممتاز تھے۔ بلاشبہ یہ زمانہ بھی خیر الاعصار کہے جانے کے قابل ہے۔ اور چشتیوں کو سہروردی مشائخ کی طرف سے جو کام ودیعت ہُوا تھا۔ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود اسے احسن طور پر انجام دیا۔ چونکہ ہمارا تعلق صرف ملتان سے ہے۔ اس لئے ہم یہاں صرف ان چشتی بزرگوں کا ذکر کریں گے۔ جو اشاعتِ دین اور رُشد و ہدایت کے فرائض انجام دینے کے بعد اس شہر کی خاکِ پاک میں محوِ خواب ہوئے۔ رحمہم اللہ علیہم جمیعاً۔

حضرت خواجہ حافظ محمد جمال اللہ چشتی نظامیؒ

آپ قبلۂ عالم خواجہ نُور محمد مہاروی علیہ الرحمۃ کے خلیفہ اور خواجہ خدا بخش محبوب الٰہی کے پیرِ طریقت تھے۔ آپ نے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے لئے اس قدر ریاضتیں کیں کہ خود قبلہ عالم بھی پھڑک اُٹھے۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ ذکر و اذکار اور مراقبہ و استغراق میں بسر ہُوا۔ زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ مقروض مرید کی نذر قبول نہیں ہوتی تھی۔ اگر گھوڑے کو پانی پلاتے یہ علم ہو جاتا کہ کنُواں کسی یتیم لڑکے کا ہے تو گھوڑے

کی باگ کھینچ لیتے۔ آپ کی مہر پر "اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمِیْل" کندہ تھا۔ حضور امراء سے کھچے کھچے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے اپنے پیر بھائی خواجہ محمد سلیمان تونسوی علیہ الرحمۃ سے شکایت کی کہ امراء اور رؤوسار آکر ہماری عبادت میں حارج ہوتے ہیں تونسوی علیہ الرحمۃ نے ارشاد کیا کہ امراء سے قرض طلب فرمائیے اور فقراء کو دینا شروع کیجئے۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور عوام و خاص کی آمد و رفت میں خاصی کمی واقع ہو گئی۔

نواب مظفر خاں فرمانروائے ملتان آپ کا معاصر تھا۔ اور وہ آپ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ضرورت مند اور سائل بالعموم سفارش کے لئے تنگ کرتے تھے۔ مگر آپ کسی کو مایوس نہیں فرماتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بڑھیا کا لڑکا ملتان کے مضافات میں ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ جب کبھی گرفتار ہوتا بڑھیا حضرت کی خدمت میں دوڑی آتی۔ آپ نواب صاحب کو سفارش کرتے اور وہ رہا ہو جاتا۔ اسی طرح وہ جوان کئی دفعہ گرفتار ہو کر رہا ہوا۔ انجام کار نواب صاحب نے تنگ آکر حکم دیا کہ اب جونہی یہ نوجوان ڈاکہ ڈالتا پکڑا جائے اسے فوراً پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے ہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہیں یہ نوجوان ڈاکہ ڈالتا پکڑا گیا۔ سرکاری کارندوں نے اسے پکڑ کر بلا پس و پیش قلعے کے باہر ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔ بڑھیا کو بیٹے کی گرفتاری کا پتہ چلا تو وہ حضرت حافظ صاحبؒ کی خدمت میں پہنچی۔ آپ حسب معمول عصا تھامے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ اور جب قلعے کے قریب پہنچے۔ دیکھا کہ بڑھیا کا لڑکا درخت سے لٹک رہا ہے۔ وہ تو دیکھ کر رونے پیٹنے لگ گئی۔ مگر آپ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ آگے بڑھ کر لاش کے پاؤں چومے اور فرمایا۔ بھئی تو سچا عاشق تھا اور اپنے عشق میں کامیاب ہوا، جو سوچا کر کے دکھایا اور جان کی پرواہ تک نہ کی۔

مُلکی حالات زمان شاہ اپنے زمانے میں رنجیت سنگھ کو پنجاب کی صوبے داری دے گیا تھا۔ ۱۲۱۶ھ میں امرائے سلطنت نے زمان شاہ کو تخت سے اتار کر اندھا کر دیا، اور اس کی جگہ محمود شاہ کو تخت نشین کیا اور اسے ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ سیاسی شاطروں نے اسے بھی معزول کر دیا۔ اس کی جگہ امیر شجاع الملک کو تخت پر لا بٹھایا۔ رنجیت سنگھ نے مرکز کو کمزور پا کر ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور مسلمان ریاستوں کو ہڑپ کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ نواب مظفر خاں بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے بڑے فرزند نواب محمد سرفراز خاں کے لئے بادشاہ کی خدمت میں صوبیداری کی درخواست کی۔ شجاع الملک نے دونوں باپ بیٹے کے نام صوبیداری کا فرمان بھیج دیا۔ لیکن نواب مظفر خاں نے امورِ صوبیداری سے قطعاً کنارہ کر لیا، اور تمام معاملات نواب سرفراز خاں کو تفویض کر دیئے۔ امیر شجاع الملک کی آمد آمد ہوئی، تو نواب مظفر خاں نے دوسرے بیٹے شاہنواز خاں کو مع دیوان شیر محمد خاں کے سلام کو روانہ کیا۔ بادشاہ ڈیرہ غازیخاں میں مقیم تھا۔ نوابزادہ شاہنواز خاں باریاب ہوا۔ چند روز کے بعد بادشاہ نے اُسے خلعت دے کر رخصت کیا اور خود کابل کو لوٹ گیا۔

جب نواب مظفر خاں کو اپنے فرزند نواب سرفراز خاں کی نظامت اور حکومت کے بارے میں اطمینان ہو گیا تو وہ حج بیت اللہ اور زیارت روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت سے ارض پاک کو روانہ ہوا۔ کمالیہ شریف بیگ تکلو کے زمانہ میں سکھوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ نواب سرفراز خاں نے خان محمد خاں بادوزئی کو بھیج کر اسے فتح کیا۔ اور سکھ گردی کے پیش نظر اپنی عسکری طاقت کو بڑھانا، اور فوج کو جدید آلات حرب سے مسلح کرنا شروع کیا۔ رنجیت سنگھ کو یہ امر سخت شاق گزرا۔ جب نواب مظفر خاں حج اور زیارت روضہ منورہ سے فارغ ہو کر واپس سرزمین ہند پر اُترا تو رنجیت سنگھ نے

انتہائی مکاری سے اسے یقین دلایا کہ نواب سرفراز خاں آپ سے باغی ہو چکا ہے، اور اس نے آپ سے لڑنے کے لئے بڑی فوج تیار کر رکھی ہے۔ نواب مظفر خاں نے نواب سرفراز خاں کا جواب طلب کیا کہ "تم نے میری اجازت کے بغیر فوج میں اضافہ کیوں کیا ہے" حکم دیا کہ "قبل اس کے کہ میں ملتان کی حدود میں قدم رکھوں، زائد فوج کو برطرف کر دو!"

نواب سرفراز خاں نے سعادت مند فرزند کی طرح والد ماجد کے حکم کی فوری تعمیل کی اور زائد فوج کو برطرف کر، بمقام شجاع آباد نواب صاحب کی خدمت میں باریاب ہوا نواب صاحب کو جب صورتِ حال کا صحیح علم ہوا تو انہوں نے بنی بنائی فوج کے توڑنے پر افسوس کیا۔ ان دنوں شجاع الملک رنجیت سنگھ کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔ جس طرح وہ کہتا امیر اُسی طرح کرتا تھا۔ مسلمان نواب بادشاہ کی اس کمزوری کو شدّت سے محسوس کر رہے تھے، خود دارالسلطنت میں بھی بادشاہ کے بہت سے مخالف پیدا ہو گئے۔ جب مدّتِ حکومت سات برس ہو گئی تو فتح خاں بارک زئی نے اُسے تخت سے اُتار کر دوبارہ محمود شاہ کو تخت نشین کیا۔ شجاع الملک شکست کھا کر ملتان کی طرف آیا اور نواب محمد خاں سدوزئی بہادر خاں حاکم منکیرا و لیّہ سے امداد طلب کی۔ ایسے حالات میں جبکہ کابل کے تخت پر محمود شاہ بیٹھ چکا تھا، شجاع الملک سے رابطہ پیدا کرنا حکومتِ کابل سے لڑائی مول لینا تھا اس لئے نواب محمد خاں نے کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ شجاع الملک برہم ہو کر راولپنڈی گیا۔ رنجیت سنگھ ان دنوں یہیں مقیم تھا۔ اس سے نواب محمد خاں کی بے اعتنائی کا ذکر کیا۔ وہ تو چاہتا ہی یہی تھا، کہ کسی طرح مسلمان حکومتیں آپس میں لڑ کر ختم ہو جائیں۔ اس نے کہا کہ محمد خاں میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی کہ آپ سے انحراف کرتا۔ آپ کا سب سے بڑا مخالف نواب مظفر خاں ہے۔ آپ پہلے اسے ختم کریں۔ محمد خاں خود بخود سیدھا ہو جائے گا۔ اس نے فوج اور اپنے تجربہ کار افسر دے کر شجاع الملک کو

ملتان روانہ کیا۔ شجاع الملک نے وعدہ کیا کہ میں ملتان مظفر خان سے چھین کر تمہارے حوالے کروں گا۔ اس عہد و پیمان کے بعد معزول بادشاہ سکھوں کے بل بوتے پر ملتان آدھمکا اور نواب مظفر خاں سے ملتان کی نظامت طلب کی۔ اگرچہ ظاہراً نواب صاحب نے کہہ دیا کہ یہ ملک آپ کا ہے، جسے چاہیں دے دیں، ہم نوکر لوگ ہیں ہمیں کیا عذر ہو سکتا ہے، مگر ساتھ ہی ملتان کے پیرزادگان کو جن میں مخدوم شیخ محمد راجوؒ گردیزی مع برادران شیخ کوڑے شاہ قریشی نائب مخدومہ بی بی راجیؒ، مخدوم شیخ عبد القادر گیلانی مع برادران حافظ محمد جمال اللہ اور سید ابراہیم رحمہم اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مع مصحف مجید بادشاہ کی خدمت میں وفد کے طور پر روانہ کیا۔ کہ ملتان مع قلعہ جات نواب کے پاس رہیں اور حضرت بادشاہ برائے خرچ خاصہ پرگنہ جات تلمبہ، سرائے سدھو، سردار پور، وغیرہ علاقہ شرقی اور مشرقی ملتان قبول فرمائیں، بادشاہ اس وقت حضوری باغ میں خیمہ زن تھا۔ جب یہ وفد باریاب ہوا تو اسے سخت گراں گزرا۔ لیکن مصلحتِ وقت کے پیش نظر منظور کر لیا۔ اور فرمایا "بخاطرِ شما بخشیدم" اس کے بعد بادشاہ اپنے محالات جاگیر کو منتقل ہو گیا۔ لیکن چونکہ وہ محالات قابلِ نزول و معاش بادشاہی نہ تھے۔ اس لئے تھوڑی مدت کے بعد بادشاہ لاہور کو روانہ ہو گیا۔

سکھوں کے حملے

سرحدی حکمران اس وقت بڑی مشکل میں تھے۔ اِدھر شجاع الملک ان پر رعب ڈالتا پھرتا تھا۔ اُدھر سے محمود شاہ مع وزیر فتح خاں بارک زئی خراج وصول کرنے کے لئے آجاتا۔ رنجیت سنگھ کے حملے مزید بر آں تھے۔ ملتان کا شرقی حصہ سکھوں کی دستبرد سے ویران ہو چکا تھا۔ نواب مظفر خاں ہر سال بادشاہ کو پچاس ہزار روپے مع تحائف نذر کرتے تھے۔ پہلی بار محمود شاہ ڈیرہ غازیخاں سے تحائف و خراج لے کر لوٹ گیا۔ دوسرے سال بادشاہ خود ڈیرہ غازی خان میں

فروکش ہوا۔ اور اپنے وزیر فتح خاں کو آگے روانہ کیا۔ وہ مظفر گڑھ میں مقیم تھا کہ نواب مظفر خاں نے جملہ مشائخ ملتان کو مع نذرانہ اور تحائف کے روانہ کیا۔ فتح خاں قبول کر کے بادشاہ کے پاس چلا گیا۔ پھر بادشاہ اور وزیر کبھی اس ملک میں نہ آئے۔ وزیر کا پیش خدمت پہلوان خاں ملتان آتا اور مقررہ نذرانہ اور تحائف لے جاتا۔ نواب صاحب رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے کئی دفعہ امیر افغانستان کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہاں تو تخت یا تختہ کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ کسی کو ملک کے استحکام کا خیال نہ تھا۔ رنجیت سنگھ نے پہلے جھنگ پر حملہ کر کے نواب احمد خاں سیال کو ملک سے نکال باہر کیا۔ اب اس نے ملتان کا رُخ کیا۔ نواب صاحب نے رنجیت سنگھ کو پہلی بار ۱۸۰۲ء میں دیکھا تھا جبکہ وہ ملک کی خفیہ دیکھ بھال کے لئے آیا تھا۔ نواب نے ملتان سے تیس میل چل کر اس غاصب اور جابر حملہ آور سے ملاقات کی اور تحفے تحائف دے کر رخصت کیا۔ ۱۸۰۶ء میں وہ دوبارہ کوٹ مہتم تک چڑھ آیا، اور ستر ہزار روپیہ لے کر واپس لوٹا۔ ۱۸۰۷ء میں رنجیت سنگھ پھر اس ملک پر حملہ آور ہوا۔ جب کوٹ مہتم کے قریب پہنچا تو سردار مست خاں علیزئی کے کاردار خدایار خاں ترین نے رعایا کو ایک جگہ جمع کر کے حصار قائم کیا اور رنجیت سنگھ سے امان طلب کی۔ ایک مقررہ پیشکش پر امان مل گئی۔ لیکن بعد میں جب مہاراجہ کو کوٹ مہتم کے ساہوکاروں کی دولت مندی کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنے قول سے منحرف ہو گیا۔ اور اس نے خدا یار خاں کو طلب کر کے گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دی اور باز کی طرح رنجیت سنگھ کی طرف جھپٹا۔ دو تین آدمی مار گرائے، اور مہاراجہ پر پوری طاقت سے وار کیا۔ مگر افسوس، کہ نواب شاہنواز خاں کی طرح اس کی تلوار بھی ہودہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی اور سکھوں نے یکبارگی

حملہ کرکے اس بہادر نوجوان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

مہاراجہ کوٹ مہتم کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کر ملتان کی طرف بڑھا۔ گیارہ روز تک نواب نے رنجیت سنگھ کا مقابلہ کیا۔ لیکن چونکہ نواب کی فوج تھوڑی تھی۔ اس لئے اس نے شہر پناہ کو خالی کرا دیا اور سپاہ و فوج جو قلعہ میں سما سکتی تھی۔ سب کو جمع کرکے مزید گیارہ روز تک مہاراجہ سے مقابلہ کیا۔ جس سے مہاراجہ کو سخت خفت اٹھانا پڑی اور وہ سردار فتح سنگھ کالیاں والہ کے ذریعے ایک بڑی رقم لے کر واپس لوٹ گیا۔

اب نواب کو بیک وقت تین طاقتوں کو خراج دینا پڑ گیا۔ ایک اس کا بادشاہ امیر افغانستان تھا جو ہر سال خراج تو لے لیتا تھا۔ مگر اُسے فوجی امداد دینے سے قاصر تھا۔ دُوسرا مہاراجہ تھا جو ہر سال پوری قوت سے تیار ہو کر آتا اور شہر پناہ کو بارود سے اڑانے کے بعد معقول رقم لے کر واپس لوٹ جاتا۔ نواب کو نہ فوج بڑھانے کی اجازت تھی اور نہ وہ جدید طرز کا اسلحہ منگوا سکتے تھے۔ انہوں نے انگریزوں سے آتشیں اسلحہ خریدنے کی کوشش کی جس پر خالصہ دربار نے ان کا سخت نوٹس لیا، اور ملتان پر حملہ کرکے ایک بڑی رقم جرمانہ میں وصول کی۔ اور جب تک نواب نے دو خریدی ہوئی بندوقیں مہاراجہ کی نذر نہ کر دیں سکھوں کی فوج ملتان کا گھیرا ڈالے پڑی رہی۔ تیسرا دُشمن شجاع الملک تھا جو کابل سے بھاگ کر لاہور آ گیا تھا اور ابھی تک اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ بھی ایک دو مرتبہ سکھوں کی فوج سے ملتان پر چڑھ آیا اور نواب سے ملتان کا مطالبہ کیا۔ ملک کی یہ حالت تھی کہ وادی کا ساحلی علاقہ ہر سال مہاراجہ کی فوج تباہ کر دیتی تھی۔ لوگ یہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے اور یہ سرسبز و شاداب وادی اب ویران ہو کر رہ گئی تھی۔ زیرین علاقہ کی آمدنی حملہ آوروں کی نذر ہو جاتی تھی۔ آئے دن کے جرمانے ادا کرنے کے سبب نواب کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ ملتان

کے گرد و پیش ابھی کافی طاقتور ریاستیں موجود تھیں، مگر وہ امداد کرنے سے ہچکچاتی تھیں اس کے اپنے امیروں میں سے کئی ایک درپردہ سکھوں سے ملے ہوئے تھے۔ عبدالصمد خاں بادوزئی تو خالصہ دربار میں جذب ہو چکا تھا اور سکھوں سے مل کر ہر وقت نواب کے خلاف منصوبے سوچتا رہتا تھا۔ مسلمان امرا اسے صدو سنگھ کہہ کر دل کا بخار نکالتے تھے۔

نواب مظفر خاں کے خلاف الزامات

۲۴ر فروری ۱۸۱۰ء کو مہاراجہ نے ملتان پر ایک اور حملہ کیا۔ پہلے اس نے فوج کو ملتان کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ اور جب وہ روانہ ہو چکی، تو اس کے تعاقب میں خود بھی بڑی سرعت سے روانہ ہوا۔ جب ملتان کے قریب پہنچا تو سردار فتح سنگھ کالیاں والے کو نواب کے پاس یہ پیغام دے کر روانہ کیا کہ "تم نے ہماری اطاعت اختیار کر کے عہد کیا تھا کہ تم ہمارے کسی مخالف کے ساتھ سازش نہ کرو گے لیکن تم نے اپنے قول کا لحاظ نہیں کیا۔ چنانچہ جب جھنگ کا رئیس احمد خاں بھاگ کر آیا تو تم نے اس کو اپنے پاس پناہ دی۔ پھر تم نے قطب الدین خاں سے دوستی کر کے ہمارے ساتھ جنگ کا منصوبہ گانٹھا۔ اب چونکہ تم نے خود عہد شکنی کی ہے۔ اس وجہ سے یا تو ایک سال کا خراج مع زرجرمانہ اور خرچ افواج ادا کرو، ورنہ خالصہ جی کا لشکر ملتان میں داخل ہو کر تمہیں بے دخل کر کے اپنا قبضہ کر لے گا"[1]

نواب مظفر خاں کا جواب

یہ پیغام سنتے ہی نواب مظفر خاں نے نہایت ملائمت اور انکساری کے ساتھ جواب دیا کہ "مہاراجہ نے خود یہاں آنے کی ناحق تکلیف کی۔ میں تو ہر طرح سے تابع فرمان تھا۔ سالانہ خراج ادا کرنے کے لئے جس کا میں نے اقرار کیا تھا۔ بسر و چشم حاضر ہوں۔ جب چاہتے ایک کتا بھیج کر بھی منگوا سکتے تھے۔ اگر میں نے فی الحقیقت کوئی بغاوت کی ہوتی تو آپ فوج کشی

---

[1] ظفرنامہ از گیان سنگھ

میں حق بجانب ہوتے۔ لیکن میں نے نہ تو احمد خاں سیال کو پناہ دی ہے اور نہ اس سے کوئی منصوبہ گانٹھا ہے۔ بلکہ وہ جس وقت آیا، میں نے اُسی وقت اس کو رخصت کر دیا ہاں اگر مہاراجہ اس کی گرفتاری کا حکم صادر کرتے اور میں تعمیل نہ کرتا تو بھی قصوروار تھا۔ دوسرے قطب الدین خاں حاکم قصور سے بھی میں نے کوئی سازش نہیں کی۔ یہ خبر مہاراجہ کو کسی نے غلط پہنچائی ہے۔ اب اس قدر خراج، جرمانہ اور خرچ سپاہ جو مہاراجہ نے طلب کیا ہے، اس کے ادا کرنے کی مجھ میں قطعاً ہمت نہیں۔ اگر اس قدر رقم خزانہ میں موجود ہوتی تو تعمیل حکم میں عذر نہ ہوتا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ مہاراجہ مجھ پر رحم فرمائیں گے۔"

محولہ بالا عبارت کسی مسلمان مؤرخ کی نہیں، بلکہ مہاراجہ کے درباری وقائع نگار گیان سنگھ کی ہے۔ اُسے پڑھ کر ہر صاحب انصاف اندازہ کر سکتا ہے کہ حالات نے نواب کو کس قدر بے بس کر دیا تھا کہ نہ وہ فوج بڑھا سکتے تھے، نہ توپ بندوق خرید سکتے تھے۔ وہ ایسی سازشوں میں گھر کر رہ گئے تھے کہ ان سے نجات کی کوئی صورت ہی نہ رہی تھی۔ ان کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ لیکن مہاراجہ خیال کرتا تھا کہ ملتان سونے کی چڑیا ہے اس لئے اُس نے نواب کے بیان پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی فوج کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ جب فوج شہر کے نزدیک پہنچ گئی، تو نواب نے دروازے بند کرا دیئے۔ سکھوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا جس سے باہر کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ نواب نے قلعہ بند ہو کر دو ماہ تک مہاراجہ کا مقابلہ کیا۔ ملتان کے بہت بڑے صوفی حضرت خواجہ حافظ محمد جمال اللہ علیہ الرحمتہ کو جب سکھوں کے حملے کا علم ہوا تو گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے میں تشریف لے گئے اور جنگ کے خاتمے تک نواب صاحب کے دوش بدوش مصروف کار رہے۔ اس دوران تین نقب مہاراجہ کے لشکر سے قلعہ تک لگائے جا چکے تھے۔ نواب نے سرنگ کھلوا کر بارود کو آگ لگوا دی۔ جس سے عطر سنگھ انچارج

توپ خانہ مع بارہ رفیقوں کے بارود کی نذر ہو گیا اور مہاراجہ کی فوج خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی۔ نواب صاحب نے عطر سنگھ کی لاش کو نہایت احترام کے ساتھ دوشالے میں لپٹوا کر مہاراجہ کے کیمپ میں بھجوا دیا۔ مہاراجہ اس بار زمزمہ توپ بھی ہمراہ لایا تھا۔ جو ایک من وزن کا گولہ پھینکتی تھی اس نے گولہ باری کر کے قلعہ کی فصیل کو ہلا دیا۔

۱۲ مارچ کو پھر حملہ ہوا۔ لیکن کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ سردار لکھم چند سپہ سالار بیمار پڑ گیا اور بہت سے سردار مارے گئے۔ لیکن قلعہ کی ایک اینٹ تک جگہ سے نہ ہلی۔

۲۵ مارچ کو اس حملے کا آخری دھاوا ہوا۔ مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جس پر مہاراجہ کو مایوس ہو کر مندرجہ ذیل شرائط پر جنہیں وہ پہلے رد کر چکا تھا۔ رضامند ہونا پڑا۔ یعنی نواب اڑھائی لاکھ روپیہ نقد، بیس جنگی گھوڑے پیش کرے۔ اور بوقت جنگ امداد دے۔ لیکن ملتان کا خزانہ یہ مطالبات پورے کرنے سے قاصر تھا۔ اس لئے قلعہ میں یاس و قنوط کی ایک لہر پھیل گئی۔ اور ہر شخص اپنے آپ کو شدید خطرے میں محسوس کرنے لگا۔ اس حالت میں شہر کے بڑے بڑے چودھری اور رئیس اتفاق کر کے نواب کے پاس گئے اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ

"سکھوں کا یہ لشکر پہلے بھی ملتان کو تاراج کر چکا ہے اور پھر بھی برباد کر کے رہے گا۔ جس طرح بھی ممکن ہو، نذرانہ وغیرہ دے دلا کر اس بلائے ناگہانی کو دفع کیا جائے، ورنہ خلق خدا تباہ ہو جائے گی۔ اگر آپ کے خزانہ میں روپیہ نہیں ہے، تو ہم لوگوں کو حکم دیجئے۔ عام رعایا مل کر چندہ دینے کو تیار ہے۔"

المختصر ایک لمبی چوڑی بحث کے بعد ایک لاکھ روپے کے قریب بالمقطع رقم مہاراجہ

نے منظور کی۔ جس کو نصف شہر کی رعایا نے اور نصف نواب نے ادا کیا۔ جب یہ روپیہ مہاراجہ کے پاس پہنچ گیا تو اس نے محاصرہ اُٹھا لیا۔ اور باقی مبالغ کی ادائیگی کے لئے نواب سرفراز خاں کے حقیقی ماموں سردار ابوبکر خاں سدوزئی کو ہمراہ لے کر بہاول پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ مدتِ معینہ کے بعد جب بقیہ رقم ادا ہو گئی تو سردار مذکور کو سکھوں کی قید سے نجات ملی۔

فروری ۱۸۱۶ء میں سکھوں نے ملتان پر پھر بے قاعدہ حملہ کیا اور خراج وصول کر کے لوٹ گئے۔ اسی طرح ۱۸۱۷ء میں ایک اور جھڑپ ہوئی۔ نواب روزروز کی لڑائیوں اور جھڑپوں کے باوجود ملک کی آبادی اور شادابی سے غافل نہیں تھا۔ جونہی سکھوں کی فوجیں واپس لوٹتیں، وہ باغات لگانے، نہریں احداث کرنے، اور بنگلے و مساجد تعمیر کرانے میں مصروف ہو جاتا۔ لیکن رنجیت سنگھ کئی سالوں سے برابر جنگ کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ ۱۸۱۷ء کے سرما میں تو اس نے اپنی تمام توجہ فوج اور رسد جمع کرنے میں صرف کر دی اور اس نے قسم کھالی تھی کہ ہر قیمت پر ملتان کو فتح کر کے رہے گا۔ ادھر نواب کی صورتِ حال یہ تھی کہ وہ خطرے کو عین قریب جاننے کے باوجود نہ تو کسی سے امداد طلب کر سکتا تھا اور نہ اسے فوج بڑھانے کا اختیار تھا۔ جب وہ بھرتی شروع کرتا، لاہور کے دربار سے حملہ کی دھمکی پہنچتی۔ اگر وہ کسی ہمسایہ ملک کے حکمران کو اپنی صورتِ حال سے آگاہ کرتا تو دربار کے جاسوس بات کو بتنگڑ بنا کر پیش کرتے اور وہ گھٹا کی طرح گرجتا برستا افقِ مشرق سے اُٹھتا اور ملتان کے مطلع پر چھا جاتا۔ اس لئے نواب تن بتقدیر نذرِ نیاز دے کر جان چھڑا لینے پر شاکر تھا۔

حضرت حافظ محمد جمال اللہ کا انتقال

۵ جمادی الاوّل ۱۲۲۶ھ کو حضرت حافظ محمد جمال اللہ علیہ الرحمۃ کا انتقال ہو گیا۔

مبارک حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب
تونسوی
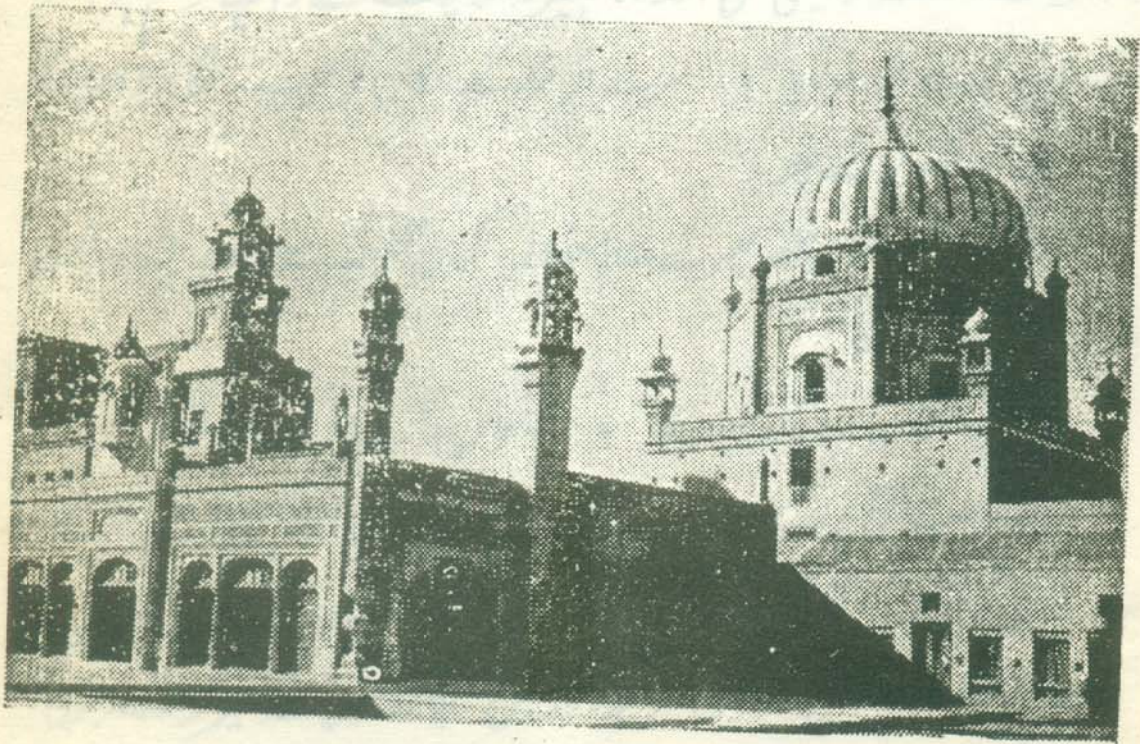
مقبرہ حضرت شاہ سلیمان تونسوی
تونسہ شریف - ضلع ڈیرہ غازی خان

اور سید زاہد شاہ کی تجویز کے مطابق بموجب سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے میں سپردِ خاک ہوئے۔ ملتان میں آپ چشتی سلسلے کے شیخ الکل کی حیثیت رکھتے تھے اور سہروردی و چشتی دونوں سلسلوں میں بیعت لینے کے مجاز تھے۔ آپ کے فیضِ صحبت سے ہزاروں لوگوں نے استفاضہ کیا۔ پندرہ کے قریب آپ نے خلفاء چھوڑے جن میں سے حضرت مولانا خدا بخشؒ، مولانا منشی غلام حسنؒ، قاضی محمد عیسیٰ خان پوریؒ۔ مولانا محمد موسیٰ اور سید زاہد شاہ رحمہم اللہ علیہم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

تعمیرِ روضہ

۲۷×۲۷ فٹ کی حسین ترین عمارت جو مقبرہ کے نام سے موسوم ہے اور شمالی و غربی رونشین حضور کے خلیفۂ اوّل حضرت مولانا خیر پوری نے تعمیر کرائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ڈیوڑھیوں کے شمال مغربی کونے کی ڈاٹ معماروں سے درست نہ بیٹھتی تھی اور وہ شہتیر رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو علم ہُوا، تو سخت ملول ہوئے اور فرمایا "بابا، میرے مُرشد کے مکان کو عیب نہ لگاؤ"۔ اور ارشاد فرمایا "مجھے موقعہ پر لے چلو!"

انحطاطِ عمر کا زمانہ، چلنے پھرنے سے معذور، کمالِ تکلیف سے اوپر چڑھے، ڈاٹ پر بیٹھ کر یہ شعر پڑھا ؎

اززمینِ خشک رویاند گیاہ　　٭　　آسماں را بے ستوں دارد نگاہ

اور پھر اپنے دستِ حق پرست سے اینٹ لگائی جو قائم ہو گئی اور اس طرح یہ ڈاٹ بغیر شہتیر کے تکمیل کو پہنچی۔ سنگِ مرمر کا کٹہرہ، مرقدِ پاک، سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کا دلفریب فرش اور خانقاہ کا شرقی دروازہ خواجہ اللہ بخشؒ سجادہ نشین نے تعمیر کرائے، جنوبی مرمریں دروازہ نواب حاجی احمد یار خاں مرحوم اور شمالی دروازہ ان کے صاحبزادے صوفی عطا محمد خاں کے تعمیر کردہ ہیں۔ مجلس خانہ بھی خوگانی نوابوں اور دوسرے ارادتمندوں

کی ہمّت سے تعمیر ہوا۔ یہ ۵۸ فٹ لمبا اور ۴۱ فٹ چوڑا ہے۔ چھت چوبی اور منقش ہے روضہ مبارکہ کی دیواریں بھی منقش ہیں اور ان پر اثر انگیز کتبے مرقوم ہیں۔ حضرتؒ کا عرس ۱۳ تا ۱۵ جمادی الاوّل بڑے اہتمام سے ہوتا ہے۔ پاکستان کے طول و عرض سے ارباب صفا یہاں کھچ کھچا کر جمع ہو جاتے ہیں اور تین دنوں تک ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔

رنجیت سنگھ کا آخری حملہ

تواریخ راج خالصہ کا مؤلف گیان سنگھ گیانی لکھتا ہے کہ سمت ۱۸۷۵ بکرمی کے اخیر اور ابتدائے ۱۸۱۸ء میں مہاراجہ نے کل باربرداری و رسد رسانی کا سامان بافراط مہیّا کر کے راجکمار کھڑک سنگھ کو پچیس ۲۵ ہزار فوج کے ساتھ ملتان کی طرف روانہ کیا اور مصر دیوان چند کو جو اپنی ذاتی لیاقت اور شجاعت کے سبب کُل توپ خانوں کا جرنیل اور ظفر جنگ کے خطاب سے ممتاز تھا۔ زمزمہ نامی توپ دے کر راجکمار موصوف کے ساتھ بھیجا اور تاکید کی کہ بغیر فتح واپس نہ آنا۔ مگر مہاراجہ ایسے وقت کے خطرناک اندیشوں سے جو مسلمان رعایا کی طرف سے اپنے دین کی حمایت میں ہونے ممکن تھے۔ بے خبر نہ تھا۔ اس کو ایسے معاملات میں بہت دُور کی سُوجھتی تھی۔ اور ایسی باتوں کو رد کرنے کا بھی اُسے خوب ڈھنگ آتا تھا۔ چنانچہ ایک جانب تو ملتان پر فوج کشی کا حکم دیا اور دُوسری جانب احمد خاں سیال رئیس جھنگ کو جو نو ماہ سے سخت قید میں پڑا ہوا تھا رہا کر کے میر دوال کا علاقہ جمعی بارہ ہزار ضلع امرتسر میں بطور جاگیر عطا کیا۔ اور نیک چلنی کی شرط میں اس کے بڑے لڑکے عنایت خاں کو اپنے پاس رکھ لیا۔

ادھر فوج نے ملتان کے قریب پہنچ کر ایک بڑی رقم نذرانہ کی مع عمدہ عمدہ اسپان بادرفتار کے طلب کی۔ لیکن نواب نے تعمیل سے انکار کر دیا۔ اور ایک عام اشتہار دے

دیا کہ یہ دینی لڑائی ہے ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنے اپنے ہتھیار لے کر اس جہاد میں شرکت کرے۔ یہ مشہور ہوتا تھا کہ مسلمان علیؓ علیؓ کے نعرے لگاتے ہر طرف سے ٹڈی دل کی طرح آ کر جمع ہو گئے۔ اتنے میں سکھوں کی فوج نے بھی راستے کے قلعے مظفر گڑھ اور خان گڑھ کو فتح کر کے خاص ملتان کا محاصرہ کر لیا، اور آگ برسانی شروع کر دی۔ نواب مظفر خاں نے شہر کے دروازے بند کرا دیئے۔ قلعہ اور شہر کی فصیلوں پر فوج تعینات کر دی اور مقابلے کے لئے ڈٹ گیا۔

مصالحت کی پیشکش

تذکرۃ الملتان کا مؤلف لکھتا ہے کہ دو ماہ کی جنگ کے بعد نواب نے ازراہِ عاقبت اندیشی سردار فتح سنگھ کی وساطت سے مصالحت کی تحریک کی اور طے پایا کہ نواب صاحبان کا جو ذاتی سامان ہے اس پر وہ خود متصرف رہیں اور شجاع آباد میں سکونت رکھ کر اسے مع توابعات کے اپنی جاگیر میں لے لیں۔ لیکن نواب سرفراز خاں کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمیں اپنی مرضی سے ملک حوالے کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ کیونکہ ہم لوگ ناظم تھے نہ کہ بادشاہ۔ اگر ہم امیرِ افغانستان کی رضائے بغیر یہ ملک سکھوں کے حوالے کر دیتے تو خدا اور رسولؐ کے نزدیک خائن ثابت ہوتے۔"

دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مہاراجہ خود کوٹ مٹھن میں امان دینے کے بعد اپنے عہد سے منحرف ہو گیا تھا۔ اور یہاں تو وہ موجود بھی نہ تھا۔ اور یہ خدشہ یقینی تھا کہ اگر اس طرح قلعہ حوالے کر بھی دیا گیا، تو اس سے بھی زیادہ ذلّت کی موت نصیب ہو گی۔ یہ حالات اور خدشات تھے جن کے پیشِ نظر نواب نے فیصلہ کر لیا کہ جنگ کئے بغیر قلعہ سکھوں کے حوالے نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے راجکمار کھڑک سنگھ کو کہلا بھیجا کہ افسوس، اس وقت نہ تو آپ کو نذرانہ کی رقم ادا کر سکتا ہوں اور نہ ملتان شہر حوالے کر سکتا ہوں۔

جب تک زندہ ہوں، اس کی حفاظت کروں گا۔ الغرض لڑائی جاری رہی۔ یہاں تک کہ سکھوں کے لگاتار گولوں نے شہر پناہ کو کئی جگہ سے شکستہ کر دیا۔ اور ایک دن کی سخت آتشباری کے بعد فروری ۱۸۱۸ء میں شہر پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

اب قلعہ کی باری آئی جس میں نواب صرف دو ہزار آدمیوں کے ساتھ محصور تھا اور سامانِ رسد بھی ناکافی تھا۔ اگرچہ سکھوں کی رات دن کی گولہ باری نے قلعے کو ہلا دیا تھا۔ مگر اندر سے نواب مظفر خاں کے بہادر ساتھیوں نے بھی سکھوں کو ناک چنے چبوا دیئے۔

گیانی لکھتا ہے کہ "ایسا موقعہ لاہور کی فوج کو دیکھنا بہت کم نصیب ہوا تھا۔ تین ماہ تک گولہ باری ہوتی رہی۔ انجام کار قلعہ کی فصیل میں دو بڑے شگاف پڑ گئے۔ کیونکہ احمد شاہ ابدالی کی توپ زمزمہ بھنگیوں کے پاس تھی اور خاص طور پر یہ مہم سر کرنے کے لئے لاہور سے منگوائی گئی تھی۔ خدا کی قدرت! احمد شاہ کو کیا معلوم تھا کہ یہ توپ ایک دن اسی کی سلطنت کے محل کو منہدم کرنے کے کام آئے گی۔ سکھوں نے کئی بار حملے کئے لیکن ہر بار پسپا کر دیئے گئے۔ ایک دفعہ تو ان کے اٹھارہ سو آدمی ضائع ہوئے۔ قلعے کا دروازہ اڑا دیا گیا۔ لیکن قلعے کی فوج نے اس کے روبرو دھس بنا کر سکھوں کے ساتھ دست بدست لڑنا شروع کیا۔ قلعے کی مدافعت کرنے والوں کی تعداد اب گھٹتے گھٹتے تین سو رہ گئی تھی۔ جن میں سے اکثر نواب مظفر خان کے قبیلے یا خاندان کے لوگ تھے۔ باقی یا تو ہلاک ہو گئے تھے، یا دشمن سے جا ملے۔ کیونکہ انہیں اپنے آقا کا ساتھ چھوڑنے کے لئے بہت کچھ رشوت دی گئی تھی[1]۔ عبدالصمد خاں بادوزئی تو شروع سے مہاراجہ کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ اب وہ مہاراجہ کی فوج میں شامل ہو کر نواب سے لڑ رہا تھا۔ نواب کی

[1] رنجیت سنگھ صہ ۱۵۱۔ از سر لیپل گرفن۔ ترجمہ مولوی نذیر حسین فاروقی مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

فوج کے چند دیگر افسر بھی خفیہ طور پر مہاراجہ سے ملے ہوئے تھے۔ ۲ر جون ۱۸۱۸ء مطابق ۲۴ر رجب ۱۲۳۳ھ کی تین شبانہ روز کی جنگ سے اندر کی فوج تھک گئی اور آرام لینے لگی تو ایک خائن سردار نے ایک چٹ پر یہ عبارت تحریر کرکے تیر کے ذریعے سکھوں کی فوج میں پھینکوا دیا:۔

"فوج آرام کر رہی ہے اور شمالی دروازہ غیر محفوظ ہے، اگر حملہ کردو تو بآسانی داخل ہو جاؤ گے!"

چنانچہ سکھوں نے دھاوا بول دیا، اور سادھو سنگھ نامی ایک اکالی سردار بہت سے بہادر سکھوں کو ہمراہ لے "اکال اکال" کہتا شکستہ حصار سے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گیا اور اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔ جس کو دیکھتے ہی بقیہ فوج بھی دیوار پھاند کر قلعہ میں گھس گئی۔ اور خضری دروازہ کے شگاف تک جا پہنچی۔ اس عالم میں جبکہ نواب کی فوج میں سے اکثر نمک حرامی کا ثبوت دے چکے تھے، کئی سعید روحیں ایسی بھی تھیں، جو اگرچہ سکھوں کے لشکر میں تھیں۔ لیکن نواب پر جان فدا کرنے کے لئے بے چین ہو رہی تھیں، چنانچہ روہیلہ دستہ، جس کے افسران پایاب خاں اور غلام رسول خاں وغیرہ تھے، نے ارادہ کیا کہ قلعے میں داخل ہو کر نواب کی طرف سے سکھوں کے ساتھ جنگ کریں، اور وہ لڑتے بھڑتے دروازے تک بھی جا پہنچے، مگر سوء اتفاق سے دروازہ بند تھا، وہ جذبات سے مغلوب ہو کر وہیں سکھوں سے الجھ گئے، اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے عالم بقا کو رخصت ہوئے۔

جب نواب نے فرشتۂ اجل کو قلعے کی فضا پر منڈلاتے دیکھا تو انہوں نے اپنے بڑے صاحبزادے نواب محمد سرفراز خاں کو طلب کرکے وصیت کی کہ ہماری شہادت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنا اور امان

لے لینا، تاکہ ہماری نسل منقطع نہ ہو۔[1]

نصر اللہ خاں کو حکم ہوا کہ جب واہب العطایا اس خاکسار کو خلعتِ شہادت سے سرفراز کرے، فوراً محلسرائے میں پہنچ کر جملہ مستورات کو تہِ تیغ کر دینا۔ اس کے بعد دیوی دروازہ سے جہاں محاصرہ کے دوران دونوں باپ بیٹے بیٹھا کرتے تھے مع خواص و مصاحبین بعزمِ شہادت سوار ہو کر خضری دروازے کی طرف تشریف لے گئے، اور اسے بند کرنے کا حکم دیا۔ خالصہ دربار کا مؤرخ گیان سنگھ گیانی لکھتا ہے کہ نواب نے جب یہ حال دیکھا تو سبز لباس پہن غازیوں کی طرح اپنے بھائی، بیٹوں اور نوکروں چاکروں کے ہمراہ نہایت جوانمردی کے ساتھ محل سے نکلا اور تلوار لے کر دشمنوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

ایثار و قربانی کا عدیم المثال منظر

تذکرۃ الملتان کی روایت کے بموجب سب سے پہلے سرمست خاں علے زئی، صاحبداد خاں دیوان فتح خاں اور اس کا بھائی خواجہ محلدار حبشی (غلامِ خاص) اور بعض دیگر ایثار پیشہ مخلصین باری باری اجازت لے کر سکھوں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے نواب پر سے تصدق ہوئے۔ پھر نواب کے پرانے نمک حلال نوکر تلواریں سونت سونت کر آگے بڑھے، اور دو دو تین تین کا کام تمام کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

ان کے بعد ذوالفقار خاں، شاہنواز خاں، شاہباز خاں، ممتاز خاں، حق نواز خاں اور اعزاز خاں، نواب کے فرزندانِ ارجمند باپ کے قدم چوم کر آگے بڑھے اور مردانہ وار سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ زاں بعد نواب کا بھتیجا سردار خیر اللہ خاں اجازت لے کر آگے بڑھا اور اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر خلدِ بریں کو رخصت ہوا۔

---

[1] "بہر حیلہ کہ توانی خود را زندہ بدار، و دامان بگیری تا نسل ما منقطع نشود"

نواب کی آخری للکار

ان سب کے آخیر میں ملتان کا بوڑھا مجاہد نواب مظفر خاں ننگی تلوار ہاتھ میں لئے مقتل کی طرف بڑھا دائیں بائیں احباب و اقرباء خون میں نہائے اپنے صف شکن اور بہادر آقا کی شجاعت و بسالت کا نظارہ دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولے پڑے تھے۔ نواب نے بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک لاش کو دیکھا۔ اور بے اختیار پکار کر کہا۔ "شاباش دوستو میں ابھی آیا"۔ یہ کہہ کر حملہ آوروں کی طرف جو اس شیر پر سُبُل بادل کے اُمنڈ آئے تھے کمال مردانگی سے لپکا۔ بوڑھے افغان کی تیغ بُرّاں نے کُشتوں کے پُشتے لگا دیئے[1]۔

نواب نہایت چابکدستی سے تلوار چلا رہے تھے۔ اور زبان پر کلام ربّانی کی یہ آیت کریمہ جاری تھی۔ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ

یعنی "اے میرے رسُول! ان سے کہہ دو کہ اے نفس پرستو! جس موت سے تم اس قدر بھاگتے ہو، وہ تمہیں چھوڑ نہ دے گی۔ ایک دن ضرور آئے گی۔ پھر تم اُسی خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ اور ظاہر سب کچھ جانتا ہے۔"

سکھوں کی فوج شمشیر زنی سے تنگ آ گئی۔ اُس نے پیچھے ہٹ کر توڑے دار بندوق سے باڑھ مارنا شروع کر دی۔ نواب نے للکار کر کہا۔ "بزدلوں کی طرح مت لڑو، اگر ہمت ہے تو سامنے آؤ"۔ لیکن سکھ اس دعوت کو کب قبول کرنے والے تھے۔ انہوں نے جواب میں پکار کر کہا کہ اب بھی وقت ہے کہ مہاراجہ کی اطاعت قبول کر لو لیکن نواب

---

[1] تواریخ راج خالصہ از گیان سنگھ گیانی [2] رنجیت سنگھ از سر لیپل گرفن۔

نے فرمایا۔ "میں مہاراجہ کی پناہ پر خدا کی پناہ کو ترجیح دیتا ہوں"۔ اس اثنا میں
سن سے ایک گولی آئی اور نواب کے بدن کو چھیدتی ہوئی پار نکل گئی۔ لیکن واہ رے
شجاع ابنِ شجاع! تُو نے اس گئے گزرے زمانے میں بھی اسلامی حرّیت و شجاعت کی
لاج رکھ لی۔ اور ایک دفعہ پھر دُنیا کو دکھا دیا کہ مجاہدینِ اسلام کیونکر لڑا کرتے تھے
اور خالدؓ، ضرارؓ، اور طارقؒ کی تلواروں کا اعجاز کیا تھا۔ زخم کھا کر بھی بپھرے ہوئے
شیر کی طرح آگے بڑھے اور کڑکتے، گرجتے، سکھوں میں گھستے چلے گئے۔

ایک روایت کے بموجب نواب کی ایک صاحبزادی اُس وقت محل پر سے
اپنے اعزا و اقارب کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے بھائیوں کو خاک و خون میں
تڑپتا اور باپ کو دُشمنوں میں گھرا ہُوا پایا تو وہ بے چین ہو گئی۔ خواجہ سراؤں کو
منت سماجت کر کے اصطبل سے گھوڑا منگوایا۔ مردانہ لباس پہن، ننگی تلوار ہاتھ میں
لے، گھوڑے پر سوار ہو، میدانِ کارزار میں گھس گئی اور اس بہادری سے مقابلہ کیا
کہ چاند سلطانہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ دو دستی تلوار چلاتی بوڑھے باپ تک جا پہنچی اور
نواب کی پیٹھ کو دشمنوں سے خالی کر دیا۔ نواب دُنیا و ما فیہا سے بے خبر شمشیر زنی
میں مصروف تھے۔ اور زبان پر یہ شعر تھا۔

بجرمِ عشق توام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

اتنے میں سکھوں کی طرف سے ایک باڑھ چلی اور شہزادی چھلنی ہو کر گر پڑی۔ اگرچہ
نواب بھی گولیوں سے چھلنی چھلنی ہو چکا تھا۔ لیکن بیٹی کی چیخ سُن کر باز کی طرح جھپٹا
اور اپنے گھوڑے کو اس کی لاش کے گرد چکّر دینے لگا۔ اسی اثنا میں گولیوں کی ایک
اور بوچھاڑ آئی۔ جس سے ملتان کا بوڑھا فرمانروا تیورا کر بچی کے پہلو میں آگرا، اور

اس کی زندہ جاوید رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نواب کے شہید ہوتے ہی سردار نصر اللہ خاں محلسرائے کی طرف لپکا۔ تاکہ شہید نواب کی وصیّت کو عملی جامہ پہنائے۔ لیکن ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ سکھوں کی گولی سے ٹھنڈا ہو گیا[1]۔ نواب محمد سرفراز خاں دیو دروازہ پر دُشمنوں سے برسرِ پیکار تھے۔ نواب کے خاندانی ریکارڈ کے مطابق اُسّی[80] زخم کھا کر بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا اور نواب کے شہید ہونے کی خبر سُنی تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

مظفر بر بساطِ مرگ بنشست
مسلمانی ز ملتاں رخت بربست

اس محاذ پر دیوان رام دیال اور عبدالصمد خاں مامور تھے۔ وہ فوراً لپک کر پہنچے اور نواب سے تلوار لے لی۔ ایک طرف سے رام دیال نے اور دُوسری طرف سے عبدالصمد خاں نے نواب کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور قلعہ سے باہر لے آئے۔ نواب سرفراز خاں عبدالصمد خاں کی طرف متوجّہ ہوا اور کراہتے ہوئے بولا:۔

"عبدالصمد خاں! نواب اور دُوسرے شہداء کی لاشوں کو بے حرمتی سے بچاؤ۔ نواب کی بہو بیٹیاں اور مسلمانوں کا ناموس تجھ پر کچھ حق رکھتا ہے اگر تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو دریغ نہ کرو، مجھ پر اور میرے خاندان پر تمہارا یہ احسانِ عظیم ہوگا!"

[1] نصر اللہ خاں سدوزئی کہ بر قتل قبائل برصت عم تو د نواب مذکور مے رفت، در راہ بضرب بندوق مقتول شد۔ (تذکرۃ الملتان فارسی قلمی صہ ۸۶)

عبد الصمد خاں نے بسرعت تمام نواب سرفراز خاں کو شہزادہ کھڑک سنگھ کے خیمے تک پہنچایا۔ اور خود ایک دستہ فوج کا لے کر میدان کارزار میں پہنچا۔ اس سے پہلے حضرت مخدومہ بی بی راجی متولیہ خانقاہ شیخ الاسلام کا مختار عام، شیخ حسن شاہ قریشی نواب شہیدؒ کی لاش کو اپنے قبضہ میں لے چکا تھا۔ اور نوابزادوں کی لاشوں کو شناخت کرتا پھرتا تھا۔ ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے پڑے تھے۔ لاشوں کے انباروں میں سے بمشکل دو تین نوابزادوں کی لاشیں مل سکیں۔ انہیں اٹھوا کر شیخ حسن شاہ نے حضرت شیخ الاسلامؒ کے آستانِ قدس نشان میں سپرد خاک کیا۔ باقی لاشیں گڑھوں میں دفن کر دی گئیں۔ نوابزادہ ذوالفقار خاں زخموں سے چور، مگر زندہ تھے۔ انہیں سکھوں نے حفاظت میں لے لیا۔ امیر باز خاں زندہ بہاول پور بھاگ گیا۔

نواب کے شہید ہونے سے ملتان و اہل ملتان پر کیا گزری، وہ مختلف مؤرخین کی زبان سے سنیئے۔

ملتان پر کیا گزری؟

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا درباری مؤرخ گیان سنگھ گیانی لکھتا ہے کہ:-

"سکھوں نے نواب کا کام تمام کر کے لوٹ مار اور غارت گری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ قلعہ میں پانچ چھ سو مکانات تھے۔ سب کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ تین چار دن تک شہر کو برابر لوٹتے رہے اور کسی کے پاس سوائے تن کے کپڑوں اور کھانے پینے کے برتنوں کے کچھ نہ چھوڑا۔"[1]

سید محمد لطیف اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:-

"شہر کو آگ لگا دی گئی اور لوگوں کے کپڑے اتار لئے گئے۔ عورتوں کی عصمتیں

---

[1] تواریخ خالصہ۔ از گیان سنگھ گیانی ص ۱۳۵

پامال کی گئیں۔ بعض عفت مآب خواتین نے اپنے ناموس کو بچانے کی خاطر کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں اور بعض نے خودکشی کر لی۔ جب شہر میں ہزاروں آدمی جان سے مارے گئے اور مکانات جل کر راکھ ہو گئے تو کنور کھڑک سنگھ فاتحانہ انداز میں شہر میں داخل ہوا۔"

گیانی کا بیان ہے کہ :-

"راجکمار کھڑک سنگھ نے قلعے میں داخل ہو کر نواب کا جس قدر مال و اسباب خزانہ، جواہرات اور پارچات ریشمی اور زرّین تھے، سب رام دیال کی معرفت نہایت حفاظت اور ہوشیاری سے مہاراجہ کے ملاحظہ کے لئے صندوقوں میں بند کرا دیئے[1] مہاراجہ کا خیال تھا کہ نواب بڑا دولت مند ہے اور خراج و نذر دینے سے عمداً گریز کرتا ہے۔ لیکن جب لوٹ کا حصہ مہاراجہ کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ صرف دو لاکھ نکلا۔"

مسٹر گرفن کے الفاظ یہ ہیں کہ :-

"مشہور تھا کہ ملتان میں بڑی دولت ہے، مگر مہاراجہ کو صرف دو لاکھ روپے لوٹ میں ملے۔ اس لئے اس نے یہ حکم دیا کہ تمام عہدہ دار اور سپاہی غنیمت کا مال واپس کر دیں ورنہ اُنہیں موت کی سزا دی جائے گی۔ اس حکم سے پانچ لاکھ روپیہ اور ریاست کے خزانے میں داخل ہوا۔"[2]

مکافاتِ عمل

ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ عام لوگوں کا خیال تھا کہ جس کے پاس اس لوٹ کا مال تھا، وہ اسے راس نہ آیا۔ بہت سے ایسے لوگ محتاج ہو کر مرے، یا لڑائی میں مارے گئے[3] اسی کتاب کا مصنف

[1] تواریخ خالصہ　[2] و [3] رنجیت سنگھ، از سر لیپل گرفن۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن

کتاب کے خاتمے پر لکھتا ہے کہ :-

"رنجیت سنگھ کے کشتِ عمل کا یہ ثمرہ ملا کہ آباؤ اجداد نے کھٹے انگور کھائے۔ اخلاف کے دانت کھٹے ہوئے۔ جس مملکت کی بنیاد ظلم، دغابازی اور خونریزی سے پڑی، وہ اپنے بانی کے بعد عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ اس کی بنیاد ایک شخص کی فوجی و ملکی قابلیت پر منحصر تھی۔ اس کے مرتے ہی ریزہ ریزہ ہو کر خاک ہو گئی، اور خالصہ کی وراثت انگریزوں کو نصیب ہوئی۔"[1]

نوّاب کی قبر کا کتبہ

نواب کا مزار دربار حضرت غوثِ زماں بہاء الحق والدّین زکریّا ملتانی قدس سرّہٗ کی خانقاہ میں داخلی دروازہ کے عین سامنے واقع ہے اور اس پر درجِ ذیل کتبہ مرقوم ہے :- ؎

شجاع ابن الشجاع و حاجی　　امیر ملتاں زہے مظفر
بروزِ میداں بہ تیغ و بازو　　چہ حملہ آورد چوں غضنفر
چوں سرخروئے شد بسوئے جنّت
بگفت رضواں "بیا مظفرؔ"

کہتے ہیں کہ جب نواب سرفراز خاں اپنی نظر بندی کے زمانے میں بغرضِ زیارتِ قبور والدِ بزرگوار اور برادران ملتان تشریف لائے تھے تو یہ کتبہ انہوں نے خود لگوایا تھا۔ نواب سرفراز خاں اور ذوالفقار خاں کی بقیہ زندگی لاہور میں بسر ہوئی۔ پہلے ان پر پہرہ رہتا تھا۔ بعد میں انہیں آزاد کر دیا گیا۔ ذوالفقار خاں سکھوں کے عہد میں فوت ہوئے۔ اور نواب سرفراز خاں نے انگریزی دور[2] میں انتقال فرمایا۔ امیر باز خاں، جو

---

[1] رنجیت سنگھ، از سر لیپل گرفن　[2] نواب محمد سرفراز خاں کا سنِ وفات ۱۸۵۱ء بیان کیا جاتا ہے۔

نواب کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ اُنہیں نواب بہاول پور نے پناہ دی، ان کی اولاد وہاں آباد ہوئی۔ ذوالفقار خان کی اولاد میں سے نوابزادہ سلطان ظفر ملتان کے ایک گمنام گوشے میں آباد ہے۔ اس کے طور و اطوار اور کردار سے خاندانی نجابت ٹپکتی ہے۔

نواب شہید کی مدّتِ حکومت تقریباً چالیس سال ہے، چوبیس سال باپ نے اور سولہ سال بیٹے نے حکومت کی۔ نواب کی شہادت سے سدّوزئی خاندان کی نظامت اور ابدالی خاندان کی حکومت دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ؎

دُنیا سے ہم کیا مٹے، مہر و وفا کا نام مٹا

نوّاب کا مقام

نواب مظفر خاں نے علومِ متداولہ کی تعلیم مولانا محمد موسیٰ صدیقی سے حاصل کی تھی، جو مولانا فخر الدین عراقی کی اولاد اور ملتان کے اکابر علماء و مشائخ میں سے تھے۔ حافظ محمد جمال اللہ چشتی علیہ الرحمۃ سے ان کا گہرا رابطہ تھا۔ چنانچہ سکھوں کی ایک لڑائی میں حضرت حافظ صاحبؒ نے بھی حصّہ لیا تھا۔ خواجہ محکم الدینؒ سیرانی سے آپ کو بڑی عقیدت تھی۔ ایک دفعہ حضرت قلعہ سے گزر رہے تھے، نواب کو علم ہُوا تو دوڑ کر پہنچے اور قدمبوس ہوئے۔ فرمایا:-

"مظفر! کیا چاہتے ہو؟"

عرض کی "حج کا شوق ہے!"

فرمایا "منظور! — اور مانگو!"

عرض کی "غازی بنوں!"

فرمایا "یہ بھی منظور ہے — اور مانگو!"

عرض کی "شہادت کا درجہ عطا ہو!"

فرمایا۔ "انشاء اللہ تمہاری تمام مُرادیں پُوری ہوں گی!"
چنانچہ حالات نامساعد ہونے کے باوجود آپ نے حج کیا۔ غزا کیا اور شہید ہوئے۔
سخاوت نواب کا فطری جوہر تھا۔ مالی مشکلات کے باوجود خیرات وصدقات میں کبھی کمی نہ ہوئی۔ نیاز مند نے ملتان کے اکثر مشائخ کے اوقاف ومعافیات کے پروانے دیکھے ہیں۔ ان سب پر نواب کی مہریں ثبت ہیں۔

کثرتِ کار اور عدیم الفرصتی کے باوجود نواب اکثر مشائخ کے آستانوں پر حاضر ہُوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مخدوم شاہ محمد یوسف گردیزی علیہ الرحمۃ کے آستانِ قدس پر حاضر ہوئے۔ ایک تھیلی روپوں کی آپ کے ہاتھ میں تھی۔ اور خانقاہ کے درویشوں میں بانٹتے پھرتے تھے۔ اُس وقت آپ نے سیاہ لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ ایک مجذوب نے پکار کر کہا۔ "او کوئلے کی صُورت والے! کچھ تو اِدھر بھی!" نواب کو یہ الفاظ ناگوار گزرے، پلٹ کر اُسے تیز نظر سے دیکھا۔ مجذوب نے برجستہ بے تکلفی سے کہا:۔

"بابا دیتے ہو تو دو، ورنہ چنگاریاں نہ برساؤ!"

نواب کو مجذوب کی یہ تجنیسِ لفظی بڑی پسند آئی۔ روپوؤں کی مُٹھی اس کے دامن میں ڈال دی۔ مجذوب نے ہاتھ اٹھا کر دُعا کی اور کہا "بابا سلگتے رہو!" (کوئلہ، چنگاریاں اور سلگنا کے الفاظ قابلِ غور ہیں)

نواب کے زہد وورع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ کی والدہ نے انتقال کیا تو نواب سرفراز خاں نے پکار کر کہا کہ مرحومہ کی وصیّت ہے کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جو صاحبِ ترتیب ہو۔ جس نے کبھی تہجّد اور اشراق کی نماز قضا نہ کی ہو۔ جس نے عمر بھر کسی نامحرم عورت کو نظرِ بد سے نہ دیکھا ہو۔ اتنے بڑے مجمع میں کہ سینکڑوں علماء اور مشائخ اس میں موجود تھے۔ کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب کافی دیر گزر گئی

تو خود نواب صاحب صفوفِ اولیاء سے اُٹھ کر آگے بڑھے اور جنازہ پڑھا۔
گویا مخدوم نے اپنی وصیت سے اہلِ ملتان پر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کس
فرزند اُن میں چھوڑے جا رہی ہے۔ لاریب ؎

عظمتوں کا فسانہ تھے یہ لوگ　٭　یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ!

شجرۂ نسب سدّوزئی افاغنہ ملتان

امیر سدّو خان

زعفران خان　بہادر خان　کامران خان　سلطان مودود خان

ایمل خان　اسمٰعیل خان　علی خان　(جد کامران خیل)　اللہ داد خان　شاہ حسین خان

جلال خان　عظمت خان　یوسف خان　عنایت خان　وفادار خان　عابد خان

محبت خان

سید خان　غازی خان　صادق خان　شکر خان　واصل خان　عارف خان

اشرف خان　قاسم خان　نواب حاجی شریف خان　نواب شجاع خان

یاران خان　عبدالرحمٰن خان　نواب عبدالرحیم خان　قاضی حاجی محمد خان　حسین خان

نواب محمد سربلند خان　نواب حافظ احمد خان　احمد خان ×　سعد اللہ

(معین الدولہ فیروز جنگ)　نواب شیر محمد خان

سکندر خان (بانی سکندر آباد)　سنجر خان (بانی سنجر پور)　غضنفر خان (بانی غضنفر گڑھ)

عبدالغفور خان　سعید اللہ خان　عبدالشکور خان　عبدالکریم خان

امیر باز خان　شہباز خان (شہید)　حق نواز خان (شہید)　اعزاز خان (شہید)　شاہنواز خان (شہید)　ذوالفقار خان

ممتاز خان شہید　احمد یار خان

محمد اکبر خان

عنایت اللہ خان

سلطان ظفر

خضر خاں (بقیہ سلسلہ)
سلطان خداداد خاں
(المعروف سلطان خدکہ)
سلطان سرمست خاں
دولت خاں
زمان خاں
سلطان حیات خاں
سلطان عنایت
سلطان قلندر خان
نواب عبدالعزیز خاں
شہید
مقرب خاں
عبداللہ خاں
محمد باقر خاں
احمد شاہ
(امیر افغانستان)
علی مردان خاں
ذوالفقار خاں
انور خاں
المعروف
ابدالی خاں
لقمان خاں
تیمور شاہ
محمود شاہ
شجاع الملک
زمان شاہ
محمد ہمایوں
شہزادہ کامران
سرمست خاں
عظیم یار خاں
محسن یار خاں
جعفر خاں
محمد خاں
محمود خاں
نواب نظام خاں
الہ یار خاں
محمد خاں
اللہ داد خاں
شہید
علی یار خاں
سیف اللہ خاں
اکبر خاں
سلیمان خاں
محمد شریف خاں
محمد خاں
دلیر خاں
لطف اللہ خاں
محمد سعید خاں
محمد انور خاں شہید
نواب دین محمد خاں
میر محمد خاں
شہزادہ علی محمد خاں
وحید امجد خوانین خدکہ ملتان شہر

مظفر خانی دور کے علماء اور مشائخ

نواب مظفر خاں کا دور اگرچہ سیاسی طور پر انتہائی تشویشناک تھا۔ تاہم ان کے زمانے میں اتنے علماء اور مشائخ کھچ کھچا کر اس شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام کا زمانہ پھر لوٹ آیا ہے۔ اس مختصر سی تصنیف میں اتنی گنجائش نہیں کہ تمام علماء اور مشائخ کے حالات درج کیے جا سکیں۔ چند اکابر اور معروف حضرات کا ذکر باختصار پیش کیا جاتا ہے۔ جو احباب تفصیل میں جانا چاہیں وہ سیرت کی اصل کتابوں سے رجوع کریں۔

مولانا خدا بخش خیرپوری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا خدا بخش حضرت حافظ محمد جمال اللہ رح کے خلیفۂ اعظم اور اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فقیہہ تھے۔ حضرت شیخ الاسلام رح کی سرکار سے چشتیوں کو سہروردی سلوک میں بیعت کرنے کی اجازت ملی تو حضرت حافظ صاحبؒ مولانا کو لے کر خانقاہ شیخ الاسلامؒ پر حاضر ہوئے، اور حضرت کے مزارِ پُر انوار پر ہاتھ رکھوا کر مولانا سے بیعت لی اور فرمایا "غوث کو غوث سے ملا دیا"۔

مولانا نے چالیس سال کابل دہلی دروازہ کے اندر ایک مسجد میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر علم حدیث پڑھایا۔ شیخ طریقت کے وصال کے بعد خیرپور (ریاست بہاولپور) میں قیام اختیار کیا اور طبعی عمر ختم کرنے کے بعد وہیں دفن ہوئے۔ آپ کی تصنیفات عالیہ میں سے "توفیقیہ شریف" وحدت الوجود میں خاص مقام رکھتی ہے۔

حضرت مولانا خواجہ محمد موسیٰ صدیقی رح

عمدۃ الاولیاء قدوۃ العلماء مولانا خواجہ محمد موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ حافظ محمد حیات کے صاحبزادے

...اعراقیؒ کی اولاد سے تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے والد ماجد سے پائی اور ...محمد جمال اللہ علیہ الرحمۃ کے مرید ہوئے۔ کافی عرصہ ریاضت کرنے کے بعد مرشد ...خلافت حاصل کیا۔ اور علوم متداولہ کی تکمیل کے لئے اکابر علماء کے آگے زانوئے ...کئے۔ اور جب اساتذہ کی خصوصی توجہ اور مرشد کامل کے فیضان سے ظاہری، ...باطنی علوم میں درجۂ کمال حاصل کر لیا تو اپنے آباء کرام کی مسند پر رونق افروز ہو ...درس دینا شروع کیا۔ اس دور کی تدریس اور آج کی تعلیم میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے ...کا طالب علم اپنے معلم سے صرف ایک یا دو مضامین کی تعلیم پاتا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے ...بعد استاد اور طالب علم کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن اُس دور کا طالب علم ہمہ وقتی تھا۔ ...استاد سے جونک بن کر چمٹ جاتا۔ اور جس قدر علوم میں وہ ماہر ہوتا وہ سب حاصل کر ...کے ہی چھوڑتا تھا۔ ساتھ ساتھ اُستاد اپنے شاگرد کی روحانی تربیت بھی کرتا تھا۔ آٹھ ...دس سالوں کے بعد طالب علم اُستاد کا مکمل نمونہ بن کر منظرِ عام پر آتا تھا۔ یہی کیفیت حضرت ...مولانا کے درس کی تھی۔ صاحب تذکرۃ الملتان لکھتے ہیں:-

"اعلم العلماء، افضل الفضلاء، استاذی الشریف مسمی کلیم اللہ اعنی مولوی
محمد موسیٰ در علوم ظاہری نظیرے نداشت و در باطنی بے عدیل از تدریس
صوری خلائق کثیر بتحصیل انواع علوم بدرجہ فضیلت رسید واز توجہ معنوی
ایشاں اُلوف اُناس بفیوض و لغمار سیدند۔" (ص ۱۴۲، غیر مطبوعہ)

یعنی ایک بڑی مخلوق نے آپ سے علومِ ظاہری کی تحصیل کی اور ہزاروں آپ کے فیضان سے فقر و ولایت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔ آپ کے درس میں نواب کے شہزادوں سے لے کر شہر کے غریب طلباء تک سب تعلیم پاتے تھے۔ اور سب پر برابر توجہ ہوتی تھی۔ اور امیر و غریب سے کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ نواب مظفر خاں کو آپ سے

بڑی عقیدت تھی۔ روزانہ ملازمِ خاص کے ذریعے پانچ روپے بطورِ نذر بھجواتے تھے اسی پر مولانا کے گھرانے کا گزارہ ہوتا تھا۔ یہ معمول نواب کی زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا۔

نواب مظفر خاں کے زمانے میں اس صوبہ کے قاضی القضاۃ حضرت علامہ قاضی محمد نادر تھے، اور وہ حضرت مولانا کے عاشقِ زار اور انتہائی مخلص مرید تھے۔ انہوں نے مُرشدِ طریقت کے خاندانی حالات کو مثنوی کے انداز میں نظم کیا ہے۔ چند شعر بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں لکھتے ہیں کہ ؎

من چہ گویم وصف آں بندہ نواز　　جامع راز و نیاز و سوز و ساز
درمیانِ خلق و حق او برزخے است　　صفحۂ تحریر را چوں دو رخے است
از یکے سوسوئے ربّ العٰلمین　　وز دگر سُو رو بخلق است آمین

یا الٰہی ظلّ آں عالی مقام
بر سرِ ما دار از فضلت مدام

قاضی محمد نادر علیہ الرحمۃ نے یہ مثنوی ۱۲۵۶ھ میں ختم کی ہے اُس وقت حضرت مولانا کی شہرت کا آفتاب عین نصف النہار پر پوری تابانی سے جگمگا رہا تھا۔ ۱۱ ماہ رجب ۱۲۶۱ھ کو طریقت و معرفت کا یہ بدرِ مُنیر سحابِ فنا کی اوٹ میں آگیا۔ جس حجرے میں آپ نے سالہا سال قرآن وحدیث کا درس دیا تھا اُسی میں آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

محبوبِ الٰہی ثانی حضرت خواجہ خدا بخش ملتانیؒ

آپ مولانا محمد موسیٰ علیہ الرحمۃ کے فرزندِ ارجمند اور حضرت خیرپوریؒ کے مرید تھے۔ آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ نذر و نیاز سے آپ کو گھن آنے لگی تھی۔ ایک دفعہ اللہ داد خاں ڈسٹرکٹ جج نے عرض کی کہ عیدگاہ کے قریب میرے دو چاہات ہیں۔ حضور انہیں لنگر خانے

کے لئے منظور فرمالیں۔ آپ نے فرمایا "بابا، فقیر کو خدا کافی ہے"۔ دوبارہ گزارش کی۔ حضور کے لئے کون کم بخت کہتا ہے، درویش جو آستانۂ قدس پر پڑے ہیں، اُن کے لئے ہی لے لیں۔ آپ نے کچھ گرم ہو کر فرمایا۔ "ہم سب کا روزی رساں ایک ہے، اس کے غیروں سے منظور نہیں"۔

۲۵ر جمادی الاوّل ۱۳۱۱ھ بروز سہ شنبہ داعئ اجل کو لبیک کہتے ہوئے عالمِ قدس کو تشریف لے گئے۔

مولانا محمد نظام بخشؒ آپ مولانا خدا بخشؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ اور نامور والد کی طرح فقر و ولایت میں یکتائے روزگار تھے۔ قرآن و حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے۔ مؤلف انیس المساکین لکھتے ہیں کہ :-

"حضرت ولی نعمی ذات، ملکی صفات، قدسی درجات، مظہر الجمال والکمال مولانا ملجانا حضرت مولانا نظام بخش۔ کہ ثمر بوستانِ خلافت جمال اللہ و محبوب اللہ است و ما متعطشان بادۂ توحید را صلائے دعموا واشربوا انتم جنودی در دادہ و ساغر بساغر سرمستان رندان بے خود را از مدام پُر کردہ مدام بخشید، الٰہی ہمیشہ ایں بوستان را از بادِ مخالف دوراں محفوظ داری و ما جرعہ نوشاں ایں مے خانہ را و میوہ چیناں ایں گلزار را از تازگی و سرسبزی ایں فردوس خوش نصیب داری۔ آمین ثم آمین!"

۸ر ذی الحج ۱۳۲۶ھ بروز جمعرات آپ کے طائرِ روح نے جسدِ عنصری سے پرواز کیا اور گلستانِ موسوی کا یہ بلبلِ ہزار داستان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ تاریخ وفات یہ ہے ؎

زتر حیلش شدہ ملتان بے نُور　　　بسال وصلش ہاتف گفت "مغفور"
　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۳۲۶

مولانا خواجہ محمد حسین بخشؒ آپ مولانا محمد نظام بخش کے فرزند اور ملتان کے متبحر عالم تھے۔ آپ کا تمام وقت اوراد و اذکار اور تسبیح و تہلیل

میں گزرتا تھا۔ آپ کے صاحبزادے مولانا حافظ دلدار بخش کا بیان ہے کہ آپ روزانہ دس پارے قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور ایک ہزار رکعت نوافل ادا کرتے تھے۔ اخیر تک آپ کا یہی معمول رہا۔ مستقل طور پر مسجد میں رہتے تھے۔ رات قیام میں اور دن روزہ میں بسر ہوتا تھا۔ ۵ محرم ۱۳۷۹ھ (۱۲ جولائی ۱۹۵۹ء) کو آپ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ ۱۸ رمضان ۱۳۸۴ھ کو حافظ بشیر احمدؒ کا انتقال ہوا۔ اور ۱۹ شعبان ۱۳۹۰ھ کو مولانا حافظ شاہ بخش علیہ الرحمۃ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب تیسرے فرزند مولانا حافظ دلدار بخش زندہ و موجود ہیں۔ اور یہی خانقاہ موسوی صدیقی کے متولی اور سجادہ نشین ہیں۔

فخر الاولیاء زبدۃ الاصفیاء حضرت خواجہ غلام حسن منشی علیہ الرحمۃ

حضرت منشی غلام حسن علیہ الرحمۃ قوم کے ملہاس راجپوت تھے۔ آپ کا خاندان راجپوتانہ سے ہجرت کر کے یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ آپ منشی جان محمد کے فرزند تھے۔ اس لئے آپ بھی منشی کہلائے۔ کم سنی میں آپ کی توجہ تعلیم کی طرف بہت کم تھی۔ والد ہمیشہ زجر و توبیخ فرماتے اور آپ رونے پر زور دیتے۔ ایک دن اسی حالت میں حضرت خواجہ حافظ محمد جمال اللہ کا گزر ہوا۔ منشی صاحب اپنے والد بزرگوار کے پاس زلیخا پڑھ رہے تھے، اور سبق یاد نہ ہونے کے سبب زیرِ عتاب تھے۔ حضرت حافظ صاحب نے بچے کو دیکھا، تو اس کی پیشانی سے سعادت اور خوش بختی کے آثار نظر آئے۔ منشی جان محمد سے فرمایا۔

"ارے بھائی! یہ بچہ تو آپ کے خاندان کا گُل سرسبد ہے۔ اس پر سختی نہ کرو!" بچے کی طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا۔ "صاحبزادے! مجھے بھی اپنا سبق سناؤ"۔ گلا اچھا تھا اور بھر معصومیت، نونہال بلند اقبال نے اپنے سبق کا یہ شعر پڑھا ؎

دراں خلوت کہ ہستی بے نشاں بود
بکنج نیستی عالم نہاں بود

حضرت حافظ صاحب پر اس شعر کے سننے سے وجد طاری ہو گیا۔ دیر تک کیف و مستی کا یہی عالم رہا۔ جب ذرا سکون ہوا تو فرمایا۔ "مجھے پیاس لگی ہے پانی لادو"۔ کمسن نور العین بھاگ کر اندر گیا اور پانی کا گلاس بھر کر لے آیا۔ اور حضرت کا بچا ہوا پانی خود پی لیا۔ اس تبرّک نے برخوردار کی کایا پلٹ دی۔ حضرت حافظ صاحب انہیں اپنے ہمراہ لے گئے۔ اور تھوڑے سے عرصہ میں ہی علوم متداولہ کی تمام کتابیں ازبر کرلیں سن رشد کو پہنچ کر منشی صاحب نے حضرت حافظ صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ ارادت اس قدر بڑھی کہ آٹھوں پہر مرشد کامل کے حضور میں رہنے لگے اور شیخ نے بھی آپ پر وہ کرم بخشی فرمائی کہ فیضانِ معرفت سے بہرہ ور فرما کر اپنا خلیفۂ اعظم بنایا۔

میاں احمد یار صاحب مرحوم سجادہ نشین حضرت حافظ جمال اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ خاکسار مصنف سے فرمایا کہ منشی صاحب بے حد حسین نوجوان تھے۔ ایک موقع پر جبکہ خادم اُنہیں وضو کرا رہا تھا۔ آپ کے حُسنِ خداداد کو دیکھ کر بولا۔ "یا حضرت! لوگ جو کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام بہت خوبصورت تھے۔ کیا وہ آپ سے بھی زیادہ حسین ہوں گے؟"

آپ یہ سُن کر بھڑک اُٹھے اور وجد طاری ہو گیا۔ جب ذرا سکون ہوا تو فرمایا "میاں اگر خوبصورتی دیکھنی ہے تو جمال اللہ کے حُسن کو دیکھ ؎

چشم خدا بیں باز کشا　　نقش جمال اللہ ببیں
تا چوں حسن در صورتِ انساں　　ذاتِ مقدس را نگری

حضرت منشی صاحب علیہ الرحمۃ وحدت وجود کے بزرگ تھے۔ فارسی میں حسن اور سرائیکی میں

گامن تخلص فرماتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

یا صبیح الوجہ من نور الجمال　　　　قد رأینا فیک آیات الکمال
گر تو سر خواہی نمی دارم دریغ　　　　لیس للعشاق الا الامتثال
در خم ابرو رخ زیبائے یار　　　　قد رأیت البدر من تحت الھلال
از فراقت جاں بلب آمد مرا　　　　یا کریم الخلق جدنی بالوصال
با حسن از کوچۂ آں دلنواز
نعم ما بلغت یا ریح الشمال

سرائیکی

ہُݨ میں کجھ ہو گیا ہور، نی میڈوں کون پچھاݨے
گامن مظہر ذات جمالی　　　　ہر یا قلندر مست موالی
ہنساں دی ہُݨ ڈیکھ کے چالی　　　　ہتھوں ٹُٹ گئی ڈوری
ہُݨ کون پچھاݨے
میں ہو گیا کجھ ہور

حضرت منشی صاحب علیہ الرحمۃ سے نواب مظفر خاں اور نواب محمد بہاول خاں کو بڑی عقیدت تھی۔ دیوان مول راج آپ کی شاگردی پر ناز کرتا تھا۔ آپ انگریزوں کے حملے میں ۲۹ محرم ۱۲۶۵ھ کو شہید ہوئے۔

بتایا جاتا ہے کہ معز الدین نام ایک درویش نے انگریز جنرل وش سے کہا تھا کہ اس شہر کا باطنی حاکم منشی غلام حسن ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے تم ملتان کو فتح نہیں کر سکتے۔ اس پر ایک انگریز افسر نے آپ کو بحالت نماز گولی مار کر شہید کر دیا۔
انا للہ و انا الیہ راجعون ط

عمدۃ المحققین، قدوۃ الواصلین حضرت مولانا محمد عبید اللہ الملتانی قدس سرہٗ

حضرت مولانا محمد عبید اللہ علیہ الرحمۃ کا خاندان جیلانی مخادیم کے ہمراہ عراق سے آیا تھا۔ آپ کے جد امجد مولانا عبد القادرؒ حضرت مخدوم سید محمد غوث اوّل کے مرید ——— اور ان کے بچوں کے اتالیق تھے۔ چونکہ حضرت مخدوم قادری تخلص فرماتے تھے۔ اس لئے مولانا بھی ان کی نسبت سے فقیر قادری کہلاتے تھے۔ آپ کا مزار چوک شاہ عباس کے قریب بیان کیا جاتا ہے، اور آپ کی اولادِ کرام فقیر قادری سے موسوم ہے۔

مولانا کا خاندان شروع سے علم و فضل کا گہوارہ چلا آیا ہے۔ آپ کے اجداد میں ایک بزرگ مولانا داؤد نے تصوّف میں ایک رسالہ "شیر و شکر" تصنیف فرمایا تھا۔ جو آسان فارسی میں ہے اور مطبوعہ ہے۔ مولانا محمد عبید اللہ کے والد مولانا حافظ قدرت اللہ علیہ الرحمۃ حضرت حافظ محمد جمال اللہؒ کے مرید اور خلیفۂ مجاز تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم والد بزرگوار سے حاصل کی۔ علم حدیث کے لئے زانوئے تلمذ مولانا گل محمد احمد پوری کے آگے تہ کیا۔ بقیہ تعلیم خیر پور جاکر مولانا خدا بخشؒ سے حاصل کی اور ان کے بیعت ہوئے۔ آپ نے بارہ سال کامل اپنے مرشد اور استاد کی خدمت میں اس طرح گزارے کہ خیر پور تو الگ رہا، اس کے بازار میں بھی چل کر نہ گئے۔ حالانکہ سودا سلف خریدنے کے لئے آدمی کا بازار جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ سالہا سال کی ریاضت کے بعد مولانا کو مرشدِ طریقت سے خرقہ عنایت ہوا۔

آپ کا مدرسہ حضرت مولانا نہایت متدین، متشرع اور متقی عالم تھے۔ آپ کا مدرسہ آپ کے علم و فضل کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھا۔ بالخصوص علم میراث کے لئے تو سند تھا۔ منتہی طلبہ درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد صرف علم میراث کی سند کے لئے یہاں آکر زانوئے تلمذ تہ کرتے، اور سند حاصل کرتے تھے۔

مقبرہ حضرت مولانا محمد عبیداللہ ملتانی
محلہ قدیر آباد۔ ملتان

تصنیفات علوم ظاہری میں حضرت مولانا ایک بحرِ موّاج تھے۔ علم میراث پر کئی رسائل تصنیف فرمائے اور درسی کتب پر گراں قدر حواشی لکھے۔ آپ کی تصنیفات کی فہرست سو تک بیان کی جاتی ہے۔ ان میں فتح العبید، رفیقیہ، سیر السماء، اصول حافظیہ وفیات الاعیان اور سرِّ دلبراں خاص طور پر مشہور ہیں۔ حضرت مولانا فارسی، عربی اور سرائیکی کے شاعر بھی تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں:-

در حقِ شب برات

جاء لیل البرات فی الانوار		حصّلوا فیہ سیرۃ الابرار
ربّ اتمم امورنا بالخیر		وقنا ربّنا عذاب النّار

در شانِ چہار شنبہ

چہار شنبہ آخرِ ماہِ صفر		ہست روزِ صحتِ خیر البشر
خیر شادی کن دریں روزِ شریف		تا بیابی در جہاں فتح و ظفر

حضرت مولانا نے ۸۶ برس کی عمر میں ۶ جمادی الاوّل ۱۳۰۵ھ کو انتقال فرمایا، اور آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے صاحبزادے مولانا عبد الرحمٰن نے نمازِ جنازہ پڑھائی
"اِنَّ المُتَّقِینَ فِی جَنّٰتٍ" سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔
۱۳۰۵

مولانا عبد الرحمٰن علیہ الرحمۃ مولانا عبد الرحمٰن آپ کے بڑے صاحبزادے، بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ آپ محلہ صحافاں سے محلہ قدیر آباد میں منتقل ہو آئے اور یہاں والد ماجد کے مقبرے کے قریب اراضی خرید کر مدرسہ عبیدیہ رحمانیہ کی بنیاد رکھی اور ایک مسجد کلاں تعمیر کرائی۔ کنواں احداث کرایا اور زائرین و طلبہ کے لئے رہائشی حجرے بنوائے۔ آپ کے مدرسہ کا تعلیمی معیار اتنا بلند تھا کہ آپ تمام طلبہ سے عربی میں گفتگو فرماتے تھے۔ ۹۱ برس کی عمر میں آپ اپنے صاحبزادے

حضرت حافظ عبد العلیم صاحب کو اپنا جانشین مقرر کر کے بارادہ حج ارض پاک کو تشریف لے گئے اور بعد فراغت حج ۲۷، محرم ۱۳۳۰ھ کو فوت ہو کر جدہ میں دفن ہوئے۔
آپ کے صاحبزادے مولانا حافظ عبد الحکیمؒ نے عین جوانی میں زہر خورانی سے شہادت پائی۔ مولانا محمد قمر الدین نے آپ کی وفات پر بے ساختہ فرمایا ؎

عاش سعیداً امات شہیداً
یا اسفا ھو مات وحیداً

مولانا مفتی حافظ عبد العلیم رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبد الرحمٰن کے دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ مفتی عبد العلیم تھے۔ آپ نے مدرسہ کو ترقی دی اور زندگی بھر آبا و کرام کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ۱۰، ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ کو ۸۸ سال کی عمر میں بعارضہ پیچش و بخار فوت ہوئے۔

اولاد امجاد مولانا مفتی عبد العلیم صاحب کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے بیٹے حافظ عبد الکریم کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور ان کے فرزندوں مولانا عبد الشکور اور مولانا عبد الغفور نے مدرسہ کی خاندانی روایات کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ محمد عبد القدوس زندہ موجود ہیں۔ انہیں واہب العطایا نے چھ فرزند عطا کئے ہیں جو سب کے سب عالم اور حافظِ قرآن ہیں اور درس تدریس میں مصروف ہیں۔

مولانا حافظ عبد الحق علیہ الرحمۃ

آپ مولانا محمد عبید اللہ علیہ الرحمۃ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ نے حضرت والد ماجد کا مقبرہ تعمیر کرایا اور درس کو جاری رکھا۔ آپ کے ایک ہی صاحبزادے تھے۔ میاں عبد الحی۔ جو محکمہ نقول میں انگریزی نوٹس تھے۔ نہایت منکسر المزاج اور دیندار انسان تھے۔ تین فرزند حافظ عبد القیوم ڈاکٹر عبد الستار حامد اور میاں عبد الغنی شیدا یادگار چھوڑ کر راہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

جیلانی مخادیم

نواب مظفر خاں کے دور میں اگرچہ چشتی اور اُویسی مشائخ ملتان میں کثرت سے آ گئے تھے اور علم و عمل میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ لیکن جیلانی مخادیم کی روحانیت ان سب پر غالب رہی۔ مخدوم سید دین محمد شاہ کے بڑے صاحبزادے سید کمال الدین ان کی زندگی میں فوت ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کی وفات پر ۱۷۷۹ء میں ان کے دوسرے فرزند ارجمند سیّد جمال الدین، شیخ عبدالقادر چہارم کے لقب سے مسند نشین ہوئے۔ آپ تعاونوا علی البرّ والتقویٰ کی زندہ تصویر تھے، فلاحی امور میں ہر شخص سے خواہ وہ کسی مسلک کا کیوں نہ ہو، مکمل تعاون فرماتے تھے، ۱۸۱۳ء میں آپ اللہ کو پیارے ہو گئے اور آپ کے صاحبزادے سیّد صدرالدین شاہ شیخ محمد غوث ثالث کے لقب سے مسندِ قادریہ کی زینت بنے۔ شاہ شجاع آپ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی ایک موقعہ پر آپ کو بیش قیمت مشکی گھوڑا اور اڑھائی سو روپے نقد نذر کئے تھے۔ آپ کے سامنے ہی دیوان مولراج کا نیّر اقبال غروب ہوا۔ اور انگریزوں نے اس ملک کا اقتدار سنبھالا۔ آپ نے ۱۸۵۳ء میں وفات پائی۔

حافظ اللہ بخش چشتی علیہ الرحمۃ

آپ مولانا عبدالمجید خیر پوریؒ کے مرید تھے۔ ان کے ارشاد پر ہی مولانا خدا بخش علیہ الرحمۃ سے خرقہ حاصل کیا زندگی بھر درس تدریس میں مصروف رہے، یکم شوال ۱۳۳۴ھ کو فوت ہو کر قبرستان بائی پاکدامنؒ کے قریب دفن ہوئے۔

مولانا نظام الدین چشتیؒ

آپ جھنگ کے باشندے تھے۔ اور سومرہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خواجہ محمد خدا یار خان پوری کے مرید اور مولانا خدا بخش خیر پوریؒ کے شاگرد عزیز تھے۔ آپ نے قریہ قریہ پہنچ کر مجالس وعظ منعقد کیں اور ہزاروں بندگانِ خدا کو صراط المستقیم پر گامزن کیا۔ ۲۸ شعبان ۱۳۰۹ھ

کو عالمِ فانی سے جہانِ باقی کو کوچ کیا، اور بستی چمرنگ ملتان میں دفن ہوئے۔

پیر فتح شاہ قریشی رح

آپ بھی مظفر خانی دور کے شیریں بیان عالم تھے، سویرے اپنی مسجد میں درس دیتے اور نمازِ جمعہ کے بعد وعظ کرتے تھے۔ انہی لیل و نہار میں ۲۵ محرم ۱۳۰۵ھ کو وفات پائی۔ اور مسجد قریشیاں (کوٹلہ تغلق) کے چبوترے پر دفن ہوئے۔

مولانا سراج الدین چشتی رح

آپ مولانا خدا بخش خیرپوری رح کے شاگردِ رشید، اور راسخ الاعتقاد مرید تھے۔ دہلی دروازہ کے باہر ایک مسجد میں زندگی بھر درس دیتے رہے، اور جب سفرِ آخرت پیش آیا تو متعلقین نے اسی مسجد میں دفن کر دیا، جو اب آپ کے نام سے ہی مشہور ہے۔

مولانا غلام محمد سلیمانی رح

آپ خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، اور اپنے دور کے متبحر عالم تھے۔ عمر بھر درس تدریس میں مصروف رہے۔ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۳۱۱ھ کو فوت ہو کر مسجد کے جنوبی حجرے میں دفن ہوئے، یہ مسجد دہلی دروازہ کے اندر واقع ہے اور آپ کے نام سے ہی موسوم چلی آتی ہے۔

پیر جنید علیہ الرحمۃ

دربار پیر صاحب کے بالمقابل ایک محلّہ میں رہتے تھے، مسجد میں امامت کرتے اور قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے، بعد وفات مسجد کی جانب جنوب دفن ہوئے۔ پیر صاحب کے بعد مولانا درویش محمد چشتی رح نے اسی مسجد میں درس دینا شروع کیا۔ آپ خواجہ عاقل محمدؒ علیہ الرحمۃ کے مرید تھے اور متوکل انسان تھے۔ جو کچھ آتا، خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ دوسرے دن کے لئے کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بعد مولانا صالح محمدؒ اور مولانا محمد حسین رح نے اسی مسجد میں درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ تینوں حضرات پیر جنید علیہ الرحمۃ کی پائینتی میں محوِ خواب ہیں، خاکسار

مصنف کے زمانے میں مولانا حکیم صالح محمد صاحب نے اس خانقاہ اور مسجد کا انتظام سنبھال رکھا تھا۔ پاس ہی ایک طولانی کمرہ تھا جو فرید منزل سے موسوم تھا۔ بالعموم فریدی احباب جو بھی ملتان آتے تھے، فرید منزل کے دروازے اُن کے لئے ہر وقت کھُلے رہتے تھے۔ مولانا محمد یار صاحب مشہور صوفی کلام واعظ کا تو مستقل ٹھکانا ہی یہی تھا۔ حکیم صاحب جب تک زندہ رہے فرید منزل اور پیر جُنید کے آستان کی رونق بہار پر رہی۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے، اور فرید منزل کے پاس ہی اپنے بزرگوں کے دوش بدوش محو خواب ہیں۔

مسکین رکن الدینؒ آپ گوجرانوالا سے ملتان تشریف لائے اور مولانا خیر پوریؒ سے فیضان حاصل کرنے کے بعد ۲۱ ر رمضان ۱۳۲۱ھ کو فوت ہوئے۔ آپ کا مزار محلہ خلاصی لائن میں گورستان کے متصل ایک چبوترے پر واقع ہے

پیر جنید شاہؒ آپ بھی مظفر خانی دور کے درویش تھے۔ بے حد مستغنی المزاج تھے امراء سے عمر بھر مجتنب رہے۔ درویشوں اور مجذوبوں کی خدمت میں فرحت محسوس کرتے تھے۔ امان پودہ میں فوت ہو کر ایک مرتفع چبوترہ پر دفن ہوئے اور محلہ آپ سے موسوم ہُوا۔

مائی موراںؒ موراں ملتان کی ایک مجذوبہ تھی۔ مشہور ہے کہ شہر میں بے ستر پھرا کرتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا خدا بخش خیر پوریؒ حسین آگاہی سے گزر رہے تھے۔ موراں نے جو دیکھا، بھاگ کر تنُور میں چھپ گئی اور برابر کہے جا رہی تھی۔ "مرد آیا، مرد آیا، مردوں سے حجاب ضروری ہے۔"

اسی قسم کا واقعہ للہ عارفہ کشمیری کے بارے میں بھی مشہور ہے۔ سچ ہے۔ تاریخ اپنے واقعات کو دوہراتی رہتی ہے۔

مولانا سیّد عظیم الدین مدنیؒ

آپ مدینہ منوّرہ میں روضۂ منوّرہ پر خاکروبی اور چراغ افروزی کی خدمت پر مامور تھے۔ نواب مظفر خاں ۱۲۰۰ھ میں جب مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو مولانا کے زہد و ورع اور تبحّرِ علمی سے متاثر ہو کر ملتان چلنے کی استدعا کی۔ چنانچہ آپ نواب صاحب کے ہمراہ اس شہر میں تشریف لے آئے۔ نواب صاحب نے آپ کے شایانِ شان رہائش کا انتظام کر دیا اور کچھ رقبہ گزر اوقات کے لئے بھی نذر کیا۔ چنانچہ آپ نے بقیہ زندگی یہیں قال اللہ و قال الرسول میں بسر کی۔ اور ۱۳ر جمادی الثانی بروز شنبہ فوت ہو کر اپنے حجرے میں دفن ہوئے۔ آپ کے دائیں پہلو میں آپ کے بھائی سیّد بھادن شاہ مدفون ہیں۔ آپ نے ۱۸۱۶ء میں نواب مظفر خاں کی حمایت میں لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔

سیرانی مشائخ

انہی ایام میں جبکہ چشتیوں نے ریاست ملتان کے طول و عرض میں رشد و ہدایت کے چراغ روشن کر رکھے تھے، ایک اور روحانی سلسلہ بھی برابر ان کے پہلو میں مصروفِ کار تھا اور یہ حضرت خواجہ محکم الدینؒ صاحب السیر کے خلفاء اور ارادتمند تھے۔ چند حضرات کا مختصر سا تعارف ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا محمد مراد اُویسیؒ

آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم، خواجہ محکم الدین سیرانی کے باکمال مرید اور مولانا شاہ علی مردانؒ کے پیرِ طریقت تھے۔ آپ کا مزار پُرانی کوتوالی لوہاری دروازہ کے قریب واقع ہے۔

مولانا شاہ علی مردانؒ

آپ مولانا محمد مرادؒ کے مرید اور حضرت صاحب السیرؒ کے خلیفہ تھے۔ حرم دروازہ کے باہر اپنی مسجد میں درس دیتے تھے۔ دُور دُور سے طالبانِ علم و ادب آپ کی خدمت میں پہنچتے اور قرآن و حدیث کا درس لیتے تھے۔ ریاضت اور مجاہدے میں

آپ کا جواب نہیں تھا۔ اکثر شب بیدار رہتے اور پچھلی رات کو محلہ کی مساجد میں جا کر پانی کے مٹکے بھرتے اور دن کو اپنے مدرسہ میں مصروف رہتے۔ کسی سے سروکار نہ تھا۔ ہر کس و ناکس سے بے نیاز اور اپنی فقیری و غریبی پر قانع تھے۔ نواب مظفر خاں اور نواب محمد بہاول خاں نے آپ سے ملنے کی کوشش کی۔ مگر اس بوریہ نشین گدا نے ان حکمرانوں کو شرفِ باریابی نہ بخشا اور فرمایا۔ "فقیر کو سکون سے خلقِ خدا کی خدمت کرنے دو"۔ بایں ہمہ مجاذیب اور فقراء سے آپ کو عشق تھا۔ انہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے، اپنے ہاں ٹھہراتے۔ خود طہارت کراتے اور کھانا کھلاتے تھے۔ مولانا نے منجملہ دیگر کتب کے ایک کتاب لطائف سیریہ بھی تصنیف کی تھی۔ جو کئی بار چھپ کر شائع ہو چکی ہے مولانا نے اس کی ترتیب و تدوین میں خاصی محنت کی ہے اور کتاب کافی افادیت کی حامل ہے۔ مگر جو روایات مولانا نے قاضی جیون داجلی سے سُن کر درج کی ہیں اُن سے کتاب کی ثقاہت کو کافی دھچکا لگا ہے۔ خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:۔

"میاں علی مردان اکثر روایات از قاضی جیون داجلی شنیدہ درج کردہ است
و قاضی جیون بعض حکایات از خود وضع کردہ است[1]"

مولانا کا مقبرہ حرم گیٹ سے باہر واقع ہے۔ حافظ شاہ بخش اور مولانا محمد مراد آپ کے متوفی ہیں۔

قاضی مٹھوؒ | آپ حضرت صاحب السیرؒ کے مرید اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ زندگی بھر خلقِ خدا کی اصلاح میں کوشاں رہے اور ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۲۴ھ کو انتقال فرما کر حضرت حافظ محمد جمال اللہ کے جوار میں دفن ہوئے۔

حافظ نور احمدؒ | آپ بھی حضرت صاحب السیرؒ کے مرید تھے۔ چوکی چہلیک کے قریب مسجد وزیر خاں میں مصروفِ عبادت رہتے تھے۔ ۶ محرم ۱۲۶۶ھ کو آپ کا انتقال

---

[1] اشارات فریدی، جلد چہارم صہ ۱۱۳

ہُوا اور مسجد مذکور سے متصل اپنے حجرے میں دفن ہوئے۔ حاجی پٹھان نامی ایک اور معمر بزرگ بھی اسی مسجد میں رہتے تھے۔ عمر بھر مسجد کی خدمت میں مصروف رہے اور اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ ان کا مزار بھی مسجد کے پہلو میں واقع ہے۔

بابا داد رح یہ بزرگوار نسباً سیّد اور کامل درویش تھے۔ اکثر فرمایا کرتے "بابا! میں تو رسُول اللہ کے دروازے کا چوکیدار ہوں"۔ اکثر سر برہنہ رہتے اور کندھے پر خراد کا سامان اُٹھائے پھرتے۔ ایک مرتبہ چند لوگ آپ کے پاس پتھری کے مریض کو لائے۔ فرمایا، کل لے آنا۔ دُوسرے دن حاضر ہوئے تو فرمایا "پیاز کی پتیاں کھایا کرے"۔ بیمار نے حسب ارشاد پیاز کے پتے کھانا شروع کیے۔ تین دن کے بعد اُسے کلّی طور پر آرام آگیا۔ اکثر بخار کے مریض آپ کے پاس آتے۔ فرماتے "جاؤ بابا! تنور کی روٹی دُودھ کے ساتھ کھالو"۔ چنانچہ ایسا کرنے سے بخار دُور ہو جاتا۔ طبعی عمر ختم کرنے کے بعد فوت ہو کر قبرستان پیر عمرؒ میں دفن ہوئے۔

عمدۃ الاولیاء حضرت شاہ دلیر علیہ الرحمۃ

آپ مظفر خانی دَور کے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ۱۲۲۸ھ میں وفات پائی۔ آپ کے کسی ارادت مند نے درج ذیل قطعہ سے تاریخ وفات نکالی ہے ؎

بمیدان باقی چو رفتہ دلیر　　　گسستہ زچار و گزشتہ ز ہفت

خرد گشت ملہم زتاریخ وے　　　دلیرِ عہد وہ "دلیرانہ رفت"

جو لوگ آپ کو دیوان ساون مل کا معاصر ظاہر کرتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اس کا ۱۲۳۷ھ میں یعنی حضرت کی وفات کے ۹ برس بعد ملتان کی صوبیداری پر تقرّر ہُوا تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ کے حسین و جمیل، مگر مختصر مقبرہ کو جن معماروں نے تعمیر کیا، وہ

خالصہ آرٹ سے متأثر تھے۔ قلعے میں دیوان ساون مل اور مولراج نے جو عمارتیں بنوائی تھیں، وہ لاہور کے خالصہ آرٹ کا نمونہ تھیں۔ اس کا اثر ملتان کے معماروں پر پڑنا لازمی تھا۔ چونکہ شہر میں سکھوں اور ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ اس لئے معمار خالصہ آرٹ کو اپنانے پر مجبور تھے۔ چنانچہ شاہ دلیر کا مقبرہ بھی ان کے کسی متولّی نے بنوایا تو محرابیں خالصہ آرٹ کے مطابق بنائی گئیں۔ اس سے یاروں نے یہ قصّہ تراش لیا کہ دیوان ساون مل حضرت کا معتقد تھا، بلکہ یہ مقبرہ بھی اسی نے تعمیر کرایا تھا۔ چنانچہ سرزمین ملتان کے پہلے ایڈیشن میں راقم الحروف کو بھی یہی بتایا گیا تھا، مگر حقیقت کو ہزار چھپایا جائے لیکن وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ آپ کا یہ مقبرہ دہلی دروازے کے اندر مسجد مولانا خیر پوری کے متصل جنوب کی طرف واقع ہے۔

مخدوم شاہ محمود قریشی سجادہ نشین شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریاؒ

نواب مظفر خان کی شہادت کے بعد جب سکھوں نے خزائن اور دفائن کے لالچ میں قلعے کے مکانات کو کھودنا اور مال و متاع کو لوٹنا شروع کیا تو حضرت مخدومہ بی بی راجیؒ تمام اثاثہ چھوڑ، جان بچا شہر میں منتقل ہو آئیں۔ افراتفری کے اس عالم میں مخدومہ کے پاس سوائے ان کے ماموں زاد بھائی شیخ حسن شاہ کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہی اُن کے دکھ سکھ کے ساتھی، معتمد خاص اور مختار عام تھے۔ اس وقت حضرت شیخ الاسلام کی اولاد کے تین گھرانے تھے۔ مخدوم محمد زمان کی اولاد ختم ہو چکی تھی۔ شیخ شہر اللہ کی اولاد میں حاجی شیخ محمد متوفی کا کمسن لڑکا شیخ بہاء الدین تھا اور وہ احمد پور شرقیہ میں تھا۔ مخدوم ضیاء الدین کے گھرانے میں شیخ غلام صدر الدین قابل نوجوان تھے اور علم و عمل میں آباء کرام کی زندہ تصویر تھے۔ انہیں مخدومہ بی بی مانو

ایک دفعہ سجادگی تملیک بھی کر چکی تھیں۔ مگر وہ ملتان کے ہنگامہ میں اہل وعیال کو قادر پور راں چھوڑ مارواڑ کی جانب چلے گئے تھے۔ اس لئے ملتان میں حضرت شیخ الاسلام کی دوسری اولاد میں سے کوئی ایسا شخص نہیں رہا تھا جسے مخدومہ خانقاہوں کی سجادگی کا اہم منصب تفویض کرتیں۔ اس لئے مخدومہ بی بی راج نے مخدوم شاہ محمود قریشی کو، جو شیخ حسن شاہ کے بڑے صاحبزادے اور مخدومہ کے متبنیٰ تھے، ۱۷ ربیع الثانی سنہ ۱۲۳۸ھ کو سجادگی کا تملیک نامہ تحریر کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مخدومہ کا انتقال ہو گیا۔

مخدوم شاہ محمودؒ نے اس حالت میں خانقاہوں کا انتظام سنبھالا کہ ان کی دیواریں خزائن کی تلاش میں کھودی جا چکی تھیں۔ قلعے کے سر بفلک محلات اب کھنڈرات کی صورت میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔ سڑکیں مٹی کے انباروں تلے دب کر رہ گئی تھیں اور آنے جانے کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ مخدوم صاحب نے پہلے خانقاہوں کی مرمت کرائی، مٹی کے انبار ہٹا کر سڑکیں صاف کرائیں۔ زائرین کی رہائش اور خوراک کا انتظام کیا، اور پھر شہر و اہل شہر کی طرف متوجہ ہوئے۔ بر چھا گردی کے دوران شہر کے مسلمان باشندے گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اب ان کے مکانات پر سکھ اور ہندو قابض تھے۔ مساجد گوداموں کا کام دے رہی تھیں۔ یہاں تک کہ جامع مسجد کوتوال شہر کا دفتر بنی ہوئی تھی۔ اس موقع پر مخدوم شاہ محمود اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ پیر شاہ نے بڑی ہمت کا کام کیا۔ کہ آدمیوں کو بھیج کر مسلمانوں کو پھر بلایا اور مکانات ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر ان کے حوالے کئے۔ انہیں دوبارہ آباد کرایا اور اکثر مساجد بھی واگزار کرائیں۔

سِکھّوں کا دَورِ حکومت

نواب مظفر خاں کی بہادرانہ شہادت اور ملتان شہر کی پامالی کے بعد جب راجکمار کھڑک سنگھ لاہور کو مرخص ہوا تو اس نے مصر دیوان چند کو جو کہ خالصہ افواج کا کمان افسر اور سپہ سالار تھا، عارضی طور پر ملک کے انتظام پر مقرر کیا۔ اور جب مہاراجہ کی طرف سے لالہ سکھ دیال کھتری صوبہ دار مقرر ہو کر آیا تو مصر دیوان چند ملتان کا چارج اس کے حوالے کر کے لاہور چلا گیا۔

سکھدیال ہوشیار آدمی تھا اُس نے اُجڑے شہر کو دوبارہ آباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اُس نے کاشتکاروں کو تقاوی کی امداد دے کر زراعت کو فروغ دیا۔ مہاراجہ کی طرف سے حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ اور قطب الاقطاب حضرت شاہ رکنِ عالم قدس اللہ اسرارہم کی خانقاہوں کی تیل چراغی کے لئے گیارہ سو روپے، حضرت شاہ شمس اور بزیؒ کے مقبرہ کے لئے تین سو روپے اور حضرت مخدوم شاہ محمد یوسف علیہ الرحمۃ کے آستان کے لئے سات سو روپے سالانہ منظور کئے۔ لالہ سکھدیال نے عرصہ ڈیڑھ سال ملتان شہر میں گزارا۔ ستمبر ۱۸۱۹ء میں بجرمِ عدم ادائیگی خراج اسے قید کر دیا گیا۔ اس کی جگہ شام سنگھ پشاوری کا تقرر ہوا۔ اس نے ملتان کا صوبہ بعوض ۶ لاکھ ۵۰ ہزار روپے مستاجری پر لے لیا، اور ندر علی کو توال کی مدد سے چوروں اور رہزنوں کا خوب قلع قمع کیا۔ لیکن ابھی وہ ملک کا پورا بندوبست نہیں کر پایا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ دورہ کرتے ہوئے خود اس شہر میں آپہنچا اور اس نے شام سنگھ کو بھی

عدم ادائیگی خراج کے جرم میں قید کر دیا۔ بدن ہزاری کو صوبہ دار، لالہ ساون مل کو پیشکار اور دیوان رام چند کو سپرنٹنڈنٹ دفاتر مقرر کیا اور تعلقہ جات کو پٹہ پر دے دیا۔ مہاراجہ ملتان میں تین ماہ مقیم رہا[1]۔ اور ہولی و بیساکھی کی تقریبات بڑی دھوم دھام سے منائیں۔ بدن ہزاری اور ساون مل نے کچھ عرصہ تو اتفاق سے کام کیا، مگر بعد میں ان کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہو گئی۔ اور ساون مل نے مظفر گڑھ، مراد آباد، اور شجاع آباد براہِ راست پٹے پر لے لئے۔ ساتھ ہی سرائے سدھو اور تلمبہ کا تعلقہ پہلے خوشحال سنگھ کو، بعد میں کپتان پریم رام سکنہ محلہ آغا پورہ کو جاگیر میں ملا غضنفر گڑھ سید اللہ داد شاہ کو، احمد پور سیالاں سیّد امام شاہ کو اور سردار پور عنایت اللہ خاں سیال (پسر احمد خاں سیال نواب جھنگ) کو جاگیر میں دیئے گئے۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں بدن ہزاری بھی خراج کی رقم ادا نہ کر سکا اور قید ہو کر موقوف ہوا۔ میجر ایڈورڈ نے اس شخص کو قلعہ لکھی مروّت میں دیکھا تھا۔ جہاں یہ میگزین کی داروغگی پر مقرر تھا اور ایک روپیہ روزانہ تنخواہ پاتا تھا۔ میجر مذکور اس کی بابت لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے بدن ہزاری سے زیادہ بے حقیقت اور حقیر شخص کہیں نہیں دیکھا، معلوم ہوتا ہے کہ اسے ملتان کی صوبیداری محض مذاق کے طور پر عطا ہوئی ہوگی

---

[1] مہاراجہ کے زمانہ میں خالصہ ریاست کی سرکاری زبان فارسی رہی۔ سکھ اگرچہ اس صورت حال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر بے بس تھے۔ ایک دفعہ سکھ امراء، فقیر عزیز الدین کے ہاں جمع ہو کر گئے اور کہا کہ ہماری دفتری زبان پنجابی اور رسم الخط گورمکھی ہونا چاہیئے۔ فقیر صاحب نے کہا کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو یہ الفاظ گورمکھی میں کس طرح لکھو گے:۔

"قاضی قطب السلاین سلمہ اللہ تعالیٰ"

ایک سکھ نے لکھا اور دوسرے سے کہا کہ اسے پڑھو۔ اُس نے پڑھا "کاجی کتابے دین سالاتے مُنہ تالا"۔

کیونکہ نہ تو اس میں سیاست ہے نہ دبدبہ، نہ تعلیم اور نہ شجاعت!"
الغرض بدن ہزاری کے بعد مٹھا مل شکار پوری کو صوبیداری ملی۔ اور باغ سنگھ کو قلعدار مقرر کیا گیا۔ زاں بعد ملتان کی عنانِ اقتدار سیوا مل کے سپرد ہوئی۔ چونکہ صوبیداری کو بقا نہیں تھا اور تیسرے چوتھے نیا حاکم آجاتا تھا۔ اس لئے عوام پر سے حکومت کا دبدبہ اُٹھ گیا تھا۔ اور جاگیردار کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہر طرف بدنظمی پھیل گئی اور جنگلات ڈاکوؤں اور رہزنوں کی کمین گاہ بن گئے۔

دیوان ساون مل

اِن حالات میں دیوان ساون مل کو قسمت آزمائی کا شوق پیدا ہوا اس نے پہلے مہاراجہ سے مظفر گڑھ اور شجاع آباد کے تعلقے پٹہ پر لے رکھے تھے۔ اس کا انتظام خوب تھا۔ اور خراج کی ادائیگی میں بھی کبھی تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ یہ ۱۸۲۱ء میں لاہور گیا اور ملتان کی صوبیداری کا پروانہ حاصل کر لیا۔

دیوان ساون مل نے اپنی طرف سے لالہ دیا رام کو نائب مقرر کر کے روانہ کیا۔ دیا رام دیوان کا معتمد علیہ تھا۔ اور ان کے سابقہ تعلقہ جات میں با تعریف کام کرتا رہا تھا۔ اس نے ملتان پہنچ کر صوبیداری کا چارج سنبھالا۔ ملک کا نہایت اچھا انتظام کیا اور دیوان صاحب کی زندگی تک اس عہدے پر مامور رہا۔

ساون مل لاہور سے جھنگ اور جھنگ سے سردار پور پہنچا۔ یہاں اسے اطلاع ملی کہ بکھو لنگڑیال نے ملک کو تباہ کر رکھا ہے۔ اور راوی کے کنارے کسی کا مال محفوظ نہیں۔ دیوان نے اپنی سپاہ اور مقامی رضا کاروں کا ایک مختصر سا لشکر مرتب کر کے دفعتہً اس کے سر جا پہنچا اور اُسے رفیقوں سمیت قتل کر دیا اور اس کا تمام مال ضبط کر لیا گیا۔

یہاں سے دیوان ملتان کو روانہ ہوا۔ بھُو کے قتل سے دوسرے ڈاکوؤں، اور لٹیروں کو بھی کان ہو گئے۔ اکثر نے توبہ کرلی۔ کئی خانہ نشین ہو کر بیٹھ گئے۔ تمام علاقے میں دیوان صاحب کا رُعب بیٹھ گیا۔ اور حکومت کے احکام میں خاصا وزن پیدا ہو گیا۔ مہاراجہ نے میانوالی، جھنگ اور ڈیرہ غازیخاں کے تعلقہ جات بھی دیوان ساون مل کو پٹہ پر دے دیئے۔ اب دیوان کی عملداری روجہان تک پھیل گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ۱۸۳۹ء میں انتقال ہو گیا۔ دربار لاہور پر جموں کے خالصہ سردار چھائے ہوئے تھے۔ ان کی مخالفت کے باوجود دیوان ساون مل ملتان کا بالاستقلال صوبہ دار رہا۔ کنور نونہال سنگھ نے دیوان کو لاہور طلب کیا۔ یہ بلا پس و پیش حاضر ہو گیا۔ اس طرح اس نے نہ صرف اپنی حکومت کو مرکز کے حملوں سے بچالیا۔ بلکہ ملتان کی قلعداری بھی اس کے سپرد ہو گئی۔ اب دیوان نے قلعہ کے استحکام پر توجہ دینا شروع کی۔ جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کے دل میں یہ بات ضرور تھی کہ اگر کبھی حالات اجازت دیں تو وہ خالصہ دربار کا جُوا کندھے سے نکال پھینکے اور خود مختاری کا اعلان کر دے۔

دیوان ساون مل کا قتل

دیوان ساون مل نے ابتدائے خریف ۱۸۲۱ء سے ۲ اسوج ۱۸۴۴ء تک تخمیناً ۲۳ سال صوبہ ملتان پر حکومت کی اور یکم رمضان ۱۲۶۰ھ مطابق ستمبر ۱۸۴۴ء صاحب داد خاں سپاہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ میجر ایڈورڈز نے اس واقعے کو تفصیل سے لکھا ہے۔ جسے ہم بجنسہ یہاں درج کر رہے ہیں۔ لکھتا ہے کہ:-

"دیوان صاحب کا ایک منظورِ نظر سپاہی تھا جسے وہ بہت عزیز رکھتا تھا سالہا سال سے وہ دیوان کا ملازم تھا۔ مگر اس عرصہ میں نہ اُسے تنخواہ ملی تھی، اور نہ گھر جانے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ ایک دفعہ تنگ آکر اس نے دیوان سے رخصت طلب کی، مگر اس نے توجہ

نہ دی۔ اور جب سپاہی نے بہت اصرار کیا تو وہ برہم ہو گیا۔ پہرہ داروں کو حکم دیا کہ اس حرامزادے کو پکڑ کر اس کی ڈھال تلوار اتار لو۔ صاحب داد خاں نے چیخ کر کہا۔ "خبردار اگر کوئی نزدیک آیا۔ میں خود ہتھیار حوالے کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اُس نے ڈھال تلوار اتار کر دے دی۔

پہرہ داروں نے کہا کہ اب اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ دیوان نے کہا کہ اسے ڈیوڑھی پر کھڑا رہنے دو، میں چلتے وقت اس سے آخری باتیں کروں گا۔ چنانچہ صاحبداد خاں کو زیر حراست باہر کھڑا کر دیا گیا۔ اُس نے ایک بھرا ہوا پستول اپنی چادر کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اپنی بے عزّتی اور بے آبروئی کا انتقام لینے کے لئے تیار ہو گیا۔ جونہی دیوان کچہری سے فارغ ہو کر ڈیوڑھی کے پاس آیا۔ صاحبداد نے پستول کی لبلبی دبائی اور دیوان تیورا کر گر پڑا۔ سپاہی کے تو اسی وقت ٹکڑے اُڑا دیئے گئے۔ لیکن دیوان بھی جانبر نہ ہو سکا اور دس روز کے صبر آزما درد و کرب کے بعد پرلوک سدھار گیا۔"

دیوان کے اوصاف

دیوان خالصہ دور کا منصف اور عادل حکمران تھا۔ اس نے کم و بیش ۲۳ سال اس تدبّر و دانائی سے حکومت کی کہ دوست دشمن سب عش عش کر اُٹھے۔ وہ پانچ گھڑی دن چڑھے، عدالت میں آکر اجلاس کرتا اور اکثر مقدمات خود فیصل کرتا تھا۔ فیصلہ ایسا صائب اور ناطق ہوتا کہ دونو فریق مطمئن ہو جاتے تھے۔ قیلولہ کے بعد پھر کاغذات کی پڑتال ہوتی۔ ایک ایک کاغذ کو خود دیکھتا اور ساتھ ہی مناسب ہدایات بھی دیتا جاتا تھا۔ چوری اور رہزنی کا مطلقاً سدِّ باب ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اگر چوروں یا ڈاکوؤں کو دیوان کی دُہائی دی جاتی تو وہ ڈر کر بھاگ جاتے تھے۔ ایک دفعہ اس کے اپنے لڑکے کے متعلق رپورٹ پیش ہوئی کہ اس نے کسی کھیت سے گنّا توڑ لیا ہے۔ دیوان نے مقدمہ سماعت کرنے کے بعد

اس کے دونوں کندھوں پر بھاری بوجھ رکھوا کر چار گھنٹے کھڑا رہنے کی سزا دی۔ زنا کاری کے بارے میں یہ حکم تھا کہ اگر خاوند اپنی بیوی کو کسی آشنا کے ساتھ دیکھ پائے، تو دونوں کو قتل کر دے۔ تمام جوان لڑکیوں کا حکماً بیاہ کرادیا، اور اعلان کیا کہ آئندہ کوئی بالغ لڑکی کنواری نہ رہے۔

دیوان غیر معمولی فہم و ادراک کا مالک تھا۔ وہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ مقدمات کا آسانی سے فیصلہ کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ دیوان کی کچہری میں ایک عورت اور دو آدمی پیش ہوئے۔ ایک مُلّا تھا، دُوسرا کسان دونوں اس عورت کو اپنی بیوی بتاتے تھے عورت کسان کی طرف مائل تھی۔ دیوان نے کچھ سوچ کر عورت کو اپنے پاس بٹھا لیا اور خود مقدمہ کی کاروائی لکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دیوان نے دفعتہً اس عورت کو بلایا اور دوات دے کر کہا۔ اس میں پانی ڈال دو، جب وہ دوات لے کر آئی تو دیوان نے کسان کو کوڑوں سے پٹوایا اور عورت کو مُلّا کے حوالے کر دیا۔ کسی امیر نے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہُوا کہ یہ عورت مُلّا کی بیوی تھی۔ کہا میں نے جب دوات میں پانی ڈالنے کو کہا تھا، تو میں اس کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھتا رہا۔ اُس نے دوات میں پانی نہایت مناسب طریقہ سے اور درست اندازہ کے مطابق ڈالا۔ اگر یہ کسان کی بیوی ہوتی تو دوات کو پانی سے بھر دیتی۔

اسی طرح ایک بڑھیا نے دیوان کی کچہری میں دعویٰ کیا کہ میرا لڑکا یتیم ہے اور میرے خویش و اقارب زبردست ہیں۔ انہوں نے یتیم کے کنوئیں پر مخالفانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ ان سے واپس دلایا جائے۔ دیوان نے بڑھیا سے کنوئیں کا اتہ پتہ پوچھ لیا۔ اور دُوسرے دن صبح سویرے اس پر نہانے کے لئے پہنچ گیا۔ نہا کر جب فارغ ہُوا، تو لوگوں کی طرف مُنہ کر کے کہا کہ "اس کنوئیں کے مالک کون ہیں؟ میری انگوٹھی اس میں

جا پڑی ہے۔ انہیں بلا کر کہو کہ میری انگوٹھی نکال دیں۔" پیادے بڑھیا کے غاصب رشتہ داروں کو پکڑ لائے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "مہاراج! یہ کنواں ہمارا نہیں بلکہ ایک بڑھیا کا ہے۔ اس کو انگوٹھی نکالنے کا حکم دیا جائے۔" دیوان نے وہیں کھڑے کھڑے بڑھیا کو طلب کیا اور کنوئیں کا قبضہ اسے دلا دیا۔

ایک بار ایک شخص نے آکر فریاد کی۔ کہ "فلاں شخص نے مجھ سے کچھ رقم قرض لی تھی، مگر اب دینے سے انکاری ہے"۔ دیوان نے پیادہ بھیج کر مدعا علیہ کو پکڑ بلوایا۔ جب اس سے رقم معلومہ کی بابت سوال کیا گیا تو وہ صاف انکار کر گیا۔

دیوان نے مدعی سے پوچھا کہ "تیرے پاس کوئی گواہ ہے؟" اس نے کہا "جناب! ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر میں نے رقم اس کے حوالے کی تھی۔ کوئی آدمی وہاں موجود نہیں تھا۔" دیوان نے کہا۔ "جاؤ اسی درخت کی ایک ٹہنی توڑ لاؤ۔ میں اس سے پوچھ لوں گا۔" مدعی چلا گیا، اور مدعا علیہ کو دیوان نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کے جانے کے بعد دیوان نے از خود بار بار کہنا شروع کیا "کمال ہے، مدعی ابھی تک نہیں آیا۔" اس پر مدعا علیہ بے ساختہ بول پڑا "حضور! وہ درخت تو کافی دور ہے!" اس پر دیوان نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "کم بخت! تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ درخت کہاں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم نے مدعی سے ضرور رقم لی ہے۔ فوراً رقم نکالو، ورنہ قید کر دوں گا۔" ابھی مدعی درخت کی ٹہنی لے کر واپس نہیں آیا تھا کہ مدعی نے پوری رقم لا کر دیوان کی میز پر رکھ دی۔

دیوان مسلمان درویشوں اور فقیروں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ان کو راضی رکھا گیا تو مسلمانوں پر اعتماد قائم رہے گا۔

دیوان کو عمارتیں تعمیر کرانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ شوالہ بوہڑ دروازہ، تالاب

سُورج کنڈ، مکانات بدصلہ سنت، کچہری عام و خاص، عمارات رام چوترہ، اس کی یادگاریں ہیں۔ باغ دیوان والا جو انگریزوں کے ابتدائی دَور میں خان غلام قاسم خاں ملے زئی کو دیا گیا تھا، وہ بھی دیوان کا لگایا ہُوا تھا!

بایں ہمہ وہ ہندُو تھا اور ہندُوؤں جیسا ذہن رکھتا تھا۔ اُس نے صُوبہ ملتان کی تمام کلیدی آسامیوں پر ہندوؤں کو تعینات کر رکھا تھا۔ تعلقہ جات میں بھی منصف اور محاصل سب ہندُو تھے۔ اس نے اکثر مواضعات کے اسلامی نام بدل دیئے تھے۔ رسُول پور کو رام پور[1] میں تبدیل کر دیا۔ جس پر مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ مگر کوئی اثر نہ ہُوا۔ بلکہ گوپال پور، تارا گڑھ، موہن پور، لالہ والہ، کوٹ ہرو، گنب باوا، جمیعت پور، چک دیسی رام، ہری پور، دُرگا پور، اور چک گودھا، نام کے کئی خالص ہندُو قصبے صرف ضلع ملتان میں ہی اُبھر آئے۔ چودھری موہن لال، چودھری بیلا ل اور چودھری فتح چند بیلہ کو نواب مظفر خاں شہید کے شہزادوں کے محل الاٹ کر دیئے۔ ساتھ ہی شہزادگان کی جاگیریں بھی ان میں تقسیم کرا دیں۔ جس پر یہ تین چار خاندان شجاع آباد کے گرد و پیش کی اعلیٰ اراضیات کے مالک بن گئے۔ چودھری نرائن سنگھ، بھگوان سنگھ وغیرہ انہی چودھری موہن لال کی ہی اولاد سے تھے۔ جو تقسیم ہند کے بعد بھارت کو منتقل ہو گئے اور وہ محلات مہاجرین کے لئے خالی کر گئے۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاس

دیوان ساون مل کی ہندُو پروری اسی پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس نے ہندو بنیوں

---

[1] لالہ حکم چند ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ملتان "تاریخ ملتان" میں اس موضع کا نام رام پور لکھ کر آگے لکھتا ہے "عرف رسول پور"۔ اس کا مطلب ہے اگرچہ کاغذات میں رام پور لکھا جاتا تھا۔ مگر عوام اسے رسول پور ہی کہتے تھے۔

کو دو کانوں سے نکال کر دیہات میں بھیجا۔ اور انہیں سیر حاصل مواضعات مرحمت کرکے اُن کے نام سے موسوم کیا اور پھر ہر موضع کے لئے الگ الگ واہی (نہر) احداث کرا کے ان کے رقبہ جات کو سیراب کرایا۔ چند جاگیروں کے نام درج ذیل ہیں

۱۔ واہی کرپال سنگھ　　　۲۔ واہی سلامت رائے
۳۔ واہی گھنوں مل　　　۴۔ واہی شام داس
۵۔ واہی راجہ رام　　　۶۔ واہی کلیان داس
۷۔ واہی بلاقی داس

اب ان نالہ جات پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو ہندوؤں سے موسوم تھے۔ اُن کے لئے احداث کرائے گئے تھے، اور ان کے ہی علاقوں کو سیراب کرتے تھے۔

	نام نالہ	نام ہندو زمیندار جس کا رقبہ سیراب کرنا مقصود تھا
۱۔	کھتریاں والہ	لالہ مہر چند
۲۔	راموں والہ	"
۳۔	جسو والہ	جسُو ولد سماں
۴۔	فقیراں والہ	واہی رام پور
۵۔	ڈتے والہ	چودہری ڈتہ رام و پنجو رام
۶۔	گسائیں والہ	پنڈت رادھا کشن ولد شیودیال برہمن گسائیں
۷۔	بھانہ والہ	چودھری بھانہ رام ولد ہر دیال
۸۔	سادھو والہ	چودھری گھنوں رام
۹۔	ترہولیاں والہ	چودھری گھسیٹا مل
۱۰۔	راجاں والہ	چودھری کرپا رام

۱۱	منگلانیاں والہ	چودھری کرپارام
۱۲	توروواں والہ	چودھری صاحب مل، تورو، جندا وغیرہ

گنیش ٹیکس

اسلامی دَور میں چونکہ ہر جگہ حضرات علماء قرآن شریف کی تعلیم دینے پر مامور تھے۔ انہیں فی خرمن دس سیر گندم رسول اورواحی کے نام پر ملتی تھی۔ لالہ حکم چند نائب مہتمم بندوبست نے تاریخ ملتان میں برہمنوں کی جو مردم شماری درج کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ برہمن صرف ملتان شہر اور چھاؤنی میں رہتے تھے۔ ان کی تعداد مردانہ ۳۱، زنانہ ۲۸، کل ۵۹ تھی۔ ضلع کی باقی تحصیلات میں کہیں کوئی برہمن آباد نہیں تھا۔ بایں ہمہ دیوان ساون مل نے تمام صوبہ میں رسُول اورواحی کے ساتھ ساتھ اسی شرح سے گنیش ٹیکس بھی عائد کر دیا۔ یہ مسلمان زمینداروں سے بھی اُن برہمنوں کے لئے برابر وصول ہوتا تھا جو ملتان شہر میں نہایت قلیل تعداد میں آباد تھے۔

ہندو تاجرانہ ذہن رکھتا تھا۔ اس نے پہلے کبھی سیاست کے بارے میں کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ دیوان نے ملتان شہر کے انتظام کے لئے جو ممبر نامزد کئے ان میں مندر نرسنگھ پوری کا مہنت بشنداس اور سیٹھ چوہتھ رام، چودھری روپ چند، رائے زادہ آسانند سیٹھ سلامت رائے، چودھری ٹکن مل اور سیٹھ جندہ رام بھی عمائدین بلدیہ اور درباری کرسی نشینوں میں نظر آتے ہیں۔ سیٹھ لچھپت رائے بھی اُمرائے سلطنت کے پہلو بہ پہلو کرسی پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ یہ جندہ دن ہوئے ریواڑی سے آکر ملتان میں خزانچی مقرر ہوا تھا۔

دیوان نے اپنے دَور میں ہندوؤں کے لئے تو کئی عمارتیں بنوائیں مگر مسلم عمارات کی مرمت کے لئے ایک پیسہ بھی نہ نکال سکا۔ اور مسلمان حکمرانوں اور سرداروں کی طاقت توڑنے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ چنانچہ مزاروں، درسگاہوں

گورچانیوں، کھوسوں اور بزدار بلوچ قبائل سے اس کی جنگیں اسی نوعیت کی ہیں خالصہ گردی میں جو مسلمان ملتان چھوڑ گئے تھے اُن میں سے اکثر دیوان ساون مل کے زمانہ میں بھی اپنے آبائی مکانات حاصل نہ کر سکے۔ مسلمان صوفیاء کے اعراس کو میلوں ٹھیلوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور حضرت سلطان سخی سرور علیہ الرحمۃ کے مزار پُر انوار پر جو تبلیغی جماعتیں جایا کرتی تھیں۔ ان کو منسخ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا نام بھی سنگ پڑ گیا۔ اس کا مسلمان ملازمین سے جو سلوک تھا وہ صاحبداد خاں سپاہی کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ اسے طویل مدت تک نہ رخصت ملی اور نہ تنخواہ۔

مقبرہ شاہ شمس سے جانبِ شرقِ ایک فرلانگ کے فاصلے پر مخروطی گنبد نما عمارت نظر آتی ہے۔ اس میں دیوان ساون مل کی راکھ دفن ہے۔ اس عمارت کی ہر چیز اندرونی تعویذ سے بیرونی فصیل تک مثمن شکل کی ہے۔

دیوان مُول راج

دیوان ساون مل کے قتل کے بعد اس کا بڑا بیٹا دیوان مُول راج بشرائطِ سابقہ ملتان کی صوبیداری پر فائز ہوا۔ البتہ مزید شرط یہ تھی کہ وہ مبلغ تیس لاکھ روپیہ نذرانہ بھی ادا کرے۔ مُولراج کا اپنے بھائی کرم نارائن سے بگاڑ ہو گیا[1]۔ اور اس نے اپنے باپ کی جائیداد مالیتی تیس لاکھ روپے تقسیم کر لی۔ جس سے نذرانہ کے ادا کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی اور آخر گورنر جنرل کی مداخلت پر قرار پایا کہ مولراج تیس کی بجائے بیس لاکھ روپے ادا کرے دیوان مول راج ان تمام عائد کردہ ذمہ داریوں سے احسن طور پر عہدہ برآ ہوا۔ مگر ریذیڈنٹ نے جو احکامات رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے صادر کیے تھے ان کی تعمیل نہ کر سکا۔ یہ امر اس پر سخت شاق گزرتا تھا کہ جب مالگزاری کی پوری رقم ادا کر دی جاتی

---

[1] تذکرۃ الملتان۔ ص ۹۴ قلمی

ہے تو اس کے اندرونی معاملات میں کسی کو دخل دینے کا کیا حق ہے۔ چنانچہ فروری ۱۸۴۶ء میں جب وہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے طلب کرنے پر لاہور گیا تو اس نے ملتان کی صوبیداری سے استعفاد دے دیا۔ جو منظور کر لیا گیا اور یہ طے پایا کہ سردار کاہن سنگھ کو ناظم مقرر کیا جائے۔ اور مسٹر وانز ایگنیو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن مشیران خاص کے طور پر کام کریں۔ اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مذکورہ بالا آفیسر پانصد سکھوں کے ہمراہ ملتان کو روانہ ہوئے۔ دیوان مولراج نے عیدگاہ میں ان کے قیام کا بندوبست کیا۔ دُوسرے دن کہ بدھ تھا، دیوان مولراج قلعہ کی چابیاں کاہن سنگھ کے حوالے کرنے کے ارادہ سے بمعیت لیفٹیننٹ اینڈرسن سوار ہُوا۔ قدیم سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ چارج دہندہ قلعے کی چابیاں حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کے مزارِ پُرانوار پر رکھ دیتا تھا، اور نیا گورنر پہلے اس امر کا اعلان کرتا تھا کہ ملتان کے باشندوں میں عدل و انصاف سے حکومت کرے گا۔ پھر چابیاں اُٹھاتا تھا۔ چنانچہ دستور کے مطابق چارج کا لین دین ہو گیا۔ اور کاہن سنگھ نے قلعہ کا تمام سامان اور نقد و جواہر دیوان مولراج سے سنبھال لیا۔ واپسی کے وقت جبکہ مسٹر وانز ایگنیو اپنے گھوڑے پر سوار ہونے کو تھا کہ دو سوار یکلخت نکلے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ تلواروں سے کاری ضربات لگائیں۔ سردار کاہن سنگھ فوراً گھوڑے سے اُترا اور سواروں پر پل پڑا۔ اور اس نے اپنے ساتھی کو مزید ضربات سے بچا لیا۔ پھر اپنے زخمی ساتھی کو ہاتھی پر سوار کر کے عیدگاہ کی جانب روانہ ہُوا، اور جب دروازہ سے نکل کر پُل پر پہنچے تو وہاں اینڈرسن کو پڑا پایا۔ جسے کسی نے برچھی سے بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ اُسے الگ ڈولی میں ڈال کر اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رات کو شہر کا ایک بڑا ہجوم مشتعل ہو کر عیدگاہ پہنچا اور اس نے دونوں انگریزوں کو ضربِ بندوق سے مار ڈالا۔ اگرچہ دیوان مولراج کا اس حملہ سے کوئی تعلق نہ

تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، تو اس نے علی الاعلان مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بلاشبہ دیوان مولراج کی نیّت اور ارادے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن اس کے اقربا غم و غصہ سے مجبور ہو کر اس بات پر آمادہ تھے کہ خواہ کچھ بھی ہو عنانِ حکومت ان کے بھائی ہی کے ہاتھ میں رہے۔ دیوان مولراج کو اس عہدے کی چنداں پرواہ نہیں تھی۔ کیونکہ ستّر ہزار اشرفیاں تو خزانہ امرتسر میں اس کے حساب میں جمع تھیں نیز ایک اور رقمِ کثیر بنارس کے ساہوکاروں کے پاس بمد امانت پڑی تھی۔ اُسے یہ خطرہ تھا کہ اگر کسی قسم کی دغابازی اس سے سرزد ہوئی تو وہ تمام روپیہ ضبط ہو جائے گا لیکن جب صورتِ حال اس طرح ہو گئی تو اس نے کاہن سنگھ کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔

انگریزوں کا ملتان پر حملہ

عہد نامہ لاہور مارچ ۱۸۴۶ء کی رو سے دلیپ سنگھ اگرچہ پنجاب کا حکمران چلا آتا تھا، مگر اصل میں اس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک سر ہنری لارنس تھا۔ جو ریذیڈنٹ کے طور پر پنجاب کے ضبط اور نظم و نسق پر پوری طرح نظر رکھتا تھا۔ جونہی اُسے انگریز افسروں کے قتل کی اطلاع ہوئی اس نے فوراً لیفٹننٹ ایڈورڈز کو جو اس وقت ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں متعین تھا، ملتان پہنچنے کو لکھا۔ لیفٹننٹ مذکور اپنی فوج کے علاوہ پٹھانوں کی جمعیتِ وافرہ کے ساتھ ملتان کو روانہ ہُوا۔ اس کے ساتھ ایک پٹھان سردار فوجدار خاں پسر ذوالفقار خاں علی زئی بھی تھا۔ جسے ملتان کی فتح کے بعد نواب فوجدار خاں کا خطاب اور پنشن و جاگیرات عطا ہوئی تھیں۔ دُوسرا غلام سرور خاں ولد معزّ الدین خاں خاکوانی تھا۔ اس کے ساتھ ملتان کے افغان سردار غلام مصطفےٰ خاں وغیرہ بھی مل گئے۔ ملک فتح شیر خاں ٹوانہ کالو خاں گنڈاپور جیسے مقامی رؤسا ادھر سے جمع ہو گئے۔ کرنل کورٹ لینڈ جو شاہ پور میں

تعینات تھے۔ دو ہزار سپاہی اور پندرہ توپیں لے کر ملتان کو روانہ ہوئے۔ لیفٹننٹ ایڈورڈز ۱۸ر جنوری ۱۸۴۸ء کو دریائے چناب عبور کر کے بگڑیں کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ بہاولپور سے فتح محمد غوری کے زیر کمان بھی ایک لشکرِ جرار آ پہنچا۔ دیوان مولراج کو خبر ملی، تو اس نے اپنی تمام فوجیں ادھر جھونک دیں۔ دیوان کی فوج نے اپنے توپ خانہ سے اس بلا کی آتشباری کی کہ بہاول پوری لشکر شکست فاش کھا کر پیچھے ہٹ گیا اب ملتانی لشکر نے لیفٹننٹ ایڈورڈز کے لشکر پر حملہ کیا۔ اس کی تمام توپیں دریا کے پار تھیں، صرف بہاولپور کی دو توپوں سے کام چلا رہے تھے۔ خوب گھمسان کا رن پڑا۔ اور دیوان کی فوج نے بھی شجاعت کا حق ادا کیا۔ قریب تھا کہ انگریزی لشکر شکست کھا کر بھاگ جائے کہ دفعتہً کرنل کورٹ لینڈ کی کمکی فوج چھ توپوں سمیت پہنچ گئی۔ اس کے آتے ہی لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ دیوان کے افسروں نے ہزار سنبھالا، مگر ملتانی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور وہ منتشر ہو کر بھاگ گیا۔ اتفاق سے اسی روز انگریزوں کو واٹرلو کے میدان میں نپولین بوناپارٹ کی افواج پر بھی فتح ہوئی جس سے انہیں دوہری خوشی ہوئی۔ ملتان کا لشکر بڑا سامان اور چھ توپیں چھوڑ گیا تھا۔ اس پر قبضہ کر کے ۲۲ر جون کو یہ لشکر ملتان کی طرف بڑھا۔ شجاع آباد اور سکندر آباد کے قلعوں پر یونین جیک لہرانے کے بعد یہ فوجیں ملتان شہر سے تین کوس جنوب میں بمقام سورج کنڈ خیمہ زن ہوگئیں۔

دیوان مولراج نے جب دیکھا کہ ملتان کے رؤسار انگریزوں کے ساتھ ملنے جا رہے ہیں تو وہ اپنی کامیابی سے مایوس ہو گیا۔ اُس نے صحیح صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا۔ اور جان بخشی کی شرط پر صلح کا پیغام بھیجا۔ لیکن ایڈورڈز نے کہلا بھیجا کہ گفت و شنید غیر مشروط ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد دیوان نے ایک اور پیغام بھیجا جو پہلے کی نسبت زیادہ عاجزانہ تھا، مگر ایڈورڈز نے اسے بھی ٹھکرا دیا۔ اس پر تن بہ تقدیر

مول راج لڑنے مرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اور دس بارہ ہزار کے قریب لشکر مرتب کر کے ملتان سے باہر نکل آیا۔

یکم جولائی ۱۸۴۸ء کو سدّو حسّام کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور دونوں اطراف کے بہادروں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ دیوان کی فوج بڑی جوانمردی سے لڑی اور ایک ایک انچ پر صدہا جانیں نچھاور کیں۔ چھ گھنٹے تک بڑی شدّت کی لڑائی جاری رہی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ قریب تھا کہ انگریزی افواج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوں۔ دفعتہً مسٹر کوٹن کی پلٹن سورج مکھی نے اس شدّت سے حملہ کیا کہ دیوان کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دار و گیر کے اس عالم میں توپ کا ایک گولہ دیوان کے ہاتھی کے ہودے پر آ پڑا۔ جس سے دیوان زمین پر آ گرا۔ مگر فوراً سنبھل کر اٹھا اور ایک صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو بھاگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام لشکر نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔

اس کامیابی سے انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ لیکن چونکہ قلعہ شکن توپیں ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ اس لئے ایڈورڈز سورج کنڈ کی طرف ہٹ کر خیمہ زن ہو گیا اور ۳ ستمبر تک یہ عظیم لشکر چپ چاپ پڑا رہا۔

۵ ستمبر کو انگریزی لشکر حرکت میں آیا۔ مگر اب ایڈورڈز کی جگہ جنرل وِش اس لشکر کا سالار تھا۔ اس کے حکم سے توپوں کی گھن گرج شروع ہوئی۔ دیوان مولراج کی طرف سے بھی اس گولہ باری کا ترکی بہ ترکی جواب ملا۔ جنرل وِش نے آگے بڑھ کر موضع رام تیرتھ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۲ ستمبر کو عام حملہ ہوا۔ چپہ چپہ پر خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ اور شام کے قریب مورچہ فتح ہو گیا۔ بایں ہمہ ماہرینِ جنگ کے مشورے پر انگریزی افواج کمک کی انتظار میں سورج کنڈ کی طرف ہٹ گئیں۔ اکتوبر کے اواخر تک انگریزی کیمپ میں

تماشے ہوتے رہے اور شہر میں بھی دسہرہ کی تقریبات منائی جاتی رہیں۔

نومبر میں پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۴۸ء کو بمبئی کی افواج آپہنچیں اب جنرل وِش کی ماتحتی میں بتیس ۳۲ ہزار فوج دادِ شجاعت دینے کے لئے تیار کی منتظر تھی۔ ۲۸ دسمبر کو صبح کے دھندلکے میں ہی بمبئی اور بنگال کی توپیں دہلی دروازے کی فصیل اور قلعہ پر گولہ باری میں مصروف ہو گئیں۔ دن بھر توپیں گولے اُگلتی رہیں آتشباری کی ہولناکی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ توپوں کی گرج کو ایک افسر نے بہاول پور میں بخوبی سُنا۔ ۲۹ دسمبر کو بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ بڑے بڑے مکانات گر کر مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ ۳۰ دسمبر کو ایک قادر انداز نے ایک گولہ ایسا تاک کر مارا کہ قلعہ کے میگزین پر جا پڑا۔ جس سے سولہ ہزار پونڈ بارود بھک سے اُڑ گیا۔ اور ایسا دھماکہ ہوا کہ کئی میلوں تک زلزلہ محسوس ہوا۔ اور قلعہ کے قریب کی عمارتیں فضائے آسمانی میں اُڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ اس خوفناک دھماکہ کے باعث شہر کی عمارتوں پر جو گزری وہ تذکرۃ الملتان کی زبان سے سُنیئے، لکھتے ہیں کہ :-

"عمارت مسجد جامع، دیوارہائے آں، سائر عمارات نواب مظفر خاں و سرفراز خاں کہ قریب بودند، دیگر مکانات ملحقہ مسجد مذکور مثل قبۂ علامہ قطب الدین کاشانی، قبہ حسین خاں وغیرہ مکانات از اساس آں برکندیدہ ہوائے شدند کہ اثرے از آثار آنہا باقی نماندہ"

آٹھ سو کے قریب آدمی مر گئے، اور بے شمار زخمی ہوئے۔ اس کے باوجود دیوان کی ہمت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ۳۱ دسمبر کو اس نے پھر انگریزی افواج پر حملہ کیا، گر شدید نقصان اُٹھا کر پسپا ہوا۔ اُسی روز دوپہر کے وقت شاہی گودام میں آگ لگ گئی۔ جس میں سات سو من کے قریب غلہ، دیگر اجناس اور تیل و گھی کے ہزارہا کپے موجود

تھے۔ تیل کے جلنے سے شعلے اس قدر بلند ہوئے کہ سارا شہر لال انگارے کی طرح دہکتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس حالت میں بھی انگریزی توپیں برابر گولے اگل رہی تھیں۔ مرقع ملتان کے مؤلف لکھتے ہیں کہ:-

"یہ سارا سماں نہایت ہیبت ناک تھا۔ باوجود اس مصیبت اور آفت کے محصورین اسی بہادری اور شجاعت کے ساتھ برسرِ پیکار رہے اور دیوان کے عزم و استقلال میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوئی۔ توپوں کا جواب برابر توپوں سے دیا جاتا رہا، اور ہنگامۂ کارزار بدستور جاری رہا۔ ادھر یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ قلعہ شکن توپوں کے ذریعہ قلعہ یا شہر میں شگاف پیدا کر کے فوجوں کو اندر داخل کیا جائے۔ اُدھر دیوان مولراج کے یہ حوصلے تھے کہ اس نے کہلا بھیجا کہ اگر جنگ ایک سال تک بھی جاری رہی تو میں مقابلہ کروں گا۔ باوجود اس کے جنرل وش نے ایک مراسلہ بھیج دیا کہ بے فائدہ کشت و خون ہو رہا ہے، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم قلعہ سرکار کے حوالے کردو۔ دیوان مولراج نے اس مراسلے کو اپنی سب سے لمبی زد والی توپ میں رکھ کر بارود کے ذریعہ انگریزی کیمپ میں واپس بھجوا دیا۔"

خونی برج پر حملہ

یکم جنوری ۱۸۴۹ء کو انگریزی فوجوں نے شہر پر شدت سے حملہ کر دیا۔ اور خونی برج کے شگاف کے ذریعے شہر کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ لیکن دیوان کی فوج ان سے بازاروں اور گلیوں میں ہر جگہ بہادرانہ وار لڑتی رہی۔ دیوان کے توپچی آخری دم تک اپنی توپوں پر ڈٹے رہے اور وہیں انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر ختم ہو گئے۔ جب شہر ہاتھ سے نکل گیا تو دیوان نے تمام فوج کو قلعہ میں جمع کر لیا۔ جنگ کے دوران اس کے

انہماک کی یہ کیفیت تھی کہ اس نے اس خیال کے پیش نظر کہ بچوں کی تکلیف اور مصیبت کہیں اس کے عزائم میں کمزوری نہ پیدا کر دے، حرم سرا میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب انگریزوں کی تمام فوجوں نے قلعے کو گھیرے میں لے لیا۔ اور توپوں سے قلعے کے محلات پر گولے برسانے شروع کئے۔ جب دیوان کو ہر طرف سے ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا تو اس نے اپنا سفیر جنرل وش کے پاس بھیجا، کہ اگر مجھے اور میرے اہل و عیال کو امان دی جائے تو میں ہتھیار ڈال دینے کو تیار ہوں۔ جنرل وش نے کہلا بھیجا کہ آپ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں۔ آپ کے اہل و عیال سے کچھ تعرض نہ کیا جائے گا۔

دیوان مولراج نے ہتھیار ڈال دیئے

خدا معلوم کس کم بخت نے دیوان کو ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دیا کہ وہ غیور اور جسور حکمران، جو ایک سال تک اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمن سے بہادرانہ وار لڑتا رہا۔ جس کے سامنے سولہ ہزار من کا بارود بھک سے اڑ گیا تو اس کا حوصلہ پست نہ ہوا۔ شاہی گدام نذرِ آتش ہوا اور تمام غلّہ اور گھی و تیل کا سٹاک برباد ہو گیا تو بھی اس نے جی نہ ہارا۔ جس نے اہل و عیال اور بچوں سے ملنا اس لئے چھوڑ دیا کہ اس کے عزمِ آہنی میں کسی قسم کی کمزوری پیدا نہ ہو، بے اختیار اس نے انگریزوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور اس کی ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ اگر یہ بھی نواب مظفر خان کی طرح میدانِ کارزار میں جان دے دیتا، تو قیامت تک اس کا نام زندہ رہتا۔ مگر افسوس! عزّت کی موت پر اس نے ذلّت کی زندگی کو ترجیح دی اور اپنی بے پناہ شجاعت و بسالت کے باوجود گمنامی کی دُنیا میں روپوش ہو گیا۔

اب دیوان مول راج کے قلعہ سے برآمد ہونے اور اپنے آپ کو جنرل وش کے حوالے کرنے کا تذکرہ سیّد محمد اولاد علی شاہ گیلانی اپنے الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:-

"۲۲ر جنوری ۱۸۴۹ء کی صبح کو انگریزی فوج قلعہ کے دروازے سے کچھ دور صف آرا ہوئی۔ سب کو انتظار یہ تھا کہ دیوان اپنے آپ کو حوالے کر دے گا پہلے پہل تقریباً دو سو آدمی مصیبت زدہ اور بدحال اپنے خچروں اور اونٹوں سمیت باہر نکلے، معلوم ہوتا تھا کہ محصورین کی کل تعداد یہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سب کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب تین ہزار جوان ہر قسم کے سامانِ جنگ سے آراستہ باہر نکلے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار یک جا قلعہ کے باہر آ کر اتار دیئے۔ اور غیر مسلح ہو کر آگے چلے۔ دولت دروازہ کے قریب ان کی بڑی احتیاط سے تلاشی لی گئی اور کل زرِ نقد، موتی، سونا، جواہرات وغیرہ جو کچھ ان کے پاس سے نکلا، ضبط کر لیا گیا۔ آخر میں بہت انتظار کے بعد سردار قلعہ دیوان مولراج اپنے دونوں بھائیوں رام سنگھ اور شام سنگھ سمیت باہر نکلا۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے سردار تھے۔ اور وہ ایک خوبصورت عربی گھوڑے پر سوار تھا۔ نہایت مکلّف اور شاہانہ لباس زیب تن تھا۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار ظاہر نہ ہوتے تھے۔ اس کی شکست میں بھی ایک شان تھی۔ جو اس کے دشمنوں پر بھی اثر کئے نہ رہ سکی۔ یہ نوجوان حاکم کوئی تیس برس کی عمر کا تھا، اور اس کی پیشانی سے فہم و فراست نمایاں تھی جب یہ جلوس دولت دروازہ پر پہنچا تو پلٹن کا خاص پہرہ تعینات ہو گیا تا کہ اس شاہی قیدی کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیا جائے۔ یہ الوداعی منظر خاص طور پر مؤثر تھا۔ جب دیوان کو اپنے بھائیوں اور دیگر سرداروں سے جو اس کے ساتھ آخر دم تک عیش و نشاط اور رنج و غم میں شریک رہے تھے، علیحدہ ہونے کا وقت آیا تو اٹھارہ سردار آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے محبوب آقا کی آخری

قدم بوسی کر کے رنج و غم کے آنسو بہائے۔ دوسرے قیدیوں اور قدیم نمک خواروں نے بھی اپنی اپنی جگہ اظہارِ غم و افسوس کیا۔ اس کے بعد دیوان مول راج کو رام نگر بھیج دیا گیا۔ کیونکہ قریب کے علاقہ میں رکھنا قرینِ مصلحت نہ تھا۔"

رام نگر میں دیوان کے خیمہ میں ایک واقعہ پیش آیا جسے گیلانی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"۱۷ فروری کی شب کو ایک سنتری نے دیکھا کہ کوئی شخص لکڑیوں کا ایک گٹھا پھینک کر چلا گیا۔ سنتری کو شک پیدا ہوا۔ وہ فوراً اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ دیوان کے ہاتھ میں ایک چٹھی ہے۔ اس پر اُسی وقت قبضہ کر لیا۔ اور فوراً گل سامان کی تلاشی لی گئی۔ تو کپڑوں اور شالوں میں سے تقریباً ایک لاکھ روپے کی اشرفیاں، خنجر پستول، گولی، بارود، خفیہ چٹھیاں اور کئی اور چیزیں برآمد ہوئیں۔ اس کے بعد ہی دیوان کو فوراً لاہور بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ قید میں رہا۔ اب ملتان میں انگریزی عملداری کا دَور دَورہ شروع ہو گیا۔ وانز ایگنیو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکالا گیا۔ اور ان کی لاشوں کو قبروں سے نکلوا کر دوبارہ بڑی شان و شوکت اور شاہی احترام کے ساتھ دفن کیا گیا اور گوجر سنگھ نامی سپاہی کو جس نے ایگنیو کو قتل کیا تھا، گرفتار کر کے تختۂ دار پر چڑھایا گیا۔

دیوان مول راج پر ایگنیو اور اینڈرسن کے قتل کی سازش کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور اس کی سماعت ایک کمیشن کے سپرد ہوئی، جس کے رکن مسٹر منسل مسٹر منٹگمری اور کرنل پینی تھے۔ کمیشن نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ حالات کچھ ایسے تھے، جن کی وجہ سے دیوان مُول راج کچھ مجبور بھی تھا۔ مول راج کو کلکتہ پہنچایا گیا۔ وہاں سے بنارس تبدیل ہوا۔ جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ مولراج

کی اولاد اور رشتہ دار اکال گڑھ میں آباد تھے، جو انتقالِ آبادی میں بھارت کو منتقل ہو گئے۔

سکھوں کے عہد پر ایک نظر

سکھ غاصبانہ حیثیت سے پنجاب کے طول و عرض پر قابض ہو گئے تھے۔ کم و بیش تمام پنجاب اس وقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے آہستہ آہستہ تمام نوابوں کو شکست دے کر اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا تھا۔ اس کا دور انتہائی جبر و تشدد کا دور تھا۔ ہر طرف بر چھاگردی کا دور دورہ تھا۔ اکثر مساجد میگزین اور اصطبل کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ جب قلعہ ملتان پر انگریزوں نے حملہ کیا تو ملتان کی تاریخی مسجد جو ناصر الدین قباچہ کے زمانے سے جامع مسجد چلی آتی تھی۔ مسلمانوں سے چھین لی گئی تھی اور میگزین کا کام دے رہی تھی۔ نواب عبدالصمد خاں کی تعمیر کردہ عید گاہ ریسٹ ہاؤس بنی ہوئی تھی۔ جو بھی شاہی مہمان آتے تھے۔ انہیں عید گاہ میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو اذان دینے کی اجازت نہ تھی۔ مسلمانوں کے عالی شان محلات چھین کر ہندوؤں اور سکھوں کو دے دیئے گئے۔ مسلمان امراء کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ دیوان ساون مل ایک انصاف پسند حکمران خیال کیا جاتا ہے، اس کے زمانے میں مسجد نواب علی محمد خاں ناظمِ وقت کی کچہری کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور اس کے اندر گرنتھ صاحب رکھا ہوا تھا۔ انگریزوں کے دور میں یہ مسجد مسلمانوں کو واپس ملی۔ چنانچہ مسجد کی پیشانی کے یہ اشعار اس حقیقت کے شاہد ہیں ؎

بماند در کفِ سنگھاں بسال سی و چہار	اسیر و بند کہ مے کرد ماہ و سال فغاں
چوں کرد نورِ محمد کشادہ از بندش	بتافت ہمچو ستارہ ز ظلمتِ سنگھاں

کلیدی آسامیوں پر صرف سکھوں اور ہندوؤں کا تقرر ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی تہوار دل

کو بھی انہوں نے مسخ کر دیا تھا۔ مشائخ کرام کے اعراس جو اسلامی دور میں انتہائی مشرع صورت میں انجام پاتے تھے۔ سکھوں نے انہیں میلوں ٹھیلوں کی صورت میں بدل دیا۔ تبلیغی جماعتیں جو سندھ سے ملتان اور شمالی پنجاب سے سخی سرور پہنچتی تھیں انہیں سنگ کا نام دے دیا گیا تھا۔ جہاں جہاں ان کے تبلیغی اجتماعات ہوتے تھے۔ سکھوں نے انہیں تماشے دراشے کا رنگ دے دیا۔ دیوان مُول راج اگرچہ بذاتِ خود ایک اچھا حکمران تھا مگر بر چھاگردی کا روکنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اِس لئے سکھوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر بشیتر مسلمان ملتان سے ہجرت کر گئے تھے۔ اور جو رہے انہوں نے خالصہ تمدّن کو قبول کر لیا۔ اس امر کی تصدیق اُن امراء کی تصاویر سے ہوتی ہے، جو ملتان میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ ان میں صاف نظر آتا ہے کہ مسلمان امراء سکھوں کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ اور ان کی تقلید میں انہوں نے مونچھوں کا ترشوانا بھی موقوف کر دیا تھا اور داڑھیاں بے ہنگم سی بن گئی تھیں۔

سکھوں کے دَور میں جو عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں، وہ بھی اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ انہوں نے خالصہ طرزِ تعمیر سے کافی اثر قبول کیا ہے۔ دہلی دروازہ کے اندر شاہ دلیرؒ کا مقبرہ اس امر کا زندہ ثبوت ہے۔ اگر مسلمانوں کو اتنی سختی سے کچلا نہ جاتا اور ان کے تمدن اور معاشرہ کو مسخ کرنے کی کوششیں نہ کی جاتیں تو مول راج کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ اس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ نواب مظفر خاں کی طرح وہ بھی آخر دم تک ثابت قدم رہا۔ اس نے مختلف محاذوں پر ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ مگر روز بروز جب اس کی جمعیت گھٹتی گئی، اور مسلمانوں کا بشیتر حصہ علی الاعلان انگریزوں سے مل گیا تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا!

ملتان میں تعزیہ داری کی ابتدا،

نواب مظفر خاں کے دور تک ملتان کا سرکاری مذہب اہلسنّت والجماعت رہا ہے۔ اس لیے شہر میں تعزیہ نکالنے کا دستور نہ تھا۔ سیّد لعل شاہ موسوی پہلے شیعہ بزرگ ہیں جو دیوان ساون مل کے زمانے میں ملتان تشریف لائے اور لوہاری دروازہ کے باہر عالی شان آستان تعمیر کر کے عشرۂ محرّم میں مجالس عزا منعقد کرائیں۔ اور ۱۰ار محرّم کو تعزیہ نکالا۔ شاہ صاحب کو امام باڑے تعمیر کرانے اور تعزیے نکلوانے کا بڑا شوق تھا۔ ریاست خیر پور میرس میں بھی انہوں نے کافی امام باڑے تعمیر کرائے تھے اگرچہ یہاں کے سُنّی علماء نے کافی مخالفت کی، مگر یہ برابر مصروف کار رہے۔ ۱۳۰۵ھ میں جب ان کا انتقال ہوا، ملتان کے گوشے گوشے میں امام باڑے بن چکے تھے۔ محرم کے دنوں میں محلّے محلّے سے تعزیے اُٹھائے جاتے اور پُورا شہر سوگوار نظر آتا۔ اس بنار پر ملتان میں سیّد لعل شاہ کو تعزیہ داری کا بانی کہا جاتا ہے۔ صاحب مرقع ملتان نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ شاہ صاحب کے بعد اگرچہ ان کے صاحبزادگان سید غلام رضا علی شاہ اور پھر سیّد ابوالحسن شاہ بھی عزاداری کے سرگرم موئید و معاون رہے، مگر بہت جلد حضرت شاہ محمد یوسف گردیزی علیہ الرحمۃ کا آستان عزاداری کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ اب یہاں عزاداری کی تمام تقریبات و رسوم بڑے جوش و خروش سے منائی جاتی ہیں۔

مخادیم گردیزی

حضرت مخدوم شیخ محمد یوسف گردیزی علیہ الرحمۃ کے بالترتیب شیخ محمد راجو اور شیخ محمد یوسف نام کے کئی سجّادہ نشین ہوئے

ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں شیخ محمد راجو سجّادہ نشین تھے۔ ان کے بعد شیخ محمد یوسف نے یہ مسند سنبھالی۔ تذکرۃ الملتان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام جائیداد ورثا میں تقسیم کر دی تھی۔ آٹھ ماہ کے بعد حضرت مخدوم گھوڑے سے گر کر فوت ہو گئے، ان کے دو صاحبزادے تھے، حافظ محمد عسکر اور سیّد فیض علی۔ اول الذکر بعارضۂ چیچک بصارتِ ظاہری سے محروم ہو گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی سیّد فیض علی ۴۷ سال سجّادہ نشین رہے۔ اور ۱۲۴۶ھ میں راہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ ان کے بعد مخدوم شیخ محمد یوسف سجادہ نشین قرار پائے۔ جنہوں نے ایک محققانہ تاریخ "تذکرۃ الملتان" لکھی۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ اس کے قلمی نسخے تلاش کرنے پر مل جاتے ہیں۔ سادات گردیز بالعموم زمینداره کرتے ہیں۔ اور اسی پر ان کا گزارہ ہے۔ سیّد مراد شاہ گردیزی اس خاندان کے پہلے فرد تھے، جنہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک تیرہ سال تحصیلدار رہے۔ ۱۸۶۴ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر ترقی پائی، اور ۱۸۶۵ء میں ریاست بہاول پور کے نیٹو ایجنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں آپ کا بطور اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ تقرر ہوا، اور ساتھ ہی ان کی مخصوص صلاحیتوں کے سبب عدالتِ عالیہ کی چیف ججی کا منصب بھی عطا ہوا۔ آپ نے اس فریضہ کو اتنی عمدگی سے انجام دیا کہ ان کی عدل گستری ریاست بھر میں ضرب المثل بن گئی۔ اور بسا اوقات یہ فقرہ "مراد شاہ نہوی سُجھدا" ہی ظالم کے اعضا کو شل کر دیتا تھا۔ ۱۰ر جنوری ۱۸۷۶ء کو آپ نے انتقال کیا، اور حضرت شاہ محمد یوسف گردیزیؒ کے جوار میں دفن ہوئے۔

ان کے بعد ساداتِ گردیز نے سرکاری ملازمتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اب شاید ہی سول اور فوج کا کوئی شعبہ ایسا ہو، جس میں گردیزی چوٹی کے عہدوں پر ممتاز

نہ ہوں۔ کاروباری سلسلے میں بھی ان کا پایہ بلند ہے۔ خان بہادر سیّد محمد مراد شاہ کے فرزند سید حسن بخش گردیزی بڑے فاضل انسان تھے۔ سالہا سال بلدیہ ملتان کے رکن اور نائب صدر رہے۔ رباب العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اور بھی بہت سے رفاہی کام کیے۔ سیّد ناصر شاہ گردیزی کو کتب جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بڑا قیمتی کتب خانہ قائم کر گئے، جو بلاشبہ علمی نوادرات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں قلمی مخطوطات کے ایسے نادر نمونے جمع ہیں، جو لاہور کے عجائب گھر کو بھی میسّر نہیں۔ موجودہ ساداتِ گردیزی میں مخدوم سیّد عبّاس حسین شاہ اور سیّد محمد رمضان شاہ گردیزی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شجرہ نسب ساداتِ گردیز

مخدوم شیخ محمد یوسف ثانی گردیزی ← سیدہ فاطمہ المعروف عجائب خاتون

سید عبداللہ خود شیخ زیدی الواسطی ← (۱) سید ابوالفتح

سیدہ فاطمہ المعروف عجائب خاتون ↔ سید ابوالفتح

(۲) مخدوم شیخ محمد ← (۳) مخدوم شیخ محمد یوسف ثالث ← (۴) مخدوم شیخ علم الدین ← (۵) مخدوم شیخ محمد راجو ← (۶) مخدوم شیخ ابوالفتح ← (۷) مخدوم سید عبدالجلیل ← (۸) مخدوم شیخ فرید ← (۹) سید فتح محمد ← (۱۰) مخدوم شیخ سید محمد یوسف رابع ← (۱۱) مخدوم شیخ محمد راجو ثالث ← (۱۲) مخدوم شیخ محمد یوسف خامس
(جدِ خان بہادر سید حسن بخش)

(۱۳) سید بہادر شاہ المعروف محمد علی شاہ

- سید تھارو شاہ الملقب بہ شیخ محمد یوسف سادس — جد موجودہ سید محمد راجو
- سید نصیر الدین محمد — جد خاندان سید فتح علی شاہ
- سید نور شاہ — جد خاندان سید نصیر محمد شاہ
- سید دوست علی — جد خاندان سید محب جہانیاں شاہ
- سید غلام حیدر شاہ — جد خاندان سید محمد رمضان شاہ
- سید نعمت اللہ شاہ — جد خاندان سید قاسم علی شاہ

ملتان، انگریزی دور میں

خدا کی شان! جس قوم نے درندوں کی طرح ملتان پر حملہ کیا اور بھیڑیوں کی طرح مسلمانوں کا خون چوسا تھا۔ وہ تیس برس کی بر چھا گردی کے بعد ملتان کے مطلع سیاست سے دفان ہو گئی۔ جس طرح نواب مظفر خاں کی شہادت کے بعد سکھوں نے قلعے کو لوٹا تھا۔ اُسی طرح آج انگریز سکھوں کے اندوختہ پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ ایک وقائع نگار جو فتح ملتان کے وقت قلعے میں موجود تھا۔ قلعے کے سامان کی کیفیت اس طرح سے بیان کرتا ہے:۔

"قلعہ ملتان بنیئے کی مکمل دُکان معلوم ہوتا ہے۔ جس کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔ ایسی رسد گاہ اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آئی جس میں سامانِ رسد، سامانِ تجارت، اور سامانِ حرب یکجا اِس کثرت و افراط سے موجود ہوں۔ اِس قلعہ میں افیون، نیل، نمک گندھک، ہر قسم کی دوائیں کثرت سے جمع ہیں۔ گندم اور چاول کے ذخیرے زیرِ زمین دفن ہیں۔ تہ خانوں میں گھی کے ہزارہا چرمی کُپّے موجود ہیں۔ ریشمی لبادے اور خلعت ہائے فاخرہ کے انبار قلعہ کی زیریں تاریکیوں میں چمک رہے ہیں۔ ملبوسات کی بے شمار گٹھریاں نیچے اوپر پڑی ہیں۔ تانبے لکڑی اور لوہے کے مضبوط سنگین اور بڑے بڑے صندوق زر و جواہرات سے پُر ہیں۔ قلم میں یہ طاقت کہاں کہ ان گوناگوں کیفیات کا ذکر کر سکے، جو اس خزانہ کے دیکھنے سے دل و دماغ میں پیدا ہوتی ہیں۔"

الغرض انگریز قلعے میں گھس گئے۔ اور دیوان کے بھی اندوختے پر جس میں سونا،

چاندی، توپیں، تلواریں، خنجر، چاقو، ڈھالیں، قیمتی پارچات، کتابیں، گھوڑے، اونٹ وغیرہ شامل تھے، قبضہ کر لیا۔ لوٹ مار اتنی مکمل تھی کہ ہیرے اور جواہرات سپاہیوں کی واسکٹوں سے نکل کر زمین پر گر رہے تھے۔ سات دن تک برابر لوٹ مار جاری رہی۔ عورتیں بے عزّتی کے خوف سے تین کپڑوں کے ساتھ مکانات چھوڑ کر نکل بھاگیں۔ یہاں تک کہ کانوں کے بُندے اور ہاتھوں کے کنگن بھی اتار کر پھینک دیئے۔ کیونکہ انگریزوں نے اپنی داشتہ عورتوں کو تلاشی پر مقرر کر رکھا تھا۔ اور وہ نہایت ذلیل طریقے سے تلاشی لے رہی تھیں۔

جب ملتان پر پُورا تسلّط ہو گیا تو امدادی لشکر واپس لوٹ گئے۔ اور لیفٹیننٹ ایڈورڈز امرائے ملتان کو ہمراہ لے کر لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور پہنچ کر تمام امرا کرنل لارنس کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ اس نے حُسنِ خدمات کے صلے میں سب کو درجہ بدرجہ خلاع فاخرہ، انعام واکرام اور اعزاز سے نوازا۔ چنانچہ مخدوم شیخ شاہ محمود قریشی سجادہ نشین حضرت زکریّا ملتانی قدس سرّہٗ کو خلعت فاخرہ، ایک ہزار روپیہ انعام اور بحالی مواجب دھرم ارتھ مقررہ سابقہ عملداری سکھ گورنمنٹ کا فرمان عطا ہُوا۔ ساتھ ہی دونوں خانقاہوں کی مرمّت کے لئے دس ہزار روپیہ کی منظوری الگ ملی۔ نواب فوجدار خان کو خلعت فاخرہ چار ہزار روپے سالانہ پنشن اور ایک باغ مرحمت ہُوا۔ بعد میں اس باغ کے بدلے آٹھ سو روپے نقد دیئے گئے۔ صادق محمد خاں کو دو ہزار روپیہ سالانہ پنشن، ایک باغ اور خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا۔ حاجی غلام مصطفےٰ خان خوگانی کو بھی اسی قدر پنشن، ایک باغ اور خلعت فاخرہ مرحمت ہوئی۔ نواب فوجدار خاں نے پنشن کے بدلے چند مواضعات حاصل کیے، اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کو لوٹ گئے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء | انگریز ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے آئے تھے جب انہوں نے ملک کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہُوا

دیکھا اور حالات کو سازگار پایا، تو ان کے دل میں بجائے تجارت کے حکومت کی ہوس پیدا ہوئی، وہ یکے بعد دیگرے حکمرانوں کو شکست دیتے اور ان کا ملک غصب کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ کم و بیش تمام ہندوستان پر چھاگئے۔ انہوں نے ہندوستانی نوابوں اور مہاراجوں پر اس قدر ظلم کیا اور عوام کو اتنی بے دردی سے کچلا کہ ان کے خلاف ملک گیر بغاوت پھیل گئی۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی ایک رجمنٹ کو حکم دیا گیا کہ وہ چربی دار کارتوس استعمال کرے۔ ستاسی ۸۷ آدمیوں نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس خبر سے اتنا اشتعال پیدا ہوا کہ میرٹھ کی تمام ہندوستانی فوجیں باغی ہوگئیں اور منظم طریقہ سے دہلی کو روانہ ہوئیں۔ جب یہ فوجیں دہلی پہنچیں، تو یہاں کی فوجوں نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا۔ انگریز دہلی کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور ہر طرف سے باغی فوجیں دہلی میں آکر جمع ہونے لگیں۔ اس تحریک کا بانی جنرل بخت خاں تھا۔ اُس نے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو دہلی کے تخت پر بٹھا کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا ۱۴ ستمبر کو جنرل نکلسن ایک انگریزی فوجی دستہ کے ہمراہ بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ دہلی میں داخل ہو گیا۔ ہفتہ بھر دہلی کے بازاروں میں دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ عین اُس وقت جبکہ لڑائی بڑے زوروں پر تھی، نکلسن مر گیا۔ مگر دہلی فتح ہو گئی۔

۲۱ ستمبر کو کیپٹن ہڈسن نے بہادر شاہ مغل بادشاہ اور اس کے دو شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر لیا۔ بغاوت کے جرم میں بوڑھے بادشاہ کو رنگون بھیج دیا گیا۔ اس کے جوان بیٹوں اور بھتیجوں، پوتوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

جہد للبقا کی اس جنگ میں کم و بیش تمام ملک نے حصہ لیا۔ کان پور، لکھنؤ، بنارس اور آگرہ ہر جگہ فوجیں تلملا اُٹھیں۔ انگریز افسروں سے تصادم ہوا، مگر ہر جگہ اپنے آدمیوں

کی منافقت نے اس تحریک کو فیل کر دیا۔

ملتان میں ان دنوں کیپٹن ہملٹن کمشنر اور چھاؤنی میں کرنل ہکسن کمان افسر تھے۔ ملتان میں دو پلٹنیں نمبر ۶۲ اور ۶۹ موجود تھیں۔ آخر الذکر سے متعلق بے حد شکوک تھے۔ باقی دیسی پلٹنوں کے بارے میں اگرچہ اس قسم کا خدشہ لاحق نہیں تھا، تاہم تشویش ضرور تھی۔ ملتان ایسا مقام تھا۔ جہاں سے دوسرے مقامات کے ساتھ رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ قلعہ محض کھنڈر بن چکا تھا۔ اس لئے انگریزوں کو خطرے کے وقت کوئی جگہ ایسی نہیں مل سکتی تھی۔ جس میں وہ حملہ آوروں سے محفوظ رہ سکیں۔ اتفاق سے بحری افواج کا لیفٹننٹ ایتھرج اپنے جہاز سمیت ملتان میں موجود تھا۔ اس لئے کیپٹن ہملٹن نے اسے روک لیا۔ تاکہ اگر ضرورت پڑے تو اس جہاز سے فائدہ اٹھا سکیں۔

آئے دن دہلی اور لاہور سے متوحش خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ہندوستانی سپاہی سب سے زیادہ فکر مند تھے۔ وہ بے چارے روز ڈاک خانہ کے گرد خبروں کے انتظار میں منڈلاتے رہتے۔ پہلے وہ اپنے اہل و عیال کو خزانے کی معرفت رقم بھیج سکتے تھے۔ اب یہ صورت ختم ہو چکی تھی۔ عوام کے دلوں سے حکومت کا اعتماد اُٹھ چکا تھا اور وہ سب اپنا مال و اسباب جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اشرفی کی قیمت بڑھ چکی تھی۔ گھریلو ضرورت کی چیزیں بازار میں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ ان حالات میں دفعتہً چیف کمشنر کا حکم آیا، کہ فوج سے ہتھیار رکھوا لئے جائیں۔ چنانچہ ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو اس حکم کی کامیابی کے ساتھ تعمیل ہو گئی۔ لاہور ملتان کی سڑک پر جگہ جگہ فوجی پہرے مقرر کئے گئے۔ تاکہ آمد و رفت میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ پلٹنوں کے ہتھیار تو چھین لئے گئے، مگر انہیں چند ماہ تک چھاؤنی میں ہی رکھا گیا۔ اس دوران میں گرد و پیش ہنگامے جاری تھے۔ اگرچہ باہر کے حالات سے فوج کو بے خبر رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی، مگر کسی نہ کسی طرح ایسی خبریں انہیں پہنچ ہی

جاتی تھیں۔ ایک دن خبر ملی کہ گوگیرہ کی فوج کو بھی غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ جہلم کا ایک صوبیدار اور آٹھ سپاہی کشتی میں سفر کر رہے تھے کہ دھر لئے گئے۔ اور انہیں جھنگ میں موت کی سزا دے دی گئی۔ ان اطلاعات سے بہادر فوجیوں کے سینے کھول اُٹھے۔ اور وہ کچھ کرنے کے لئے سیماب وار بے چین نظر آنے لگے۔ جس روز فوج سے ہتھیار رکھوائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک گرفتار ہو گیا۔ اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی سے ایک رات پیشتر جان بخشی کے وعدے پر اُس نے تمام راز اُگل ڈالے اس کی نشان دہی پر ناہر خاں صوبیدار میجر اور چند دوسرے سپاہیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ اس فردِ واحد کے علاوہ اور کوئی شہادت ان کے جرم کی نہ تھی۔

الزامات اور سزائیں

ناہر خاں پر ۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء کو مقدمہ دائر ہوا۔ اس پر حسب ذیل تین الزامات لگائے گئے:۔

۱۔ ۷ر جون کو اس نے فوجیوں سے کہا تھا۔ کہ افسروں کا حکم ضرور مانو، لیکن اگر تمہارے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تو جہاں جاؤ گے، نوکری مل جائے گی۔

۲۔ اپریل اور مئی کے مہینوں میں اُسے کارتوسوں کے سلسلے میں رجمنٹ کی بے چینی کا علم ہو گیا تھا۔ مگر اس نے اس امر کی کمان افسر کو کوئی اطلاع نہ کی۔

۳۔ ۱۱ر جون کو اس نے کہا تھا کہ ۶۹ رجمنٹ صبح کو ختم کر دی جائے گی۔

اگر یہ الزامات صحیح ہوتے۔ تو بھی قتل کے لئے جواز کا سبب نہ بن سکتے تھے۔ بایں ہمہ اسے مجرم قرار دے کر تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔

ناہر خاں کے سوا جن دوسرے سپاہیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں
لچھمن تیواڑی نائک، شیو سہارے سنگھ، رام ودلر سنگھ، سیتا رام سنگھ
مہی رام دوبے، ٹھاکر پانڈے، پرانگ سنگھ، اجودھیائے انوستے، میر

سبحان علی، لچھمن سنگھ۔

لچھمن نائک نے پھانسی سے ایک رات پہلے بار بار کہا کہ "افسوس ہے وقت پر کام نہ ہو سکا۔ اور جو منصوبہ طے کیا گیا تھا، اُس کے مطابق عمل نہ ہو سکا۔"

ان سپاہیوں میں سے ایک بالکل نوخیز بیس سال کا نوجوان تھا۔ جب اسے پھانسی کی سزا کا علم ہوا تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ مگر آزادی کے پروانوں کو اتنی سی بات بھی گوارا نہ ہوئی۔ نائک برہم ہو کر بولا "افسوس ہے، کہ بیڑیوں اور ہتھکڑیوں نے مجبور کر رکھا ہے، ورنہ تمہارا ابھی گلا گھونٹ دیتا"۔ باقی تمام سپاہی نشۂ حرّیت سے سرشار تھے۔ انہوں نے رات کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور صبح کو پھانسی کے تختہ پر لٹکنے کے لئے تیار ہو گئے۔[1]

ان بہادروں کی خونین داستان سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:-

۱۔ جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، وہ بڑے جری اور بہادر تھے۔

۲۔ ان میں ہندو مسلم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ کیونکہ اس رجمنٹ کا صوبیدار میجر مسلمان تھا۔ اور اس کے دس جانباز رفیقوں میں سے نو غیر مسلم تھے۔

۳۔ ان میں اس قدر ضبط تھا کہ افسروں کو شہادتیں حاصل کرنے کے لئے کئی قسم کے طریقے اختیار کرنا پڑے۔ یعنی باقاعدہ رسالہ کے سپاہی فقیروں کا بھیس بدل کر فوجیوں میں پھرتے رہتے تھے۔ اور آزادی پسندوں کی حمایت میں باتیں کر کے فوجیوں کا مافی الضمیر معلوم کرتے تھے۔

دوسرا طریقہ دیسی افسروں کا تعاون تھا۔ کئی وطن دشمن اور ضمیر فروش انہیں مل گئے اور انگریزوں نے اس طرح برکت علی اور شہ داد خاں کی غدّاری اور وطن دشمنی سے

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم۔ ص ۱۷۔ ۱۸

فائدہ اٹھا کر بہت سے بہادر وطن پرستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جون کے اواخر میں حکم ہوا کہ ان پلٹنوں کو توڑ دیا جائے اور چونکہ ایسے افراد کا کافی تعداد میں یک جا جمع ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے طے پایا کہ ہر روز بیس بیس کی تعداد میں یہ سپاہی چھاؤنی سے نکالے جائیں۔ اس حکم سے سپاہیوں کو شک گزرا کہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کرنے سے سرکار کا مقصد یہ ہے کہ وطن پہنچنے سے پہلے پہلے ہمیں راستے میں ہی ختم کر دیا جائے۔ ایسے شکوک و شبہات مختلف صورتوں میں متعلقہ افسران تک بھی پہنچ رہے تھے۔ مگر کسی نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۳۱ اگست کی صبح کو دونوں پلٹنوں نے کام چھوڑ دیا۔ کُل بارہ سو سپاہی تھے وہ آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے کیمپ سے باہر نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ ملتان کے عوام انہیں سینوں سے لگالیں گے۔ لیکن جب وہ نالہ ولی محمد کے پُل پر پہنچے تو وہاں شہریوں نے انہیں روک دیا۔ اور کہا، حالات بڑے خراب ہو چکے ہیں۔ اگر آپ لوگ شہر میں داخل ہو گئے تو شہر پر مصیبت آجائے گی۔ اس لئے آپ بجائے شہر کے دیہات کا رُخ کریں۔ جس پر وہ بیچارے مایوس ہو کر واپس لوٹے۔ آگے گورا پلٹن انتظار میں تھی۔ تڑاتڑ گولیاں چلیں، جن سے تین سو مجاہدین وہیں ڈھیر ہو گئے۔ چار سو سپاہیوں نے شجاع آباد کا رُخ کیا۔ شیر شاہ کے پاس مقامی زمینداروں نے ان کا تعاقب کیا۔ اس پر سپاہیوں کے دو گروہ ہو گئے۔ چھوٹی ٹولی لڑتی بھڑتی دریا میں اتر گئی۔ ان میں سے کئی غرق ہو گئے۔ کئی مارے گئے اور جو بچے انہیں زمینداروں اور پولیس نے گرفتار کر کے کرنل ہکس کے حوالے کیا جس نے انہیں پھانسی پر لٹکوا دیا۔

دُوسرے گروہ نے شجاع آباد کا رُخ کیا۔ یہاں بھی ان کی گرفتاری کے احکام پہنچ چکے تھے۔ تحصیلدار شجاع آباد اور چودھری کھیم سنگھ نے ان کا تعاقب کیا۔ ملتان سے

لیفٹننٹ نور گیٹ ان کی امداد کو پہنچ گیا۔ مجاہدین جان بچانے کے لئے جلال پور کی طرف بھاگے۔ مگر حکام برابر ان کے تعاقب میں رہے اور دریائے چناب و ستلج کے مقام اتصال پر ان پرستاران حریت کو گھیر گھار کر ختم کر دیا گیا۔

مجاہدین کا ایک اور گروہ جو جھنگ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں کرنل ہملٹن خود روانہ ہوا۔ لارڈ لارنس چیف کمشنر کی طرف سے نمبرداران و ذیلداران کے نام گشتی مراسلے جاری ہوئے جن کا متن درج ذیل ہے۔

"آنکہ بہ تعمیل حکم پروانہ جناب صاحب کمشنر بہادر صوبہ ملتان رقمزدہ یکم ستمبر ۱۸۵۷ء نمبری ۸۵۔ تم کو حکم ہے کہ بجمعیت مردمان ہمراہی خود ادہر گذرات تلمبہ کے جا کر جہاں کہیں مفرور سپاہی نمک حرام دستیاب ہوں، ان کو گرفتار کرو، یا قتل کرو، موت معاف ہو گی اور عنہ۲ روپے فی سپاہی گرفتار کردہ سرکار سے انعام ملے گا!"

اس پروانے کی خاطر خواہ تعمیل ہوئی۔ زمینداروں نے فوج کے لئے اونٹ اور گھوڑے مہیا کئے۔ نیز ٹنگروٹوں کے ذریعے بڑھ چڑھ کر مدد کی۔ راوی کے کنارے مجاہدین کے ساتھ زبردست مقابلہ ہوا۔ وہ بڑے بہادر سہی، مگر تنکے اور پہاڑ کا مقابلہ تھا۔ مردانہ وار لڑے، اور پروانہ وار ملک پر سے تصدق ہو گئے۔

مجاہدین کے ایک اور گروہ سے کرم پور کے قریب نالہ دیوان واہ کے محاذ میں شدید جنگ ہوئی اور مجاہدین اتنی بہادری سے لڑے کہ سرکاری فوج کو بری طرح سے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اگلت رائے تحصیلدار سرائے سدھو اپنی کمک کے ساتھ پہنچ گیا۔ مجاہدین کافی تھک ہار چکے تھے۔ اس نئی کمک کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انگریزوں کے

حامیوں نے کسی کو امان نہ دی، اور سب کا وہیں خاتمہ کر دیا۔
مسٹر برکلے ای اے سی منٹگمری نے زمینداروں کو جلو میں لے کر پہلے موضع جہامڑہ اور پھر پنڈی شیخ موسیٰؒ پر حملہ کیا۔ پیرزادگان کا مال و اسباب ضبط کر کے مکانات اور مسجد کو نذر آتش کر دیا گیا۔ تمام قلمی کتب، ملفوظات اور نوادر برباد ہو گئے۔ یہ آتش بار رسالہ فتح شاہ کو زیروزبر کرتا ہوا جلی فتیانہ پہنچا۔ یہاں مہر دلیل فتیانہ، اور اس کی شیر دل اولاد، وہنی وال، کاٹھیے، بگھیلے، بھٹانے، جوئیے، سیال اور وٹو بہادروں کی معیت میں معرکہ آرار ہوئے۔ مسٹر برکلے مہر دلیل کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔ انگریزوں کے تقریباً ایک سو سپاہی مارے گئے۔ اور سرکاری رسالہ بری طرح شکست کھا کر پسپا ہوا۔ بعد میں جب انگریزوں کو تازہ کمک پہنچ گئی۔ اور ملک ماچھیا لنگڑیال بھی اپنے رفیقوں سمیت اُن سے آملا، تو انگریزی افواج پیر نادر شاہ، سردار ولی داد مردانہ بلوچ، سردار لال کاٹھیا اور موکھا وہنی وال کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور انہیں عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔ پنڈی شیخ موسیٰؒ کے ایک معمر بزرگ پیر ساندر شاہ فرمایا کرتے تھے کہ جو جوان کالے پانی بھیجے گئے تھے۔ ان جیسے بہادر اور خوبصورت جوان پھر دیکھنے میں نہیں آئے۔ اور نہ ہی اس مال جیسی گائیں، بھینسیں اور بیل پھر نظر آئے۔ الغرض کلکتہ سے پشاور تک جس کسی نے اس جہاد میں حصہ لیا تھا، وہ بے دریغ قتل کر دیا گیا۔ جس پر ان کی حمایت کا شبہ ہوا اُسے بھی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ تیموری نسل مٹا دی گئی۔ مولانا ذکاء اللہ خاں لکھتے ہیں کہ:۔

"دلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے۔ پکڑے گئے۔ ان کی تعداد انتیس ۲۹ بیان کی جاتی ہے۔ بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔"
(عروج عہد سلطنت انگلشیہ ص۸۰)

سیّد کمال الدین حیدر کی تحقیق یہ ہے کہ :-

"(صرف دہلی میں) ستائیس ہزار مسلمانوں نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر جو قتل عام رہا، اس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو نہ رکھا، مٹادیا بچوں تک کو مار ڈالا۔ عورتوں سے جو سلوک ہوا وہ بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے[1]۔"

مولانا ذکاء اللہ پھر لکھتے ہیں کہ :-

"غرض حسین اور وجیہہ مسلمانوں کو انہوں نے اتنا مارا کہ دلی میں خوش صورت مسلمانوں کا پیدا ہونا ہی بہت کم ہوگیا۔ اگر دلّی کے پہلے اور اب کے مسلمانوں کی صورتیں ملا کر دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ غدر نے ان کی صباحت و وجاہت صورت کو بہت کم کر دیا ہے۔"

الغرض پاک و ہند کے حُرّیت پسند ختم ہوگئے۔ باقی صرف وہ کمزور روحیں رہ گئیں جنہوں نے انگریزی اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

ملکہ وکٹوریہ کا دورِ حکومت

برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۵۸ء میں ایک قانون پاس کیا، جس کی رُو سے پاک و ہند کا انتظام اس کے قبضے میں چلا گیا۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں ایک شاندار شاہی دربار منعقد کیا۔ اس میں ملکہ وکٹوریہ کا مشہور عالم اعلان پڑھ کر سنایا گیا۔ جس میں مرقوم تھا کہ آج سے ہندوستان کی حکومت تاجدولت کے تحت آگئی ہے اور اس ملک کی تمام رعایا ہمیں یکساں عزیز ہے۔ تمام برطانوی ہند میں تمام لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ الیٰ آخرہ

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صہ ۴۵۴

اس فرمان کی رُو سے گورنر جنرل ہند کو وائسرائے کا لقب بھی دیا گیا۔ چنانچہ لارڈ کیننگ ہندوستان کے پہلے وائسرائے مقرر ہوئے۔

ملتان کے عمائدین کا انتقال

۱۸۶۸ء میں مشہور گیلانی پیر مخدوم سیّد نُور شاہ اور ۱۸۶۹ء میں حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کے صاحب سجّادہ مخدوم شاہ محمود یکے بعد دیگرے راہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔

مخدوم پیر نُور شاہ الملقب بہ مخدوم شیخ حامد گنج بخش چہارمؒ

آپ بے حد ہر دلعزیز انسان تھے۔ شہر کے مسلمان اور ہندو سب آپ کو اپنا مقتدار جانتے تھے۔ جب آپ کی سواری بازار سے گزرتی، لوگوں کا دورویہ ہجوم ہو جاتا تھا۔ ہز ہائینس نواب بہاول پور، اور نوابانِ ڈیرہ جات آپ سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ اور اکثر نیاز حاصل کرنے کے لئے دربار شریف پر حاضری دیا کرتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں آپ کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ اور یادگار کے طور پر درجِ ذیل تین صاحبزادے چھوڑ گئے :۔

(۱) پیر ولایت شاہ (۲) سیّد شادی شاہ (۳) سیّد پیر شاہ

مخدوم پیر ولایت شاہ گیلانیؒ

مخدوم پیر ولایت شاہ تیس سال کی عمر میں آبار کرام کی مسند کے مالک بنے۔ آپ آنریری مجسٹریٹ، پراونشل درباری اور شہر کے با اثر مخدوم تھے۔ آپ کے زمانے میں شاہِ ترکستان، خانِ قلات، مہاراجہ پٹیالہ، نواب بہاول پور، راجہ فرید کوٹ،

گورنر بمبئی، مختلف اوقات میں خانقاہِ عالیہ پر حاضر ہوئے۔ اور آپ سے ملاقات کی۔ ۱۸۷۸ء میں، یعنی والدِ ماجد کے دس سال بعد آپ بھی خُلدِ بریں کو تشریف لے گئے۔ اور آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے مخدوم سیّد صدرالدین گیلانی رح سجادہ نشین قرار پائے۔

مخدوم شاہ محمودؒ کا انتقال

۲۷ر شعبان ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۶۹ء شیخ الاسلامؒ کے صاحب سجادہ مخدوم شاہ محمود نے عالمِ فانی سے عالمِ باقی کو انتقال فرمایا۔ آپ کے جنازہ میں ہزاروں آدمی شریک ہوئے اور اس روز سرکاری عدالتیں، دفاتر اور مدارس بطورِ ماتم داری بند رہے۔ ان کی جگہ ان کے بڑے صاحبزادے مخدوم بہاول بخش مشائخ سہروردکے متولی اور سجادہ نشین قرار پائے۔

مخدوم شاہ محمودؒ بڑے اثر ورسوخ کے بزرگ تھے۔ گورنمنٹ پنجاب نے مقابر کی مرمّت کے لئے دس ہزار روپے منظور کئے تھے، لیکن حکومتِ ہند نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ مخدوم صاحب نے اپنے مُریدوں کی اعانت سے تمام خانقاہوں کی خاطر خواہ مرمّت کرادی۔

خالصہ گردی نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو ختم کر دیا تھا۔ تبلیغی جماعتیں غیر قانونی قرار دے دی گئی تھیں۔ اعراس بجائے خود رہے، مسلمانوں کو اذان دینے کی اجازت نہ تھی۔ یہ انہی کا دم خم تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے نہ صرف خوف وہراس دُور کیا بلکہ ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی کہ وہی مسلمان جو چند سال پہلے غنڈہ عناصر کے ڈر سے اذان دیتے ڈرتے تھے، اب ان میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی، کہ ۱۸۶۰ء میں جب ہندوؤں نے چندہ کرکے پرہلادجی کا مندر تعمیر کرایا اور اس کے

کلس کو مقبرہ شیخ الاسلامؒ کے گنبد سے اونچا بے جانے کی سعی کی تو شہر میں کہرام برپا ہو گیا، اور انہوں نے اسے حضرت شیخ الاسلام کی صریح بے ادبی پر محمول کیا۔ اگرچہ مخدوم شاہ محمود نے مسلمانوں کو سکون میں لانے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود شدید ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جس پر گورنمنٹ نے ہندوؤں کو مجبور کر دیا کہ وہ پرہلاد کے کلس کو روضہ مطہرہ سے اوپر لے جانے کی حماقت نہ کریں۔ بالآخر سرمایہ دار قوم کو اپنے تمام حربے استعمال کرنے کے باوجود مسلمانوں کے جذبات کے آگے جھکنا پڑا۔

مخدوم شاہ محمود نے اپنی ذاتی قابلیت سے اس قدر جائیداد پیدا کر لی تھی کہ وہ ملتان کے رئیس اعظم سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح اُن کے چھوٹے بھائی، شیخ پیر شاہ کا شمار بھی بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔

آپ کے زمانے میں نواب محمد بہاول خاں ثالث ملتان تشریف لائے۔ انہوں نے مشائخ سہروردیہ رحمہم اللہ کے آستانہائے قدس پر حاضری دی اور ڈیڑھ ہزار روپیہ مخدوم صاحب کی خدمت میں نذر کیا۔ حضرت مخدوم نے قدیم دستور کے مطابق زنجیر فیل اور اسپ خاصہ عنایت فرمایا۔ ساتھ ہی نواب صاحب اور ان کے پورے عملے کے لئے لنگر غوثیہ سے پختہ ضیافت بھجوائی۔

۱۸۸۲ء تک کے مشہور واقعات

لارڈ کیننگ جنگ آزادی کے مجاہدین سے سخت انتقام لینے کے خلاف تھا اور جہاں تک اس سے ہو سکا۔ اس نے مجاہدین سے نرمی کا سلوک کیا۔ فوج نئے سرے سے ترتیب دی۔ اور کمپنی و گورنمنٹ کی فوجیں ملا کر ایک کر دی گئیں۔ ۱۸۶۲ء میں لارڈ کیننگ واپس انگلستان چلا گیا۔ ۱۸۶۹ء میں ملکہ وکٹوریہ کا دوسرا بیٹا ڈیوک آف ایڈنبرا ہندوستان میں آیا۔ لارڈ میو نے اس کا شایانِ شان استقبال کیا۔

۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم کے نام سے تخت نشین ہوا۔ ہندوستان کی سیر و سیاحت کے لئے آیا۔

۱۸۷۶ء میں لارڈ لٹن وائسرائے مقرر ہو کر آئے۔ ان کے زمانے میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کر کے انگلینڈ کے حکمران کے لئے قیصر ہند کا خطاب منظور کیا۔ چنانچہ لارڈ لٹن نے یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو دہلی میں ایک شاندار دربار منعقد کیا۔ جس میں ملکۂ وکٹوریہ کے قیصرۂ ہند ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اسی سال لارڈ لٹن نے علی گڈھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کالج کے بانی اور روحِ رواں سر سیّد احمد خاں تھے۔ جو اس دور میں مسلمانوں کے بڑے لیڈر تھے ۱۹۲۰ء میں یہ کالج مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

افغانستان کی دوسری جنگ

انگریزوں کے تعلقات روس سے سخت کشیدہ تھے اور انہیں افغانستان کے راستے سے روسی حملے کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ اس لئے انگریز امیرِ افغانستان سے دوستانہ تعلّقات قائم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن امیر شیر علی انگریزوں سے بدگمان ہو چکا تھا۔ اور وہ روس کی طرف مائل تھا۔ لارڈ لٹن نے کابل میں ایک سفارت روانہ کی جسے درّۂ خیبر سے ہی واپس لوٹا دیا گیا۔ اس پر لارڈ لٹن نے اعلانِ جنگ کر دیا۔

انگریزی افواج تین راستوں سے افغانستان پر حملہ آور ہوئیں۔ یعنی خیبر، کرم اور بولان کے درّوں سے۔ امرائے ملتان نے اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ امیر شیر علی مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ روس کی طرف بھاگ گیا اور وہیں فوت ہو گیا۔

انگریزوں نے امیر شیر علی خاں کے لڑکے محمد یعقوب خاں کو کابل کا حکمران تسلیم کر لیا اور اس کے ساتھ گنڈمک کے مقام پر ایک معاہدہ کیا۔ جس کی رُو سے امیر نے

کابل میں ایک ریذیڈنٹ رکھنا منظور کر لیا۔ افغانستان کے تمام دروں پر انگریزی قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ اور خارجی پالیسی میں انگریزوں کی ماتحتی قبول کر لی۔ لیکن ابھی اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ افغانوں نے انگریزی ریذیڈنٹ کو مگنیری اور اس کے شرکار کار کو قتل کر ڈالا، اور جنگ پھر چھڑ گئی۔

انگریزی جنرل رابرٹس نے کابل پر قبضہ کر کے محمد یعقوب خاں کو گرفتار کر لیا، اور شاہی قیدی کی حیثیت میں ہندوستان بھیج دیا گیا۔ ابھی جنگ جاری تھی کہ لارڈ لٹن واپس چلا گیا، اور اس کی جگہ لارڈ رپن کا تقرر ہوا۔ اس کے دور میں افغانستان کی دوسری جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور عبدالرحمٰن خاں کو امیر کابل تسلیم کیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کا اجراء عمل میں آیا۔

انڈین نیشنل کانگرس

انگریزوں نے ہندوؤں کی مدد سے مسلمانوں پر فتح پائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہندوؤں پر ہر قسم کی نوازشات کے دروازے کھول دیئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس غیر مساوی سلوک سے مسلمان روز بروز پستے اور ہندو اُبھرتے چلے گئے۔ اب یہ لوگ مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ متموّل اور تعلیم یافتہ تھے۔ چھوٹی بڑی ملازمتوں پر بھی انہی کا قبضہ تھا۔ جب ان کی پوزیشن مضبوط ہو گئی تو انہوں نے سیاست کی طرف قدم بڑھایا۔ انگریزوں کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ کبھی یہ تحریک اُن کے لئے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لئے خود ایک انگریز ہی کی کوششوں سے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا وجود عمل میں آیا۔ شروع شروع میں کانگرس کے مطالبات یہ تھے کہ مجلسِ قانون ساز کی توسیع کی جائے، اور ان میں ہندوستانی زیادہ تعداد میں لئے جائیں۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ ملازمتوں میں زیادہ تعداد میں لیا جائے، اور فوجی اخراجات کم کئے جائیں۔ اور اس وقت گورنمنٹ کا

رویّہ بھی کانگرس کی طرف ہمدردانہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ گورنمنٹ کا رویّہ بدلتا گیا اور کانگرس کا نقطۂ نگاہ بھی بدلتا گیا۔ انجام کار کانگرس کا نصب العین مکمل آزادی ہوگیا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کے لیڈر سر سیّد تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت نے بھانپ لیا تھا کہ اگر ابھی سے مسلمانوں نے اس میدان میں قدم رکھنا شروع کر دیا، تو یہ اور کمزور ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ تعلیم، تموّل اور سُوجھ بوجھ میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں میں تعلیم کا پرچار کیا، اور پاک و ہند کے طول و عرض میں دَورے کر کے جگہ جگہ اسلامیہ مدارس کا اجراء کرایا اور علی گڈھ مُسلم یونیورسٹی کو خوب چمکایا۔ مسلمانوں کو کانگرس سے دُور رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن جب کانگرس ایک زبردست سیاسی جماعت بن گئی تو مسلمان جو فطرتاً آزادی پسند تھے، جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے۔ علمائے دیوبند تو اس میں اس طرح مدغم ہوئے، کہ اس دلدل سے پھر نکل ہی نہ سکے۔ مسلمانوں نے کانگرس میں شامل ہو کر قابل قدر کام کیا۔ بڑی عظیم قربانیاں دیں۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور جب انگریزوں نے جذبۂ آزادی کو کچلنے کے لئے بندوقیں تانیں تو مسلمانوں نے اپنے سینے سامنے کر دیئے۔ چنانچہ جلیاں والہ کے مقام پر اور پشاور کے قصّہ خوانی بازار میں زیادہ جانی نقصان مسلمانوں کا ہی ہُوا۔ اس دَور میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مسٹر محمد علی جناح، مسیح الملک اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ سب پیش پیش تھے۔

مخدوم شیخ بہاول بخش قریشی کا انتقال

آپ مخدوم شاہ محمود کے بڑے فرزند اور حضرت شیخ الاسلام کے سجادہ نشین تھے۔ کم و بیش نو مواضعات میں آپ کی اراضیات پھیلی ہوئی تھیں۔ ۱۸۷۷ء سے تادمِ

وفات بلدیۂ ملتان کے رکن رہے۔ اور کچھ عرصہ بطورِ آنریری مجسٹریٹ بھی کام کیا۔
مخدوم صاحب کو مریدوں کی اصلاح کا بڑا خیال تھا۔ اس غرض کے پیش نظر آپ نے کئی بار سندھ کے دورے فرمائے اور خلیج کچھ کے اُن مقامات تک تشریف لے گئے جہاں سینکڑوں میلوں تک سمندری دلدل تھی اور میٹھے پانی کا نشان تک نہ تھا اس لئے آپ پانی کی مشکیں بھروا کر ہمراہ لے جاتے تھے۔ آپ کا فرزند جگر بند مخدوم زادہ شیخ محمد شاہ ایک ہونہار نوجوان تھا۔ ۱۸۹۴ء میں بقضائے الٰہی فوت ہو گیا۔ مخدوم صاحب اگرچہ بڑے حوصلہ مند انسان تھے۔ لیکن اکلوتے بچے کی جوانامرگ کے متحمل نہ ہو سکے۔ اور اس حادثہ فاجعہ کے دو سال بعد ۱۸۹۶ء میں آپ بھی عالمِ فانی سے عالمِ باقی کو انتقال فرما گئے۔ اور جدِّ اعلیٰ کے قدموں میں سپردِ خاک ہوئے۔ چونکہ آپ نے کوئی وارث نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے آپ کے بعد آپ کے چھوٹے بھائی مخدوم شیخ حسن بخش صاحب سجّادہ بنے۔

رام راجیہ کے منصوبے

ہندو میدانِ فصاحت کے شہسوار نہیں تھے، اور نہ ہی عوام پر اپنی گھن گرج سے اثر ڈال سکتے تھے اُن کے مقابلے میں مسلمان لیڈر ریلا کے خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی آتش بیانی سے برطانوی پارلیمنٹ میں تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ اور انگریز کے قصرِ استبداد کی بنیادیں تک ہلا دی تھیں۔ مسلمان عوام کی یہ کیفیت تھی کہ وہ شجرِ حُرّیت کو اپنے خُون سے سینچ رہے تھے۔ جیلوں، سٹیجوں، مظاہروں، غرضیکہ ہر جگہ مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے۔ بایں ہمہ ہندوؤں کا ذہن بُغض و عناد سے بھرا ہُوا تھا۔ "بغل میں چھُری مُنہ میں رام رام" کے مصداق جلسوں میں مسلمان لیڈروں کی تعریف کرتے۔ اور ہندو مسلمان بھائی بھائی" کا نعرہ لگاتے، مگر اپنی خفیہ سبھاؤں میں گاندھی، پٹیل، نہرو اور اچاریہ کرپلانی تک سب

مخدوم شیخ بہاول بخش صاحب قریشی رح
المتوفی ۸ شعبان ۱۳۱۳ھ

رام راجیہ کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں پر ہندوؤں کے یہ ناپاک ارادے منکشف ہوتے چلے گئے۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ کانگریس سے علیحدگی پر مجبور ہو گئے۔

مسلم لیگ کا قیام

انجام کار ڈھاکہ کے مقام پر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وجود عمل میں آیا۔ مسلمانوں کی یہ انتہائی خوش قسمتی تھی کہ اُنہیں ایسے نازک دور میں قائدِ اعظم محمد علی جناح جیسی عظیم شخصیت راہنمائی کے لئے میسّر آ گئی۔ جس نے تھوڑے سے عرصے میں سر توڑ کوشش کر کے اس نوزائیدہ جماعت کو کانگریس کا مدِّ مقابل بنا دیا۔

معاہدہ لکھنؤ

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۶ء تک مسلمان اپنی تعلیمی کمی پوری کرتے رہے۔ ان دس سالوں میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور دوسرے اسلامی اداروں نے تعلیم کے ذریعے مسلمانوں میں کافی شعور پیدا کر دیا۔ ۱۹۰۹ء میں انگریز آئینِ ہند میں مسلمانوں کے قومی حق کو تسلیم کر چکے تھے۔ اب لکھنؤ میں ہندو نیتاؤں نے بھی اس پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اور مسلمانوں کی جُداگانہ حیثیت مُسلّم ہو گئی۔

جنگِ عظیم

۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر اس کا بڑا بیٹا ایڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوا اور وہ ۹ سال حکومت کر کے ۸ مئی ۱۹۱۰ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی جگہ ۹ مئی ۱۹۱۰ء کو جارج پنجم تخت پر بیٹھا۔ ۱۹۱۱ء میں اس نے معہ ملکہ میری کے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں ایک عظیم الشان دربارِ تاجپوشی منعقد ہوا جس میں ملک کے تمام راجوں، مہاراجوں اور امراء نے شرکت کی۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہو گئی، جس میں ہندوستان کو بھی شریک ہونا پڑا۔ ہندوستانیوں نے دل کھول کر جان اور مال سے انگلینڈ کی مدد کی۔ ملک کے چوٹی کے لیڈر قائدِ اعظم محمد علی جناح اور مسٹر گاندھی دونوں نے سرکار کو اس بھرتی میں مدد دی۔ ملتان نے اس مہم میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اور انگریزوں کی ہر طرح سے امداد کی۔

تحریکِ خلافت

جنگ میں اتحادیوں کو شاندار فتح ہوئی۔ مگر اس نشے میں انگریز وہ تمام وعدے بھول گیا، جو اس نے سلطانِ ترکی اور مقاماتِ مقدسہ کے سلسلے میں مسلمانوں سے کئے تھے۔ اس کی شہ پر یونانیوں نے ترکوں پر ایسے مظالم توڑے کہ ان کے اظہار سے قلم کا جگر پھٹتا ہے۔ خلافت کی قبا چاک چاک کر دی گئی اور ترکوں کے سامنے ایسی اہانت آمیز شرائط پیش کیں کہ اسلامی دنیا رنج اور غم سے چیخ اٹھی۔ پاک و ہند کے مسلمانوں نے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت کی تحریک شروع کر دی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ خلافت اور سلطنتِ ترکیہ کا تحفظ کیا جائے۔ گاندھی مسلمانوں کے دانا دشمن تھے، انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کو خوب ابھارا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک زبردست سلطنت کی قوت کے آگے ہندوستانی مسلمانوں کی یہ تحریک کوئی وزن نہیں رکھتی البتہ مسلمان بری طرح سے پٹیں گے۔ اور سیاسی طور پر کافی حد تک کمزور ہو جائیں گے۔ چنانچہ ترکِ موالات اور عدم تعاون کا پروگرام منظرِ عام پر آیا۔ مسلمان اس خاکہ میں رنگ بھرنے کے لئے آگے بڑھے، ملازموں نے ملازمتیں اور مزدوروں نے مزدوری چھوڑ دی، طلباء نے سکول اور کالج جانا بند کر دیا۔ ہنستے کھیلتے لاکھوں نے سینوں پر گولیاں کھائیں۔ جیلوں کو آباد کیا۔ مگر گاندھی جی تو مسلمانوں کو ایک قدم اور آگے لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہجرت کی تجویز پیش کی، مسلمانوں نے جذبات کے جوش میں نتائج کی کوئی پرواہ نہ کی، مسلمانوں کا ایک زبردست ریلا افغانستان کی طرف بڑھا، مگر آگے جب سرما کی شدت اور کابل و غزنی کی یخ بندی نے ضیافت کی تو دماغ ٹھکانے آگیا۔ کئی سردی میں اکڑ گئے، اور جو مر کھپ کر واپس آئے تو وہ نانِ شبینہ کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ اس دوران کانگریس پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو چکی تھی، اور مسلم لیگ کا تقریباً دیوالیہ نکل چکا تھا۔ مسلمانوں کو اس میں کوئی جاذبیت اور دلکشی نظر نہ آئی تو وہ پھر کانگریس سے ہمکنار ہو گئے۔ اور گاندھی نے کہنا شروع کر دیا کہ مسلم لیگ تو

ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے اس کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریکِ خلافت کے خاتمہ پر مسلمانوں نے جو آنکھ کھولی تو ان کے ذہنوں پر ہندو وجاتی کا قبضہ ہو چکا تھا اور ملک میں پھر وہی دو طاقتیں نظر آ رہی تھیں یعنی کانگریس اور حکومت۔ مسلمان بے اختیار اس دھارے میں بہتے چلے گئے، یہاں تک کہ اس قوم نے دس سال کے عرصے میں جو تھوڑا بہت ملّی احساس پیدا کیا تھا، وہ گاندھی کی سیاست سے برباد ہو گیا۔

افغانستان کی تیسری جنگ

۱۹۱۹ء میں افغانستان کے حکمران امیر حبیب اللہ خاں کو کسی نے قتل کر دیا، اور اس کی جگہ اس کا بیٹا امان اللہ خاں تخت نشین ہوا۔ وہ انگریزی اثر سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اُن دنوں پاک و ہند میں رولٹ ایکٹ کے سبب انتشار سا پھیلا ہوا تھا۔ تحریکِ خلافت کے دوران جو لوگ ہجرت کر کے کابل پہنچے تھے۔ انہوں نے امان اللہ خاں کو یقین دلایا تھا۔۔۔ کہ ہندوستانی عوام برطانوی حکومت سے سخت نالاں ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس ملک پر حملہ کرے تو ہندوستانی عوام یقیناً اس کا ساتھ دیں گے۔ ترکِ موالات کی تحریک سے ان افواہوں کی اور تصدیق ہوئی۔ جس پر امیر امان اللہ خاں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ تمام سرحد پر لڑائی چھڑ گئی۔ درّۂ خیبر میں تو انگریزوں کا پلّہ بھاری رہا اور انہوں نے ہوائی جہازوں سے جلال آباد اور کابل پر بم بھی گرائے لیکن جنوبی محاذ میں جنرل نادر خاں نے انگریزوں کو سخت پریشان کیا۔ اور فورٹ سنڈیمن کا محاصرہ کر لیا۔ انجام کار دونوں حکومتوں نے بہتری اسی میں دیکھی کہ صلح کر لی جائے۔ چنانچہ ۱۸ اگست ۱۹۲۱ء کو راولپنڈی کے مقام پر صلح نامہ ہوا۔ جس کی رو سے دونوں حکومتوں نے اپنی اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ اور امیر افغانستان کو خود مختار تسلیم کر لیا گیا۔ فریقین نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے علاقوں میں کچھ خاص مراعات بھی دیں اور اس طرح ایک نیم دوستانہ ماحول پیدا ہو گیا۔

فسادِ محرم ۱۹۲۲ء

یوں تو ان دنوں پورا برّصغیر کانگریس کے زیرِ اثر آچکا تھا اور ہندو مسلمانوں میں بظاہر کوئی مغائرت نہیں رہی تھی۔ یہاں تک کہ بعض جگہ ہندو مسلمان ایک میز پر کھانا بھی کھانے لگے تھے۔ لیکن ملتان اِس مودّت، اور یگانگت میں پورے برّصغیر سے بازی لے گیا تھا۔ ہندو شہر کے متعدد مقامات پر سبیلیں لگا کر مسلمان بھائیوں کو پانی پلاتے اور ان کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمان بھی ان کے دُکھ کو اپنا دُکھ اور ان کے سُکھ کو اپنا سُکھ سمجھنے لگے تھے۔ کئی رات تک پبلک جلسے ہوتے جس میں انگریزوں کو بُرا بھلا کہا جاتا۔ اور "آلو بیچنے والو! ہمارے ملک سے نکل جاؤ" کے نعرے لگائے جاتے۔ مسلمان امراء کے ساتھ صوفیاء کا طبقہ بھی ہندو مسلم اتحاد کو تقویت دینے میں برابر مصروفِ عمل تھا۔ چنانچہ وادئ سندھ کے مشہور ولی اور صوفی شاعر حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ اگر ایک طرف اپنے پیارے مرید نواب صادق محمد خاں فرماں روائے بہاول پور کو "پٹ انگریزی تھانے" کا درس دے رہے تھے تو دُوسری جانب سندھ کی پوری وادی "مسجد مندر ہِکّو نُور" سے گونج رہی تھی۔ اُنہی دنوں مسٹر گاندھی ملتان آئے۔ تمام شہر ان کے استقبال کو نکل آیا۔ موصوف ایک بیل گاڑی پر بیٹھے چرخہ کاتتے، ہندو مسلم بھائی بھائی کہتے چوک بازار سے گزر گئے۔ ملتان کے متعصب انگریز ڈپٹی کمشنر ایمرسن کو یہ منظر پسند نہ آیا اور اس نے ہندو مسلم اتحاد کے خرمن کو جلا کر راکھ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۰ محرم کو عین اُس وقت جبکہ تمام شہر میں ماتمی جلوس نکلے ہوئے تھے، سینہ کوبی ہو رہی تھی اور "آہ حسین واہ حسین" کے نعروں سے ملتان کی فضائے بسیط گونج رہی تھی اور درکھانوں والا تعزیہ چوک علی محمد خاں سے گزر کر پاک دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا، دفعۃً ایک پولیس سپاہی نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت اس پر اینٹ پھینک دی۔ پھر کیا ہُوا؛ بپھرے ہوئے مسلمان نوجوان ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں گاجر مُولی کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ ہندوؤں

حکیم الامت علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ

نے مکانوں کی چھتوں سے تیزاب انڈیلنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ فساد پھیلتا چلا گیا، یہاں تک کہ پورا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ پولیس اور فوج کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ اس موقع پر حضرت مخدوم سید صدرالدین شاہ گیلانی اور ان کے نامور بھائی مخدوم سید راجن بخش گیلانی حسین آگاہی کے قریب تعزیہ کمنگراں کی ڈیوٹی پر متعین تھے۔ انہیں اطلاع ہوئی تو بے چین ہو کر پہنچے، اور اپنے بے پناہ اثر و نفوذ کے طفیل مشتعل ہجوم کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اس وقت تمام شہر جل رہا تھا۔ ہر طرف کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ دیہات سے ہزاروں مسلمان "علیؓ علیؓ" کے نعرے لگاتے شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ اس لئے پورے شہر کو قتل و غارت سے بچانے میں تین دن لگ گئے۔ اس عرصے میں ہزاروں ہندو اور مسلمان قتل ہو گئے کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ اور یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر اکھٹے نہیں رہ سکتے۔ ہندو مسلم اتحاد اس شہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سر پیٹتا رخصت ہو گیا۔ یہی صورتِ حال رفتہ رفتہ پورے ملک پر مسلط ہو گئی۔ محسوس کیا جانے لگا کہ اس کشمکش کا واحد حل یہی ہے کہ دونوں قوموں کو الگ الگ رہنے کا موقع دیا جائے، اور مسلمانوں کو الگ آزاد حکومت قائم کرنے کا حق دیا جائے۔

پاکستان کا تخیل

چنانچہ جب یہ معاملہ علامہ محمد اقبال کے سامنے رکھا گیا تو انہوں نے سید جمال الدین افغانی کی تجویز کے پیش نظر ایک اسلامی ریاست یعنی "پاکستان" کا تصور پیش کیا کہ پنجاب، کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک الگ سلطنت بنا دی جائے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں براہینِ قاطعہ کے ساتھ اس امر کو ثابت کیا کہ مسلمان ہندوؤں سے مذہب اور تمدن میں بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے انہیں ایک فیڈریشن میں جکڑنا قطعاً مشکل ہے۔ ہندوؤں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور مسلمانوں کی کشتی ڈبونے کی پوری کوشش کی۔ مگر قائد اعظم نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

مخدوم شیخ حسن بخش قریشی کا سانحۂ ارتحال

۱۳ر محرم سنہ ۱۳۴۰ھ کو حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرّہٗ کے صاحب سجادہ مخدوم شیخ حسن بخش قریشی کا انتقال ہو گیا۔ آپ علم و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنے کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں جمع کر رکھی تھیں، اور آپ نے اپنے جدِّ اعلیٰ اور سلسلۂ سہروردیہ کے حالات پر "انوارِ غوثیہ" نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

آپ کے زمانے میں ملتان کا قلعہ اگرچہ جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکا تھا، تاہم فوجی بارکوں کے سبب رات کے وقت اس میں داخلہ ممنوع تھا۔ مشائخ سہروردیہ کی خانقاہوں کے خدام قلعے میں رہتے تھے، اور حضرت مخدوم بھی مجاز تھے کہ جب چاہیں تشریف لے آئیں۔ حضرت مخدوم کے زمانے تک زائرین گروہ در گروہ اس حالت میں آستانۂ زکریا پر حاضر ہوتے تھے کہ اُن کے آگے ایک شخص جھنڈا اُٹھائے ہوئے ہوتا تھا۔ اگرچہ اب بھی زائرین کی آمد و شد کی وہی کیفیت ہے لیکن جھنڈا ہمراہ لانے کا دستور نہیں رہا۔

۲۵ر فروری ۱۹۰۸ء کو نواب صادق محمد خاں عباسی ملتان تشریف لائے اور شیخ الاسلام اور حضرت قطب الاقطاب رحمہم اللہ کے آستانہائے قدسی پر حاضری دے کر ایک ہزار روپیہ حضرت مخدوم صاحب کی خدمت میں نذر کیا۔ مخدوم صاحب نے معمول کے مطابق نواب اور ان کے عملہ کو لنگر سے پختہ ضیافت بھجوائی اور ایک عنان اسپ اور ایک دست بازبھی پیش کیا۔

مخدوم صاحب انجمن اسلامیہ کے صدر، انجمن اتحاد کے نائب صدر اور رؤسائے پنجاب کی یونین کے ممتاز رکن تھے۔ اوّل اوّل آپ کو سب رجسٹرار کا عہدہ تفویض ہوا تھا۔ چونکہ نیا عہدہ تھا، آپ نے قبول کر لیا، مگر منصبِ سجادگی کے سنبھالتے ہی مستعفی ہو گئے۔ تیرہ سال تک آپ شہر کے میونسپل کمشنر اور تادمِ زیست آنریری مجسٹریٹ رہے۔ دیوانی عدالت کی حاضری آپ کو معاف تھی۔ آپ نے دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ یہ شیخ مرید حسین اور شیخ احمد کبیر۔ آپ

مخدوم شیخ حسن بخش صاحب قریشی رح

المتوفی ۱۳ محرم ۱۳۴۰ھ

کی وفات پر اول الذکر صاحب سجّادہ قرار پائے۔

ملتان کے سیاست دان

ملتان کی مُسلم سیاست ان دونوں قریشی اور گیلانی مخادیم کے ہاتھ میں تھی جن کے اسمار گرامی درج ذیل ہیں

۱۔ نواب مخدوم مرید حسین قریشی ایم ایل اے
۲۔ خان بہادر مخدوم راجن بخش گیلانی۔ ایم ایل اے
۳۔ مخدوم زادہ سیّد محمد رضا شاہ گیلانی۔ ایم پی اے
۴۔ میجر عاشق حسین قریشی۔ ایم پی اے
۵۔ سیّد زین العابدین شاہ گیلانی

ہندوؤں کی اقلیمِ سیاست پر لالہ شیو دیال ایم اے ایڈووکیٹ، پردھان ہندو مہاسبھا۔ لالہ کیول کرشن صدر ضلع کانگریس۔ لالہ یودھراج ایم ایل اے۔ اور لالہ فتح چند ٹوبن کا سکّہ چلتا تھا۔ پنڈت شیودت رنگا بلاشبہ بہترین ادیب اور شعلہ نوا مقرر تھے۔

ہندوؤں کے چار اخبارات "ویر کیسری"۔ "بیدار"۔ "مسافر" اور حقیقت نکل رہے تھے ان کے متعدد پریس تھے۔ مسلمانوں کا صرف ایک چھاپہ خانہ تھا۔ یونین پرنٹنگ پریس، جو مولوی منوّر الدین کی قلندرانہ جرأت کا ثمرہ تھا۔ البتہ بعد میں خان محمد اکرم خاں جرأت کر کے آگے بڑھے۔ پہلے تو انہوں نے روزنامہ "شمس" جاری کیا۔ پھر "مطبع شمس" کے نام سے ایک پریس بھی لگا لیا۔ اخبارات میں ہفت روزہ "صادق" لعل دین عاصی نکالتے تھے۔ ہفت روزہ اخبار "اسلام" واحد ندوی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ غلام علی ظفر "طوفان" نکال رہے تھے بعد میں شیخ مظفر الدین نے "نربندا رسُدھار" نامی ہفت روزہ جاری کیا۔ کچھ عرصہ مولوی محبوب احمد اُویسی ہفت روزہ "محسن" بھی نکالتے رہے۔

ہندوؤں نے سیوا دَل، مہابیر دَل، پرتاپ سینا، سیوا اجی سینا، راشٹریہ سیوک سنگ،

گورو کل اور کانگریس والنٹیئرز کور کی صورت میں خفیہ اور ظاہر بے شمار تنظیمیں قائم کر رکھی تھیں ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی صرف ایک تنظیم "فدایانِ اسلام" تھی۔ جسے سیّد زین العابدین گیلانی نے مخصوص وردی میں ملبوس اور صرف کلہاڑی سے مسلح کر رکھا تھا۔ اگرچہ ہندوؤں نے اخبارات میں واویلا مچا کر کلہاڑی ضبط کرا دی تھی۔ بایں ہمہ اپنے ذہنوں سے کلہاڑی کا خوف نہ نکال سکے۔ ایک دفعہ جبکہ گپ میدان میں پنڈت شودت رنگا چھانی کا پورا زور لگا کر اس طرح گرج رہے تھے کہ:۔

"وہ زمانے لد گئے جبکہ علیؓ علیؓ کے نعروں سے ہندو سہم جایا کرتے تھے۔ اب نہ وہ ہندو رہا اور نہ مسلمانوں کے وہ دن۔ جے چند کی نسل معدوم ہو چکی۔ اب کوئی غوری نہیں آسکتا۔ آج ہر ہندو بچہ بھیم و ارجن ہے۔ سیوا جی و پرتاپ ہے، بیر بندہ اور ہری سنگھ نلوہ ہے۔ یہ بے چارا زین العابدین کیا اور اس کے فدائی کیا..... !"

پنڈت جی کی اس آتش بیانی کے دوران دفعتہً مجمع میں" او آ گیا" کی زوردار چیخ سنائی دی، اور ساتھ ہی کسی نے کہہ دیا۔ "کلہاڑی والا"۔ بس پھر کیا تھا کہ ہزاروں بھیم اور ارجن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے، اور رنگا جی سکتہ کے عالم میں منہ کھولے کھڑے رہ گئے۔[1] اس طرح کی تقریریں ہندو اپنے خفیہ اجلاسوں میں کرتے تھے۔ مگر مسلمانوں کے سامنے آنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔

مسجد شہید گنج کا حادثہ

۱۹۳۴ء میں مسٹر ایمرسن نے جو اب پنجاب کا گورنر تھا لاہور میں پھر فساد کرا دیا۔ دہلی دروازہ سے مسجد شہید گنج تک گورہ فوج کی وحشیانہ فائرنگ سے ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں برصغیر کے مسلمانوں میں کہرام برپا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے جا رہے

[1] یادوں کے چراغ، از واحد ندوی

تھے۔ جب اس واقعہ کی اطلاع ملتان پہنچی تو مسلمان تڑپ کر باہر نکل آئے۔ ایک عظیم جلوس دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود شہر کے بازاروں اور سڑکوں سے ہوتا ہوا مسجد جنازہ گاہ میں آکر ختم ہوا۔ ملتان کا انگریز کمشنر، انگریز بریگیڈیئر، انگریز ڈپٹی کمشنر، انگریز ایس پی اور انگریز کوتوال کو جلو میں لیے جلوس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس خلاف قانون مجمع میں مخدوم سیّد راجن بخش، مخدوم سیّد محمد رضا، اور خان بہادر غلام فرید ڈاہا بھی سیاہ کفن پہنے عوام کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ انگریز حکام کو دیکھ کر لوگوں نے بیک زبان نعرے لگانے شروع کیے:

"گورنر ایمرسن مردہ باد!"

"گورنر ایمرسن پر لعنت!"

"دس ہزار مسلمان نوجوانوں کا قاتل ایمرسن ہائے ہائے!"

کمشنر نے گھبرا کر کہا "مخدوم صاحبان! آپ یہاں کیسے؟"

تینوں حضرات نے بیک زبان کہا— "تو کیا آپ ہمیں اپنی قوم سے جدا سمجھتے ہیں؛ ہماری زندگی اور موت اپنی قوم سے ہی وابستہ ہے"۔ اس پر تمام گورے حکام دم بخود واپس لوٹ گئے۔ جلسہ ہوا، تقریریں ہوئیں، جلوس نکلا، مگر اکابرینِ ملتان کے اثر و نفوذ کے سبب حکومت کو سخت ایکشن لینے کی جرأت نہ ہوئی[1]

کوئٹہ کا خوفناک زلزلہ اور قریشی اکابر کی وفات

۱۹۳۵ء میں کوئٹہ، قلات اور بلوچستان کے طول و عرض میں شدید زلزلہ آیا۔ جس سے چھپن ۵۶ ہزار آدمی دب کر مر گئے اور لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہوا۔ ملتان کے مقتدر رئیس اعظم نواب ریاض حسین قریشی ان دنوں تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے

[1] "یادوں کے چراغ" از وآحد ندوی

اپنے صاحبزادے کپتان مقبول حسین کے پاس کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔ وہ بھی مع اپنے فرزند جگربند اس حادثے کا شکار ہو گئے۔ سارے کنبے میں سے صرف کپتان مقبول حسین کی دو صاحبزادیاں اور ان کی والدہ ماجدہ زندہ بچ سکیں۔ مرحومین کی لاشیں ملتان پہنچیں تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔ ہزاروں آدمی جنازے میں شریک ہوئے اور شہداء کو حضرت غوث پاکؒ کے قدموں میں سپرد خاک کیا گیا۔ قل خوانی کے موقع پر نواب مخدوم مرید حسین قریشی نے میجر عاشق حسین قریشی کی دستار بندی فرمائی۔

مخدوم راجن بخش گیلانی کی وفات

۳؍ اپریل ۱۹۳۶ء بروز جمعہ مخدوم راجن بخش گیلانی تین سال بعارضہ ذیابیطس بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ مرحوم بے پناہ اثر و نفوذ کے مالک تھے۔ کم و بیش ۳۳ سال میونسپل کمیٹی ملتان کے بلامقابلہ ممبر منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں اس کمیٹی کے پہلے غیر سرکاری پریذیڈنٹ بنے۔ اور تا زندگی اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ بیس سال کامل کونسل کے بلامقابلہ رکن منتخب ہوتے رہے۔ اور چونکہ لیجسلیٹو اسمبلی کے سب سے پرانے ممبر تھے اس لئے برصغیر پاک و ہند میں "فادر آف اسمبلی" کے نام سے موسوم ہوئے۔ آپ کے صاحبزادگان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:۔

سیّد غلام محی الدین شاہ (ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر) سیّد غلام نبی شاہ، سیّد غلام دستگیر اور سیّد عبداللہ شاہ

قرارداد لاہور

۱۹۴۰ء میں اُسی اقبالؒ کے پہلو میں جس نے سب سے پہلے اسلامی ریاست کا تخیّل پیش کیا تھا۔ مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا اور اس میں واشگاف الفاظ میں مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کو مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم کر دیا جائے۔ شمال مشرق اور شمال مغرب کی مسلم اکثریت کے صوبوں کو مسلمانوں کا وطن قرار دے دیا جائے۔ یہ تجویز "قرارداد لاہور" کے نام سے موسوم ہوئی۔ ۱۹۴۲ء تک قرارداد لاہور کو پاکستان کا نام نہیں دیا گیا تھا۔

خود ہندوؤں نے "پاکستان پاکستان" پکار کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ یکم مارچ ۱۹۴۲ء کو قائدِ اعظم نے اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم نے اس تجویز کو پاکستان کا نام نہیں دیا تھا۔ لیکن چونکہ ہمارے دُشمن ہمیں چڑانے کے لئے اس نام کو پکار رہے ہیں، اس لئے آج سے ہم اس قرارداد کو "پاکستان" ہی کے نام سے پکاریں گے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دُوسری عالمگیر جنگ نے ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس جنگ سے بڑا خطرہ انگریزوں کو تھا۔ جرمنی اور جاپان کے سبب لڑائی ہندوستان کے بہت قریب دکھائی دینے لگی۔ ان حالات میں انگریزوں کو ہندوستانیوں کی امداد اور تعاون کی اشد ضرورت تھی، اس لئے حکومتِ برطانیہ نے مسٹر کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ جس نے یہ "پیغامِ مسرت" لا کر سنایا کہ جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کو نوآبادیات کا درجہ دے دیا جائے گا۔ مگر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ یورپ میں ہٹلر فاتحانہ یلغار کر رہا تھا۔ جاپان کی شہ پر آزاد ہند فوج نے ہندوستان پر قبضے کا اعلان کر دیا۔ اور ہندوستان میں ہندوؤں نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کر دی۔ حکومت نے تمام کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ جس سے ملک میں فسادات شروع ہو گئے۔ کانگریسی ایک طرف تو حکومت کو نکل جانے کی دھمکی دے رہے تھے۔ دُوسری جانب مسلمانوں پر بھی اپنا رعب ڈال رہے تھے۔ بہرحال لڑائی میں انگریزوں کو جیت ہوئی اور کانگریس کی یہ تحریک کچھ عرصہ کے لئے دب کر رہ گئی۔

شملہ کانفرنس

جنگ کے خاتمہ پر انگلستان میں چرچل کی بجائے مسٹر اٹیلے نے مزدور وزارت بنائی اور کانگریس کے تمام لیڈروں کو رہا کر دیا۔ گاندھی جناح گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں گاندھی نے چار و ناچار پاکستان کے بنیادی اصُول کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول وائسرائے ہند نے نئی کابینہ کی تشکیل کے لئے ہندو اور مسلمان لیڈروں کو بلایا مگر یہ کانفرنس کانگریس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ ویول سکیم کی ناکامی پر ملک

میں عام انتخابات کا اعلان ہوا، کانگرس نے انتخابات کے ذریعے مسلم لیگ کو شکست دینے کی کوشش کی، مگر ہر جگہ سوائے ندامت کے اُسے کچھ نہ ملا۔ اور مسلم لیگ سو فیصدی کامیاب ہوئی ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو ملک بھر میں یوم فتح منایا گیا۔ اور دُنیا پر ثابت ہوا کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ دہلی میں ایک عظیم جلسہ منعقد ہوا۔ بعض دستکاروں نے قائدِ اعظم کی خدمت میں ہدیے پیش کئے۔ ان میں ایک چھوٹی سی توپ اور اس کے کارتوس بھی تھے۔ قائدِ اعظم نے اس موقع پر پہلی مرتبہ اردو میں تقریر کی [1]

الحاج مخدوم سیّد محمد صدرالدین جیلانی کی وفات

۱۰ محرم ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) کو ملتان کے بہت بڑے عارف، طریقت و معرفت کے بدرِ منیر اور حضرت مخدوم سیّد محمد جمال الدین موسیٰ پاک شہید قدس سرّہٗ کے صاحب سجّادہ حضرت مخدوم سیّد محمد صدرالدین شاہ صاحب جیلانی کا انتقال ہو گیا۔ آپ سیّد نور شاہؒ الملقّب بہ مخدوم سیّد حامد گنج بخش رابع علیہ الرحمتہ کے پوتے اور حضرت مخدوم سیّد محمد ولایت شاہؒ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے۔ خواص و عوام میں بڑے پیر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عابد انسان تھے۔ قوم و ملّت کی طرف سے جب کبھی "من انصاری الی اللہ" کی صدا بلند ہوتی تو سب سے پہلے آپ لبّیک فرماتے تھے۔ آپ کے اثر و نفوذ کا یہ عالم تھا کہ جب بھی ملتان میں کوئی ہندو مسلم فساد ہوا محض آپ کے وجود کے طفیل ہی عوام نے ہلاکت سے نجات پائی۔ انگریزی انتداب کے زمانے میں آپ کا ضمیر ہر قسم کی ترغیب و ترہیب سے پاک رہا۔ ۱۹۱۹ء میں جب انگریزوں نے سلطان عبدالحمید خاں فرمانروائے ترکی کے خلاف کفر کے فتویٰ پر علماء و مشائخ سے دستخط کرائے تو آپ نے بڑی بے باکی سے انکار کر دیا۔ اسی طرح حج کے سفر میں جب آپ شاہ عبداللہ والیٔ اُردن کے مہمان تھے۔ اور اس نے آپ سے دریافت کیا کہ ہندوستان کے مسلمان میرے والد ماجد خلیفتہ المسلمین شریف حسین والیٔ حجاز کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں

[1] پاکستان ناگزیر تھا۔ از سید حسن ریاض صہ ۲۷۷

تو آپ نے بلا تامل جواب دیا کہ ہندوستان کے تمام لوگ آپ کے والد کو غدّار خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ اس موقع پر موجود تھے اُن کا بیان ہے کہ یہ جواب سُنتا تھا کہ شاہ عبداللہ کے ہاتھ سے لقمہ گر پڑا۔ مگر آپ کی جلالت قدر اس پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوئی کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا، بلکہ آپ کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر اُس نے آپ کا زیادہ احترام کیا، اور آپ کے و آپ کے جملہ رفقاء کے لیے سپیشل ٹرین کا انتظام کر دیا اور بڑی عزت سے رخصت کیا۔ ترکوں کی شکست پر ملتان کے اکثر مشائخ کمشنر کو مبارکباد دینے گئے، مگر آپ خاموش رہے۔ اور جب انگریز کمشنر نے آپ سے اس امر کا شکوہ کیا تو آپ نے صاف کہہ دیا کہ میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترک بھائیوں کی شکست پر آپ کو مبارک کیسے دے سکتا تھا۔ ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعلائے کلمۃ الحق میں حضرت مخدوم صاحب علیہ الرحمۃ کا مقام کتنا بلند تھا۔ سنِ شعور سے عالمِ وفات تک آپ سے کوئی نماز قضا نہ ہوئی۔ اگرچہ آخری عمر میں آپ کو متعدد عوارض لاحق ہو گئے تھے اس کے باوجود آپ تمام نمازیں با جماعت ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وفات کے دن بھی آپ نے عصر کی نماز باجماعت پڑھی اور اس کے چند لمحات بعد انتقال فرمایا۔ آپ کا حلقۂ ارادت بڑا وسیع تھا۔ حضرت مخدومؒ کے چار صاحبزادے تھے۔ سیّد مختار حسین شاہؒ کا ۲۳ جمادی الاوّل ۱۳۳۱ھ کو آپ کی زندگی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ فقر و ولایت میں مرحوم کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ شیر شاہ کے قریب چاہ سہری والے پر جہاں آپ مصروفِ عبادت رہے تھے، برسات کے بعد ہر سال یہاں آپ کا عرس ہوتا ہے۔ مخدوم صاحب کے انتقال پر درج ذیل تین صاحبزادے موجود تھے:۔

۱۔ مخدوم زادہ سید محمد غلام یٰسین شاہ

۲۔ مخدوم زادہ سید غلام مصطفےٰ شاہ

۳۔ مخدوم زادہ سیّد محمد رضا شاہ

اگرچہ مخدوم زادہ سیّد غلام یٰسین شاہ بڑے بیٹے ہونے کے سبب اپنے آپ کو سجّادگی کا حقدار

خیال کرتے تھے۔ لیکن چونکہ گیلانی خاندان میں منصبِ سجادگی وراثت نہیں سمجھا گیا اور اولاد میں سے جس صاحبزادہ کو اس منصب کا زیادہ اہل خیال کیا جاتا تھا۔ گیلانی اکابرین اسے ہی سجادہ تسلیم کرتے تھے اس لئے بڑے پیر صاحب کے انتقال پر مخدوم زادہ سیّد غلام مصطفیٰ شاہ صاحب رح بالاتفاق گیلانی خاندان کے سربراہ اور حضرت موسیٰ پاک شہید علیہ الرحمۃ کے سجادہ نشین قرار پائے۔

فسادات

۱۹۴۶ء میں برطانیہ کا وزارتی وفد ہندوستان آیا، جو لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس، اور اے وی الیگزنڈر پر مشتمل تھا۔ انہوں نے ہندو مسلم لیڈروں سے ملاقاتیں کیں، دونوں فریق اپنے اپنے مطالبات پر سختی سے قائم تھے۔ ۱۶ مئی کو وزارتی مشن نے اپنی سفارشات کا اعلان کر دیا۔ ان سفارشات کی رُو سے طے پایا کہ جو پارٹی اس فیصلہ کو قبول کرے گی اُسے عارضی حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ اس سکیم میں چونکہ پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس لئے کانگرس نے گروپ بندی کے خلاف احتجاج کیا لیکن مسلم لیگ نے ۶ جون ۱۹۴۶ء کے اجلاس میں ان سفارشات کو منظور کر لیا۔ اور قائدِ اعظم کو اختیار دے دیا کہ وائسرائے سے گفت و شنید کر کے وہ عبوری حکومت بنانے کی سعی کریں۔ لیگ کے اس فیصلہ پر کانگرس بڑی برہم ہوئی اور اس نے لارڈ ویول سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے پنڈت جواہر لال نہرو کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دی۔ کانگرس کی وزارت کے منظرِ عام پر آتے ہی ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ اب رام راج قائم ہو گیا، اور ملک بھر میں فسادات شروع ہو گئے۔

لیگ کونسل نے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو ڈائرکٹ ایکشن کا دن مقرر کر رکھا تھا۔ اس موقع پر جب مسلمانوں کے جلوس نکلے تو نہتّے مسلمانوں کو ہندوؤں نے بے دردی سے قتل کرنا شروع کر دیا پہلے کلکتہ میں فساد ہوا، پھر نواکھالی اور بہار تک اس کی لہر پہنچ گئی۔ اس غنڈہ گردی میں بیس ہزار مسلمان شہید ہوئے، پھر بمبئی میں یہ آگ بھڑک اٹھی۔ چنانچہ سارا سال اسی قتل و غارت کی نذر ہو گیا۔ کانگریس اور وائسرائے نے پھر قائدِ اعظم سے بات چیت شروع کی جس پر لیاقت علی

خاں، سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خاں، مسٹر اسمٰعیل چندریگر اور مسٹر منڈل لیگ کی طرف سے مرکزی کابینہ میں لئے گئے۔

تقسیم ہند

۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں پاک و ہند کے تمام ممتاز لیڈر شریک ہوئے اور ملک معظم نے اعلان کیا کہ وہ نئے آئین کو نارضامند علاقوں پر زبردستی ٹھونسنے کے حق میں نہیں۔ اس اعلان سے کانگریسی حلقوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن مسلمان کافی حد تک پُر امید ہو گئے۔ چونکہ خضر حیات کی غدّاری کے سبب لیگ پنجاب میں اپنی وزارت قائم نہ کر سکی تھی۔ اس لئے مسلمانوں نے صُوبہ بھر میں جنوری ۱۹۴۷ء میں سول نافرمانی شروع کی۔ خضر حیات نے چھوٹے بڑے مسلم لیگ کے تمام لیڈروں کو جیل میں ٹھونس دیا۔ اور لیگ کو کچلنے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن اسے جتنا دبایا گیا یہ اُتنی اُبھری آخر ۲ر مارچ کو خضر حیات وزارت سے مستعفی ہو گیا اور گورنر نے اپنا راج مسلّط کر دیا۔

۱۳ر مارچ ۱۹۴۷ء کو ماسٹر تارا سنگھ اکالی لیڈر نے اسمبلی ہال کے باہر تلوار گھماتے ہوئے اعلان کیا کہ خالصہ یا تو پنجاب میں راج کرے گا یا مٹ جائے گا۔ حکومت کی حوصلہ افزائی پر لاہور اور امرتسر میں فسادات کے شعلے بھڑک اُٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا صُوبہ اس کی لپیٹ میں آگیا۔ ملک سے امن مفقود ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی شہ پر سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگھی خفیہ طور پر مسلح ہو رہے تھے۔ انہی حالات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نیا وائسرائے مقرر ہو کر آگیا۔ اب کانگریس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کیا کہ جن اضلاع میں ہندو اکثریت میں ہیں، وہ بھارت سے ملا دیئے جائیں۔ ۱۹ر مئی کو ماؤنٹ بیٹن خود لندن گیا، اور وزیر اعظم کے مشورے سے اعلان کیا، کہ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دے دیا جائے۔ اسے دو حصّوں میں بانٹ دیا جائے۔ اور بنگال و پنجاب کو بھی مسلم اور ہندو اکثریت کے علاقوں میں بانٹ دیا جائے۔ حدود مقرر کرنے کے لئے حد بندی کمیشن عمل میں لایا جائے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور آسام کے ضلع سلہٹ میں رائے شماری

کرائی جائے کہ وہ ہند اور پاکستان میں سے کس سے الحاق کرنا پسند کرتے ہیں۔ ریاستیں شامل ہونے کے معاملے میں خود مختار ہیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔

نوابزادہ میجر عاشق حسین کی شہادت

۳۱ر جولائی ۱۹۴۷ء کو کسی بدبخت نے نوابزادہ میجر عاشق حسین کو شہید کر دیا۔ نواب ریاض حسین اور کیپٹن مقبول حسین کی وفات کے بعد اہل ملتان کے لئے یہ بڑا المیہ تھا۔ میجر صاحب کا جنازہ جب ملتان پہنچا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی۔ ملتان کربلا کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ پاک و ہند کے تمام مسلمان اخبارات نے سیاہ جدولوں کے ساتھ آپ کی وفات کی خبر شائع کی۔ ملتان کے جرائد نے عاشق حسین نمبر نکالے اور مرثیے لکھے۔ جنازہ میں لاکھ آدمی شریک ہوئے۔ ہر شخص بے اختیار رو رہا تھا، اور شہید ملت کی لاش مسکرا رہی تھی۔ گویا ؎

آنچناں زی کہ وقت مُردنِ تو
ہمہ گریاں بوند تو خنداں

کسی نے آپ کے لئے ہی موزوں کیا تھا۔ نواب مخدوم مرید حسین قریشی سجادہ نشین بارگاہِ غوثیہ نے گلوگیر ہو کر کہا:۔

"بھائی عاشق حسین! یہ تیری لاش نہیں، پوری قوم کی لاش ہے"!

اور پھر آہ جگر دوز کھینچتے ہوئے فرمایا:۔

"آج قریشیوں کی سیاسی زندگی ختم ہو گئی!"

نواب زادہ میجر عاشق حسین کافی عرصہ تک بلدیۂ ملتان کے پریذیڈنٹ، آنریری مجسٹریٹ درجہ اول سب رجسٹرار اور ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ رہے تھے، آخر میں گورنمنٹ پنجاب کے وزیر دفاع بنے لیکن قوم کے مطالبے پر آپ نے اس عہدۂ جلیلہ سے استعفیٰ دے دیا۔ قیامِ پاکستان میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انتقالِ آبادی کے سلسلے میں جب فتنہ پرداز عناصر نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو آپ نے

شہید ملت نواب عاشق حسین قریشی علیہ الرحمۃ
سابق وزیر دفاع گورنمنٹ پنجاب

اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہر جگہ پہنچ کر ہندوؤں اور سکھوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ اسی تگ و دو میں صبح کہیں، شام کہیں، آپ کی کار اُڑتی پھرتی تھی کہ دفعتہً کسی لعین کی گولی سے آپ کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

میجر مرحوم نے دو صاحبزادے یادگار چھوڑے تھے، نوابزادہ صادق حسین اور نوابزادہ نسیم حسین، اس حادثہ فاجعہ کو تقریباً ۲۴ سال گزر چکے ہیں۔ اب دونوں بھائی جوان ہیں اور ملک کے مقتدر امراء میں شمار ہوتے ہیں، بایں ہمہ نوابزادہ صادق حسین سوشلزم میں یقین رکھتے ہیں اور ملتان میں پیپلز پارٹی کے سب سے زیادہ مستعد رکن ہیں۔ کم و بیش پانچ سال تک آپ ڈسٹرکٹ کونسل ملتان کے وائس چیئرمین بھی رہے ہیں۔ اور ان دنوں گورنمنٹ پنجاب کے وزیر زراعت ہیں۔

مُسلم لیگ کی کارکردگی پر اجمالی نظر

مسلم لیگ اس لئے وجود میں آئی تھی کہ ہندوستان میں ایک الگ مُسلم ریاست قائم ہو جس میں مسلمان اسلامی زندگی بسر کر سکیں۔ لیگ کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ رکھی گئی تھی۔ اور ۱۹۴۶ء میں یہ اپنے بہترین نظم و نسق کے طفیل عروج و اقبال کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ کامیابی قائدِ اعظم کے حُسنِ تدبر اور ان کے شرکاءِ کار کے بے پناہ اخلاص کی رہینِ منّت تھی۔ مسلمانوں کے بیسیوں فرقے تھے اور پھر نسل اور خون کے اعتبار سے ان کے کئی گروہ تھے یہ مسلم لیگ کا ہی فیضان تھا کہ تمام مسلمان بلا امتیازِ رنگ و ملّت ایک ہی مرکز پر جمع ہو گئے ملتان میں قریشی گیلانی آویزش اکبر اعظم کے دور سے چلی آتی تھی۔ لیکن جب مسلم لیگ نے خضر وزارت کے خلاف سول نافرمانی شروع کی تو نیو سنٹرل جیل کی بارکوں میں گیلانی حضرات میں سے مخدوم سیّد شیر شاہ، مخدوم سیّد محمد ولایت حسین شاہ اور سیّد زین العابدین شاہ، قریشی خاندان سے مخدوم زادہ محمد سجاد حسین، گردیزیوں میں سیّد علی حسین، اور بخاریوں میں سے سید سعید احمد ایڈوکیٹ اور سیّد نوبہار شاہ رئیس اعظم قتال پور دوش بدوش بیٹھے دکھائی دیئے۔ الحاج صوفی عبدالغفور، خواجہ

عبدالحکیم، میاں عبداللہ ارائیں، ڈاکٹر بشیر احمد، شیخ عبدالرزاق ایڈووکیٹ، مولوی محبوب احمد اُویسی، اور محمد نواز تک سبھی ایک ہی جذبے سے سرشار تھے۔ اس کشمکش حیات میں مسلمان مستورات نے بھی بھرپور حصّہ لیا۔ چنانچہ دُوسرے تیسرے روز اُن کے جلوس بھی نکلا کرتے تھے۔ خضر وزارت نے لیگ کو کچلنے کی انتہائی کوشش کی۔ جب جیلیں لیگی کارکنوں سے بھر گئیں تو پھر پولیس انہیں لاریوں پر سوار کر کے شہر سے بہت دُور دیہات میں چھوڑ آتی۔ لیکن قبل اس کے کہ پولیس کی لاریاں واپس لوٹتیں، خواجہ عبدالحکیم صدیقی کی بسیں دوڑ پڑتیں اور مسلم لیگی کارکنوں کو بحفاظت تمام شہر میں واپس لے آتیں۔ بھاگ دوڑ کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو خضر وزارت نے دَم توڑ دیا اور پنجاب میں گورنری راج قائم ہو گیا۔

فسادات کے اِکّا دُکّا واقعات ہر جگہ برابر ہو رہے تھے۔ ملک کی تقسیم کا اعلان سُنتے ہی ہندوؤں نے پاکستان چھوڑنے اور بھارت منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ مسلم لیگ انتقالِ آبادی کی مخالف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ہندو اِس ملک سے چلے گئے تو بھارت کے مسلمانوں کی شامت آ جائے گی۔ اور اتنی بڑی تعداد اِس ملک میں آ جائے گی کہ اُسے آباد کرنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔ اسی لئے مسلم لیگی کارکنان ہندوؤں کو اطمینان دلانے میں برابر کوشاں رہے اور مسلمانوں کو بھی ان کی منقولہ جائیداد خریدنے سے روکتے رہے۔ بایں ہمہ در پردہ خرید و فروخت باقاعدہ ہوتی رہی اور ہندوؤں نے اپنی اشیاء مناسب داموں پر فروخت کر کے معقول روپیہ جمع کر لیا۔

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان

صوبہ سرحد اور سلہٹ کے باشندوں نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ دیا۔ اور بلوچستان نے بھی پاکستان سے الحاق کر لیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان و بھارت کو اختیارات سونپ دیئے گئے۔ اور تمام انگریز خواہ وہ سول میں تھے یا فوج میں، جہازوں پر سوار ہو کر چلے گئے۔ پاکستان عالم وجود میں آ گیا اور قائدِ اعظم محمد علی جناح اس کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے افسوس ہے کہ انگریز جاتے جاتے بھی مسلمانوں سے پیچ کھیل گیا۔ اس نے پاکستان تو مسلمانوں کو دیا، مگر لولا لنگڑا بنا کر۔ حد بندی مطلقاً غیر منصفانہ طور پہ ہوئی۔ گورداسپور مسلم اکثریت کا ضلع تھا۔ مگر اس کی ایک تحصیل شکر گڑھ کے علاوہ باقی تین تحصیلیں ہندوستان کے ساتھ ملا دی گئیں۔ لاہور کا کچھ حصہ کاٹ کر بھارت سے ملا دیا۔ محض اس لئے کہ فیروز پور ہیڈ ورکس کی نہریں مشرقی پنجاب کے حصے میں آ جائیں۔ جو گندر نگر کا پاور ہاؤس بھارت کے حوالے کر کے مسلم پنجاب کو بجلی سے محروم کر دیا گیا۔ مرشد آباد کا مسلم اکثریت کا زرخیز اور شاداب ضلع بھی پاکستان سے چھین کر بھارت کو دے دیا گیا۔ اور بھی بہت سے زرخیز اور سیر حاصل علاقے بھارت سے ملا دیئے گئے اور ان کی جگہ بنجر اور ویران حصے پاکستان کو دیئے گئے۔ علیٰ ہذا القیاس بری اور بحری فوج، بجلی، بنک، ریلوے اور نہروں کے سلسلے میں بھی پاکستان سے صریحاً بے انصافی کی گئی۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ پاکستان پنپ نہ سکے اور اس کا روزِ اوّل یوم آخر ثابت ہو لیکن ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

غلط توقّعات

مسلمانوں کا خیال تھا کہ ہندو مسلم منافرت انگریز کی پیدا کی ہوئی ہے، پہلے بھی سات آٹھ سو برس سے ہم بھائیوں کی طرح رستے بستے چلے آئے ہیں جب یہ شر پسند عناصر دفع ہو جائیں گے تو ہم بھائیوں کی طرح سکون و اطمینان سے سامان وغیرہ کی تقسیم ٹھیک طور پر کر لیں گے۔

مگر مسلمانوں کی یہ توقع درست ثابت نہ ہوئی۔ جوں ہی انگریز جہاز پر سوار ہوا ہندوؤں نے جون تبدیل کر لیا۔ وہ سچ مچ درندے بن گئے۔ اور انہوں نے بے بس اور بیکس مسلمانوں کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دیا۔ مشرقی پنجاب، دہلی اور یوپی وغیرہ تمام مقامات پر مسلمانوں کو دھر لیا گیا۔ اور یہ کہہ کر تنگ کرنا شروع کیا کہ پاکستان چلے جاؤ تمہیں یہاں رہنے کا کیا حق ہے؟

اگر ہم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اختیارات منتقل نہ ہونے دیتے اور یہ مطالبہ کرتے، کہ جب تک ملکی حدود، سرکاری ملازمین، ریلوے، نہریں، بنک، دفاتر اور اُن کے ریکارڈ، سرمایہ ریاستیں اور فوجوں وغیرہ کی تقسیم پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ جاتی۔ ہندوستان پر مسلمانوں، اور ہندوؤں دونوں کا مشترکہ کنٹرول رہے گا تو آج مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

مسلمان ہندوؤں کے دھوکے میں آ گئے اور انہوں نے ۱۵ اگست کو ایسے عالم میں تقسیم اختیارات کا اعلان کیا جبکہ اختیارات کے تمام سرچشمے مخالفوں کے پاس تھے، اس لئے جونہی مشرقی پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں نے درندوں کی طرح مسلمانوں کو چیرنا پھاڑنا شروع کیا تو پاکستان نے چارج سنبھالنے کے مقابلے میں تباہ حال مسلمانوں کو کلیجے سے لگانا زیادہ ضروری خیال کیا۔ ہندو گورنمنٹ جانتی تھی کہ پاکستان سے صرف ۱½ کروڑ ہندوؤں کو نکالنا ہوگا اور انہیں اپنے ملک میں کھپانے کے لئے سولہ لاکھ مربع میل زمین پڑی ہے لیکن پاکستان پہلے تو دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے، ایک مشرق اور دُوسرا مغرب میں، اور ان دونوں کا رقبہ ملا کر بھی دو لاکھ مربع میل سے زیادہ نہیں۔ لیکن انتقالِ آبادی کی صورت میں اُسے پانچ کروڑ کے

قریب مسلمانوں کو اپنے مختصر سے رقبے میں کھپانا پڑے گا۔

ہندو نے اِس علم اور یقین کی بنا پر کہ پاکستان ایک نوزائیدہ ملک ہے۔ انتقالِ آبادی کی تاب اس میں قطعاً نہیں ہے۔ اگر بھارت کے تمام مسلمانوں کو نکال پھینکا جائے تو پاکستان اپنی موت آپ مر جائے گا اور پھر کابل سے برما تک رام راج کی عملداری ہو گی۔ چنانچہ ہندو نے تمام ملک میں شور برپا کر دیا کہ مسلمانوں کی وفاداری مشتبہ ہے۔ اُنہیں اس ملک سے چلا جانا چاہیئے۔ ساتھ ہی سوچی سمجھی سکیم[1] کے تحت مسلمانوں کو مار مار کر پاکستان کی طرف منتقل کرنا شروع کیا۔ بچارے مسلمان صرف اِس قصور میں کہ وہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے تھے، بلا وجہ اپنے گھروں سے نیزوں اور سنگینوں کے سائے میں نکالے گئے۔ اس حالت میں کہ ان کے ہر ہر عضو سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ان کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ اُن کے مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اُن کی لڑکیاں چھین لی گئیں۔ کپڑے اُتار لیے گئے، ماں کو بیٹے سے، بھائی کو بہن سے اور شوہر کو بیوی سے جدا کر کے لاشوں کے انبار لگا دیئے گئے۔ روزانہ سپیشل ٹرینیں لاہور پہنچنے لگیں۔ مہاجروں کے جسموں پر کرپانوں اور سنگینوں کے نشان تھے۔ کسی کا بازو، کسی کی ٹانگ، کسی کی آنکھ اور کسی کا سر دو نیم ہو رہا تھا۔ مسلم خواتین کی حالت ان سے زیادہ قابلِ رحم

---

[1] سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو صفحۂ دہر سے مٹانے کیلئے مفصلۂ ذیل جتھے ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے سے قائم کئے ہوئے تھے:۔

(۱) آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن (۲) شہیدی جتھہ (۳) اکالی پارٹی (۴) اکالی فوج (۵) اکالی سینا (۶) اکالی ہائی کمانڈ (۷) آل انڈیا ہندو مہاسبھا (۸) آریہ پرتی ندھی سبھا (۹) آریہ سماج (۱۰) آریہ ویر دل (۱۱) بیوپار منڈل (۱۲) دیوان سکھوں کا مذہبی اجتماع (۱۳) ڈوگرہ راجپوت (۱۴) دُرلی جتھا (۱۵) گیانی ویر سنگھ جتھا (۱۶) ہندوستانی نیشنل گارڈز (۱۷) آئی این اے آزاد ہند فوج (۱۸) نہنگ جتھہ۔ (۱۹) پنتھک پرتی ندھی بورڈ (۲۰) راشٹریہ سیوک سنگھ (۲۱) شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی (۲۲) شرومنی اکالی دل (۲۳) سنگھ سبھا۔

ہو رہی تھی۔ جوان عورتیں اور لڑکیاں کہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ بوڑھی مائیں زخموں سے چور، یا چھوٹی بچیاں، وہ بھی کئی زخم کھائی ہوئیں۔ کئی دن کی بھوکی پیاسی، ایک ایک کو حیرت سے تکتی تھیں۔ بے بسی اور بے چارگی کے اس دردناک منظر کو دیکھ کر گود سے خالی ماؤں کی آہیں، اور یتیم بچوں کی کراہیں اور آہ و فریاد کی لرزہ خیز چیخیں سن سن کر مسلمانوں کا دامن صبر تار تار ہو گیا۔ اپنے بے گناہ بھائیوں اور بہنوں کی کربناک حالت دیکھ کر ان پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کو لے کر ہندوؤں اور سکھوں کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ قطعاً نہ گھبراؤ، ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور جہاں تک ممکن ہوا، ان لوگوں نے انہیں شرپسند عناصر سے بچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیا۔

لیکن

ہندو تو پہلے سے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسے یہاں کوئی تکلیف تھی، بلکہ اس لئے کہ بھارت جا کر مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکال باہر کرے۔

چنانچہ نہایت منظم طریق پر ہندوؤں اور سکھوں نے یہاں سے نکلنا شروع کیا۔ مسلمان اپیلیں کرتے رہے اور دامن پکڑ پکڑ کر روکتے رہے۔ اور ایسے وقت بھی انہیں روکا، جبکہ چاروں طرف مہاجرین کی لاشیں پڑی تڑپ رہی تھیں، جبکہ وہ دسمبر کی برفانی راتوں میں باہر پڑے سسک رہے تھے، مگر ہندو جھٹکے سے اپنا دامن چھوڑا اس ملک کو روانہ ہو گئے۔ جہاں وہ کبھی کبھی یاترا کے لئے جایا کرتے تھے۔ گنگا جمنا کی پوتر سرزمین انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی، وہ چلے گئے اور وہاں جا کر مسلمانوں کو ان کے گھروں سے دھکے دے دے کر نکال باہر کیا۔

سجن سنگھ کا اعتراف

یہ فسادات محض اتفاقی نہیں تھے، بلکہ اس کے لئے بھارت کے ہندو اور سکھ پہلے سے تیار تھے۔ اس امر کی ہمارے پاس وزنی شہادتیں ہیں۔ "بندے ماترم" بھارت کا ایک بدنام متعصب اخبار ہے۔ سجن سنگھ بہرحال

ایک سکھ مضمون نگار ہے۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کے منصوبے کافی عرصہ پہلے سوچے سمجھے جا چکے تھے۔ لکھتا ہے کہ:-

"جوں جوں ۱۵ اگست قریب آنے لگا۔ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ عوام سے شہیدی فنڈ کے نام سے لاکھوں روپے اکٹھے کر لئے، مگر اس فنڈ کا حساب نہ انہوں نے پڑتال کروا کر عوام کے سامنے رکھا اور نہ آئندہ رکھیں گے۔ بدقسمتی سے پنجاب کی ایک بڑی ریاست کے مہاراجہ نے اُن کو ہتھیار مہیا کر دیئے۔ گوردواروں کی حفاظت کے نام پر انہوں نے ڈسچارج شدہ آئی این اے اور دیگر فوجی آدمی ملازم رکھ لئے، مگر ان سے گوردواروں کی حفاظت کا کام لینے کے بجائے مُسلم دیہات پر حملہ کرانے کا کام لیا گیا۔

۱۵ یا ۱۶ اگست کو ضلع امرتسر کے ایک ذمہ دار پولیس افسر نے مسلمان ملازمین پولیس کو بے ہتھیار کر دیا۔ جس کے باعث وہ بے حوصلہ ہو کر پاکستان چلے گئے۔ باقی ہندو اور سکھ ملازمین کے ساتھ اکالی پارٹی اور سیوک سنگھ والوں نے گٹھ جوڑ کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا، کہ محافظینِ قانون نے قانون گردی اور قتل و غارت اپنا شیوہ بنا لیا۔ پھر کیا تھا۔ غنڈہ گردی عام ہو گئی۔ لاقانونی حد سے بڑھ گئی۔ سکھوں کے منظّم جتھے مُسلم دیہات پر یورش کرنے لگے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں، کہ ماہ اگست کے فسادات میں مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کرنے کے لئے اکالی پارٹی نے ابتدا کی، اور یہ بات واقعات سے ثابت کی جا سکتی ہے۔

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ بعض پولیس افسران نے خود سکھ عوام کو اُکسایا اور انہیں مسلم دیہات پر حملہ کرنے کے لئے زور دیا، بلکہ خود ان کے ہمراہ گئے۔ جب سکھ عوام نے دیکھا کہ اُن کو پوچھنے والا کوئی نہیں تو انہوں نے نہایت بے باکی اور بے فکری سے مسلمانوں کو قتل کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا۔

اخلاق کی تباہی | جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے معتبر دوستوں سے

اس گڑبڑ کے ہولناک مظالم کی بابت سُنا ہے۔ اس کی یاد بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ مشرقی پنجاب کے لوگوں نے بے گناہ انسانوں اور معصوم بچوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ ان کا کبھی کسی کو تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔ اور زندہ انسانوں کو جلتی آگ میں ڈال کر بھون دیا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا گیا۔ ایک ایک عورت کے ساتھ دس دس غنڈوں نے رات رات بھر زنا بالجبر اس شدت سے کیا کہ وہ پاگل ہو گئیں ——— میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ دیہاتی طبقہ میں ۵۰ فی صد سکھوں نے لُوٹ مار اور قتل و غارت گری میں حصّہ لیا۔"

(ملخّص: "بندے ماترم" دہلی۔ ۱۲ جنوری ۱۹۴۷ء)

الغرض بھارت کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ مہاجروں کے قافلے قدم قدم پر لاشوں کے انبار چھوڑتے اور اپنے بدن پر نیزوں اور بھالوں کے زخم کھاتے پاکستان کا رُخ کر رہے تھے۔ بلاشبہ چنگیز اور ہلاکو نے بھی نوعِ انسانی کو قتل کیا تھا، لیکن انہوں نے مسلمانوں کی قبروں کو نہیں چھُوا تھا۔ لیکن شانتی شانتی پکارنے والے ہلاکوؤں نے لاکھوں مسلمانوں کا بے دریغ خون بہانے کے بعد ان کے بزرگوں کی قبروں کو بھی اکھاڑ پھینکا۔ اس میں صرف بھارت کے ہندو سکھ ملوّث نہیں، بلکہ مغربی پنجاب کے ہندو اور سکھ بھی پوری طرح تیار تھے۔ اگر انہیں موقع ملتا تو یہ بھی مسلمانوں کو ختم کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑتے۔ تقسیم سے چند ماہ پہلے جھنگ کی پولیس نے ایک سکھ کے گھر کی تلاشی لی تو حسبِ ذیل اشیاء برآمد ہوئیں:-

"فوجی بم، تیزاب، لیبارٹری کے آلات، دو برچھے، دو کمانیں اور کئی تیر، سوا انچ کے تین نقشے، جن میں جھنگ کے مسلم علاقے دکھائے گئے تھے۔"

گویا مسلمانوں پر حملہ کرنے کی پوری تیاری ہو چکی تھی۔ بم پھینکنے کی ۳۱ جنوری سے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء

تک ۱۵۱، وارداتیں ہوئیں۔ پولیس کی تحقیقات کے مطابق صرف نو حادثات میں مسلمانوں کا ہاتھ تھا، باقی ۱۴۲ میں غیر مسلم سازش کار فرما تھی۔

۶ اگست سے اکتوبر کے پہلے ہفتے تک دو ماہ میں کل ۹۷ حملے ہوئے۔ ان میں ۲۵ ٹرینوں پر مسلمانوں نے اور ۵۴ پر غیر مسلموں نے حملے کئے۔ ان حملوں میں جو ہتھیار استعمال ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے:-

"بم، تلواریں، رائیفلیں، بندوقیں، نیزے، بلّم، کرپانیں، بھالے، لاٹھیاں، خود بخود پھٹنے والے بم، ٹامی گن، چھرے، کلہاڑے، پستول۔"

حملہ کرنے والوں میں حسب ذیل تنظیمیں اور طبقے شامل تھے:-

"راشٹریہ سیوک سنگھ، سکھ، سابق فوجی، اکالی پارٹی، پٹیالہ کے فوجی، ہندو جاٹ اور ملٹری پولیس۔"

مسلمانوں کی طرف سے حملہ آور صرف ہجوم تھا یا دو ایک جگہ پٹھانوں کے گروہ!

ہلاک ہونے والوں میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً بتیس ہزار ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے حملے سے غیر مسلم پناہ گیر صرف ۱۲۶ کے قریب مارے گئے۔

۱۹۴۹ء کے وسط تک مشرقی پنجاب میں ساٹھ لاکھ، دہلی اور اس کے مضافات میں تقریباً دس لاکھ۔ مغربی یوپی کے اضلاع میں بھی کم و بیش اتنے ہی مسلمان قتل ہوئے۔ پورے بھارت میں مسلمانوں کا جو جانی ضیاع ہوا اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔

دُنیا کی سب سے بڑی ہجرت

فروری ۱۹۴۹ء کے وسط تک مغربی پاکستان میں تقریباً ستر لاکھ مہاجر پناہ لینے کے لئے آئے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان سے ۵۰ لاکھ کے قریب غیر مسلم بھارت گئے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے عزت مآب وزیر مہاجرین نے بتایا تھا کہ ۸ فروری ۱۹۴۹ء تک مہاجرین

-/۷۸۳۴۶۹۹۵
پر حکومت نے سات کروڑ تراسی لاکھ چھیالیس ہزار نو سو پچانوے روپیہ خرچ کیا ہے۔

تقسیم کے وقت مسلمان مہاجر مشرقی پنجاب اور ہندوستانی ریاستوں سے اس بے سرو سامانی کی حالت میں بھاگے تھے کہ بہت سی عورتیں اور بچے اپنے وارثوں سے علیحدہ ہو گئے ایسی اغوا شدہ عورتوں اور بچوں کی تعداد مختلف بتائی جاتی ہے۔ وزیر مہاجرین نے پارلیمنٹ میں بتایا تھا کہ اس قسم کے اغوا شدہ مسلمانوں کی تعداد چھیالیس ہزار سے کم نہیں۔ اور ان میں سے تقریباً دس ہزار مسلمان عورتیں اور بچے دسمبر ۱۹۴۸ء تک برآمد کئے جا چکے تھے۔

ملتان اور مہاجرین

باقی اضلاع کے مقابلے میں ملتان مہاجر زیادہ آئے۔ کیونکہ لاہور کے بعد اس مملکت کا زیادہ جاذب شہر ملتان تھا۔ نیز درمیان میں ہونے کی وجہ سے زیادہ محفوظ بھی تھا۔ ملتان شہر کے عوام اور حکام نے مہاجرین کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں آباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ مہاجرین کا کیمپ ملتان چھاؤنی میں قائم کیا گیا تھا۔ رضاکار اور حکام اسٹیشن پر موجود رہتے تھے۔ جونہی ٹرین آتی۔ مسلمان جوق در جوق جاتے اور اپنے مظلوم بھائیوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر اس ناگہانی مصیبت پر صبر کرنے کی تلقین کرتے۔ آہستہ آہستہ مہاجرین شہر اور اس کے مضافات میں آباد ہوتے چلے گئے۔ دکانداروں نے دکانیں الاٹ کرائیں۔ ملازموں نے ملازمتیں لے لیں۔ زمیندار زمینوں پر قابض ہوئے۔ کارخانہ داروں نے کارخانے سنبھالے اور تھوڑے عرصہ میں ہندوؤں کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا تھا۔ وہ پُر ہو گیا۔ جانے والوں کو یقین تھا کہ پاکستان کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ اور بازاریں ویران ہو جائیں گی۔ مگر مہاجرین نے کاروبار میں وہ چمک دمک پیدا کی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ صرف ملتان ہی نہیں بلکہ اس مملکت کا ہر شہر پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ پُر رونق ہو گیا اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ جس کی پیشینگوئی قرآن کریم میں ان الفاظ سے کی گئی تھی

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۔

ترجمہ:- "اور جو شخص ہجرت کرے گا، اللہ کی راہ میں، وہ رہنے کے لئے بہترین جگہ اور کشادہ روزی پائے گا"　　صدق اللہ وصدق رسولہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے اہم تاریخی واقعات

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو غیر منقسم ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آزاد مملکت پاکستان کے قیام کا اعلان کیا۔ اور پاک دستور یہ کو اختیارات منتقل کئے۔ ۱۵ر اگست کو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور قائدِ ملت لیاقت علی خاں نے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے عہدوں کے حلف اٹھائے۔

- ۱۶ر اگست کو مہاراجہ ہری سنگھ والئ کشمیر نے حکومتِ پاکستان سے معاہدہ جاریہ کیا۔
- ۱۸ر اگست کو سر مائیکل ریڈ کلف نے پاکستان اور ہندوستان کے مابین نئی سرحدوں کا اعلان کیا۔ (ریڈ کلف ایوارڈ)
- ۱۵ر ستمبر کو ریاست جونا گڈھ اور ۲۴ر ستمبر کو ریاست مانوادر، باضابطہ طور پر پاکستان میں شامل ہوئیں۔
- ۳۰ر ستمبر کو پاکستان کو اقوام متحدہ کا رُکن بنا لیا گیا۔
- ۲۲ر اکتوبر کو ہندوستان کی مسلح افواج نے جونا گڑھ، مانگرول اور مانوادر کی پاکستانی ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ جس پر ۳ر نومبر کو حکومتِ پاکستان نے بھارت کے اس غاصبانہ قبضے کے خلاف اقوام متحدہ سے احتجاج کیا۔
- ۸ر نومبر کو دِیر اور چترال کی ریاستیں بھی پاکستان میں شامل ہو گئیں۔

قائداعظم محمد علی جناح
رحمۃ اللہ علیہ

قائدِ اعظم کی وفات

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے بانی قائدِ اعظم محمد علی جناح چند ماہ کی علالت کے بعد دارِ فانی سے مُلکِ بقا کو رخصت ہو گئے۔ جو نہی ریڈیو پاکستان سے یہ اندوہناک خبر نشر ہوئی۔ تمام ممالکِ اسلامیہ نے اپنے جھنڈے سرنگوں کر دیئے۔ پاکستان کے دونو حِصّوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور عین اُس وقت جبکہ عالمِ اسلام اس کربناک کیفیت سے دوچار تھا، بھارت نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر حیدر آباد کی خود مختار و آزاد سلطنت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔

خواجہ ناظم الدین، پاکستان کے دُوسرے گورنر جنرل

خواجہ ناظم الدین بنگال کے نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، قائدِ اعظم کے انتقال پر گورنر جنرل بنے۔ اُن کے عہد کے مشہور واقعات درجِ ذیل ہیں:۔

- یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء بنک دولتِ پاکستان نے پانچ، دس اور سو روپے کے کرنسی نوٹ جاری کیئے۔
- ۲۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو کاکول میں پاکستان کی فوجی اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا۔
- یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں التوائے جنگ کا اعلان ہُوا۔
- ۶ جنوری کو کشمیر کمیشن کی روئیداد شائع ہوئی۔
- ۲۴ جنوری کو پنجاب میں خان افتخار حسین خان ممدوٹ کی وزارت توڑ دی گئی اور گورنری راج قائم کر دیا گیا۔
- ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد منظور ہوئی اور امریکی امیر البحر

نمبٹر کا کشمیر میں ناظم استصواب رائے کی حیثیت میں تقرر کا اعلان ہوا۔

مخدوم زادہ سیّد محمد رضا شاہ جیلانی کا سفرِ آخرت

۶، جمادی الاوّل ۱۳۶۸ھ مطابق ۷، مارچ ۱۹۴۹ء مخدوم زادہ سیّد محمد رضا شاہ طویل عرصے کی علالت کے بعد دارِ فانی سے ملکِ بقا کو رخصت ہو گئے۔ آپ اپنے والدِ ماجد کے سب سے چھوٹے بیٹے اور اپنے خاندان کے حسین ترین نوجوان تھے۔ ۱۹۰۹ء میں جبکہ آپ کی عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی، چیفس کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۴ء تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ آپ تعلیمی، اخلاقی اور جسمانی حالت کے لحاظ سے کالج بھر میں نمایاں خصوصیّت رکھتے تھے اور اسی خصوصیت کی بدولت "ریواز گولڈ میڈل" جو نواب بہاول پور کی طرف سے اُس طالب علم کو دیا جاتا تھا جو کالج کی آخری جماعت میں ہر لحاظ سے اچھا ہو بالصورتِ خاص آپ کو آٹھویں جماعت میں ملا۔

تعلیم کے دوران اِس جُرم کی پاداش میں کہ آپ مسجد میں جا کر طلباء کو ترکوں کی حمایت پر اُکساتے ہیں، کالج سے خارج کر دیا گیا۔ لیکن جب سر ایڈوائر کو علم ہوا تو اُس نے آپ کو دوبارہ داخل کرا دیا۔ لیکن اب آپ کا دل کالج سے اُکتا چکا تھا۔ اس لیے لوئر ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد تعلیم چھوڑ دی اور ریونیو کی ٹریننگ یعنی شروع کی۔ ۱۹۲۱ء میں جیمس فورڈ ریفارم کا نفاذ ہوا۔ جس پر آپ ۱۹۲۲ء سے تا دمِ زندگی یعنی ۱۹۴۹ء تک پنجاب کونسل کے رُکن منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے جونیئر وائس چیئرمین مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے اپنے والد ماجد اور خاندان کے دُوسرے افراد کے ہمراہ خشکی کے راستے حج کا فریضہ ادا کیا۔ اس سفر میں آپ نے قافلے کی بڑی خدمت کی۔

اب تک ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کا سرکاری چیئرمین چلا آتا تھا، جو ضلع کا ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں پہلی بار سرکاری اور غیر سرکاری چیئرمین کا مقابلہ ہوا اور مخدوم زادہ صاحب

نے مسٹر ای پی موَن ڈپٹی کمشنر ملتان کو شکستِ فاش دے کر چیئرمینی کا اعزاز حاصل کیا۔ اس طرح آپ پورے ہندوستان میں پہلے غیر سرکاری چیئرمین منتخب ہوئے۔ اور زندگی کے آخری لمحات تک اس منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ جس طنطنہ اور شوکت و اجلال سے آپ نے اس عہدہ کو نبھایا، اس کی مثال پنجاب کے کسی بورڈ میں نہیں ملتی۔

آپ مدارس میں دینی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اس لئے آپ نے مساجد میں بھی مکاتیب قائم کئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ مساجد کے آئمہ کو وظائف دیئے گئے۔ دوسرے قرآن مجید کے ساتھ دیہاتی طلباء معمولی نوشت بھی حاصل کر لیتے تھے۔ اور جملہ مدارس میں بجائے اتوار کے جمعہ کو چھٹی ہونے لگی تھی۔ مخدوم زادہ بڑے دھڑتے کے انسان تھے اور کوہ وقار طبیعت رکھتے تھے۔ عام لیڈروں کی طرح لباس کے مانند خیالات بدلنے کے عادی نہ تھے۔ ایک دفعہ جس تحریک سے منسلک ہو گئے عمر بھر اس سے نباہ کیا۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۳۷ء میں اس وقت مسلم لیگ کا ساتھ دیا جس میں پوری پنجاب اسمبلی میں صرف ایک رکن ملک برکت علی مسلم لیگی تھا۔ اور بقیہ دو حضرت مخدوم زادہ صاحب مذکور اور ان کے بھتیجے مخدوم زادہ سید محمد ولایت حسین جیلانی تھے۔ اور پھر آپ نے عمر بھر اس کا ساتھ دیا۔ اور کبھی آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی!

آپ کی پہلے حرم سے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ادھیڑ عمر میں آپ نے خان بہادر سردار شاہ صاحب گیلانی آف پیر اکوٹ کی دختر نیک اختر سے شادی کی۔ اس بانوئے عفت مآب سے واہب العطایا نے آپ کو ایک فرزندِ جگر بند عطا کیا۔ جن کا نامِ نامی و اسمِ گرامی مخدوم زادہ سید حامد رضا گیلانی ہے اور جن کا شمار ملک کے نامور سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔

مخدوم سید غلام مصطفےٰ شاہ گیلانی کا انتقال

مخدوم زادہ سید محمد رضا شاہ صاحب کے سانحۂ ارتحال کے پورے ایک ماہ بعد

۷ رجمادی الثانی ۱۳۶۸ھ مطابق ۷ اپریل ۱۹۴۹ء کو اُن کے بڑے بھائی حضرت مخدوم سیّد غلام مصطفےٰ شاہ صاحب جیلانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپ اپنے والدِ محترم کے دُوسرے فرزند تھے۔ اپنی مخصوص قابلیتوں اور صلاحیتوں کے طفیل اپنے خاندان کے سربراہ اور خانقاہ جدّ امجد کے سجّادہ نشین قرار پائے۔ آپ چیفس کالج کے تعلیم یافتہ اور پنجاب سول سروس کے ایک ممتاز رکن تھے اور عمر بھر بحیثیت ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملازمتِ سرکار سے وابستہ رہے آپ علم التاریخ کے ماہر، بے حد خلیق، متواضع اور شریف النفس انسان تھے۔ امیر و غریب سب سے بکمالِ محبّت ملتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد حلقہ لودھراں سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں حضرتِ والد ماجد کے انتقال پر منصب سجادگی کی عظیم ذمہ داریاں آپ کے سپرد ہوئیں تو آپ نے انہیں بھی بڑی عمدگی سے انجام دیا۔ لنگر خانے کا انتظام پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا۔ مگر افسوس کہ اپنے آبا، کرام کی مسند پر رونق افروز ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ مالکِ حقیقی کا بلاوا آپہنچا۔ اور معمولی علالت کے بعد آپ بھی راہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ آپ کو اپنے والدِ ماجد کے پہلو میں مقبرہ شریف کے اندر سپردِ خاک کیا گیا۔

مخدوم زادہ سیّد محمد ولایت حسین شاہ جیلانیؒ

مخدوم سید غلام مصطفےٰ الجیلانی علیہ الرحمۃ کے چھ صاحبزادے تھے۔ مخدوم زادہ سید محمد ولایت حسین جیلانی سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اسلامیہ ہائی سکول ملتان سے حاصل کی۔ اور پھر پرائیویٹ طور پر چند امتحانات بھی دیئے۔ اردو، اور انگریزی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ اپنے عمّ مکرم مخدوم زادہ سید محمد رضا شاہ صاحب کے کافی عرصہ تک سیکریٹری رہے۔ اس طرح انہوں نے سیاست کے تمام اسرار و رموز سیکھ لئے تھے۔ پہلے پنجاب اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے چیئرمین منتخب ہو گئے اور تا زندگی بورڈ مذکور کے چیئرمین رہے۔ آپ نے اپنے زمانہ اقتدار میں بہت سے

اچھے کام کیے ہیں۔ لیکن آپ کا بڑا کارنامہ ولایت حسین کالج کا اجراء ہے۔ کاربنکل کے عارضہ میں آپ کا ۱۶؍ جنوری ۱۹۵۴ء کو دفعتہً انتقال ہو گیا۔ اور اپنے عم محترم مخدوم زادہ سیّد محمد رضا کے پہلو میں برآمدے کے نیچے دفن ہوئے۔ اسلامیہ کالج کی وجہ سے آپ کا نام زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ آپ کے صاحبزادے کا نام سیّد شفاعت حسین ہے، اور وہ زیرِ تعلیم ہیں۔

موجُودہ گیلانی مخدُوم

مخدوم سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب اور مخدوم زادہ سیّد محمد رضا شاہ علیہم الرحمۃ دونوں ملتان کی سیاست کے زبردست ستون تھے۔ انہیں بے پناہ اثر و نفوذ حاصل تھا اور ضلع ملتان کے تمام زمیندار اُن پر جان دیتے تھے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوؤں اور سکھوں سے بھی ان کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ سوء اتفاق سے خاندانِ جیلان پر دفعتہً خزاں کا گزر ہوا اور یکے بعد دیگرے خاندانِ جیلان کے یہ دونوں مہر و ماہ غروب ہو گئے۔ جیلانی خاندان کی محفل سونی پڑ گئی اور اس کی عظمت و شوکت خطرے میں نظر آنے لگی۔ ہر دو مخادیم کے صاحبزادگان کاروبارِ عالم کی ابجد سے ناآشنا اور راہ و رسمِ منزلہا سے بے خبر تھے۔ بظاہر اس خاندان کے اُبھرنے کی کوئی امید نہ تھی۔ لیکن قدرت اپنی طاقتوں کا مظاہرہ ایسے ہی موقعوں پر کیا کرتی ہے۔ چند دنوں کے اندر ہی اندر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مسندِ ارشاد پر مخدوم سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب کا جواں سال فرزند مخدوم سیّد شوکت حسین جیلانی اپنے آباء کرام کے انداز میں جلوہ گر ہے۔ مخدوم سیّد محمد ولایت حسینؒ نے آمرانہ گرفت سے ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے نظام کو سنبھال رکھا ہے

مخدوم سیّد محمد علمدار حسین بیک وقت مارکیٹ کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں اور ضلعی مسلم لیگ کے صدر بھی۔ بلاشبہ اس وقت جیلانی خاندان کا نیّرِ اقبال ایک دفعہ پھر پوری تابانی سے نصف النہار پر چمکنے لگا تھا۔ مخدوم زادہ سیّد محمد ولایت حسینؒ کا انتقال ہُوا تو ان کے چھوٹے بھائی مخدوم زادہ سید محمد رحمت حسینؒ اعجازی طور پر نہ یہ کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر بن گئے بلکہ بالاتفاق چیئرمین بھی منتخب ہو گئے۔ مخدوم صاحب کو بحیثیت سجادہ نشین، اگرچہ زیادہ وقت مریدوں کی اصلاحِ اعمال پر صَرف کرنا پڑتا تھا، تاہم انہیں ملک وملت کے مفاد کی خاطر انجمن اسلامیہ کے پریذیڈنٹ کا منصب بھی قبول کرنا پڑا۔ اُس وقت انجمن مذکور نے کئی کالجوں اور ہائی سکولوں کا انتظام سنبھال رکھا تھا، جو تقریباً شہر کی نصف آبادی کی تعلیمی ضروریات کے کفیل تھے۔ مخدوم زادہ سیّد فیض مصطفےٰ گیلانی جو مخدوم صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں انجمن کے مینیجر تھے اور اپنی مخصوص صلاحیتوں کے سبب انجمن کے مالیاتی نظام کو نہایت عمدگی سے چلا رہے تھے۔ اب چونکہ موجودہ حکومت نے کالجوں اور ہائی سکولوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے تاہم کنڈر گارٹن سکول بدستور انجمن کی تحویل میں ہے اور مخدوم صاحب اس سکول کے علاوہ مدرسہ عربیہ انوار العلوم اور دیگر کئی دینی مدارس کے بدستور سرپرست اور نگران چلے آتے ہیں۔ تمام مخدوم زادگان آپس میں پیار و محبت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور مخدوم صاحب ان کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں۔

خواجہ ناظم الدین ملتان میں

۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو خواجہ ناظم الدین بحیثیت گورنر جنرل سردار عبد الرّب نشتر کی معیّت میں ملتان تشریف لائے اور انہوں نے سرکاری مصروفیات کے بعد حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریّا اور قطب الاقطاب شاہ رُکنِ عالم رحمہم اللہ علیہم کے مقابرِ مقدسہ پر حاضری بھی دی۔ مخدوم مرید حسین صاحب قریشی سجّادہ نشین نے اس موقع پر خواجہ صاحب کی خدمت میں قرآن مجید،

ایک کمان اور تسبیح کا ہدیہ پیش کیا۔ اور فرمایا:-

"جنابِ والا کا میرے بزرگوں کے اس خاموش گھر میں تشریف لے آنا میرے اور میرے خاندان کے لئے مایۂ صد افتخار ہے۔ میرے آبار کرام کا طریقہ رہا ہے، کہ جب کبھی فرمانروایانِ مملکت ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں انہوں نے حضرت شیخ الاسلام کی طرف سے کتاب اللہ، کمان اور تسبیح کا ہدیہ پیش کیا ہے جو فتح و نصرت کا نشان سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس تقریب پر بحیثیت سجادہ نشین شیخ الاسلام کی سرکار سے یہ ہدیہ پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ خدا لئے بلند و برتر پاکستان کو فتح و نصرت عطا فرمائے۔"

اس تقریر کا گورنر جنرل اور حاضرین پر خاص اثر ہوا اور ان سب نے بڑے اخلاص سے شیخ الاسلام کی بارگاہ میں فاتحہ کی صورت میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہاں سے آپ دربار پیر صاحبؒ تشریف لے گئے اور حضرت مخدوم جمال الدین موسیٰ پاک شہید قدس سرہٗ کے آستانِ قدس پر حاضری دی۔ جہاں مخدوم سید شوکت حسینؒ جیلانی نے اپنے برادرانِ عالی مقام و دیگر اعزہ و اقارب کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ خاندانی روایات کے مطابق کمان اور تلوار صاحبِ روضہ کی طرف سے پیش کی اور ساتھ ہی بڑے اخلاص سے دعا فرمائی۔ دوپہر کو مسلم لیگ کی طرف سے گورنر جنرل کو کھانا دیا گیا۔

سنہ ۱۹۵۱ء تک کے اہم واقعات

۱۳؍ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے عالمِ فانی سے عالمِ قدس کو انتقال فرمایا۔ آپ کو کراچی میں دفن کیا گیا۔

یکم مارچ سنہ ۱۹۵۰ء کو شہنشاہ ایران پہلی بار پاکستان تشریف لائے۔

۲، اپریل کو نئی دہلی میں خان لیاقت علی خاں اور پنڈت نہرو کے مابین مذاکرات شروع ہوئے اور ۲۹، اپریل کو امریکی حکومت کی دعوت پر موصوف امریکہ تشریف لے گئے۔

۶، ستمبر ۱۹۵۰ء کو جنرل محمد ایوب خاں پاک افواج کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔

۱۵، ستمبر ۱۹۵۰ء کو پاکستان کا ہندو وزیرِ قانون جوگندر ناتھ منڈل ہندوستان بھاگ گیا۔

۹، فروری ۱۹۵۱ء کو پاکستان میں پہلی مردم شماری ہوئی۔

۳، مئی ۱۹۵۱ء کو ڈاکٹر گراہم کشمیر میں متحدہ اقوام کے نمائندے مقرر ہوئے۔

۲۷، جون ۱۹۵۱ء کو خان لیاقت علی خاں نے ہندوستان کو تاریخی مُکّا دکھایا۔

۲۸، اگست ۱۹۵۱ء کو پاکستان اور مصر کے درمیان دوستانہ معاہدے پر دستخط ہوئے۔

۳۰، ستمبر کو مشرقی اور مغربی پاکستان کے لئے نئے اسٹینڈرڈ ٹائم کا تعین ہوا — یعنی گرین وِچ ٹائم سے پانچ گھنٹے آگے۔

لیاقت علی خاں کی شہادت

۱۶، اکتوبر ۱۹۵۱ء کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کو راولپنڈی کے ایک جلسۂ عام میں شہید کر دیا گیا۔ ان کی لاش کراچی میں لائی گئی اور قائدِ اعظم کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ پندرہ دنوں تک پاکستان میں سرکاری طور پر سوگ منایا گیا۔ جھنڈے سرنگوں رہے اور ریڈیو پاکستان بجائے نغمات کے قرآن کریم کی آیات نشر کرتا رہا۔

ملک غلام محمدؒ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل

قائدِ ملت کی شہادت پر خواجہ ناظم الدین گورنری سے مستعفی ہو گئے اور ملک غلام محمدؒ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ خواجہ ناظم الدین نے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف

شہید ملت لیاقت علی خان

اُٹھایا۔ ان کے عہد میں ۱۴ر دسمبر کو پاکستان پہلی مرتبہ سلامتی کونسل کا ممبر منتخب ہوا۔ ۲۲ر فروری ۱۹۵۲ء کو ملک غلام محمدؒ نے ملتان کا سرکاری دورہ کیا۔ اور دن کے گیارہ بجے اس نے شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمتہ کے آستان قدسی نشان پر حاضری دی۔ صاحب سجادہ مخدوم مرید حسین قریشی نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ جب گورنر جنرل اور عمائدین سلطنت مزارِ پُرنور بار پر فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہوئے تو مخدوم صاحب نے گورنر جنرل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"عالی مرتبت! میں اپنے آباء کرام کی اس آرام گاہ میں آپ کی تشریف آوری پر پُرخلوص شکریہ پیش کرتا ہوں۔ میری دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی روحانی اعانت ہمیشہ آپ کے شاملِ حال رہے۔

میرے جدِّ اعلیٰ کی وفات آٹھ سو سال کا زمانہ پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ اور میرا خاندان اتنے ہی عرصہ سے اس شہر میں آباد ہے۔ اس طویل زمانہ میں کئی انقلابات آئے، اور گزرتے رہے۔ زمانۂ ماضی کی کئی تاریخی داستانیں افسانہ بن کر رہ گئیں۔ کئی فرمانرواؤں کی کافوری شمعیں جل جل کر ہمیشہ کے لئے بجھ گئیں۔ لیکن ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد

ان کی روحانی فرمانروائی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی!"

گورنر جنرل مخدوم صاحب کے ان الفاظ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مزارِ پُرنور بار پر اخلاص و عقیدت سے سر جھکا دیا۔ اور دیر تک ہاتھ اُٹھا کر مصروفِ دُعا رہے۔ اِس موقع پر تقریباً ایک ہزار سندھی مُرید دربار شریف پر موجود تھے۔ جب اعیانِ مملکت مقبرۂ ابیض سے باہر نکلے تو انہوں نے حضرت غوثؒ کے مخصوص نعروں سے گورنر جنرل کا خیر مقدم کیا اور

سندھی زبان میں کئی قصیدے پڑھے، جن کا گورنر جنرل اور حاضرین پر خاص اثر ہُوا۔ یہاں سے فارغ ہو کر گورنر جنرل "البیلان" تشریف لے گئے۔ جہاں آپ کو مسلم لیگ کی جانب سے بڑے پیمانے پر کھانا دیا گیا۔ اس تقریب میں مملکت پاکستان کے معروف وزراء مسلم لیگ کے اکابر اراکین اور ممتاز رؤسا شامل تھے۔

پچھلے پہر گورنر جنرل نے دربار پیر صاحب پر حاضر ہو کر فاتحہ کا خراج عقیدت پیش کیا۔ یہاں حضرت مخدوم صاحب اپنے بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں سمیت آپ کے استقبال کو موجود تھے۔ انہوں نے بھی بڑے اخلاص سے گورنر جنرل کو تیر اور کمان کا ہدیہ پیش کیا اور پاکستان کے استحکام کے لئے دُعا کی۔

۱۹۵۵ء تک کے اہم واقعات

ملک غلام محمدؒ کے زمانۂ اقتدار کے مشہور واقعات یہ ہیں:۔

۱۲ر اپریل ۱۹۵۲ء کو قلات، لس بیلا اور مکران کے والیانِ ریاست کی رضامندی سے متحدہ ریاست ہائے بلوچستان کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۲۸ر اپریل کو کراچی کو چیف کمشنر کا صوبہ قرار دیا گیا۔

۲۶ر ستمبر ۵۲ء کو ہندوستان کی ہٹ دھرمی سے متحدہ اقوام کے نمائندہ مسٹر گراہم مسئلہ کشمیر کے تصفیہ میں ناکام رہے اور انہوں نے سلامتی کونسل کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

۱۶ر فروری ۵۳ء کو لاہور میں پاکستان اکیڈیمی آف سائنس کا افتتاح عمل میں آیا۔

۲۷ر فروری کو دار الحکومت کراچی میں تحریکِ ختمِ نبوّت کے راہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

۶ر مارچ کو لاہور میں مارشل لار کا نفاذ ہُوا اور تحریکِ ختمِ نبوّت کے سلسلے میں کافی مسلمان شہید ہوئے۔

۲۳ مارچ کو وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کی وزارت کو برطرف کر دیا اور اُن کی جگہ ملک فیروز خاں نون کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ نون کیبنٹ میں ملتان سے مخدوم زادہ سید محمد علمدار حسین گیلانی کو بطور وزیر بلدیات و صحت شامل کیا گیا۔ انہوں نے نشتر کالج کی عمارات کو جس کا سنگِ بنیاد نشتر صاحب بحیثیت گورنر رکھ گئے تھے، کئی مخالفتوں کے باوجود تکمیل تک پہنچایا اور پنجاب کے سات آٹھ اضلاع میں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹرز ہسپتالات تعمیر کرائے۔

۱۷ اپریل کو ملک غلام محمد نے اپنے اختیاراتِ خاص سے خواجہ ناظم الدین اور ان کی کابینہ کو برطرف کر دیا۔ اور مسٹر محمد علی بوگرا سفیر متعینہ امریکہ کو ان کی جگہ وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سونپ دیا۔

۱۶ اگست کو مسٹر محمد علی بوگرا اور پنڈت نہرو کے مابین مسئلہ کشمیر پر مفاہمت کا اعلان ہوا جس سے بعد میں بھارت منحرف ہو گیا۔

۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو اسلامی دُنیا کے بہت بڑے مؤرخ علامہ سید سلیمان ندوی نے کراچی میں وفات پائی۔

۱۰ دسمبر کو پنجاب اسمبلی نے اردو کو صوبے کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔

۱۳ مارچ ۱۹۵۴ء کو شاہ عراق فیصل ثانی کراچی میں تشریف لائے۔

۲۲ مارچ ۱۹۵۴ء کو پیپر مل کرنافلی اور مشرقی پاکستان میں خونریز فسادات ہوئے جن میں ۱۵۰ کے قریب افراد ہلاک و مجروح ہوئے۔

۲ اپریل کو ترکی اور پاکستان کے درمیان فوجی امداد کے معاہدہ پر دستخط ہوئے۔

۱۴ اپریل ۱۹۵۴ء میں حجاز کے بادشاہ سلطان سعود بن سلطان عبدالعزیز پاکستان تشریف لائے۔

۱۹ اپریل کو دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نے اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی پاکستان

کی سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کیا۔

۱۵ر مئی ۵۴ء کو نرائن گنج کے صنعتی علاقوں میں شدید خونریز فسادات ہوئے جن میں سینکڑوں افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ پاکستان کی تاریخ میں اتنا بڑا فساد پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

۱۹ر مئی کو پاکستان اور امریکہ کے درمیان دفاعی امداد کا معاہدہ ہوا۔

۳۰ر مئی ۵۴ء کو ملک غلام محمدؒ نے مولوی فضل الحق کی کابینہ کو برطرف کرکے مشرقی پاکستان میں گورنری راج قائم کیا اور سکندر مرزا گورنر مقرر ہوئے۔

۲۴ر جولائی کو کمیونسٹ پارٹی خلافِ قانون قرار دی گئی۔ اور متعدد گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

۸ر اگست ۵۴ء کو ملک غلام محمدؒ اور مسٹر محمدؒ علی بوگرا نے حج کیا اور اسلامی ممالک کے راہنماؤں کی کانفرنس میں شرکت کی۔

۲۴ر اکتوبر ۵۴ء کو گورنر جنرل ملک غلام محمدؒ نے اپنے خاص اختیارات سے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور مسٹر محمد علی کو کابینہ میں مکمل ردّ و بدل کرنے پر مجبور کیا۔

۲۲ر نومبر ۵۴ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ایک صوبے میں منتقل کرنے کے منصوبے کا اعلان ہوا۔

۱۴ر دسمبر ۵۴ء کو کراچی میں صوبائی گورنروں، وزرائے اعلیٰ اور والیانِ ریاست کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں ایک یونٹ کی سکیم منظور کر لی گئی۔

۱۸ر فروری ۵۵ء کو جمہوریہ ترکیہ کے صدر جلال بایار پاکستان کے دورہ پر تشریف لائے۔

۵ر مارچ کو اردن کے بادشاہ شاہ حسین نے پاکستان کا سرکاری دورہ کیا۔

۱۵ر مارچ کو کوٹری بیراج کی رسمِ افتتاح انجام دی گئی۔ اور بیراج کا نام غلام محمد بیراج رکھا گیا۔

۲۷؍مارچ ۱۹۵۵ء کو ہنگامی حالات کا اعلان کر کے گورنر جنرل نے ملک کے تمام اختیارات خود سنبھال لئے۔

۹؍اپریل کو کراچی میں مصر کے وزیر اعظم کرنل جمال عبدالناصر تشریف لائے، پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

۲۱؍مئی ۱۹۵۵ء کو پنجاب کے گورنر میاں مشتاق احمد خاں گرمانی نے ملک فیروز خاں نون کی کابینہ کو برطرف کر دیا اور وزارت عظمیٰ کا منصب سردار عبدالحمید خاں دستی کو تفویض ہوا۔

۲۸؍مئی کو نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کا اعلان کیا گیا۔

۲؍جون ۱۹۵۵ء کو مشرقی پاکستان میں گورنری راج ختم کر کے مولوی اے کے فضل حق کو دوبارہ تشکیل وزارت کی دعوت دی گئی۔

۲۱؍جون کو نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ختم ہوئے۔

یکم جولائی کو پاکستان میثاق بغداد میں شامل ہوا۔

۷؍جولائی ۱۹۵۵ء کو مری میں نئی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس میاں مشتاق احمد خاں گرمانی کی صدارت میں شروع ہو کر ۱۴؍جولائی کو ختم ہوا۔

۱۸؍جولائی کو صوبہ سرحد میں سردار عبدالرشید خاں کی وزارت برطرف کر دی گئی۔

یکم اگست ۱۹۵۵ء کو پاکستانی روپیہ کی قیمت کم کر کے اسے ایک شلنگ چھ پنس کے برابر کر دیا گیا۔ ہندوستان اپنے روپے کی قیمت گرا چکا تھا۔ لیکن پاکستان نے تخفیف منظور نہیں کی تھی۔

۷؍اگست ۱۹۵۵ء کو ملک غلام محمد نے علالت کی بنا پر رخصت لی اور وزیر داخلہ میجر سکندر مرزا نے پاکستان کے قائم مقام گورنر جنرل کی حیثیت سے عہدے کا حلف لیا۔

۸ر اگست ۱۹۵۵ء کو کراچی میں نئی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس شروع ہوئے۔
۱۱ر اگست کو چودھری محمد علی کی زیر قیادت مخلوط وزارت کا قیام عمل میں آیا۔ اور متحدہ محاذ کے لیڈر مولوی اے کے فضل الحق وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔

میجر جنرل سکندر مرزا، پاکستان کے چوتھے گورنر جنرل

۱۹ر ستمبر کو دفعتہً پتہ چلا کہ ملک غلام محمد نے گورنری سے استعفا دے دیا ہے اور ان کی جگہ میجر جنرل سکندر مرزا پاکستان کے نئے گورنر جنرل مقرر ہوئے ہیں۔ یہ بھی بنگال کے نوابی خاندان سے تھے۔ ان کے زمانے کے مختصر واقعات حسب ذیل ہیں:۔
۲۱ر نومبر ۱۹۵۵ء کو مشرقی پاکستان کی پولیس نے ہڑتال کر دی۔
۲۶ر نومبر کو کراچی میں آل پارٹیز کشمیر کانفرنس ہوئی۔
۹ر دسمبر کو روس کے وزیر اعظم مارشل بلگانن اور روسی کمیونسٹ پارٹی کے ناظم اول مسٹر خروشیف نے سری نگر میں کشمیر کو ہندوستان کا شمالی علاقہ تسلیم کر لیا اور پاکستانی مؤقف پر اعتراضات کئے۔
۳۰ر دسمبر کو دستور یہ کی مخلوط پارلیمنٹری پارٹی نے انگریزی کو بیس سال تک سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔
۲۸ر فروری ۱۹۵۶ء کی نصف شب سے چند منٹ پہلے دستور ساز اسمبلی میں اسلامی دستور منظور ہو گیا۔
۱۸ر مارچ ۱۹۵۶ء کو جشن جمہوریہ اسلامیہ کی شرکت کے لئے ترکی کے وزیر اعظم ڈاکٹر عدنان مندریس اور وزیر خارجہ مسٹر زاد کوپرولو کراچی تشریف لائے۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا جشن منایا گیا۔

یومِ انقلاب

پاکستان کا نظام روز بروز بگڑتا جا رہا تھا۔ وزراء اور دُوسرے سیاسی طالع آزماؤں کو صرف اپنا مفاد عزیز تھا۔ ملک تباہی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دفعتہً ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو یہ خبر ریڈیو سے نشر ہوئی کہ ملک کا نظام فوج نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ جنرل محمد ایوب خاں کے برسرِ اقتدار آتے ہی ملک کے سیاسی اور سماجی حالات برق رفتاری سے تبدیل ہونے لگے۔ سماج دشمن عناصر کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے فوجی عدالتیں قائم ہوئیں۔ ۹ر اکتوبر کو سارے ملک میں اشیائے ضروریہ کی قیمتیں گرنا شروع ہو گئیں۔ ۲۰ر اکتوبر کو پاکستان کی نئی کابینہ کا اعلان ہُوا اور جنرل محمد ایوب خاں وزیرِ اعظم بنا دیئے گئے۔ ۲۷ر اکتوبر کو متروکہ املاک کے قابضین کو ایک ماہ کے اندر تفصیلات مہیا کرنے کا حکم دیا گیا۔ ۲۸ر اکتوبر کو سکندر مرزا صدارت سے سبکدوش کر دیئے گئے اور جملہ اختیارات جنرل محمد ایوب خاں نے سنبھال لئے۔

جنرل محمد ایوب خاں صدرِ مملکت پاکستان

یکم نومبر کو سکندر مرزا نہایت بے بسی کے عالم میں مُلک بدر کر دیئے گئے اس کے نہ تو برسرِ اقتدار آنے پر کسی کو خوشی ہوئی تھی اور نہ معزول ہونے پر کسی کو افسوس ہُوا۔ جنرل محمد ایوب خاں ایسے وقت میں برسرِ اقتدار آئے تھے جبکہ ملک کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا اس لئے تمام افرادِ رعایا نے اس پر اعتماد کیا۔ اور اس نے بھی ابتداءً ہر لحاظ سے اپنے آپ کو صدارت کا اہل ثابت کیا۔ مُلک کی اصلاح کے لئے جو قدم اُٹھایا گیا تھا اس میں اور چُستی پیدا ہو گئی۔

اسدؔ ملتانی کا انتقال

۱۷ر نومبر ۱۹۵۹ء کو ملتان کے عظیم دانشور اور قادرالکلام شاعر جناب اسدؔ ملتانی کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تھا، آپ اُس وقت "فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ" میں

ملازم تھے۔ اندرون اور بیرونِ ملک کی تمام خفیہ فائلیں ان کی تحویل میں تھیں۔ جونہی گورنر جنرل نے ان فائیلوں کو جلانے کا حکم دیا، آپ نے رازدارانہ طور پر یہ تمام فائیلیں اس جہاز کے ذریعے جو انہیں اہل وعیال اور سامان و اسباب پاکستان بھیجنے کے لئے دیا گیا تھا پاکستان بھجوا دیں۔ پاکستان میں آپ کو وزارتِ خارجہ میں لیا گیا۔ اور آپ بہت جلد اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے طفیل ڈپٹی سیکرٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو گئے۔

آپ انتہائی سادہ طبیعت کے انسان تھے اور مشرقی تہذیب کی اعلیٰ قدروں پر جان دیتے تھے۔ جب انہوں نے ملک کے نوجوان دانش وروں کو ترقی پسند ادب کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تو آپ نے انہیں شدت سے اس امر کا احساس دلایا کہ تم لوگوں نے اپنی کم فہمی سے جسے "شاخِ نبات" سمجھ لیا ہے۔ یہ ساحرالموط کے "برگِ حشیش" سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ ذیل کے اشعار سے جو انہوں نے "نیا ادب" کے ضمن میں موزوں کئے تھے ان کی برہمی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، ارشاد فرماتے ہیں ؎

نہ پاسِ خلق نہ خوفِ خدا، نہ شرمِ نبیؐ — نیا ادب ہے کہ سعیٔ فروغِ بے ادبی
ہوائے نفس کی تصویرِ شوخ و عریاں کو — کہیں حیات کا آئینہ، وائے بوالعجبی
بیانِ حال میں پنہاں ہے آرزومندی — ہے احتساب کے پردے میں مدعا طلبی
یہ چاہتے ہیں کچھ ایسی مکمل آزادی — کہ جس کے دور میں کوئی بدی رہے نہ دبی
ہے سر میں ہوش بہ اندازۂ پریشانی — ہے دل میں جوش بمقدارِ بادۂ عنبی
یہ زندگی ہے کہ دنیائے دل کی بربادی — یہ روشنی ہے کہ فکر و نظر کی تیرہ شبی
وہ بوالہوس بھی جنہیں جرأتِ گناہ نہیں — ادب میں ڈھونڈھ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی
نئے ادب میں چمک اور تپش سہی لیکن — وہی کہ اصل ہے جن کی شرارِ بولہبی
جدید بھی تو نہیں یہ ادب کہ ہے اس میں — وہی قدیم ہوس جوئی و طرب طلبی

پھر ایک بار یہ فیضِ فرنگ اُبھرا ہے — دبا ہُوا ادبِ جاہلیّت عربی
اسدؔ ادیب" ترقی پسند" ہے کہ دو
لے ہے تجھی کو مبارک فریب خوش نقبی

اسد مرحوم نے اردو، فارسی اور سرائیکی میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر افسوس ہے سوائے چند کتابچوں کے ان کا کوئی جامع دیوان طبع نہیں ہو سکا۔ اگر ان کے بھائی خان محمد اکرم خان ان گراں قدر جواہر ریزوں کو کتابی صورت دے سکیں تو یہ قوم و ملک کی بہت بڑی خدمت ہو گی!

۱۹۶۰ء کے اہم کوائف

۱۵ر جنوری کو صدر کے انتخاب کا نتیجہ بر آمد ہُوا۔ ننا نوے فی صد ووٹروں نے صدر پر اعتماد کا اظہار کیا۔ ۲۲ر جنوری کو ترکی کے صدر جلال بایار لاہور تشریف لائے۔ ۲۵ر جنوری کو طے پایا کہ نئے دارالحکومت کا نام اسلام آباد رکھا جائے۔

نواب مخدوم مرید حسین قریشی کی وفات

جون ۱۹۶۰ء کے اواخر میں دفعتہً یہ خبر سُننے میں آئی کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمتہ کے دریا دل سجّادہ نشین نواب مخدوم مرید حسین انتقال کر گئے دوست، دُشمن جس نے بھی سُنا دل پکڑ کر رہ گیا۔ اعزّا احباب اور ارادت مندوں کو تو اس لئے دُنیا تاریک معلوم ہوئی کہ انہیں پھر اپنے خاندان میں مخدوم مرید حسین جیسا رجل عظیم پیدا ہونا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جب مرحوم عاشق حسین کی جگہ آج تک جُوں کی توں خالی پڑی ہے تو مخدوم مرید حسین ایسی عظیم شخصیت پھر کہاں نصیب ہو

سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مخدوم صاحب کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ان کے چھوٹے بھائی شیخ احمد کبیر صاحب کو ہوئی، تو وہ بے تحاشا گر پڑے اور انہیں گہری چوٹیں آئیں جن کے باعث وہ عرصہ تک نشتر میڈیکل کالج میں زیر علاج رہے۔

مخدوم صاحب بڑے خوش نصیب بزرگ تھے کہ انہوں نے دل کی تمام مرادیں پائیں۔ آپ اللہ کی جناب میں پوتے کے لئے دست بدعا رہتے تھے۔ خدا نے آپ کی وہ دعا بھی سن لی اور اپنے پوتے کو پروان چڑھتا دیکھ لیا۔ وفات سے چند یوم پہلے مخدوم زادہ سجاد حسین بلدیہ ملتان کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ یہ چند در چند ایسی مسرتیں تھیں جنہوں نے مخدوم صاحب کو عالم آخرت کے سفر کے لئے کامل اطمینان سے تیار کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت پیک اجل کے منتظر رہتے تھے۔ آخر وہ وقت آیا کہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ۲۸ جون کی صبح کو عالم باقی کو انتقال کر گئے یہ مخدوم صاحب کی ایک اور خوش نصیبی کی بات ہے کہ آپ کو حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں جگہ ملی۔ ملتان کا یہ نامور مخدوم، دریادل نواب، ادب نواز رئیس اپنے والد ماجد مخدوم حسن بخشؒ کے پہلو میں محوِ خواب ہے۔

آپ بہترین ادیب، فصیح البیان خطیب اور بیدار مغز انسان تھے۔ آپ کی دریادلی کا یہ عالم تھا کہ پاک و ہند کی کوئی علمی درسگاہ یا انجمن ایسی نہیں تھی جسے آپ کی اعانت حاصل نہ ہو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انجمن صلیب احمر، یتیم خانہ لکھنؤ اور انجمن خیر المدارس کو آپ گراں قدر عطیات دیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام کی ذات سے آپ کو والہانہ محبت تھی۔ آپ نے کئی بار مقابرِ مقدسہ کی مرمت کرائی اور اعراس جو سکھوں کے دور میں بند کر دیئے گئے تھے، بڑے اہتمام سے دوبارہ منعقد کرائے۔ ان تقریبات پر آپ ہزاروں روپے اپنی جیب سے خرچ کیا کرتے تھے۔

انگریزی دورِ حکومت میں اپنی غیر معمولی سوجھ بوجھ اور فہم و تدبر کے سبب وہ سب اعزازات

نواب مخدوم مرید حسین صاحب قریشی رح

المتوفی ۲۸ جون ۱۹۶۰ء امطابق ۶ محرم ۱۳۸۰ھ

اور خطابات حاصل کر لیئے تھے جو آپ کے والد بزرگوار کو حاصل تھے۔ بلکہ مزید بر آں سر اور نوابی کے اعزازات بھی ملے۔ جو آپ کے خاندان میں پہلے کسی کو نہیں ملے تھے۔ سالہا سال تک مرکزی اسمبلی کے رُکن، بلدیہ کے چیئرمین، آنریری مجسٹریٹ اور انجمن اسلامیہ کے صدر رہے۔ آپ کی زندگی کے آخری دَور میں جب ملکی سیاسیات نے غیر معمولی کروٹ لی اور مُلک کی آزادی کے لیئے کانگریس اور مُسلم لیگ نے ٹھوس کام کرنا شروع کیا تو آپ نے بھی ضعیفی، اور پیرانہ سالی کے باوجود مُسلم لیگ کو تقویت پہنچانے کی غرض سے طوفانی دَورے کیئے۔ ضلع ملتان کے علاوہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے سندھ پہنچے اور وہاں لاکھوں مریدوں کو مسلم لیگ کی امداد پر آمادہ کیا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی جب لاکھوں مہاجرین بے سروسامانی کے عالم میں یہاں پہنچے، تو آپ نے ان کی امداد کے لیئے نہ صرف زرِ خطیر مہاجر فنڈ میں داخل کی، بلکہ اپنی اراضیات میں بھی مہاجرین کی آباد کاری کا خاطر خواہ انتظام فرمایا۔ ۱۹۵۲ء میں جب گورنر جنرل ملک غلام محمد ملتان تشریف لائے اور حضرت شیخ الاسلام کے آستانِ قدسی نشان پر حاضری دی۔ تو مخدوم صاحب سے حضرت کی سیرت طلب کی۔ اگرچہ آپ کے والد ماجد نے انوارِ غوثیہ کے نام سے ایک تذکرہ طبع کرایا تھا۔ مگر اب وہ نایاب ہو چکا تھا۔ اگر ایک آدھ نسخہ کہیں موجود تھا بھی تو اس کے اوراق اس قدر بوسیدہ ہو چکے تھے کہ قاری کو اس سے استفادہ کرنے میں بڑی دِقّت ہوتی تھی۔ اِس لیئے مخدوم صاحب کو حضرت شیخ الاسلام کا تفصیلی تذکرہ طبع کرانے کا خیال پیدا ہُوا اور اس مقصد کے لیئے ان کی نظرِ انتخاب اِس احقر پر پڑی۔ نیازمند نے تین سال کے عرصے میں حضرت شیخ الاسلام کا جامع تذکرہ مدوّن کر لیا۔ اور اسے طبع کر کے مخدوم صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ جسے آپ نے بے حد پسند فرمایا۔ اس سلسلہ کی دوسری تصنیف "صدر الدین عارف" مخدوم صاحب کے لمحاتِ آخر میں طبع ہوئی اور وہ اسے ملاحظہ کر کے ملکِ بقا کو رخصت ہوئے۔

موجودہ سجّادہ نشین مخدوم محمد سجاد حسین قریشی

جناب مخدوم مُرید حسین قریشی کے انتقال پر ان کے جواں سال فرزند مخدوم محمد سجاد حسین کی رسم دستار بندی ادا کی گئی۔ جس میں مغربی پاکستان کے ممتاز علماء و مشائخ اور امراء و رؤسا شریک ہوئے۔ اس موقع پر آپ نے دل کھول کر روپیہ صرف کیا اور یہ تقریب بڑے اعلیٰ پیمانے پر انجام کو پہنچی۔

مخدوم صاحب ۳۸ سال کے نوجوان ہیں۔ آپ عرصہ تک بلدیہ ملتان کے نائب صدر اور نیشنل اسمبلی کے رُکن رہے ہیں۔ مگر پچھلے الیکشن میں آپ نے حصّہ نہیں لیا۔ اس لئے اب خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جناب مخدوم صاحب اردو، فارسی، انگریزی اور سندھی میں خاصی قابلیت رکھتے ہیں۔ آپ باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں، ہر شخص کو خندہ پیشانی سے ملتے، اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔ آپ ہزاروں مُریدوں کے پیر ہیں جو آپ سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

فدائے ملّت سیّد زین العابدین شاہ گیلانی

سیّد زین العابدین شاہ کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں جب علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر سرکاری ملازمتوں کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا۔ آپ اس وقت تحصیلدار تھے اور بڑے سکون و اطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ترکوں کی حمایت اور خلافت کی بقاء کے لئے دُوسرے درد مند مسلمانوں کی طرح آپ بھی ملازمت چھوڑ کر مردانہ وار میدان میں نکل آئے۔ اور زندگی بھر کا اندوختہ تحریکِ خلافت پر نچھاور کر دیا اس کے بعد مسلمانوں کے مفاد کے لئے جو تحریک بھی اُبھری آپ نے اُسے خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا۔ بالخصوص تحریکِ فدایانِ اسلام توان کا اوڑھنا بچھونا ہو کر رہ گئی۔ بقول

مخدوم محمد سجاد حسین صاحب قریشی

منشی عبدالرحمٰن خانؒ" انجمن فدایانِ اسلام کا مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بچانا تھا۔ اس فدائی سردار کے باقاعدہ وزیر تھے، فوج تھی۔ ملتان میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ جب یہ عظیم مجاہد اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بازاروں سے گزرتا تو ہندو کانپ اٹھتے تھے۔ غریبوں کی یہ فوج مرنے مارنے سے نہ ڈرتی تھی۔ جہاں بھی ہندو ذرا شرارت کرتا، یہ وہاں پہنچ کر جھنڈے گاڑ دیتی اور اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹتی جب تک کہ اپنی بات نہ منوا لیتی [1]۔"

واحد ندوی لکھتے ہیں :۔ "انگریز اور اس کی حکومت اس پر ہمیشہ قہر و عتاب کی بجلیاں گراتی رہی، بارہا بغاوت کے سنگین مقدمات قائم کر کے اسے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند رکھا۔ ان کی زبان بندی کی۔ ان کا اخبار "ترجمان" ضبط کیا لیکن زین العابدین کا نام اس کی چھاتی کا "کابوس" اور اس کی چہیتی ہندو جنتا کے لئے "ہوّا" بنا رہا۔ ہندو اسے "فسادی شاہ" کے نام سے پکارتا رہا۔ انگریز اسے باغی شاہ کہتا رہا اور اپنے طنطنۂ و اقبال اور جاہ و جلال کے باوجود مرتے دم تک اس سے خائف و ہراساں رہا [2]۔"

باغ عام خاص شاہ صاحب کا میدانِ جنگ تھا۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد یہاں ہزاروں مسلمان اُن کی گھن گرج سے ایمان تازہ کرنے کے لئے جمع ہوتے اور پورا باغ اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج اٹھتا تھا۔ پھر یہاں سے ان کی فوج ظفر موج سینہ تانے سر اٹھائے حسینؓ آگاہی سے شہر میں داخل ہوتی اور ملتان شہر کے اسٹیشن کے پاس پہنچ کر منتشر ہو جاتی۔ اس طویل جدوجہد کے بعد بالآخر شاہ صاحب کو فتح ہوئی۔ نہ انگریز رہا اور نہ اس کی چہیتی ہندو جنتا۔ اپنے شہر کو ان دونوں نحوستوں سے پاک کر کے یہ بیباک اور نڈر مجاہد

---

[1] آئینہ ملتان صفحہ ۴۲۶　[2] یادوں کے چراغ ص۱۰۱، از واحد ندوی

۸ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کو فتح و کامرانی کی چادر تان قلبِ شہر میں ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گیا۔ ع
خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

شیخ احمد کبیر قریشی

آپ نواب مخدوم مرید حسین قریشی علیہ الرحمۃ کے چھوٹے بھائی اور مخدوم محمد سجاد حسین قریشی کے چچا تھے۔ آپ کو اپنے برادرِ محترم سے بے انتہا محبت تھی۔ جوں ہی ان کے انتقال کی خبر سُنی بے تحاشا گر پڑے۔ متعدد گہری چوٹیں آئیں اور عرصہ تک نشتر میڈیکل کالج میں زیرِ علاج رہے۔ جب زخم مندمل ہوئے تو آپ کو واپس اپنے بنگلے میں لے آئے۔ اسی صورتِ حال میں آپ مخدوم محمد سجاد حسین صاحب کی رسمِ دستار بندی میں شریک ہوئے اور اپنے دستِ شفقت سے حضرت غوث العٰلمین کے پیرِ طریقت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی علیہ الرحمۃ کی دستارِ مبارک ان کے سر پر رکھی۔ اس تقریب کے کچھ عرصہ بعد ۱۹ر مئی ۱۹۶۲ء کو آپ نے وفات پائی اور حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم قدس سرہٗ کے احاطے میں دفن ہوئے۔ پیر خورشید احمد صاحب قریشی آپ کے اکلوتے صاحبزادے اور شیخ آفتاب احمد صاحب اکلوتے پوتے ہیں۔ دونوں باپ بیٹے علومِ متداولہ میں اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ شہر کے مقتدر رئیس ہونے کے باوجود ان میں تعیش کا ذرہ بھر بھی مادہ نہیں ہے۔ کاروباری ذہن رکھتے ہیں اور سکون و اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی کوٹھی "الکبیر" کا شمار ملتان کی حسین ترین عمارتوں میں ہوتا ہے۔ خوشنما مرغزاروں اور گرد و پیش کے متناسب اضافوں نے اس کی دلکشی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ جب انسان شہر کی گھما گھمی اور ہاؤ ہو سے گھبرا کر ایسے فرحت بخش ماحول میں قدم رکھتا ہے۔ تو اس کے دل میں کھوئے ہوئے خلدِ بریں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

محمد ایوب خاں کی آمرانہ حرکتیں

محمد ایوب خاں میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اچھے حاکم کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس کا ذہن اسلامی تھا۔ تقریر کے لئے کھڑا ہوتا تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے آغاز کرتا۔ بات بات میں انشاء اللہ اور خدا کے فضل و کرم کا سہارا لیتا۔ تقریر خدا سے نیک تمناؤں اور آرزو کی دعا پر ختم کرتا۔ مگر ساتھ ہی اس میں ایسی خرابیاں بھی پیدا ہو گئیں جنہوں نے اس کی تمام خوبیوں اور صلاحیتوں پر پانی پھیر دیا۔

اگرچہ کہنے کو وہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا صدر تھا، مگر اس کی روش شروع سے آخیر تک آمرانہ رہی۔ سب سے پہلے اس نے سیاسی حریفوں کو مفلوج بنانے کی مہم چلائی۔ یہ لوگ یا تو زمیندار تھے، یا خانقاہوں کے متولّی اور سجّادگان۔ زمینداروں کو تو زرعی اصلاحات کے ذریعے نیم جاں کیا۔ سجادگان اور متولّیوں سے خانقاہیں چھین لیں۔ باقی رہے سابق وزراء اور کلیدی افسران، ان کے خلاف انتہائی نفرت انگیز اور مکروہ پروپیگنڈا کیا گیا۔ اور عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ یہ وزراء، اُمراء اور سیاست دان سب قوم اور ملک کے غدّار ہیں اور اگر یہ لوگ چند روز اور برسرِ اقتدار رہتے تو ملک کا نظام تلپٹ ہو کر رہ جاتا۔ اس پروپیگنڈے کا مقصد عوام کو خود اعتمادی کی دولت سے محروم کر کے ذہنی طور پر آمریت قبول کرنے کے لئے آمادہ کرنا تھا۔ اس جدوجہد میں ایوب خاں کو کامیابی تو کیا ہونی تھی، البتہ اس ضمن میں جو کاروائیاں کی گئیں وہ تاریخ کا ایک تلخ باب ضرور بن کر رہ گئیں۔

۶۵ء کی دفاعی جنگ

ملک میں محمد ایوب خاں کے خلاف اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا کہ اعلانِ جنگ کئے بغیر ۶ ستمبر کی صبح کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ دشمن کا ارادہ یہ تھا کہ دفعتہً لاہور پر قبضہ کر لے۔ جونہی

اس حملے کی اطلاع ریڈیو پر نشر ہوئی، پاکستان کے تمام شہری اپنے اختلافات بھول گئے اور دشمن کو اس بزدلانہ حرکت کا مزا چکھانے کے لئے سینہ تان کر آگے بڑھے۔ امراء نے روپے پیسوں کے انبار لگا دیئے، ملازمین نے اپنی تنخواہیں پیش کر دیں۔ عورتوں نے فوجیوں کے لئے سوئٹر اور مفلر تیار کر کے دفاعی فنڈ میں جمع کرایا۔ گلوکارہ نور جہاں نے "تنا تن دھیاں" کے بجائے "میڈا اڈھول سپاہیا تیکوں رب دیاں رکھاں" گانا شروع کیا۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ پاک سپاہیوں کی جرأت و مردانگی کا خون کھول اٹھا اور انہوں نے عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کی لازوال روایات کو پھر سے اجاگر کر دیا۔ اگرچہ بھارتی افواج کے مقابلے میں پاکستان کی فوج کہیں کم تھی۔ لیکن اس نے اس جوانمردی اور بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ قرنِ اوّل کے مجاہدین کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ جنگ سترہ روز لڑی گئی اور پاکستانی افواج نے ہر محاذ پر شجاعت و بہادری کی شاندار مثالیں قائم کیں، جارح دشمن کو اس کی نفری اور اسلحہ کی کثرت کے باوجود کچل کر رکھ دیا اور وہ بوکھلا کر مغربی طاقتوں سے طالبِ امداد ہوا جس پر جنگ ختم کرا دی گئی۔

معاہدہ تاشقند اور اس کا ردِ عمل

یہ جنگ کشمیریوں کی تائید و حمایت میں لڑی گئی تھی، جنگ بندی کے بعد وزیر اعظم روس کے زیر اہتمام تاشقند میں پاک بھارت مذاکرات شروع ہوئے۔ نتیجہ کے طور پر بھارت کے پست قد وزیر اعظم نے پاکستان کے لمبے تڑنگے فیلڈ مارشل کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ یعنی جو معاہدہ ہوا اس میں کشمیر کا نام تک نہ تھا۔ جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں تاشقند سے واپس آئے تو پورے ملک میں اس کے خلاف رنج و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کالجوں کے طلباء کمروں سے باہر نکل آئے اور انہوں نے توڑ پھوڑ کی کارروائی شروع کر دی۔ اس سلسلے میں ملتان کے طلباء نے بھی ایک جلوس نکالا جس پر پولیس نے گولی چلا دی۔

جس سے ایک نوجوان طالب علم جرودت کامران شہید ہو گیا۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مظاہروں نے شدت اختیار کر لی اور کراچی سے ڈھاکہ تک اشتعال پھیل گیا۔ ساتھ ہی کم و بیش تمام محکموں نے ہڑتالیں شروع کر دیں۔ اور ملک کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ صدر مملکت ایوب خاں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ اپنی آمریت کی بساط لپیٹ جمہوریت کا تخت بچھانے میں مصروف ہُوا۔ مگر اس کے گماشتوں نے ایسا کرنے نہ دیا اور ملک میں جلاؤ گھیراؤ کی تحریک زور پکڑ گئی، آخر کار ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خاں کی آمریت کا محل گر پڑا۔ سوا سات بجے شام گیارہ برس تک کوس لمن الملک بجانے کے بعد انتہائی بے بسی سے پاکستان کے "ہٹلر" نے اپنے مستعفی ہونے اور ملک کو ایک بار پھر فوج کے حوالے کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ایوبی ظلم و تشدّد کا بھیانک دَور ختم ہُوا، اور ملک ایک ڈکٹیٹر کے ہاتھ سے نکل کر دُوسرے ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں چلا گیا۔

آغا محمّد یحییٰ خاں

پاکستانی عوام فوجی حکومت کے تشدّد سے اس قدر نالاں تھے کہ انھوں نے آغا محمد یحییٰ خاں کے برسرِ اقتدار آنے پر کوئی خوشگوار اثر قبول نہ کیا۔ کیونکہ یہ شخص نہ صرف یہ کہ فہم و ادراک سے عاری تھا بلکہ بد ترین قِسم کا عیاش بھی تھا۔ اور ہمہ وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا تھا۔ چونکہ اس وقت وَن یونٹ کے خلاف ہمہ گیر تحریک چل رہی تھی اس لئے عوام کو خوش کرنے کے لئے فوری طور پر وَن یونٹ کا خاتمہ کر کے یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو تمام صوبوں کو اس نے بحال کر دیا۔ حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن کرایا گیا۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ نیشنل اسمبلی کے قیام کا اعلان ہُوا۔ مگر مجیب کی ہٹ دھرمی سے صدر مملکت کو یہ حکم واپس لینا پڑا۔ آغا محمد یحییٰ گیارہ روز ڈھاکہ میں مقیم رہے اور مغربی پاکستان کے تمام سیاسی سربراہوں کو وہاں بلا لیا گیا۔ صدر

نے مجیب کو ہموار کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس نے قانون کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور مشرقی پاکستان میں عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی، پاکستان کے قومی جھنڈے کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ قائدِ اعظم کے فوٹو کو اتار کر پھاڑ دیا گیا۔ اور کھُلم کھُلا آزاد بنگلہ دیش کے نعرے لگانے شروع کر دیئے گئے۔ بھارت نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا۔ ہزاروں بھارتی فوجی سادہ لباس میں مشرقی پاکستان میں داخل ہو کر تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔ مغربی بنگال سے اسلحہ سے بھری ہوئی گاڑیاں مشرقی پاکستان کے سینے پر دندناتی پھرتی تھیں۔ عوامی لیگ کے درندوں نے ان لوگوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے جنہوں نے اپنے ووٹ ان جماعتوں کو دیئے تھے جو اسلام کی حقانیت اور پاکستان کی سالمیت پر یقین رکھتی تھیں۔ آغا محمد یحییٰ خاں نے جب دیکھا کہ ملک ہاتھ سے نکلتا ہے تو اس نے بلا توقّف لیفٹیننٹ جنرل ٹکّا خاں ایسے پختہ کار اور محبّ وطن فوجی افسر کو مشرقی پاکستان میں تعینات کر کے اس صوبے کو فوج کے حوالے کر دیا۔ مجیب گرفتار کر لیا گیا اور بھارت کے دراندازوں کو قرار واقعی سزا دی گئی۔ اندرا گاندھی وزیرِ اعظم، اور بھارتی ممبرانِ اسمبلی نے بڑے غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ اور اس کے آقاؤں رُوس اور امریکہ نے بھی پاکستان کو آنکھیں دکھانا شروع کیں مگر حکومتِ پاکستان نے کچھ اثر نہ لیا اور اس نے اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان کی بدنظمی ہمارا داخلی معاملہ ہے۔ کسی کو ہمارے داخلی امور میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ فوج نے بڑے ضبط و تحمل سے مجیب کے غدار، اور وطن دشمن حامیوں کی توڑ پھوڑ اور گھیراؤ جلاؤ ایسی حرکتوں سے ملک کے امن پسند شہریوں کی حفاظت کی اور بھارت کے ایجنٹوں اور فوجیوں کو ختم کر کے ملک میں امن بحال کر دیا۔ مگر بھارت اور روس تو فیصلہ ہی کر چکے تھے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کرنا ہے۔ چنانچہ پاکستانی فوج کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا گیا۔ بی بی سی لندن نے اس مہم میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا

بھارتی ریڈیو نے الگ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اس موقع پر پاکستان کے رنگیلے صدر نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ جنرل ٹکا خاں جیسے پختہ کار محب وطن جرنیل کو جو مشرقی پاکستان کی جغرافیائی صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھا اور بھارتی محاذوں کی اُونچ نیچ کو بھی بخوبی جانتا تھا، مشرقی پاکستان سے واپس بُلا لیا۔ بھارت تو اسی روز کے انتظار میں تھا۔ جنرل ٹکا خان کا چارج چھوڑنا تھا کہ بھارت نے اپنی پوری فوجی قوت مشرقی پاکستان میں جھونک دی۔ روس نے ہر طرح کی مدد کی، بلکہ اس کے فوجی افسروں نے کمان کی۔ ادھر مشرقی پاکستان جل رہا تھا اور اسلام آباد میں جمہوریۂ اسلامیہ کا صدر رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ امریکہ کو یہودی پریس نے پاکستان کے خلاف اس قدر برافروختہ کر دیا تھا کہ صدر نکسن بحری جنگی بیڑہ بحرِ ہند میں بھیجنے کے باوجود مشرقی پاکستان کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ چین نے بھی جب دیکھا کہ اس ملک کے حکمران خود اپنی قوم اور ملک کے لئے مخلص نہیں ہیں اور جنگ کے ان ہولناک لمحات میں شاہد و مینا سے دل بہلا رہے ہیں تو اس نے بھی کوئی کارروائی نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۶؍دسمبر کو آغا محمد یحییٰ خاں نے بوکھلا کر فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ تقریباً ایک لاکھ مردانِ کارزار کے ہوتے ہوئے بھارتی فوجوں نے ڈھاکہ پر قبضہ کر لیا اور ترانوے ۹۳ ہزار کا بہت بڑا لشکر بھارت کا قیدی بن کر رہ گیا۔ ۱۷؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خاں نے مغربی محاذ پر بھی جنگ بند کرا دی۔ روس اور بھارت کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ مشرقی پاکستان جس نے پاکستان کے لئے عظیم قربانیاں دی تھیں، اب بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ آغا محمد یحییٰ نے جب دیکھا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے تو اس نے ۲۰؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو نیچے کھچے ملک کی زمامِ اختیار مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دی۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے جن حالات میں اقتدار سنبھالا تھا وہ بڑے حوصلہ فرسا اور یاس انگیز تھے۔ مملکتِ پاکستان

کا دایاں بازو کٹ چکا تھا۔ اور مغربی پاکستان انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے حالات کو موافق بنانے کی بڑی کوشش کی ہے اور ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ درج ذیل مسائل ابھی تک جوں کے توں اُلجھے ہوئے ہیں۔

۱۔ بنگلہ دیش کا تسلیم کرنا یا نہ کرنا

۲۔ اسیرانِ جنگ کی رہائی

۳۔ کشمیر کے مستقبل کا مسئلہ

مسٹر بھٹو اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان شملہ میں جو معاہدہ ہوا تھا۔ اس کی رُو سے پاکستان اور بھارت کی دونوں حکومتوں نے ایک دوسرے سے چھینے ہوئے علاقے واپس کر دیئے ہیں لیکن ترانوے ہزار مجاہدین بدستور بھارت کی قید میں پڑے ہیں۔ ان کے لاکھوں اعزا و اقارب ان کی یاد میں بے چین ہیں۔ ان سے زیادہ رنجدہ صورتِ حال مشرقی پاکستان کے غیر بنگالیوں اور اُن افراد کی ہے جو اَب بھی پاکستان کی سالمیت پر یقین رکھتے ہیں۔ مسٹر بھٹو کو یقین ہے کہ جب تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا جائے گا نہ فوجی قیدیوں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور نہ غیر بنگالیوں کو سُکھ چین سے رہنا نصیب ہو گا۔ اس لئے موصوف اپنی تقریروں میں بارہا کہہ چکے ہیں کہ مصلحت اسی میں ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا جائے، مگر ملک کی چند جماعتیں ایسا کرنے کے حق میں نہیں ہیں بالخصوص طلبہ کی بیشتر تعداد اس خیال کی مؤید ہے کہ بنگلہ دیش کو منظور نہ کیا جائے، خدا معلوم کیا نتیجہ برآمد ہو۔ بظاہر بنگلہ دیش کا دوبارہ مشرقی پاکستان کی صورت اختیار کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ ہاں اگر اللہ کریم چاہے تو ٹوٹے دِلوں کا دوبارہ جُڑ جانا کوئی مشکل بات نہیں۔ واللہ غالبٌ علیٰ امرہٖ و لکن اکثر الناس لا یعلمون ۔

ملتان شہر کا دورِ جدید

کسی زمانے میں دریائے راوی ملتان شہر سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس کا زیادہ حصّہ قلعہ کے شمال سے، کچھ قلعہ اور شہر کے درمیان سے اور باقی حصّہ شہر کے جنوب سے فصیل کے ساتھ لگ کر بہتا تھا۔ طغیانی کے دنوں میں جب پانی زیادہ ہو جاتا تو شمالی اور جنوبی شاخوں کو لوگ کشتیوں کے ذریعے عبور کرتے تھے۔ تمام شاخیں قاسم بیلہ کے قریب مل کر متّا بھگت کے نزدیک دریائے چناب میں جا گرتی تھیں۔

قلعے کے شمال مغرب میں امراء کے بنگلے تھے۔ اسی طرح شہر کے جنوب میں جہاں اب مائی پاکدامن کا قبرستان واقع ہے۔ پرانی آبادی تھی۔ اس میں قدیم خاندان اب تک آباد چلے آتے تھے۔

موجودہ ملتان شہر مرتفع سطح پر واقعہ ہے۔ اس کو حضرت مخدوم شیخ محمدؒ یوسف گردیزی علیہ الرحمۃ نے از سرِ نو آباد کیا تھا۔ اس کے گرد اگرد پختہ فصیل تھی جو اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہے۔ فصیل کے ساتھ ساتھ خندق تھی اب یہ سرکلر روڈ کا کام دے رہی ہے۔ شہر کا رقبہ ۲۴۰۰ × ۲۴۰۰ فٹ ہے۔ لیکن اب یہ کافی دُور تک پھیل چکا ہے۔ دریائے راوی کے رُخ بدلنے کے سبب اس کی گزرگاہ سوکھ کر آبادی میں تبدیل ہو چکی ہے انتقالِ آبادی کے بعد سے ملتان نے ہر سمت بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اب اس کا قطر پندرہ میل ہے حسن پروانہ کالونی، ممتاز آباد، رشید آباد، شمس آباد، سیٹلائٹ ٹاؤن، گلگشت، پیر خورشید کالونی، رائیٹرز کالونی، گلبرگ، شریف پورہ، گلگشت اور یسین آباد کے ناموں سے

کئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔

شہر کے بازار

شہر کے چھ دروازے ہیں۔ جن میں حرم دروازہ، بوہڑ دروازہ اور دہلی دروازہ اصلی حالت میں موجود ہیں۔ پاک دروازہ، دولت دروازہ اور لوہاری دروازہ منہدم ہو چکے ہیں۔ لوہاری دروازہ کو اسلامی دور میں بابِ آہنگراں بولتے تھے۔ دروازوں سے جو بازار چوک بازار کو گئے ہیں، اکثر خمدار اور ڈھلوان ہیں۔ آپ جوں جوں آگے جائیں گے آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کسی بلندی پر چڑھ رہے ہیں اور جگہ جگہ موڑ ملیں گے۔ ان میں حکمت یہ تھی کہ جنگ کے دوران اگر دشمن کی فوج دروازوں کو توڑ تاڑ، اندر گھس بھی آتی تو چوک تک پہنچنا اس کے لئے آسان نہ ہوتا تھا۔ اگر ایک موڑ پر شہریوں کو شکست ہو جاتی تو وہ پیچھے ہٹ کر دوسرے موڑ پر پھر جمع ہو جاتے تھے۔ اور سر توڑ مقابلہ کرتے تھے۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ لڑائی میں اونچی جگہ والے فائدہ میں رہتے ہیں۔ دوسری غرض اس ڈھلوان سے یہ تھی کہ بارش کتنی موسلادھار کیوں نہ برسے پانی بازاروں میں نہ رُکے اور کیچڑ سے خلقِ خدا کو تکلیف نہ ہو۔

مہاجرین کی آمد سے ملتان شہر کی آبادی بہت بڑھ چکی ہے۔ کم و بیش دس لاکھ نفوس اس شہر میں آباد ہیں۔ شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً مکانات کی تعمیر کا سلسلہ پھیلتا جا رہا ہے۔ مظفر آباد تا نواب پور اور سورہ میانی تا ٹاٹے پور شہر کے پھیل جانے کی توقع ہے سڑکیں پختہ بن چکی ہیں۔ پانی اور بجلی کا اعلیٰ انتظام ہے۔ بازاروں میں آٹھوں پہر گھما گھمی رہتی ہے۔ خاص کر چوک بازار اپنی وسعت اور رونق کے اعتبار سے تمام بازاروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ عصر کے وقت یہاں اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ آدمی کے لئے راستہ نکالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کے کاریگر دن بھر کی کمائی یہاں لا کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ملتان نے صنعت و حرفت کی نمائش دکھانے کے لئے اپنے جگر کے ٹکڑے اگل دیئے

ہیں۔ خاص کر اندھی کھوئی کی چہل پہل اور خرید و فروخت کی گرماگرمی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ یہاں روزانہ لاکھوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔

تاریخی حیثیت تاریخی اعتبار سے بھی یہ شہر بلند حیثیت رکھتا ہے۔ فقرار علما، اور صلحار کے مامن و مسکن ہونے کے علاوہ اسے تین نامور سلاطین کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے۔ پندرھویں صدی کے وسط میں حسین آگاہی کے اندر محلہ قاضیاں والہ میں بہلول لودھی پیدا ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مکان کی چھت کے گرنے سے سلطان کی ولادت قبل از وقت ہوئی تھی۔ دُوسرے سلطان غیاث الدین تغلق ہیں۔ جو لوہاری دروازہ کے باہر کوٹلہ تغلق خاں میں پیدا ہوئے۔ تیسرے سلطان احمد شاہ ابدالی امیر افغانستان ہیں جنہوں نے مرہٹوں کو شکستِ فاش دے کر ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو کچھ عرصہ اور زندہ رہنے کا موقع بخشا۔ آپ سترھویں صدی کے اواخر میں کڑی ہتدوزئی میں پیدا ہوئے۔ امتدادِ زمانہ نے محلات کا تو نام و نشان نہیں رکھا لیکن شیش محل کے سامنے اسی مقام پر آپ کی یاد باقی رکھنے کے لئے مرمریں کتبہ موجود ہے جو ہر رہرو کے دل میں آپ کی عظمت و جلالت کا احساس تازہ کر دیتا ہے۔

قلعہ قدیم ملتان شہر کے متصل پُرانا قلعہ ہے۔ اگرچہ فصیل اب منہدم ہو چکی ہے لیکن جہاں کوئی ٹکڑا سالم ہے اس سے قلعہ کی پختگی، بلندی، اور استواری کا اندازہ ہوتا ہے۔ لاریب کسی زمانے میں یہ نہایت شاندار قلعہ ہوگا۔ آثار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ ½ ۱ میل مربع تھا اور اس کے ۲۶ مورچے تھے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ قلعے کے تین دمدمے تھے۔ ایک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور سیاحوں کی وابستگی کا ذریعہ بنا ہُوا ہے۔ جو شخص بھی قلعے میں داخل ہوتا ہے اس دمدمے پر چڑھے بغیر نہیں رہتا۔ چراغاں کے موقع پر یہاں سے شہر کا نظارہ بے حد بھلا معلوم ہوتا ہے۔

دُوسرا دمدمہ حضرت علامہ قطب الدین کاشانیؒ کے مقبرہ کے قریب تھا جو اب معدوم ہو چکا ہے۔ تیسرا پرہلادؔ کے مندر کے قریب تھا۔ جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔

آج سے چند سال قبل قلعہ محض ایک تودۂ خاک تھا۔ شاہی محلات اور ایوانات کا نشان تک نہ تھا۔ بلدیۂ ملتان کے ادب نواز اور علم دوست ایگزیکٹو آفیسر میاں محمد شفیع صاحب نے اسے گل و گلزار میں تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا۔ قلعے کو مختلف سطوح میں تقسیم کر کے ان میں کشادہ گلشن، رنگ برنگ پھولوں کے خوشبودار تختے، بادام اور درخت، مصنوعی آبشاریں، نہریں، حوض اور فواروں سے اس بُوڑھے کھنڈر کو بہشت نما گلستان بنا دیا۔ ایک وقت تھا کہ اہلِ ملتان دن کو بھی ان ویرانوں میں آنے کی جراُت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اب رات کو بھی قلعے کے ان فردوسی مقامات کی پُر کیف سیر جنّت کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ فضائے خُلد چھُوٹنے کا ملال ہوتا ہے اور پھر اُسی بہشت کی آرزو پیدا ہوتی ہے جسے آدمؑ چھوڑ کر نکلا تھا۔ قلعے کا یہ "فردوسی خطّہ" اب "قاسم باغ" کہلاتا ہے۔ یہ نسبت سیّاح کو بارہ سو برس پیشتر کے اُس زمانے میں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے، جب سترہ سالہ عرب مجاہد محمدؒ بن قاسم نے اس شہر پر اسلامی عظمت کا جھنڈا لہرایا تھا۔ قلعے کا مشرقی حصّہ ابھی تک کھنڈر پڑا ہے۔ بڑے بڑے کھڈ اور غار مُنہ کھولے مسافروں کے لئے دہشت اور ہیبت کا سامان پیش کرتے ہیں۔ مغلوں، تاتاریوں، سدوزئیوں اور سکھوں کی ہڈیاں چمک چمک کر زبانِ حال سے پکار اُٹھتی ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیۡہَا فَانٍ ؕ

اس تعمیری فقدان کے باوجود یہ قلعہ سر بلند ہے اور اتنا کہ اکبر آباد، شاہجہان آباد اور لاہور کے فلک شکوہ قلعے بھی اس کے آگے سرنگوں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اس کھنڈر میں شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کی بلند شخصیت اپنے صدہا نسبی و روحانی نامور فرزندوں سمیت محوِ خواب ہے۔ کیا دُنیا کا کوئی قلعہ اس کی برابری کر سکتا ہے؟

؎ اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے ٭ اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں ٭ اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

آب و ہوا

ملتان کی آب و ہوا گرمی میں سخت گرم اور خشک اور سردی میں سخت سرد اور خشک ہے۔ مگر گرمی اتنی نہیں پڑتی جتنی کہ دُنیا میں مشہور ہے۔ چنانچہ کسی ستم ظریف کا یہ شعر آج تک زبان زدِ خاص و عام چلا آتا ہے ؎

چہار چیز است تحفۂ ملتان ٭ گرد و گرما گدا و گورستان

بلاشبہ موسمِ گرما میں گرم ہوائیں چلتی ہیں، آندھیاں بھی آتی ہیں۔ مگر مغربی پاکستان کا وہ کون سا شہر اور کون سا مقام ہے جہاں اتنی گرمی نہ پڑتی ہو اور اتنی آندھیاں نہ آتی ہوں۔ جبکہ جیکب آباد اور سبی میں ملتان کے مقابلے میں کہیں زیادہ گرمی پڑتی ہے۔ سکھر "سقر" کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ عرب جب یہاں آئے تو گرمی کی شدّت سے بلبلا اُٹھے اور اسے "سقر" کہہ کر پکارا جو بعد میں کثرتِ استعمال سے سکھر ہو گیا۔ ملتان میں گرمی صرف دن کو پڑتی ہے۔ رات اعجازی طور پر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درجۂ حرارت زیادہ ہونے کے باوجود ملتان میں حبس کی صورت پیدا نہیں ہوتی اور خشک ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ موسمِ گرما میں صبح شام دونوں اوقات فضا میں خنکی سی محسوس ہونے لگتی ہے اور اگر یہ درجۂ حرارت زیادہ ہو جائے تو آندھی آجاتی ہے۔ اس سے خاص فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تنگ گلی کوچوں کے باوجود شہر میں تعفّن پیدا نہیں ہوتا اور ہوا صاف ہو جاتی ہے۔

سردی کا موسم مقابلتہً زیادہ خوشگوار ہوتا ہے۔ دسمبر کے وسط میں خوب لُطف رہتا ہے۔ غیر ممالک کے سیاح اور امراء زیادہ تر اسی مہینے میں ملتان آتے اور اس کی صحت بخش آب و ہوا سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ویسے نومبر سے اپریل تک ملتان میں خوب گھما گھمی رہتی ہے
ملتان شہر کا پانی بہت عمدہ ہے۔ بدہضمی کی شکایت بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ ہر قسم کے افراد

اور ہر رنگ کی طبیعتیں یہاں آکر اپنے وطن کا سا ماحول پاتی ہیں۔ آج کا ملتان سایہ دار درختوں اور ندی نالوں میں گھرا ہُوا ہے۔ اس لئے گرمی کی وہ صُورت نہیں رہی جو کبھی تھی۔

ملتان قدیم سے دُنیا کے سیاحوں کا مرکز رہا ہے۔ باہر سے آنے والے اکثر سیاح کئی کئی دنوں تک اس شہر کی سیر اور مقابر و معابد پر حاضری دینے کے لئے شہر میں رہتے ہیں نالہ علی محمد جو شہر کے پاس سے ہی گزرتا ہے اور اب چھوٹا سا کھالہ بن کر رہ گیا ہے کبھی آبِ رکنا باد کو شرماتا تھا۔ اس کا نظارہ بے حد دلفریب اور تماشائیوں کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ اس کے کنارے حسین مندروں کا ایک لا متناہی سلسلہ چلا گیا تھا اور جگہ جگہ گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ جہاں ہندو اشنان کرتے تھے۔ اور دن بھر رونق لگی رہتی تھی۔ شہر کے بے فکرے ساون کے اکثر ایّام اور چاندنی کی اکثر راتیں اسی خوبصورت نالہ کے کنارے باغ لنگے خاں میں گزارتے تھے۔ چاندنی میں باغ کی بہار خُوب لطف دیتی تھی اور آدمی بے ساختہ پُکار اُٹھتا تھا ؎

بیا ساقی بدہ باقی کہ در جنّت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلّیٰ را

اُس وقت نالہ علی محمد خاں "آبِ رکنا باد" اور باغ لنگے خاں "مصلّیٰ" کا سماں پیش کرتے تھے۔ اب بھی اس باغ کی گل گشت جنّت الفردوس کی یاد تازہ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ عروس البلاد ملتان مجموعی طور پر خوبصورت شہر ہے اور غیر ممالک سے آنے والے سیاح اور زائرین یہاں آکر مایوس نہیں ہوتے۔

ذرائع آمد و رفت

قدیم زمانے میں لوگ قافلوں اور کاروانوں کے ذریعے یہاں مال و اسباب لایا کرتے تھے۔ اور مسافروں کو بھی قافلوں کے ہمراہ چلنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس دُور کے راستے بے حد مخدوش اور دُشوار گزار تھے۔ جگہ جگہ

رہزنوں اور قزاقوں کے اڈّے تھے۔ اس لئے حفاظت کے بغیر سفر کرنے کی کسی کو ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جن مقامات کو دریا قریب پڑتا تھا، وہ تجارت کا مال یہاں کشتیوں کے ذریعے لاتے تھے، دریائے چناب کے دو گھاٹ، راج گھاٹ اور بندر گھاٹ اب تک اُس دور کی یاد دلاتے ہیں۔ سورومیانی کے ملّاح بڑے امیر تھے، وہ روپوں کو گنتا نہیں، بلکہ تولا کرتے تھے۔ اب قافلوں اور کشتیوں کا رواج نہیں رہا۔ ریل، موٹر اور ہوائی جہازوں کا زمانہ ہے۔ ملتان چھاؤنی کا اسٹیشن پاکستان کی حسین ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں ملتانی روغنی اینٹیں کثرت سے استعمال کی گئی ہیں، جس سے اسٹیشن کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی ہے۔ دن میں درجنوں گاڑیاں یہاں پہنچتی، چلتی اور گزرتی رہتی ہیں۔ موٹروں اور بسوں کے بھی کئی اڈے ہیں۔ جن میں ڈیرہ اڈہ، خانیوال اڈہ اور وہاڑی اڈہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہوائی جہازوں کا اڈہ ملتان چھاؤنی کی بغل میں واقع ہے۔ کراچی، لاہور، کوئٹہ اور پشاور کا سنٹر ہونے کے سبب اکثر جہاز یہاں اُترتے اور پرواز کرتے ہیں۔ مسافروں کے علاوہ اب یہاں سے سامان بھی بک ہونے لگا ہے۔

ملتان شہر کے ہوٹل اور آرام گاہیں

ملتان شہر میں معیاری ہوٹلوں اور آرام گاہوں کی کمی نہیں۔ شیزان، شب روز فردوس ہوٹل، الحرم، گلڈ ہوٹل، عزیز ہوٹل اور زمیندار ہوٹل زیادہ آرام دہ ہیں۔ دل پسند کھانے، عمدہ کمرے، اچھے بستر، تسلّی بخش سروس ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ نوواردوں اور سیاحوں کو ان ہوٹلوں میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ کم و بیش شہر کے تمام ہوٹلوں اور چائے خانوں پر سارا دن خوب چہل پہل رہتی ہے۔ سٹیزن ڈیرہ اڈہ کے قریب ہے۔ الحرم حرم گیٹ پر اور شیزان ملتان کچہری کے چوک میں واقع ہے۔

عقابوں کے نشیمن

ملتان پیروں فقیروں کا شہر ہے۔ اس شہر میں جو سیاح یا زائر وارد ہوتا ہے وہ ان اللہ والوں کے آستانوں پر ضرور حاضری دیتا ہے۔ ان بزرگوں کے آستانوں کی نشاندہی کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اجمالاً ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی جائے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ایسے کون سے کام کئے، جن کے سبب صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کا نام زندہ ہے۔ اور لوگ ان کے مقبروں پر حاضری دینے کے لئے کالے کوسوں کا سفر طے کرتے ہیں۔

یہ امر کسی پر مخفی نہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی اصلاحِ احوال پہ دو بہت بڑے گروہ متعین ہیں۔ ایک علمائے ظواہر کا ہے اور دوسرا اصحابِ بواطن کا۔ شریعت اس مجموعہ احکام کا نام ہے جو قرآن کریم اور رؤف رحیم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم ہے اور جس پر عمل نہ کرنے یا انکار کرنے سے کوئی شخص مسلمان یا مؤمن کہلانے کا حقدار نہیں رہتا۔ جس طرح ہر کام کا ظاہر اور باطن ہوتا ہے اُسی طرح شریعتِ حقہ کا بھی ظاہر اور باطن ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے، جس طرح نماز پڑھنے میں ہاتھوں کا اُٹھانا، سر جھکانا، زبان سے تکبیروں کا ادا کرنا تسبیحوں کا پڑھنا وغیرہ۔ فقہا اور علماء بھی اس کے احکام یوں بیان فرمائیں گے کہ منہ قبلہ کی طرف کرو، ہاتھ یوں باندھو، رکوع اس طرح کرو، سجدہ میں ہاتھوں کو اس طور سے رکھو پھر سر پہلے اور ہاتھ بعد میں اُٹھاؤ۔ تشہد میں اس طریق سے بیٹھو، وغیرہ

ان کا نام شروع زبان میں ظاہری ارکان ہے۔ حضرات علماء کرام اور فقہائے عظام

انہی ظاہری ارکان کی صحت کو دیکھ کر نماز کے صحیح ہونے کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ اور باطنی ارکان میں صرف تکبیر اولیٰ کہتے وقت حضورِ قلب اور صحتِ نیت وغیرہ کا ہونا صحتِ نماز کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اور یہی ان کا منصب ہے۔ باطنی امور جن کا نام حضورِ قلب، صحتِ نیّت، خشوع، خضوع، ہیبت، تعظیم، خوف و رجاء وغیرہ جسے شریعت کی زبان میں اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان پر چونکہ ان بزرگانِ دین کو کسی کے حال کے لحاظ سے اطلاع نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی نسبت بالاجمال ہی حکم لگا دیتے ہیں کہ ہر کام میں نیّت نیک چاہیے۔ پس اسی باطنی حصے کا نام طریقت یا تصوّف ہے۔ وہ انسان نادان ہیں جو اس کو کسی اور رنگ میں تعبیر کرتے ہیں۔ بلاشبہ شریعت اور طریقت کی حقیقت ایک ہے۔ یعنی ہر کام کا ظاہر اور باطن درست ہو۔ علامہ شوکانی رح کے نزدیک تصوّف کے معنی دنیا سے بے تعلق ہونے کے ہیں۔ یہاں تک کہ مٹی اور سونا اور لوگوں کی مدح و قدح ان کے نزدیک برابر ہو۔ ہر وقت خدا کے ذکر میں مصروف رہے۔ ایسا شخص ہی سچّا صوفی ہوتا ہے۔

ایسا شخص روحانی طبیبوں میں سے ہوتا ہے اور وہ باطنی امراض کا علاج کرتا ہے جیسے غرور، حسد، بڑائی، ریا اور اس قسم کی دیگر شیطانی باتیں جو تمام معصیات اور گناہوں سے بڑھ کر ہیں۔ بعد ازاں جن حجابات کے باعث حکمت کے دروازے بند تھے کھل جاتے ہیں اور جب انسان ظاہری اور باطنی غفلت کے حجابات سے صاف اور گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے تو ایسے حواس سے دیکھتا، سُنتا اور سمجھتا ہے کہ اسے حقائق اشیاء کے سمجھنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ حدیث قدسی میں ارشاد ہوتا ہے۔

"کسی چیز سے میرا اتنا قرب حاصل نہیں ہوتا، جس قدر ان فرائض کے ادا کرنے سے ہوتا ہے جن کا میں نے حکم دیا ہے (اس کے بعد نوافل کا درجہ ہے) جب میرا بندہ نوافل کے ذریعے

---

[1] مرصاد العباد

میرا قرب حاصل کرتا ہے۔ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب مجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے، تو میں ہی اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں ہی اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں ہی اس کے پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں فوراً اُسے دیتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں پناہ دیتا ہوں۔ مجھ کو کسی کام میں جسے میں کرنا چاہتا ہوں، ایسا تردّد نہیں ہوتا جیسا اپنے بندے کی رُوح قبض کرنے میں ہوتا ہے۔ کیونکہ میرا مومن بندہ موت کو مکروہ سمجھتا ہے۔ اور میں اس کے مکرُوہ سمجھنے کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ لیکن موت سے چارہ نہیں!"

ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذریعے سے دیکھتا، سُنتا، پکڑتا اور چلتا ہے۔ اُس کا مرتبہ ایسے شخص سے، جو غافل ہے، ہر پہلو سے بڑھا ہوا ہے۔ ایسے آدمی پر حقائقِ اشیاء کُھل جاتی ہیں۔ اور آئندہ ظہور میں آنے والے اُمور منکشف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس سے گناہ صادر نہیں ہو سکتے۔ اور جو لوگ غفلت اور گناہوں کے حجابات میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں، وہ نہ خدا کے ساتھ دیکھتے، نہ سنتے نہ پکڑتے اور نہ چلتے ہیں۔ وہ سبیل الرشاد سے بھٹک جاتے ہیں۔

اسلام کی ضیا باریوں نے صحابہ کے قلوب کو نورِ ایمان سے جگمگا دیا تھا۔ وہ ایسے بابرکت ماحول میں اکتسابِ فیض کر رہے تھے جو اُن کے بعد نہ کسی کو نصیب ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اُن میں خدا کا آخری نبیؐ موجود تھا۔ اور نبوّت کے آفتاب نے صحابہ کے دلوں کی تاریکیوں کو دُور کرنے کے لئے مجاہدات و ریاضات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اُنہیں کسی قسم کی چلّہ کشی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپائے جمال پر اک نظر ڈالنے سے وہ تمام مراحل اور منازل طے کر لیتے تھے جو آج زندگی بھر کے ذکر و فکر، اور معکوس ریاضتوں سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ ان قدسی نفوس کا مراقبہ و مجاہدہ تو صرف

سرکار کے سراپائے جمال کو تکتے رہنا اور آپ کے اشارۂ ابرو پر جان نچھاور کر دینا تھا۔ اس لئے جو حضرات صحابہ کرام کی سیرتوں میں اشغال و اذکار، ذکر و مراقبہ، ریاضات و مجاہدات کو ڈھونڈتے ہیں اور پھر صوفیاء کے ان اعمال و اعوال پر طنز کرتے ہیں وہ نبوّت کے فیضان کی قوّتِ لامتناہیہ سے ہی بے خبر ہیں۔ تمام محققین صوفیاء کا اس صداقت پر اتفاق ہے کہ مرید کو شیخ سے جس قدر محبت زیادہ ہوتی ہے۔ اُتنا ہی اُسے مجاہدات و ریاضات کی ضرورت کم پڑتی ہے۔ وہ شیخ کی قلبی قوت اور ہمت کے طفیل برسوں کی منزلیں لمحوں میں طے کر لیتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب اولیائے اُمت باطنی تاثر اور قلبی قوت سے اپنے ارادت مندوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتِ قلبی اور تاثیرِ باطنی سے عاشقانِ رسالت کو کتنے رفیع مقام پر پہنچا دیا ہوگا۔ اس لئے تمام اولیائے اُمّت کو تسلیم کرنا پڑا کہ صحابہ کے مقام کو کوئی غیر صحابی نہیں پہنچ سکتا۔ خواہ وہ کتنے بڑے مرتبے کا مالک کیوں نہ ہو۔

جب سورج غروب ہو جاتا ہے اور ہر طرف تاریکی کے دَل بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ تو لوگ اپنی اپنی توفیق کے مطابق موم بتیاں، گیس لیمپ اور بجلی کے قمقمے روشن کر لیتے ہیں اسی طرح جب آفتابِ نبوّت مرکزِ اصلی پر چلا گیا اور آنحضرت روحی فداہ کا جسدِ اطہر عوام کی ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اسلامی تعلیمات کو نقصان سے بچانے اور انہیں زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے لئے ہر شخص نے اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق کام چن لیا۔ چند بزرگوں نے قرآن کا تحفظ اپنے ذمے لیا۔ بعض نے احادیث کی طرف توجّہ کی۔ یہ لوگ مفسّر اور محدّث کہلائے۔ ان کے بعد ایک اور گروہ منظرِ عام پر آیا۔ اس نے عبادت، مالی و بدنی معاملات اور عقائد کے مسائل مستنبط فرمائے اور فقیہہ مشہور ہوئے۔ بعض نے ان استنباط مسائل کے اصول مدوّن فرمائے۔ انہیں اصولی اور اس علم کو اصولِ فقہ سے موسوم کیا گیا۔ انہی

بزرگوں میں سے ایک گروہ قرآن مجید کے معارف و حقائق اخلاقی و باطنی اوامر و نواہی اور قلب و رُوح کے اعمال کی طرف متوجہ ہُوا۔ یہ حضرات صُوفی کہلائے اور اس علم کا نام تصوّف رکھا گیا۔

اس دَور کی حالت آجکل کے حالات سے قطعاً مختلف تھی۔ اس پاک دَور میں ہر گروہ اپنے اپنے کام میں مصروف تھا اور محض فی سبیل اللہ اسے دینی خدمت سمجھ کر انجام دیتا تھا۔ ایک کو دُوسرے سے نہ غرض تھی نہ کد۔ نہ کوئی مخالف تھا اور نہ حاسد۔ اگر ایک جانب امام محمد اسماعیل بخاریؒ اور امام مُسلمؒ جیسے اکابر حدیث کی تدوین میں مصرُوف تھے تو دُوسری جانب امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام محمدؒ، امام ابو یوسفؒ فقہ کے مسائل پر بحث و تنقید کرتے دکھائی دیتے تھے۔ تیسری طرف خواجہ حسن بصریؒ، داؤد طائیؒ، حبیب عجمی رحمہم اللہ علیہم عوام کے قلوب و ارواح کی بالیدگی میں لیل و نہار بسر کر رہے تھے۔ اس صُوفیانہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہُوا، کہ تمام دُنیا میں دینِ اسلام کا نقارہ بج گیا۔ صفحۂ روزگار پر اسلامی برکات کے آثار نمودار ہو گئے۔ تمام دُنیا کے نشیب و فراز، بحر و بر، آبادی اور ویرانہ، دیار و امصار، شجر و حجر، برگ و بار، در و دیوار، روڑوں روڑوں، قطروں قطروں اور ذرّوں ذرّوں سے وحدہٗ لاشریک لہ کی دلچسپ و دلآویز صدائیں آنے لگیں۔ دُنیا کی اونچی اونچی پہاڑی چوٹیوں پر خدا کی وحدت اور الوہیت، ربوبیت، معبودیت، حضور رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، عبدیت و عظمت اور محبوبیت کے پرچم لہرانے لگے۔ شرک و کُفر کی تاریکی رفع ہو گئی۔ عرب و شام، فارس و روم، مصر و افریقہ ان کے زیرِ نگین آ گئے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے خدا تعالیٰ نے انہیں دے دیئے۔ اور دُنیا پر ظاہر ہو گیا کہ خدا کے سچے صوفی اور دُنیا کے حقیقی وارث ایسے ہوتے ہیں انوارِ ربّانی سے روئے زمین چمک اُٹھی۔ تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا۔ آتشکدے ٹھنڈے پڑ گئے۔ بُت خانے ویران ہو گئے۔ مسجدوں کے سُنہری گنبدوں اور عالی شان میناروں سے تمام بستیاں آباد

ہوگئیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر کی دل ہلانے والی صداؤں سے تمام آبادیاں گونج اٹھیں۔ خدا پرستی کا دور آیا۔ حیوانیت اور بہیمیت کا بازار سرد پڑ گیا۔ علم و حکمت کے ساتھ انسانیت اور ملکیت نے ظہورِ اجلال فرمایا۔ ناسوت ملکوت بن گیا۔ جبروتی برکات لاہوتی انوار سیل درسیل نازل ہونے لگے۔ ایک تو وہ حالت کہ یہی ملکِ عرب جہالت اور بد تہذیبی میں ضرب المثل تھا، یا یہ حالت ہوگئی کہ وہی عرب تمام دُنیا میں مہذّب اور شائستہ ہونے کا فخر پاکر علم اور تہذیب کا سرچشمہ بن گیا۔ عربوں کے ذریعے تمام دُنیا نے سچّی تہذیب سیکھی۔ وہ روحیں جو شرک اور بدعت کی نجاست سے بالکل مُردہ ہوگئی تھیں از سرِ نو زندہ ہوگئیں۔ روحانیت کا غلبہ ہوا۔ زمانہ نے اپنی کایا پلٹی۔ جدھر نظر پڑتی خدا کے سچّے اور پکے بندے ہر وقت، ہر لحظہ اور ہر آن اپنے محبوبِ مطلق، معبودِ برحق اور شہنشاہِ حقیقی خداوندِ ذوالجلال والاکرام کی عبادت اور اطاعت اور عشق و محبّت میں نہایت عاجزی، انکساری، مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ سربسجود اور کمربستہ نظر آتے نہ تجارت اور سوداگری اُنہیں یادِ الٰہی سے غافل کرسکتی تھی اور نہ مزدوری، نہ حکومت اور اَمارت، نہ سلطنت اور دولت، نہ مال اور اولاد کی محبّت۔ بعض لوگ جنہیں صوفیا سے عقیدت نہیں وہ یہ کہتے ہوئے بھی نہیں جھجکتے کہ رشد و ہدایت اور تبلیغ اسلام کا کام شروع سے حضراتِ علمار سے متعلق رہا ہے۔ صوفیا، حجرہ نشین لوگ تھے اور ہمیشہ دنیا پر بوجھ بن کر رہے۔

حضرت علمار کی دینی خدمات کا کیا کہنا، بلاشبہ یہ حضرات وارثانِ نبوّت ہیں انہوں نے حدیث اور فقہ کی تدوین کی۔ علوم کو دین سے متعارف کرانے اور مسائل دین کو عام فہم صورت میں پیش کرکے انہوں نے اسلام کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ حضرات صوفیہ بھی ہمیشہ علمار کا احترام کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریّا قدس سرہٗ سہروردی سلسلہ کے برِصغیر میں شیخ اکمل ہونے کے باوجود خانقاہ کی مسجد کو چھوڑ کر علامہ قطب الدین کاشانی علیہ الرحمۃ کے پیچھے نماز ادا کرنے کے لئے ان کی مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ جو ان کی خانقاہ سے کافی

دُور تھی۔ اور فرماتے تھے کہ کسی عالم باعمل کے پیچھے نماز پڑھنے کا اتنا ثواب ملتا ہے گویا اس نے کسی نبی کے پیچھے نماز پڑھ لی ہو۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اشاعتِ اسلام میں جو مقام شیخ الاسلام زکریا رح کو حاصل ہے، علامہ کاشانی کو اس کا ہزارواں حصّہ بھی حاصل نہیں۔ جو لوگ علماء اور صوفیاء میں تفریق کرتے ہیں وہ شاید نہیں جانتے کہ صوفی کے لئے علومِ متداولہ کی تحصیل ضروری ہوتی ہے۔ یعنی تصوّف کی دُنیا میں قدم رکھنے سے پہلے علومِ متداولہ کی سرحد کو پار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے اکثر مشائخ کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کا قول تھا کہ بے علم صُوفی شیطان کا کھلونا بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام فریدالدین گنج شکر رح زمانۂ طالب علمی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ کو بیعت میں لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا پہلے علم حاصل کرو، پھر میرے پاس آؤ۔

حضرت محبوب الٰہی نظام الدینؒ اولیاء قرآن مجید کے علاوہ صحاح ستّہ کے بھی حافظ تھے۔ شیخ الاسلامی کے انتخاب میں ہندوستان کے اڑھائی سو جیّد علماء نے حصّہ لیا تھا اس میں آپ سب سے اوّل آئے۔ گویا جب ہم کسی صُوفی کا ذکر کرتے ہیں وہ عالم پہلے ہوتا ہے اور صُوفی بعد میں۔ معترضین سے یہ غلطی محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اکابر صوفیاء کو دَورِ حاضر کے نام نہاد صوفیاء پر قیاس کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ صوفیاء کو حجرہ نشین اور دُنیا پر بوجھ خیال کرتے ہیں یہ ان کی صوفیاء کے حالات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ واقعات شاہد اور تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی دُنیا کو صوفیاء کی خدمات کی ضرورت پڑی ہے، یہ حجروں سے پارے کی طرح اُچھل پڑے ہیں اور اُنہوں نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ چشمِ فلک آج تک حیران ہے۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی علیہ الرحمۃ حجرہ نشین بزرگ تھے۔ مگر جب انہیں علم ہوا کہ خوارزم شاہ بغداد پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو آپ اُس کے دربار

میں گئے اور اُسے اِس ارادے سے باز رکھا۔

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرّہٗ نے ایک لاکھ اشرفی "صالے نوئین" نامی چنگیزی جرنیل کو ادا کرکے اہلِ ملتان کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونے سے بچالیا۔

جب حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم رح کو اطلاع ملی کہ ملتان شہر میں قتلِ عام ہو رہا ہے تو آپ ننگے پاؤں اور ننگے سر محمد تغلق کے دربار میں پہنچے اور سفارش کرکے قتلِ عام کو موقوف کرایا۔

اسی طرح جب سلہٹ کے راجہ گوڑ گوبند نے شیخ برہان الدین کے معصوم بچے کو قتل کرایا اور ان کا دایاں ہاتھ کٹوادیا، تو اُسے قرار واقعی سزا دینے کے لئے شیخ جلال سلہٹی کی ہمراہی میں چھ سو درویش اُچ سے بنگال پہنچے اور راجہ کو شکستِ فاش دے کر اس علاقہ میں اسلام کی عظمت کا جھنڈا گاڑا۔

یہ دیومالا کی کہانیاں نہیں حقائق ہیں جنہیں مؤرخین نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی تاریخوں میں درج کیا ہے۔ اس مختصر سی تصنیف میں اتنی گنجائش کہاں کہ تمام مشائخ کا تفصیلی تذکرہ اس میں آسکے۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں۔ وہ ان کتابوں سے رجوع کریں جو ملتان کے مشائخ پر لکھی گئی ہیں۔ یہاں صرف چند اہل اللہ کے اجمالی تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مقبرہ شیخ الاسلام بہاء الدّین زکریا علیہ الرحمۃ

یہ بلند و بالا اور پُر شوکت مقبرہ ملتان کے قلعۂ قدیم پر واقع ہے اور ہر وارد و صادر کو دُور سے دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ اس خطیرۂ قدس میں چوبی کٹہرے کے اندر دو مزارات ہیں۔ غربی غربی مرقد میں چھٹی صدی ہجری کے نائبِ رسُول اور شیخ الاسلام حضرت غوث العالم بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ محوِ خواب ہیں اور دائیں جانب آپ کے بڑے صاحبزادے الشیخ العارف صدر الدین عارف

علیہ الرحمۃ بل احیاءؒ کی چادر تانے استراحت فرما ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام ۵۶۵ھ جو میں بمقام کروڑ (ضلع مظفر گڑھ) پیدا ہوئے۔ نسباً قریشی الاسدی تھے۔ ابتدائی تعلیم ملتان کے ایک فخر روزگار عالم مولانا عبدالرشید کرمانی سے حاصل کی۔ پھر بلخ بخارا کی طرف تشریف لے گئے اور چار سو چالیس باکمال اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرکے سندِ فضیلت حاصل کی بیس برس ریاضت و عبادت میں گزارے۔ پانچ سال مدینہ منورہ میں رہ کر مولانا کمال الدین محمد یمنی سے حدیث پڑھانے کی سند حاصل کی اور پانچ حج کیے۔ یہاں سے بیت المقدس ہوتے ہوئے بغداد پہنچے، شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ سے بیعت کرکے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اور مرشد کے حکم کی تعمیل میں اہلِ ملتان کی اصلاح احوال پر مامور ہوئے۔ آپ نے قلعہ کے اندر پرہلاد جی کے مندر کے عین سامنے[1] مسندِ ارشاد قائم کی۔ اور خلقِ خدا کو صراط المستقیم پر گامزن کرنا شروع کیا۔ مندر سے جو ہندو درشن کرکے باہر نکلتا، آپ کے نورانی چہرے کو دیکھتے ہی مسلمان ہو جاتا۔ آپ نے خانقاہ کے ساتھ مدرسۂ بہائیہ قائم کیا۔ جس میں اس زمانے کے دینی نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ بڑے بڑے قابل اساتذہ تعلیم دینے پر مقرر تھے مدرسہ کے ساتھ ہی تبلیغی شعبہ تھا جس میں مبلّغین کو دوسرے ممالک میں تبلیغ کرنے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ خانقاہ اور مدرسہ کے پہلو میں سرائے اور لنگر خانہ تھا۔ جس میں معلّمین، طلباء اور مریدوں کے علاوہ مسافروں اور مسکینوں کو کھانا دیا جاتا تھا۔ میر حسینیؒ، مولانا فخر الدین عراقیؒ مخدوم جلال بخاریؒ، اور خواجہ حسنؒ جیسے ہزاروں باکمال علماء اور مشائخ آپ کی مریدی پر فخر کرتے تھے۔ ۷ صفر ۶۶۱ھ کو علم و ادب اور طریقت و معرفت کا یہ نیرِ اعظم ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ حجرے کے چاروں کونوں سے آواز آئی "دوست بدوست رسید"۔

---

[1] پہلے پرہلاد مندر کا رخ شمالی جانب تھا۔ مخدوم شاہ محمود سجادہ نشین کے زمانے میں جب ہندو مسلم فساد ہوا تو اس نے شمالی دروازہ بند کرا دیا۔ اس پر مندر کے پروہتوں نے اس کا دروازہ مشرقی جانب تعمیر کرا لیا۔

آپ کو اسی حجرے میں دفن کیا گیا، جس میں آپ عمر بھر مصروفِ عبادت رہے تھے۔ یہ مقبرہ آپ نے خود تعمیر کرایا تھا۔ انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی میں اس کا بالائی حصہ شہید ہو گیا تھا، جسے آپ کے صاحب سجادہ مخدوم شاہ محمودؒ نے اپنے مریدوں کی مدد سے تعمیر کرایا۔ اس لئے چار دیواری کو قدیم سمجھنا چاہیے۔ اور بالائی عمارت بعد کی تعمیر ہے۔

الشیخ العارف حضرت صدر الدین محمد علیہ الرحمۃ

آپ حضرت شیخ الاسلامؒ کے بڑے فرزند اور جانشین تھے۔ آپ نے علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور ان کے ہی دستِ بابرکت پر بیعت کر کے مرتبۂ علیا پر فائز ہوئے۔ آپ کا عقد جناب بی بی راستی پاکدامن علیہ الرحمۃ سے ہوا جس کے بطنِ عفت سے وہ لولوئے شہوار عالم وجود میں آیا۔ جسے دُنیا قطب الاقطاب شاہ رُکنِ عالمؒ کے بابرکت نام سے پہچانتی ہے۔ آپ کا فیضان عام تھا۔ بڑے بڑے جلیل القدر بزرگ آپ کے برگزیدہ خلفاء میں سے تھے۔ جن میں حضرت شیخ جمال خنداں رُوؒ اُچوی، شیخ صلاح الدین سیستانیؒ، شیخ احمد معشوقؒ اور مولانا علاء الدینؒ محبوبِ خدا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۳ ذی الحجہ ۸۰۹ھ کو فوت ہو کر اپنے والدِ بزرگوار کے دائیں پہلو میں سپردِ خاک ہوئے۔

مقبرہ قطب الاقطاب شاہ رُکنِ عالم علیہ الرحمۃ

یہ مقبرہ بھی قدیم قلعہ پر واقع ہے اور بلحاظِ وسعت اور بلندی دُنیا کا آٹھواں عجوبہ خیال کیا جاتا ہے۔ سطح زمین سے ڈیڑھ سو فٹ کے قریب اُونچا ہے۔ قبّے کی گولائی ۵۸ فٹ ہے، اور بارہ تیرہ میلوں سے چمکتا ہُوا نظر آتا ہے۔ رات کو جب اس پر بجلی کے قمقمے روشن ہوتے ہیں تو ان کی روشنی میں گنبد کی بیرونی سطح بے حد دیدہ زیب اور دلفریب دکھائی دیتی ہے۔ اس مقبرے کا طرزِ

تعمیر اس قدر مقبول ہوا کہ بعد میں جو مقبرے تعمیر ہوئے، ان میں بالعموم اسی ہیئت کو پیش نظر رکھا گیا۔ مثلاً مقبرہ خواجہ اُویسؒ ملتان، مقبرہ سلطان احمد قتالؒ (جلالپور پیروالا) مقبرہ حضرت دین پناہؒ، مقبرہ مخدوم لعل عیسن (کروڑ، ضلع مظفر گڑھ) مقبرہ مائی جنداں، اوچ شریف۔

محکمہ اوقاف نے اس مقبرے کی مرمت کے لئے ......۴۰۰، ۲ روپے منظور کئے ہیں۔ اور مرمت کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہو رہا ہے۔ تقریباً ۵۰ کاریگر ــــــ اور ــــــ ۷۷ مزدور بلا معیہ کام کر رہے ہیں۔

حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ حضرت الشیخ العارف صدر الدین محمد علیہ الرحمہ کے فرزند ارجمند اور حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرّہ کے نامور پوتے تھے آپ ۹ رمضان المبارک ۶۴۹ھ بروز جمعہ تولد ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت حضرت شیخ الاسلام کی نگرانی میں ہوئی اور دادا حضور ہی کے مرید ہوئے۔ والد ماجد کی وفات پر سلسلۂ عالیہ سہروردیہ کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اور دہلی کے دربار سے آپ کو شیخ الاسلامی کا منصب نذر کیا گیا۔ سلاطینِ دہلی کے قلب و دماغ پر آپ کا بے پناہ اثر تھا۔ جب آپ عوام کے مقدمات کے تصفیہ کے لئے دہلی تشریف لے جاتے تو بادشاہ مع علماء اور اکابر امراء ایک منزل آگے پیشوائی کو حاضر ہوتا اور دو لاکھ اشرفی نذر کرتا۔ جو آپ دہلی پہنچتے ہی فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیتے۔ واپسی پر پانچ لاکھ اشرفی نذر ہوتی۔ وہ بھی وہیں بانٹ، خالی ہاتھ ملتان آتے اور فرماتے ملتان کے لئے ہم خود کافی ہیں۔

آپ نے دو مرتبہ سلطان علاء الدین اور تین بار سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں دہلی کا سفر اختیار کیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانے میں آپ کئی سال تک دہلی میں مقیم رہے۔ حضرت محبوب الٰہی نظام الدینؒ اولیاء سے آپ کے گہرے مراسم تھے ان کا آپ کی موجودگی ہی میں انتقال ہوا اور ان کا جنازہ بھی آپ ہی نے پڑھایا۔ امیر خسروؒ

مرشد کے انتقال کے چھ ماہ بعد لکھنوتی سے دہلی آئے۔ اور محبوب کے فراق کو برداشت نہ کرتے ہوئے ۱۸ شوال ۷۳۵ھ کو ان سے جا ملے۔ حضرت قطب الاقطابؒ نے ان کا جنازہ بھی پڑھا اور پھر ملتان تشریف لے آئے۔

محمد تغلق نے ملتان میں قتل عام کا حکم دیا تو آپ برہنہ سر دربار میں حاضر ہوئے اور قتل عام موقوف کرایا۔ ۷ جمادی الاوّل ۷۳۵ھ کو آپ نے بوقت عصر سجدے کی حالت میں انتقال فرمایا۔ پہلے آپ کو دادا بزرگوار کی پائینتی میں دفن کیا گیا۔ بعد میں آپ کے صندوق کو بڑے مقبرے میں منتقل کیا گیا۔

مقبرے کے شمال میں ایک خوبصورت مسجد ہے جسے اورنگ زیب نے تعمیر کرایا تھا۔ انگریزوں اور سکھوں کی جنگ میں یہ مسجد بارود سے اُڑ گئی تھی۔ اب اسے بھونگ (ضلع رحیم یار خاں) کے صوفی مذاق رئیس سردار غازی محمد خاں صاحب انڈھڑ نے دوبارہ تعمیر کرایا ہے۔ جنوبی دروازے پر حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی چھوٹی سی مسجد ایستادہ ہے جس میں آپ معتکف رہا کرتے تھے آپ کے روضۂ منورہ پر صبح شام کافی چہل پہل رہتی ہے۔

پیر در بر شاہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ الاسلام اور شاہ رکن عالمؒ کی خانقاہوں کے درمیان ۱۵×۱۵ فٹ کا ایک چھوٹا سا مقبرہ ملتا ہے۔ اس میں پیر در بر شاہ بخاریؒ دہلوی آرام فرما ہیں۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں جلال الدین فیروز کی عملداری میں تشریف لا کر حضرت شیخ الاسلام سے فیضیاب ہوئے اور آپ کی زندگی میں ہی ۶۹۴ھ میں فوت ہو کر یہاں دفن ہوئے خانقاہوں کے عین درمیان دفن ہونے کے باعث وصفی طور پر در بر شاہ مشہور ہو گئے ورنہ اصل نام کچھ اور تھا۔

مقبرہ سید عبد النورؒ اور گنج شہیداں

حال ہی میں پیر دربر شاہ علیہ الرحمۃ کے عین سامنے ایک چھوٹا سا مقبرہ اور اُبھر آیا ہے جسے مولانا عبد الستار شاہ صاحب نے تعمیر کرایا ہے۔ عوام اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی صحت پر یقین نہیں کرتے۔ لیکن شاہ صاحب خواجہ حسین خاں گورنر ملتان کا ایک فرمان دکھاتے ہیں جو موصوف نے ۹ رمضان المبارک ۱۱۳۱ھ کو جاری کیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں حضرت شیخ الاسلام اور شاہ رکن عالم قدس اللہ اسرار ہما کے مقبروں کے عین درمیان سڑک کے جانب شمال مسجد گنج شہیداں اور سید عبد النور علیہ الرحمۃ نام کا ایک مقبرہ موجود تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

علامہ قطب الدین کاشانیؒ

مقبرہ دربر شاہؒ سے جنوب کو شمالی درس گاہ کے متصل ایک چبوترے کے اوپر آپ کا مرقد واقع ہے۔ آپ مدرسہ ناصریہ کے مدرس اعلیٰ تھے، اور آپ کا علم و عمل کے لحاظ سے مرتبہ اتنا بلند تھا کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ صبح کی نماز آپ کے پیچھے اکثر ادا کرتے تھے آپ کے مشرقی پہلو میں مولانا وجیہہ الدین علیہ الرحمۃ دفن ہیں۔ جو حضرت مولانا محمد موسیٰ صدیقی علیہ الرحمۃ کے جدّ امجد اور حضرت فخر الدین عراقی کی اولاد سے تھے۔ سنہ ۹۷۱ھ میں فوت ہو کر حضرت علامہ کے دائیں پہلو میں دفن ہوئے۔

خانقاہ پیر سوہن شہید علیہ الرحمۃ

پرانے قلعہ کے باب القاسم کے باہر ڈھلان پر ایک مسجد بنی ہے۔ اس کے جنوب میں

۱۶ × ۱۳ فٹ کی مسقف خانقاہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ محو خواب ہے۔ جو کسی جنگ میں لڑتا ہوا شہید ہوا تھا۔ کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت شاہ رکن عالمؒ کے مریدوں میں سے تھے۔

بیرون دولت دروازہ

پیر دولت شاہ و خدمتگزار شاہؒ — چوکی پولیس دولت گیٹ سے متصل ایک خوشنما سا مقبرہ نظر آتا ہے۔ اس میں دو حقیقی بھائی محو خواب ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے زمانے میں تشریف لائے۔ اور ہزارہا خلق خدا کو صراط المستقیم پر گامزن کرنے کے بعد یہاں دفن ہوئے۔ شہر کا یہ دروازہ آپ سے ہی منسوب ہے۔

مقبرہ مولانا سید عظیم الدین شاہؒ — آپ مدینہ منورہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کے روضہ مبارکہ پر خاکروبی اور چراغ بندی کی خدمت پر مامور تھے۔ نواب مظفر خاں حج پر گئے۔ تو آپ کے زہد و ورع سے متاثر ہو کر اپنے ہمراہ ملتان لیتے آئے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی تمام زندگی امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں گزاری اور بعد وفات یہاں دفن ہوئے۔

دولت دروازہ، دہلی دروازہ

پیر فضل شاہؒ — آپ کا مزار کاشی گراں کی مسجد سے بالکل متصل ہے۔ آپ اپنے زمانے کے بے مثل درویش تھے۔ عمر بھر قائم اللّیل و صائم النّہار رہے اور کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا۔

پیر کلیم اللہؒ — اسی محلہ میں میاں محمد امین کاشی گر کے مکان سے متصل آپ کا مزار ہے۔ آپ زہد و تقویٰ میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اور آپ کا ہر فعل اور قول شریعت کے مطابق ہوتا تھا۔

مولانا محمد شفیع عام خاص باغ کے اندر مسجد کے احاطہ میں آپ کا مزار واقع ہے آپ عہدِ وسطیٰ کے بہترین عالم اور خوش الحان واعظ تھے، زندگی بھر اس مسجد میں درس دیتے اور وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ وفات کے بعد وصیّت کے مطابق آپ کو مسجد سے متصل دفن کیا گیا۔ مگر جب مسجد میں توسیع ہوئی تو یہ قبر صحنِ مسجد کے اندر آگئی۔

مسکین رکن الدین رح سڑک حافظ محمد جمال رح، محلہ خلاصی لائن، متصل گورستان چبوترے پر آپ کا مزار واقع ہے۔ آپ گوجرانوالہ سے فیضانِ معرفت کی طلب میں یہاں آئے اور ۱۲ رمضان ۱۳۲۱ھ کو فوت ہو کر یہاں دفن ہوئے۔

پیر جندے شاہ رح اسی سڑک پر امان پورہ کے قریب محلہ پیر جندے شاہ میں ایک مرتفع چبوترے پر آپ کا مزار واقع ہے۔ خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ محنت و مشقّت کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ امراء سے مجتنب رہتے اور عوام سے محبّت کرتے تھے۔

مزاراتِ شہیداں محلہ سیّداں کے قریب اور محلہ پیر جندے شاہ کے پہلو میں پانچ شہداء دفن ہیں جو کسی جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت سے ہمکنار ہوئے۔

خانقاہ شاہ شمس سبزواری علیہ الرحمۃ

عام خاص باغ سے جانبِ شمال سبز مونگیہ رنگ کا ایک خوبصورت مقبرہ نظر آتا ہے اس میں دو مزارات ہیں۔ دایاں مزار آپ کا ہے اور بائیں جانب آپ کے پوتے سیّد عالم شاہ جتی آسودۂ خاک ہیں۔

حضرت شاہ شمس علیہ الرحمۃ کو تذکرہ ملتان کے مؤلف نے اور بزی لکھا ہے۔ بعض آپ کو سبزواری ظاہر کرتے ہیں۔ چونکہ آپ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، اس لئے اسمٰعیلی فرقے کے لوگ آپ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ کہ آپ اسمٰعیلی فرقہ سے

تعلق رکھتے تھے۔ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اسی طرح آپ کا نہ تو فرقہ نور بخشیہ سے کچھ تعلق ہے اور نہ ہی "احوط" آپ کی تصنیف ہے جیسا کہ جلد اوّل میں ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے مصنف شاہ شمس عراقی تھے جو کشمیر میں مدفون ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے مبلّغ اور مصلح تھے۔ ہزاروں غیر مسلموں نے آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ پنجاب میں بے شمار قبائل ایسے موجود ہیں جو اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کو حضرت شاہ شمسؒ نے ہی حلقہ بگوشِ اسلام کیا تھا۔

آپ کا مقبرہ اوقاف کی تحویل میں ہے اور اسی کے زیرِ انتظام آپ کا میلہ منعقد ہوتا ہے آپ کی تاریخ وفات اکثر تذکروں میں ۲۷، صفر ۷۹۲ھ درج ہے۔ مگر میلہ مستقل طور پر ساون کے مہینہ میں ہوتا ہے۔ حضرت شاہ شمسؒ کے موجودہ متولّی سید مختار حسین شاہ صاحب شمسی ہیں جن کے رہائشی مکانات مقبرہ سے متصل واقع ہیں۔

نواب شاہنواز خاں

روضہ شاہ شمسؒ سے متصل ½۲۳ × ½۲۳ فٹ کے پختہ چبوترے میں نواب زکریا خاں کا بہادر بیٹا نواب شاہنواز خاں محوِ خواب ہے جو دیوان کوڑامل کی جنگ میں شہید ہو کر یہاں دفن ہوا۔

حاجی بغدادیؒ

اسی چبوترے کے قریب ایک اور پختہ مزار نظر آتا ہے۔ اس میں ہلاکو خاں کا پوتا اور سلطان احمد تکودار کا لختِ جگر شہزادہ محمدؒ "کلّ من علیہا فان" کی چادر تانے پڑا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر جلد اوّل میں ہو چکا ہے۔

پیر نور شاہؒ

طرف مبارک سے متصل چاہ ٹبّی والا کے قبرستان میں ایک جگہ معین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پیر نور شاہ علیہ الرحمۃ دفن ہیں۔ چونکہ آپ کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے مرقد بنانے کی کسی کو ہمّت نہیں پڑتی۔

مقبرہ خواجہ حافظ محمد جمال اللہ چشتی نظامی قدس سرہٗ

عام خاص باغ سے مشرقی جانب ایک قلعہ نما چار دیواری کے اندر حضرت حافظ محمد جمال اللہ چشتی نظامی علیہ الرحمۃ کا حسین و جمیل مقبرہ واقع ہے۔ آپ حضرت قبلہ عالم خواجہ نور محمد مہاروی قدس سرہٗ کے خلیفہ اور خواجہ خدا بخش خیر پوری علیہ الرحمۃ کے پیرِ طریقت تھے۔ آپ کے اتقا کا یہ عالم تھا کہ وضو کی جگہ مقرر تھی اور لوٹا بھی محفوظ رہتا تھا۔ فرماتے: اگرچہ یہ صورت محمود نہیں ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ عوام احتیاط نہیں کرتے اور لوٹے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اگر دورانِ سفر گھوڑے کو پانی پلاتے ہوئے معلوم ہو جاتا کہ اس کنوئیں کا مالک کوئی یتیم لڑکا ہے تو فوراً گھوڑے کی لگام کھینچ لیتے اور اسے پانی نہ پینے دیتے۔ مقروض مرید کی نذر قبول نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی امداد کرتا تو فرماتے کہ اس رقم سے قرضہ اتارنے کی کوشش کرو۔

اگرچہ آپ حجرہ نشین درویش تھے۔ لیکن بوقت ضرورت جہاد بالسیف سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ آپ کی زندگی میں رنجیت سنگھ جتنی بار ملتان پر چڑھ کر آیا۔ آپ نے شہر کو بچانے کے لئے مع مریدوں کے نواب مظفر خاں کا ساتھ دیا۔ اور وہ کئی گنا زیادہ لشکر رکھنے کے باوجود ملتان کو فتح نہ کر سکا۔ ۵، جمادی الاوّل ۱۲۲۶ھ کو جب آپ کا انتقال ہوا، تو کسی عارف نے کہا، افسوس آج ملتان کا پاسبان رخصت ہو گیا۔ اور یہی ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد سکھوں نے شدید حملہ کر کے ملتان کو فتح کر لیا۔

حضرت حافظ صاحب رحؒ کا عرس ہر سال بڑے اہتمام سے ہوتا ہے اور ہزاروں ارادتمند بڑی عقیدت و ارادت سے اس یادگاری تقریب میں شرکت کرتے ہیں۔

- قاضی مِٹھو علیہ الرحمۃ۔ مرید حضرت صاحب السیرؒ۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۳۴ھ کو وفات پائی۔
- پیر بُرہان شاہ رحؒ۔ بطرف جمعہ خالصہ، چاہ مٹھے والہ، متصل گورستان بابے ودی۔

۔ حضرت خواجہ محمد یوسف علیہ الرحمۃ ۔ پیر بُرہان کے قبرستان میں دفن ہیں۔ آپ حضرت حافظ محمد جمال اللہ قدس سرہٗ کے والد تھے۔ شرقی مزار آپ کی اہلیہ کا ہے۔

۔ حضرت اوچی شاہ ؒ ۔ محلہ کچی سرائے ۔ سیّد احمد شاہ بخاری ؒ ولایت حسین ڈگری کالج کے جانب شرق۔ مقبرہ سید معصوم شاہ بخاری ؒ معصوم شاہ روڈ پر واقع ہے۔

۔ نواب وزیر خاں ؒ ۔ خانیوال روڈ پر عید گاہ کے قریب آپ کے نام سے ایک قبرستان ملتا ہے۔ اس میں آپ کا مزار واقع ہے۔ آپ ملتان کے نواب تھے۔

۔ مائی موراں ؒ ۔ نزد قلعۂ قدیم، نواب مظفر خاں کے دور کی ایک مجذوبہ۔ جو اکثر نیم برہنہ پھرتی رہتی تھی۔

بیرون دہلی دروازہ

۔ پیر گوہر سلطان ؒ ۔ دہلی دروازہ کے باہر سڑک کے دائیں جانب ایک احاطے میں پچیس فٹ لمبی قبر ملتی ہے۔ دراصل یہ گنج شہیداں ہے۔ اور بے شمار شہید یک جا دفن ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان شہداء میں کوئی غوری سردار بھی تھا۔ جس کے نام پر یہ مدفن مشہور ہو گیا۔ قبر کے بہر جانے اس کی طوالت کے پیش نظر کسی ستم ظریف نے سُرخی گوٹنے والا پانچ من وزنی پتھر رکھ دیا ہے۔ جسے داستان گو حضرات تسبیح کا دانہ ظاہر کرتے ہیں۔

۔ پیر دُلّا درویش ؒ ۔ اصل نام میاں ولی محمدؒ، شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ کے مرید تھے۔ محلہ آغا پورہ میں مزار واقع ہے اور اس کا محلّ وقوع "دُلّا چوک" کہلاتا ہے۔ مزار سے ملحقہ مسجد کے مدرّس اور امام و خطیب تھے۔

۔ مولوی سراج الدین ؒ ۔ مولانا خیرپوری کے مرید و شاگرد۔ اپنے محلہ کی مسجد سے متصل مدفون ہیں۔ آپ بھی اسی مسجد کے امام و خطیب تھے۔ اور درس دیتے تھے۔

• پیر اکبر شاہ بخاریؒ۔ محلہ ہرایاں میں ایک اونچے ٹیلے پر چوبی کٹہرے میں آپ کا مزار ہے ۱۴ جمادی الاوّل کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

• حضرت خواجہ غلام حسن منشیؒ۔ آغا پورہ کے نزدیک ایک حسین و جمیل مقبرے میں دفن ہیں۔ تاریخ ولادت ۱۲۰۲ھ وفات ۱۹ محرم ۱۲۶۵ھ ہے۔

• پیر شاہ حسین بخاریؒ۔ نزد پُرانا اُوہ شرقی جانب آپ کا مزار ہے۔ جانب غرب پیر حامد شاہ بخاری محو خواب ہیں۔

بیرون خُونی بُرج

• پیر عمرؒ۔ سندھ سے آئے اور حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریاؒ سے فیضان حاصل کیا۔ خان بہادر رب نواز خاں چترالی کے محلات کے قریب اپنے نام کے بہت بڑے قبرستان میں دفن ہیں۔ بابا دادؒ اسی گورستان میں دفن ہیں۔ حافظ محمد حیاتؒ۔ آپ کا مزار بھی پیر عمرؒ کے گورستان میں واقع ہے۔ آپ اپنے زمانے کے بہترین قاری، بے مثال عالم اور حضرت خواجہ محمد موسیٰ صدیقی علیہ الرحمتہ کے والد تھے۔

• مولانا عبداللہؒ۔ آپ کا مقبرہ بھی قبرستان پیر عمرؒ میں واقع ہے۔ اپنے دور کے متبحر عالم تھے۔ مشہور ہے کہ درس کے دوران اگر کوئی مشکل پیش آتی تو حجرہ کے اندر جا کر کواڑ بند کر لیتے اور حضرت رسالت مآب سے استمداد کرتے۔ حضورؐ تشریف لا کر عقدہ حل فرما دیتے اور مولانا خوشی خوشی باہر نکلتے اور تقریر فرماتے۔

• شاہ خُرّمؒ۔ علاقہ خُونی برج میں باغ رب نواز خاں کے قریب مسقّف چاردیواری کے اندر آپ کا مزار ہے۔ شرقی مرقد آپ کے خلیفہ صاحب کا ہے۔

بیرون حرم دروازہ۔ بیرون پاکدروازہ اور طرف دائرہ

• مولانا شاہ علی مردانؒ، مولانا محمد مرادؒ کے مرید اور خواجہ محکم دین سیرانی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ ولادت ۱۱۹۶ھ وفات ۱۲۸۲ھ۔ حرم دروازے کے باہر مزار واقع ہے۔

حضرت مولانا اللہ داد خاں گرمانیؒ، ملتان سٹی اسٹیشن کے نزدیک آپ کا مقبرہ گنجان محلہ میں واقع ہے، مرید صاحب السیرؒ، تاریخ وصال ۱۲۶۵ھ

• مقبرہ حضرت خواجہ اویسؒ کھگہ، (بستی دائرہ) حضرت مخدوم صدر الدین عارفؒ کے زمانے میں ملتان تشریف لائے۔ آپ نے انہیں مکانات کے لئے اراضی عنایت کی۔ ۱۱ محرم ۷۰۰ھ کو فوت ہوئے حضرت شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ نے نماز جنازہ پڑھائی اور مقبرے کی بنیاد رکھی۔ ۱۱ محرم کو آپ کا عرس منعقد ہوتا ہے۔ مقبرے کے قریب آپ کی اولاد امجاد آباد تھی۔ مگر سکھوں کی بر چھاگردی کے دوران اکثر گھرانے موضع پتل (تحصیل کوٹ ادو) اور تحصیل خانیوال میں منتقل ہو گئے۔

• بی بی پاک دامنؒ۔ آپ کا خوبصورت کاشی دار مقبرہ ریلوے اسٹیشن ملتان شہر سے جنوبی طرف ایک وسیع و عریض قبرستان میں واقع ہے۔ جو آپ کے نام سے موسوم ہے۔ آپ حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ کی والدہ اور حضرت عارف باللہؒ کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ آپ کے زہد و ورع کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی خادمائیں جب چکی پیسنے بیٹھتی تھیں تو قرآن ختم کر کے اٹھتی تھیں۔ خانقاہ سے غربی جانب ایک کنواں ہے جس پر عورتیں شفایابی کے لئے غسل کرتی ہیں اور مچھلی و روٹی نذر کے طور پر تقسیم کرتی ہیں سارا دن عجیب چہل پہل رہتی ہے۔

• حضرت حافظ محمد اسمٰعیلؒ، گورستان مائی پاکدامن میں دفن ہیں۔ آپ اپنے زمانے

کے بے مثل حافظ اور قاری تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حفاظ اور قاری آپ کے آگے قرآن مجید پڑھنے سے جھجکتے تھے۔ اَب بھی جو آپ کے مزار پر ایک دفعہ قرآن مجید ختم کرے اس پر پُورا حاوی ہو جاتا ہے۔ حضرت حافظ اللہ بخش جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، وہ بھی اسی قبرستان میں مدفون ہیں۔

بیرون بوہڑ دروازہ

• حضرت شاہ حسن پرواناؒ، شہر سے اسٹیشن جاتے ہوئے بوہڑ گیٹ کے باہر سڑک کے دونوں جانب ایک بڑا قبرستان ملتا ہے۔ جو آپ کے نام سے ہی منسوب ہے۔ اس میں ایک اونچے ٹیلے پر غیر مسقف چار دیواری کے اندر آپ کا مزار ہے۔ آپ گیلانی سیّد تھے اور پروانہ تخلص کرتے تھے۔

• نواب علی محمد خاں شہیدؒ، اسی قبرستان میں ملتان کا شاہجہان جس نے اپنے دور میں بہترین مسجد تعمیر کی۔ شہر کی فصیل مرمت کرائی، نالے احداث کرائے، باغات لگوائے۔ آج ایک کچی اور شکستہ قبر میں سو رہا ہے۔ ملتان کے خوگانی امراء کو کئی بار توجہ دلائی گئی ہے، مگر کسی نے اس قبر کی خبر نہیں لی۔ یہ قبر بھی مولوی جان محمد صاحب نے تیار کرائی تھی۔ جو مسجد علی محمد خاں کے خطیب تھے۔ اگر وہ بروقت اس طرف متوجہ نہ ہوتے تو شاید آج اس مزار کا نشان تک نہ ملتا۔

• مقبرہ شاہ حسین خاں، شیش محل اور حسن کوشک کے درمیان ایک دیرینہ سال مقبرہ اور چند خشت و آہک کی قبریں نظر آتی ہیں۔ یہ سدوزئی خاندان کا قبرستان ہے۔ نواب مظفر خاں شہید اسی خانوادے کا چشم و چراغ تھا۔ مقبرے میں دو قبور ہیں۔ شرقی مرقد نواب زاہد خاں کا اور غربی اس کے بیٹے نواب شاکر خاں کا ہے۔ مقبرے کے شمال میں تین گنبدوں کی مسجد ہے۔ پاس ہی چند خشتی قبریں ہیں۔ ایک میں نصر اللہ خاں دفن ہے۔ دوسری پر عبدہٗ حسین خاں مرقوم ہے۔ باقی قبروں پر کوئی کتبہ نہیں۔

• قبرستان خوانین خدکہ۔ ملتان چھاؤنی میں سیٹھ جیون لعل کی کوٹھی سے متصل ایک احاطہ میں چند قبور نظر آتی ہیں۔ یہ خدکہ خاندان کا قبرستان ہے۔ اس میں بڑے نامی گرامی جرنیل اور خدکہ حکمران محوِ خواب ہیں۔ چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:۔

سلطان حیات خاں۔ نواب عبدالعزیز خاں شہید۔ نواب دین محمد خاں شہزادہ علی محمد خاں۔

بیرون لوہاری دروازہ

• پیر محمد مراد سیرانیؒ۔ نزد پرانی کوتوالی • مولانا نظام الدینؒ۔ بستی چمرنگ
• نواب تولے خاں۔ کوٹلہ تولے خاں (صحیح نام تغلق خاں)
• پیر مصاحب شاہؒ۔ آپ حضرت صاحب السیرؒ کے مرید تھے۔ ۱ر چیت کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔
• پیر محمد سید شاہؒ، چاہ مصاحب شاہ والہ کے ایک چبوترے پر آپ کا مزار واقع ہے۔ آپ بھی حضرت صاحب السیرؒ کے مرید تھے۔ ۴، ۵ ر چیت کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔
• پیر فتح شاہؒ (نزد مسجد قریشیاں)، المتوفیٰ ۲۵ ر محرم ۱۳۰۵ھ بروز جمعہ
• پیر میر آغاؒ، کوٹلہ تولے خاں میں سادی مسجد کے نام سے روغنی اینٹوں کی ایک مرتفع عمارت ملتی ہے۔ اس کے اندر شمالی جانب میر آغاؒ کا مزار ہے۔ جو چوغطہ خاندان کے نواب تھے۔ درمیان میں نواب اصغر علی اور آپ کی اہلیہ کے مرقد ہیں۔ دونوں تعویذ سنگِ مرمر کے ہیں اور انتہائی صنعت کے ساتھ بخطِ طغریٰ نقش من الاموال تا آخر کندہ ہے سرہاں کتبے پہلو کی جانب ایستادہ ہیں۔ یہ عمارت محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں ہے۔
• پیر بسنت شاہؒ، محلہ گنج متصل مکان حافظ طاہر محمد صاحب مرحوم حجرے کے اندر آپ کا مزار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ مجذوب تھے۔ آپ کی پائنتی میں گورستان ہے،

جس کا نام شہید گنج تھا۔ مگر اب صرف گنج رہ گیا ہے۔

• حافظ نور احمدؒ ——— محلہ حاجی پٹھان

• پیر جھنڈا فقیرؒ ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے اندر چبوترے پر آپ کا مزار ہے۔ روایت کرتے ہیں کہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ یہاں دو زنخ تیار ہوگی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہاں ڈسٹرکٹ جیل بنائی گئی۔ قیدی آپ کے مزار پر چراغ جلاتے ہیں۔

• حضرت مولانا عبید اللہ ملتانی علیہ الرحمۃ (محلہ قدیر آباد) آپ کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

• خانقاہ بی بی مہربانؒ و شاہ شرفؒ۔ (نزد چوک فوارہ) سول ہسپتال سے متصل گنجان عمارتوں میں ایک کہنہ مقبرہ نظر آتا ہے۔ اس میں مخدومہ بی بی مہربانؒ اور ان کا پوتا شیخ شاہ شرفؒ دفن ہیں۔ مائی صاحبہ کے شوہر شاہ حسینؒ جو شیخ قاسم سلیمانیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت محبوب سلیمانی علیہ الرحمۃ کے مرید تھے۔ بغداد سے قندھار تشریف لائے۔ ان کی اور ان کے صاحبزادے شیخ حسن کی خانقاہیں قندھار میں ہیں شاہ شرفؒ موخر الذکر کے فرزند تھے۔ حضرت مائی صاحبہؒ اور شاہ شرف کے انتقال پر ان کے مریدوں نے یہ مقبرہ تعمیر کرایا۔ پہلو میں ایک باغیچہ لگوایا اور ایک کنواں بھی احداث کرایا مگر اب صرف شکستہ مقبرہ باقی رہ گیا ہے۔

• مولانا شاہ بدر رخ عالمؒ۔ آپ حضرت شیخ الاسلامؒ کے معاصر اور مدرسہ بہائیہ کے معلم تھے۔ آپ کے فضل و کمال اور تبحر علمی کی بڑی شہرت تھی۔ اس لئے جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملتان تشریف لائے۔ تو حضرت شاہ رکن عالم قدس سرہ نے آپ کو ان کا اتالیق مقرر کر دیا۔ یہ آپ کا رہائشی مقام تھا۔ گرد و پیش کی قبریں ان کی ہیں جنہوں نے آپ کے بعد اس آبادی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

• حضرت موج دریا علیہ الرحمۃ۔ (نزد پل موج دریا) قبر منہدم ہو چکی ہے صرف

مسجد نشان دہی کے لئے باقی رہ گئی ہے۔

• نواب میرن شاہ بلوچ ۔ (نزد کوٹھی "الکبیر" پیر خورشید احمد کالونی) ملتان کے گورنر تھے۔ اور حضرت مخدوم سید حامد جہاں بخشؒ کے مُرید تھے۔ آپ نے حضرت مخدوم کو چوراسی ہزار بیگھے اراضی نذر کی تھی۔ مزار مرتفع چبوترے پر واقع ہے۔ مگر افسوس ہے کسی ناواقف نے آپ کے نام سے لفظ "بلوچ" مٹا کر "بخاری" لکھ دیا ہے لوگ بخاری سیّد کا مزار سمجھ کر منّتیں مانتے اور نذریں چڑھاتے ہیں۔

مُلتان شہر کے اندر

(حُسین آگاہی کے قریب)

• خانقاہ مبارک عمدۃ العلماء مولانا خواجہ محمد موسیٰ پاک صدّیقی علیہ الرحمۃ (محلہ کنگراں)

• حافظ عبّاسؒ ۔ متصل مسجد حضرت خواجہ محمد موسیٰ صدیقیؒ آپ کا مزار بے نشان ہو گیا تھا۔ اور لوگ مسجد میں داخل ہونے پر یہاں جُوتے اُتارا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ محمد موسیٰؒ کو خواب میں صُورتِ حال سے آگاہی ہوئی۔ تو انہوں نے مسجد کے فرش کو تھوڑا سا بڑھا کر جُوتے اُتارنے کی جگہ کو پیچھے ہٹا دیا۔ اور آپ کے مزار پر محرابی ڈاٹ تیار کرائی۔

• مولانا غلام محمد سلیمانیؒ ——— واقع محلہ بدرُو شیر خاں

• مولانا شاہ دلیرؒ ——— بالمقابل مسجد مولانا خیر پوریؒ

• مقبرہ شاہ دانا شہیدؒ ——— اندرون دہلی دروازہ

• حضرت حافظ بولا صاحبؒ ——— (محلہ ساگ ویڑھا) آپ بڑے متشرع اور پرہیزگار عالم تھے۔ اسی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کی عدم موجودگی میں ایک فقیر آگھسا اور بھنگ گھوٹنی شروع کر دی۔ جب آپ آئے تو غصّہ سے لال ہو گئے، فرمایا

"یہ کون بے ادب ہے کہ شریعت کا بھی لحاظ نہیں کرتا"۔ مارنے کو ہاتھ اُٹھایا تھا کہ وہیں خشک ہو کر رہ گیا۔ دُوسرا ہاتھ اُٹھایا وہ بھی خشک ہو گیا۔ لات مارنا چاہی تو وہ بھی ناکارہ ہو گئی اور آپ دُھم سے گر پڑے۔ حاضرین اُٹھانے کو دَوڑے تو فرمایا، میری خیر ہے۔ مجھے اُٹھا کر اِس فقیر پر دے مارو۔ فقیر نے جب یہ استقلال دیکھا تو سینے سے لگا کر اچھا کر دیا، اور پھر غائب ہو گیا۔ اُس دن سے حافظ صاحب کی دُنیا بدل گئی۔ اور وہ بہت جلد فقر و ولایت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ خضر تھے، جو فقیر کے لباس میں حافظ صاحب کی آزمائش کو آئے تھے۔

- بانگا بلالؒ ــــــــ محلہ بانگا بلال، اندرون دہلی دروازہ
- نواب سعید خاں قریشیؒ ــــــ محلہ سعید خاں اندرون دہلی دروازہ
- مٹھاں والا پیرؒ ــــــ آپ کا نام سیّد فتح اللہ شاہ ہے، اور گیلانی سید ہیں
- شاہ حسین آگاہیؒ ــــ صاحب تذکرۃ الملتان کی تحقیق کے بموجب آپ شاہ منصور بن شاہ ابوجعفر کے فرزند تھے، اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کی اولاد سے تھے۔ آپ سیر کرتے ہوئے ملتان تشریف لائے۔ اور یہیں مقیم ہو گئے۔ آپ پر اکثر استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی، معنوی نعمت آپ کو اپنے والدِ بزرگوار سے ملی تھی۔ ۱۰۳ برس کی عمر میں ۷ رجب ۷۶۳ھ کو انتقال فرمایا۔ شہر کے گنجان آباد حصے میں بازار حسین آگاہی کے غربی جانب آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔
- پیر دوست محمد خاںؒ ــــــ گڑ منڈی
- پیر عبدالرشید کرمانیؒ ــــ محلہ کٹڑہ نزد مسجد
- پیر عبدالرشید زکریاؒ ــــ بازار چوڑی سرائے محلہ یار بنداں، طاق کے اندر آپ کا مزار ہے۔ آپ حضرت پیر عمرؒ کے بھائی ہیں۔

• مزارات گوشہ نشیناں ــــــ گلی مچھی ہٹ محلہ گوشہ نشیناں میں ایک مسجد کے اندر شمالی جانب ایک مزار نظر آتا ہے۔ اس میں سید محمد ابراہیم شاہ علیہ الرحمۃ محوِ خواب ہیں آپ اپنے زمانے کے مشہور شیخ تھے۔ تفسیر و حدیث کا درس آپ کا شغلِ عزیز تھا۔ ساری زندگی توکل اور قناعت کے گوشہ میں بسر کر دی۔ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کیا اور نہ کسی کے ہاں چل کر گئے۔ حکیم محمد عتیق صاحب آپ کے متولی ہیں۔

• مولوی عبدالعلیم شاہ ــــــ مشہور عالم تھے۔ شریعتِ حقہ کے ساتھ طریقت و معرفت کے اسرار و رموز سے بھی واقف تھے۔ اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں بسر کر کے اپنی مسجد میں مدفون ہوئے۔ یہ مسجد شریف محلہ پونگراں میں واقع ہے۔

• لڈن گڈن ؒ۔ کپڑی پٹولیاں محلہ چھک میں ایک قبہ کے اندر دو درویش لڈن، گڈن ؒ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ دونوں خدا رسیدہ بھائی تھے۔

• پیر قاضی جلال ؒ ــــــ محلہ قاضی جلال میں احاطہ کے اندر آپ کا مزار ہے۔ آپ سید جلال بخاری اُچوی کے پوتے اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے مرید تھے آٹھویں صدی ہجری میں ہزارہا بندگانِ خدا کو آپ کے وجود سے فیض پہنچا، ۷ رجب ۷۳۲ھ کو فوت ہو کر یہاں دفن ہوئے۔

• پیر حافظ محمد جمال ؒ ــــــ دربار پیر صاحب سے شمال مشرقی جانب جموں والی مسجد میں آپ کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ گیارھویں صدی کے متبحر عالم تھے۔ استنبول سے تشریف لائے اور درس و تدریس میں عمر صرف کر کے یہاں دفن ہوئے۔

پیر جنید ؒ ــــــ دربار پیر صاحب سے جانب شرق۔

دربار پیر صاحب ؒ ــــــ اندرون پاک دروازہ (مقبرہ حضرت مخدوم سید ابوالحسن حافظ محمد جمال الدین موسیٰ پاک شہید رحمۃ اللہ علیہ)

• مقبرہ پیر حامد شاہؒ ——— دربار پیر صاحب سے جانب غرب ایک پُرشکوہ مقبرہ نظر آتا ہے۔ اِس میں سیّد حامد شاہ گیلانی استراحت فرما ہیں۔ عنفوانِ شباب میں آپ بڑے رنگین مزاج تھے۔ مگر جونہی حضرت محبوب الٰہی خواجہ خدا بخش صاحب خیر پوری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ عیش و عشرت سے کنارہ کر کے زاہد مرتاض بن گئے۔ سچ ہے ؎

سالکانِ راہِ ہمّت چوں ارادت بینند
ملک کاؤس و فریدوں بگدائے بخشند

• مقبرہ نواب یحییٰ اسخیؒ ——— اندرون حرم دروازہ، محلہ گیلانیاں

• مزار سیّد عیسیٰ گیلانیؒ ——— اندرون حرم دروازہ

• مقبرہ شاہ عنایت ولایتؒ ——— اندرون حرم دروازہ، برلب النگ

• پیر قالہ صاحبؒ ——— کالے منڈی میں مسجد کے مقابل ایک حجرے کے اندر آپ کا عرسی مزار ہے۔ آپ اپنے زمانے کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ ایک دفعہ ملتان میں سخت قحط پڑ گیا اور خلق خدا بھوکوں مرنے لگی۔ اسی اثنا میں ایک آدمی گیہوں کی بوری اُٹھائے آپ کے سامنے سے گزرا۔ آپ نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ بوری نیچے رکھ کر اوپر بیٹھ گئے اور منادی کرا دی کہ جس نے گندم لینی ہو لے جائے۔ خلقت کا ہجوم ہو گیا۔ شہر بھر کے گھروں میں غلّہ گندم کے ڈھیر لگ گئے، اور قحط کا نام تک نہ رہا۔ تب آپ بوری سے اُترے اور مالک سے کہا، لے میاں اب اپنی بوری اُٹھا لے۔ اُس نے دیکھا تو بوری ویسی کی ویسی بھری ہوئی تھی۔ سچ ہے ؎

اولیا را ہست قدرت از الٰہ ❊ تیرِ جستہ باز گردانند ز راہ

• پیر جعفر شاہؒ ——— محلہ سعد اللہ میں محوِ خواب ہیں۔

• پیر سیّد برہان الدین شاہؒ ——— (اندرون بوہڑ دروازہ، بازار کتب فروشاں)

برسرِ بازار ایک احاطے کے اندر آپ استراحت فرما ہیں۔ میجر شمس الدین وزیر معارف بہاولپور بڑے وثوق سے فرمایا کرتے تھے کہ سید برہان الدین قطب الاقطاب شاہ رکنِ عالمؒ اور سلطان محمد تغلق کے استاد تھے، اور مدرسہ بہائیہ میں بطور معلّم ملازم تھے۔

• پیر اَدھمؒ ــــ سیّد برہان الدّین رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے چند قدم بوہڑ دروازہ کو بائیں جانب محلہ درکھاناں میں نوگز لمبی قبر ملتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں شہدا، دفن ہیں قبر کیا ہے ایک لمبی سی منڈیر ہے جس پر گلی کے لڑکے گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ بوڑھی عورتیں چرخے کاتتی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ آج بھی اس عمیق گڑھے کے اندر مجاہدین کا اُبلتا ہوا گرم خون موجود ہے۔

• پیر حاجی محمد جمالؒ ــــ حرم دروازہ اور بوہڑ دروازہ کے مابین برلب فصیل احاطہ کے اندر طویل و عریض مزار نظر آتا ہے۔ اس میں بھی متعدد نفوس دفن ہیں۔ حاجی محمد جمالؒ ان میں سے معروف بزرگ تھے اس لئے یہ مزار اُن سے منسوب ہو گیا۔

• خانقاہ مبارک شیخ الاسلام شیخ محمد یوسف شاہ گردیز علیہ الرحمۃ اندرون بوہڑ دروازہ

• مزار گوہر بار شیخ محمد موسیٰ ــــ شاہ گردیز سے محلہ حمام کو جائیں تو دائیں طرف چبوترے پر آپ کا مزار ملتا ہے۔ مزار بہت لمبا چوڑا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ یہاں بھی صرف شیخ دفن نہیں ہے، بلکہ نوگزی قبر کی طرح اس میں بھی بہت سے شہدا، آسودۂ خاک ہیں۔

مساجد

اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ

مسلمانوں کا یہ معمول رہا ہے کہ جہاں کہیں انہوں نے قدم رکھا سب سے پہلے وہاں

مسجد تعمیر کی۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا۔ تو قلعۂ قدیم کے عین مرکز میں عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی۔ جسے قرامطہ نے اپنے دَور میں بند کرا دیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اُسے دوبارہ کھلوایا اور مناسب مرمّت کرائی۔ یہ مسجد برابر آباد رہی یہاں تک کہ جب انگریزوں نے قلعے پر بمباری کی، تو شہید ہوگئی۔ قلعے پر دُوسری تاریخی مسجد سلطان ناصر الدین قباچہ کی تھی، جو اس کی قائم کردہ یونیورسٹی میں واقع تھی۔ اسی طرح حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ، اور قطب الاقطاب شاہ رکنِ عالم قدس اللہ اسرارھم کے مقابر پر بھی عظیم مساجد تھیں۔ یہ سب سکھوں اور انگریزوں کی جنگ میں منہدم ہوگئیں۔ لیکن ملتان شہر اور اس کے مضافات میں مقابر کے پہلو میں جو مساجد تعمیر کی گئیں وہ بدستور موجود ہیں۔ ان میں سے درج ذیل مساجد قابلِ ذکر ہیں

۱۔ مسجد حضرت مخدوم شاہ یوسف گردیز علیہ الرحمۃ۔ اسے شیر شاہؒ نے تعمیر کرایا تھا۔ بعد میں اس کی مرمّت ہوتی رہی ہے۔

۲۔ مسجد دربار پیر صاحبؒ۔ یہ مسجد حضرت مخدوم جمال الدین موسیٰ پاک شہید قدس سرّہٗ کے مقبرے کے شمال میں واقع ہے۔ اس کے تین گنبد ہیں۔ اصل عمارت اندر سے ۶۰x۲۹ فٹ ہے۔ باہر کا مرمریں فرش ۶۰ x ۲۴ فٹ ہے۔ بائیں طرف سنگِ موسیٰ کا ½۵ x ¾۲ x ⅛ فٹ کا مُصلّیٰ دیوار پر پیوست ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر حضرت صاحب الروضہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

۳۔ مسجد نواب علی محمد خاں خوگانی۔ قلبِ شہر میں واقعہ ہے۔ اور اس پر یہ کتبہ ثبت ہے:۔

» بفضلِ ایزد و لطفِ نبی آخر الزماں ، بیمن حضرت جیلاں غوثِ ہر دو جہاں
بہ جائے شحنہ بازار بہر ہدم فساد ، کہ بُد چبوترہ دا بجرم ظلم عیاں
بنائے مسجد و حمام چاہ حوض عجیب ، بساخت بہر بازار ناظمِ ملتاں

برائے سال بنایش زغیب ہاتف گفت ، نمود مسجد عالی علی محمد خاں

بلحاظ مرکزیت اور نفاست یہ مسجد ملتان شہر کی جملہ مساجد پر فوقیت رکھتی ہے اور یہ صحیح معنوں میں جامع مسجد کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ چاروں طرف نیچے دُکانیں بنی ہیں۔ اوپر مرتفع چبوترہ پر یہ عالیشان مسجد قائم ہے۔ اصل عمارت اندر سے ۴۳½×۱۷ فٹ ہے۔ دیواروں پر نقاشی کا کام نہایت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اور آیۃ الکرسی، قرآنی آیات و اسمائے باری تعالیٰ کمال دلفریبی اور خوبصورتی سے بخطِ کوفی مرقوم ہیں۔ چھت چوبی ہے اور اس پر کمال چابکدستی سے نقاشی کا کام کیا گیا ہے۔ محراب اور منبر مرمریں ہے۔ باہر صحن میں ۱۰×۱۰ گز کا ایک حوض ہے، جس سے نمازی وضو کرتے ہیں۔

مسجد کی تعمیر کا مختصر حال ۔ اس مسجد کے بانی ملتان کے مظلوم تاجدار نواب علی محمد خاں خوگانی تھے ۱۷۵۸ء میں مسجد تیار ہوئی۔ اور ۱۷۶۷ء میں نواب نے شہادت کا خلعت زیبِ تن کیا۔ مظفر خانی عہد کے بعد جب سکھ برسرِ اقتدار ہوئے، تو یہ مسجد ناظمِ وقت کی کچہری قرار پائی اور اندر گرنتھ صاحب رکھا گیا۔ چنانچہ یہ واقعہ مسجد پر بطور کتبہ کے درج ہے۔ ؎

زہے عمارت عالی مسجد ملتاں — کہ کردہ اش بنایش علی محمد خاں
کشیدہ برسرِ بازار بادو صد اقبال — لواءِ دین نبی ہم چو آفتاب عیاں
بماند در کفِ سنکھاں بسال سی و چار — اسیر و بند کہ می کرد ماہ و سال فغاں
ظہور نور جبیبی رہاند از بندش — کہ گشتہ است ظہورش ز نور کون و مکاں
پس از شکستنِ سنکھاں تیار شد از نو — بزینہا و ستوں ہا و نقشۂ دالاں

چو کرد نور محمد کشادہ از بندش
بتاھت ہمچو ستارہ زظلمتِ سنکھاں

مسجد پھول ہٹاں عین چوک بازار میں، جنوب مغربی گوشہ کے اندر مغل طرز کی وسیع و عریض مسجد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی درویش نے شہنشاہ فرخ سیر کو بچے کے تولد ہونے کی خوشخبری دی تھی، جو پوری ہوئی۔ اور اسی خوشی میں بادشاہ نے یہ مسجد تعمیر کرادی۔ چونکہ دروازے پر گل فروشوں کا ہجوم سا رہتا ہے۔ اس لئے پھول ہٹاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسجد کے ساتھ چند دکانیں بھی ہیں۔

• مسجد خیر المعاد ـــــ چوڑی سرائے میں واقع ہے۔ جناب مولانا حامد علی خاں مدظلہ العالی اس کے خطیب اور امام ہیں۔ اس مسجد کا ملتان کی خوبصورت مسجدوں میں شمار ہوتا ہے۔

• جامع مسجد گرم منڈی ـــــ وسیع و عریض اور خوبصورت مسجد ہے۔ مشہور ہے کہ اس میں حضرت شیخ الاسلام نے کچھ عرصہ درس دیا تھا۔

• جامع مسجد محلہ کٹڑہ ـــــ یہ مختصر مگر انتہائی خوبصورت مسجد ہے۔ اس کے جنوب میں حضرت علامہ عبدالرشید کرمانی کا مقبرہ ہے۔ جو اس میں درس دیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے اسی مسجد میں حضرت کرمانی علیہ الرحمۃ سے تعلیم پائی تھی۔

• مسجد مولانا موسیٰ پاک صدیقی ـــــ یہ سادہ مگر تاریخی مسجد ہے۔ جس میں بڑے بڑے اولیاء اللہ نے امامت کا فریضہ انجام دیا ہے۔

• مسجد مولانا خیر پوریؒ ـــــ باغیچہ مرزا جان سے جانب شمال ایک وسیع و عریض مسجد ملتی ہے جس میں حافظ محمد جمال اللہ رح کے مرید اور خلیفہ اول مولانا خدا بخش خیرپوری درس دیا کرتے تھے۔ اس لئے اسے درس والی مسجد بھی کہتے ہیں۔

• مسجد عید گاہ ـــــ یہ روح پرور عمارت ۱۷۳۵ء میں ملتان اور لاہور کے صوبیدار نواب عبدالصمد خاں کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ خالصہ دور میں فوجی تصرف رہا، اور
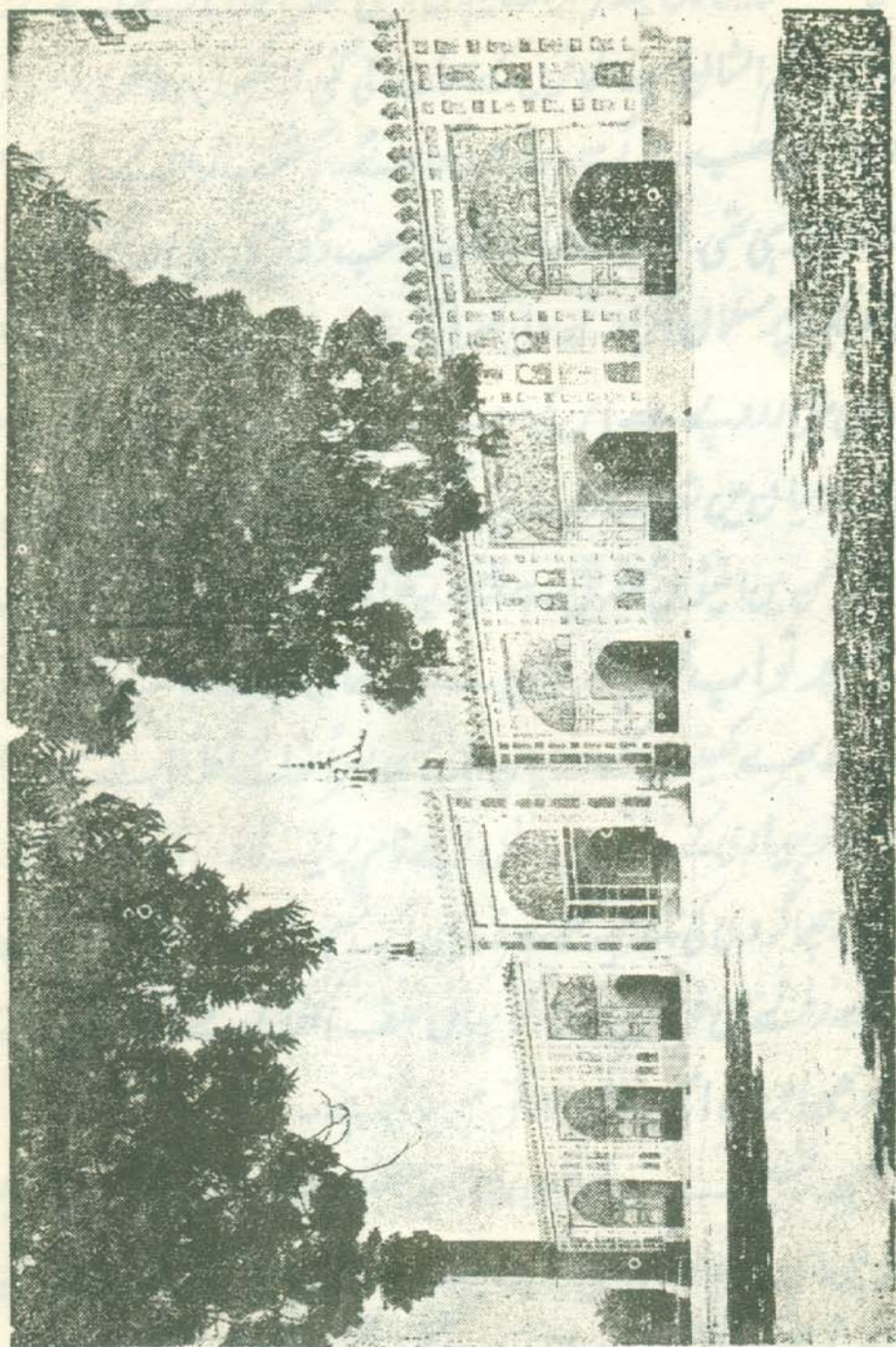
مسجد عید گاہ - خانیوال روڈ ملتان

دیوان مولراج کے زمانے میں یہاں لیفٹیننٹ ایگینو اور مسٹر اینڈرسن قتل کئے گئے انگریزی عملداری میں بھی کچھ عرصہ تک یہاں ڈپٹی کمشنر اجلاس کرتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں اس شرط پر یہ عظیم الشان مسجد مسلمانوں کے حوالے کی گئی کہ مقتول برطانوی افسروں کی یادگار کے طور پر جو کتبہ نصب ہے اُسے برقرار رکھا جائے۔ آشوب زمانہ کے باعث عمارت بے حد خستہ ہو رہی تھی۔ نواب محمد حیات خان صاحب ڈویژنل جج اور گکسن صاحب ڈپٹی کمشنر کی تحریک پر مسلمان اُمراء نے دل کھول کر چندہ دیا۔ اسی قدر گورنمنٹ نے بھی امداد دی اور بیس ہزار روپے سے اس کی مرمت کرائی گئی۔ مسجد کا مسقف حصہ ۲۴۰×۵۴ فٹ ہے۔ درمیان میں نہایت دیدہ زیب گنبد ہے۔ دونوں طرف بسیط دالان بنے ہوئے ہیں۔ باہر صحن میں اینٹوں کا فرش ہے۔ اوقاف بلدیہ ملتان اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

● مسجد نواب محمد باقر خاں —— ملتان شہر سے جانب مشرق سمیجہ آباد کی طرف ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان ایک مسجد سر اُٹھائے نظر آتی ہے۔ نواب محمد باقر خاں نے اپنی صوبیداری کے زمانے میں یہاں اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کیا تھا۔ محلات وغیرہ تو سکھوں کی برچھا گردی کی نذر ہو گئے، صرف یہی ایک مسجد نواب مرحوم کی یادگار رہ گئی ہے ساون مل کے زمانے میں فریقین مقدمہ کو یہاں حلف اُٹھانے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ جمعہ کے دن اب بھی اس میں اچھی خاصی رونق ہو جاتی ہے۔

● مسجد لیلین —— یہ خوبصورت مسجد معصوم شاہ روڈ پر واقع ہے سیٹھ محمد لیلین نے ۱۹۶۱ء میں اس کی بنیاد رکھی تھی، مگر وہ بہت جلد فوت ہو گئے۔ بعد میں ان کے فرزند سیٹھ محمد امین نے مجوزہ نقشہ کے مطابق اسے تکمیل تک پہنچایا۔

● مسجد اشرف رائیٹرز کالونی ملتان —— منشی عبدالرحمن خاں نے شیخ خلیل احمد و میاں عطا محمد بودلہ سے اراضی حاصل کر کے اس مسجد کی بنیاد رکھی اور چار دیواری

بھی تعمیر کرائی۔ چھت اُن کے ایک عزیز خان محمد اعظم خاں نے عوام کے تعاون سے بنوائی ہے۔ حضرت علامہ محمد شریف کشمیری و شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان، اس مسجد میں بغیر کسی معاوضہ کے خطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور مولانا نور الحق صاحب کو میلوی بچوں کو قرآن پڑھاتے اور امامت کرتے ہیں۔

گزشتہ سالوں میں ڈرائیور کی غفلت سے ایک ٹرک مسجد سے ٹکرا گیا تھا۔ جس سے دروازے کو شدید نقصان پہنچا، مسجد کے منتظمین نے اب اسے دوبارہ تعمیر کرا دیا ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔

● جامع مراد ــــ یہ مسجد باغ عام خاص کے شرقی پہلو میں واقع ہے۔ جامعہ محمدیہ اہلحدیث کی انتظامیہ پُرانی عمارت کو گرا کر نئے ڈیزائن کے مطابق اس کی تعمیر کرا رہی ہے دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں۔ اور کام جاری ہے۔

● جامع مسجد جمال پورہ ــــ اسے حال ہی میں شیخ خلیل احمدؒ نے تعمیر کرایا ہے، کافی کشادہ اور خوبصورت ہے۔ اس کے قریب ہی خانقاہ حضرت حافظ محمد جمال اللہ علیہ الرحمۃ کے قریب ایک اور مسجد واقع ہے جو مغل آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔

● مسجد خیر المدارس ــــ یہ عظیم مسجد مدرسہ مذکور میں واقع ہے کم و بیش تین ہزار افراد بیک وقت اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

● مسجد حضرت خواجہ اویس کھگہؒ ــــ ملتانی روغنی اینٹوں سے بنی ہوئی ہے اور قابلِ دید ہے۔

● مسجد خدا کہ ــــ یہ مسجد حسن و جمال کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس پر ملتانی روغنی اینٹوں کا کام بڑی نفاست سے ہوا ہے اور اس کے گنبد کا پورے شہر میں جواب نہیں۔

● مسجد نواب احمد یار خاں ــــ محلہ قدیر آباد میں واقع ہے۔ اس کی تزئین

آرائش پر کافی روپیہ صرف ہوا ہے۔ نواب اللہ یار خاں مرحوم جب اپنے جواں سال صاحبزادوں اور پوتوں کے ہمراہ جلوس کی صورت میں تشریف لاکر اس مسجد میں نماز ادا کرتے تھے، تو یہ نظارہ دیدنی ہوتا تھا۔ افسوس کہ اب اس منظر کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی ہیں، اور شاید ہمارے بعد آنے والے یہ ایمان افروز نظارہ پھر کبھی نہ دیکھ سکیں ؎

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب ڈھونڈ انہیں چراغ رخ زیبا لے کر

• مساجد عبیدیہ و رحمانیہ۔۔۔۔ مسجد نواب صاحب سے شمال رویہ مسجد عبیدیہ اور جانب غرب قدرے فاصلے پر مسجد رحمانیہ واقع ہیں۔ اوّل الذکر میں حضرت مولانا عبیداللہ اور مؤخرالذکر میں آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن قدس سرہٗ درس دیا کرتے تھے۔ دونوں مساجد آباد ہیں اور سلسلہ درس تدریس جاری ہے۔

• مسجد شاہ حسینؒ۔۔۔۔ یہ مسجد قبرستان خوانین سدوزئی میں واقع ہے۔ ہر جمعرات کو اس میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہوتا ہے۔

• مسجد سلطان حیات خاں خدکہ۔ یہ مسجد ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی سے شمالی جانب واقع ہے۔ اسے سلطان حیات خاں خدکہ نے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں خدکہ امراء کی آبادی تھی، جسے سکھوں نے اپنے پیہم حملوں سے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اور خزائن و دفائن کی تلاش میں بنیادیں تک کھود ڈالی تھیں۔ اب صرف یہ مسجد اُس عظمت رفتہ کی نشاندہی کے لئے باقی رہ گئی ہے۔ جب کبھی کوئی دیندار کمشنر آجاتا ہے تو اس کے دروازے کھل جاتے ہیں ورنہ آٹھوں پہر بند رہتی ہے۔ اقبالؒ نے شاید کسی ایسی ہی مسجد کو دیکھ کر کہا تھا ؏　مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

ملتان کی درس گاہیں

ملتان پرہلاد جی کے زمانے سے ہی علم و فضل کا مرکز چلا آیا ہے۔ مندر پرہلاد میں علوم متداولہ کی تعلیم بڑے پیمانے پر دی جاتی تھی۔ ہزارہا سال تک ملتان کو ہندو یونیورسٹی کا درجہ حاصل رہا۔ مہابھارت کے دور میں راجہ دریودھن نے اپنی بہن کی خواہش پر وادی سندھ میں علم پھیلانے کے لئے تیس ہزار برہمن بھجوائے، جس سے گھر گھر میں علم پھیل گیا۔ علامہ بیرونی کئی سالوں تک سنسکرت کے علوم حاصل کرنے کے لئے ملتان میں مقیم رہا۔ حضرت شیخ الہند اجمیری قدس سرہٗ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچسال کامل یہاں رہ کر پہلے آپ نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی، پھر اپنے رفقار کے ہمراہ اجمیر کو روانہ ہوئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی دور میں ملتان میں مقابلۃً ہندی علوم کا زیادہ چرچا تھا۔

اسلامی دور میں سب سے پہلے حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا رح قدس سرہٗ نے اپنی خانقاہ کے پہلو میں دینی علوم کی بہت بڑی درس گاہ قائم کی، ناصر الدین قباچہ نے بھی ملتان اور اُچ میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم کی تھیں۔ جن کے پرنسپل ملتان میں علامہ قطب الدین کاشانی اور اُچ میں علامہ منہاج سراج تھے۔ تعلیم و تدریس کا یہ شاندار سلسلہ لنگاہوں کے آخری دور تک قائم رہا۔ مگر جب ارغون نے اس شہر پر حملہ کیا تو بہت سے علماء یہاں سے ہجرت کر گئے اور دہلی پہنچ کر علم و فضل کی ایسی شمعیں روشن کیں جنہوں نے بنگال اور دکن تک کی ظلماتی سرزمین کو جگمگا دیا۔

نواب شجاع خاں کے زمانے میں چشتی علماء نے درس تدریس کی بساط بچھائی نواب

مظفر خاں کا عہد اگرچہ سکھوں کے پیہم حملوں کے سبب پُر آشوب دَور خیال کیا جاتا ہے، مگر رشد و ہدایت اور درس و تدریس کا کام اِن دنوں معراج کمال کو پہنچ گیا تھا۔ ہر دروازے پر ایک نہ ایک عارف ربانی طالبانِ حق کے دلوں کو قال اللہ و قال الرسول سے گرمانے کو موجود تھا۔ حرم دروازے کے باہر مولانا علی مردانؒ، بوہڑ دروازہ میں مولانا محمدؒ عبیداللہؒ، لوہاری دروازہ کے باہر مولانا محمد مراد سیرانیؒ، حسین آگاہی میں مولانا محمد موسیٰ صدیقیؒ، باغیچہ مرزا جان کے قریب مولانا خیرپوری اور مسجد نواب علی محمد خاں میں مولانا نور محمدؒ کے مدارس بڑے عروج پر تھے۔ سکھوں کے زمانے میں علوم دینیہ کی یہ بساط اُلٹ گئی، مولانا خدا بخش خیرپور میں اور مولانا محمدؒ عبیداللہ جھنگ کو منتقل ہو گئے۔ انگریزوں کے عہد میں کچھ امن قائم ہوا تو پھر چند علماء نے اِس سلسلے کو دوبارہ شروع کیا، مگر پہلی بات پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ اسلامی دَور کی مساجد کو جو اپنی اپنی جگہ پر مدرسے کا کام دیتی تھیں قفل لگ چکے تھے۔ مسلمان سکھوں کی بربھاگردی کے سبب مکانات چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ان کی جگہ ہندو اور سکھ آباد ہو چکے تھے۔ پاکستان بننے پر ہندو اور سکھ یہاں سے بھارت کو منتقل ہوئے تو بہت سی ایسی مساجد واگذار ہوئیں۔ جنہیں مندروں اور رہائشی مکانوں میں تبدیل کیا جا چکا تھا۔ بھارت سے جو علمائے دین اِس شہر میں آکر آباد ہوئے ان کی جہدِ مسلسل نے ملتان کی علمی دُنیا میں زندگی کی نئی ضرورت پیدا کر دی۔ چنانچہ آج بھی یہ شہر اپنے شاندار ماضی کی عظمتوں اور رفعتوں کا آئینہ دار ہے اور اس کے ہر گلی کوچے سے قال اللہ و قال الرسول کی صدائے سامعہ نواز سنائی دیتی ہے۔ چند مدارس کا اجمالی ذکر ملاحظہ فرمائیں:۔

• مدرسہ خیر المدارس

یہ مدرسہ جالندھر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کی سرپرستی میں قائم تھا۔ اس کے مہتمم مولانا خیر محمدؒ صاحب ۱۹۴۷ء میں بحیثیت مہاجر ملتان تشریف لائے، تو

اس مدرسے کو از سر نو حسین آگاہی روڈ پر جاری کیا۔ بعد میں قاضی عبدالرحمٰن صاحب انسپکٹر آف سکولز کی مساعی جمیلہ سے گیان متفلہ کی وسیع و عریض عمارت مدرسہ ہذا کو الاٹ ہوئی تو آپ مع عملہ اس میں منتقل ہو آئے۔ اور آپ کے حسن انتظام سے تھوڑے سے عرصے میں ہی اس مدرسہ نے اتنی ترقی کی کہ اس کا شمار ملک کی معیاری درس گاہوں میں ہونے لگا۔ مولانا نے متاثرکہ عمارت سے متصل مدرسہ کے لیے مزید زمین خریدی اور اس میں تین لاکھ روپے کی لاگت سے جدید عمارات تعمیر کرائیں اور اڑھائی لاکھ روپے سے ایک پُرشوکت جامع مسجد بنوائی جو تین ہزار نمازیوں کے لیے مکتفی ہو سکتی ہے۔ حضرت مولانا کا انتقال[1] ہو چکا ہے۔ اب ان کے صاحبزادے مولانا محمد شریف صاحب جالندھری مدرسہ کے مہتمم ہیں۔ اور بہترین اساتذہ ان کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ جن میں حضرت علامہ محمد شریف صاحب کشمیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کا وجود اس مدرسہ کے لئے بسا غنیمت ہے۔

اس مدرسہ میں درس نظامی کے مطابق جملہ علوم و فنون اسلامیہ عربیہ کی تعلیم دی جاتی ہے چار سو کے قریب طلبہ تعلیم پاتے ہیں جن کا تمام خرچ مدرسہ برداشت کرتا ہے۔ سالانہ بجٹ ڈیڑھ لاکھ روپے کے قریب بتایا جاتا ہے۔ مدرسہ ہذا میں تعلیم النسار کا بھی معقول انتظام ہے۔

● مدرسہ قاسم العلوم

اِس مدرسہ کے بانی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ہیں۔ پہلے یہ ایک مسجد میں تھا۔ اب اپنی جدید عمارت میں منتقل ہو آیا ہے۔ مولانا مفتی محمود صاحب اس درسگاہ کے شیخ التفسیر

---

[1] مولانا مرحوم نے اپنی زندگی میں ہی مدرسے کے ایک گوشے میں اپنی قبر کے لئے جگہ متعین فرما دی تھی۔ چنانچہ بعد وفات آپ کو اسی جگہ سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کے پہلو میں مولانا محمد علی صاحب جالندھری محو خواب ہیں۔ جن کی سیف بیانی سے بڑے بڑے فرعون لرزہ براندام رہتے تھے۔ اور ان دونوں علمائے ربانی کے درمیان مولانا خیر محمدؒ کے صاحبزادے حافظ رشید احمد صاحب کا مزار ہے۔ جو مدرسہ ہذا کے خزانچی تھے۔

ہیں۔ دو صد کے قریب طلباء تعلیم پاتے ہیں۔ جن کا تمام خرچ مدرسہ برداشت کرتا ہے۔
اس درسگاہ کے طلباء اور اساتذہ بھی سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔
مدرسے کا نصاب دیوبندی مسلک کے مطابق ہے۔

● مدرسہ انوار العلوم

ملتان میں صوفیانہ تعلیمات کا یہ واحد ادارہ ہے۔ اس درسگاہ کی بنیاد مولانا سید احمد سعید صاحب کاظمی امروہوی کی تحریک پر حضرت مخدوم سید محمد صدر الدین شاہ صاحب جیلانی علیہ الرحمۃ نے ۱۹۴۴ء میں رکھی تھی اور اس کے ابتدائی اخراجات منشی اللہ بخش صاحب ٹین ساز نے برداشت کئے تھے۔ موجودہ عمارات اور مسجد بھی اسی مردِ مجاہد کی قلندرانہ جرأت کا نتیجہ ہیں۔ کافی عرصہ تک مولانا کاظمی صاحب اس درس گاہ میں تعلیم دیتے رہے۔ ان کی اعلیٰ علمی و روحانی شخصیت کے طفیل یہ مدرسہ بہت جلد چار دانگ عالم میں مشہور ہو گیا۔ چند سالوں سے مولانا کاظمی صاحب کی خدمات جامعہ اسلامیہ بہاول پور نے لے لی ہیں۔ اس لئے اب مولانا غلام مصطفےٰ صاحب رضوی اور مولانا مشتاق احمد صاحب چشتی ان کی نیابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس مدرسے میں صوفیانہ تعلیمات کے مطابق درس نظامی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کم و بیش چار سو طلباء تعلیم پاتے ہیں جن کے جملہ اخراجات مدرسہ برداشت کرتا ہے۔ مدرسے کا سالانہ خرچ ایک لاکھ روپے کے قریب ہے آمدنی کا انحصار زیادہ تر صدقات، خیرات، زکوٰۃ اور عطیات پر ہے۔

● مدرسہ خیر المعاد

اس مدرسہ کے مہتمم و مدرس اعلیٰ مولانا حامد علی خاں نقشبندی ہیں۔ پہلے آپ نے یہ مدرسہ رہتک میں قائم کیا تھا۔ انتقال آبادی میں جب مسلم آبادی پاکستان منتقل ہو آئی تو آپ رام پور تشریف لے گئے کیونکہ آپ کے اعزہ و اقارب وہیں آباد تھے۔ اور آپ کے پیر طریقت کا مزار بھی وہیں تھا۔ آپ نے ۱۹۵۹ء تک وہاں بطور شیخ التفسیر مدرسہ عالیہ میں کام کیا۔ بعد میں رہتکی

ارادتمندوں کے اصرار پر آپ وہاں سے مستعفی ہو کر ملتان تشریف لے آئے۔ چوڑی سرائے میں مدرسہ خیر المعاد کی بنیاد رکھی اور حلقہ و ختم کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ قریب ہی جامع مسجد پھول ہٹ میں آپ ہی کی نگرانی میں تعلیم القرآن کا انتظام ہے اور جامع مسجد حنفیہ میں درس نظامی جاری ہے۔

● مدرسہ مظہر العلوم ـــــ یہ مدرسہ عام خاص باغ کے بالمقابل واقع ہے۔ اس کے مہتمم و شیخ الحدیث مولانا محمد شریف صاحب رضوی ہیں۔ اس مدرسہ میں قرآن پاک کی تعلیم کا اچھا انتظام ہے۔

● جامعہ عربیہ تعلیم الابرار ـــــ یہ درس گاہ خانیوال روڈ پر واقع ہے اس کی بنیاد ۱۹۴۵ء میں سید مبارک شاہ صاحب بغدادی نے رکھی تھی۔ اور شروع سے ہی مولانا ابو الحسن قاسمی صاحب اس درسگاہ کے مہتمم اور شیخ الدرس چلے آتے ہیں۔ اس مدرسے میں اسی کے قریب طلباء داخل ہیں۔ اور اس میں درس نظامی و علوم شرقیہ کی تعلیم دی جاتی ہے اس مدرسہ کے فارغ التحصیل طلباء جو علوم شرقیہ کی تحصیل کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں یہ مدرسہ وظائف دیتا ہے تعلیم کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ اور مضافات کے طلباء سے قیام و طعام کا خرچ بھی نہیں لیا جاتا۔ مدرسہ کی آمدنی کا دارومدار عوامی عطیات پر ہے۔

● مدرسہ انوار الابرار ـــــ یہ مدرسہ اورنگ زیب روڈ کے قریب محلہ پرانی منڈی میں واقع ہے۔ اس کے مہتمم سید عبداللہ شاہ صاحب ہیں اور اس میں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے۔

● مدرسہ رومیہ ـــــ یہ مدرسہ مسجد طوطلاں میں قائم ہے جو قبرستان بائی پاکدامن میں واقع ہے۔ اس کے مہتمم و منصرم مولانا فیض رسول نظامی ہیں اور قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے ہیں۔

● مدرسہ رضویہ انوار القرآن ـــــ یہ مدرسہ شہر کے عین درمیان میں کالے منڈی کے قریب واقع ہے اس کے مہتمم شیخ القرآن مولانا غلام رسول نوری ہیں تعلیم و تربیت پر قابل اساتذہ مقرر ہیں

• متفرق مدارس ــــ مندرجہ بالا مدارس کے علاوہ اور بھی بہت سی درسگاہیں قابلِ تعریف کام کر رہی ہیں۔ جن میں سے چند درجِ ذیل ہیں:۔
جامعہ حبیبیہ رحمانیہ۔ مدرسہ نعمانیہ قدیر آباد۔ مدرسہ رحمانیہ دار الحدیث چونگی نمبر ۱۴۔ جامعہ محمدیہ اہلحدیث عام خاص باغ۔ جامع العلوم معصوم شاہ روڈ۔ رمضانیہ ریاض العلوم گڑ منڈی۔ دعوت الحق حسین آگاہی۔ خیر العلوم۔ باب العلوم (امامیہ درسگاہ) ابدالی روڈ۔

سرکاری تعلیمی ادارے

گزشتہ سال تک سرکاری تعلیمی اداروں کے مقابلے میں غیر سرکاری اداروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کے ملازمین غیر یقینی زندگی بسر کر رہے تھے۔ نہ انہیں گورنمنٹ سکیل کے مطابق تنخواہ ملتی تھی اور نہ انہیں استقلالِ ملازمت پر یقین تھا۔ موجودہ عوامی حکومت کا یہ ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے کہ اس نے تمام پرائیویٹ اداروں کو اپنی نگرانی میں لے کر ان کے ملازمین کو ملازمت کا تحفظ دے دیا ہے۔ اور وہ سکون و اطمینان سے قوم کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ موجودہ سرکاری اداروں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ نشتر میڈیکل کالج
۲۔ گورنمنٹ ڈگری کالج بوسن روڈ
۳۔ گورنمنٹ زنانہ ڈگری کالج
۴۔ گورنمنٹ ولایت حسین ڈگری کالج
۵۔ گورنمنٹ ڈگری کالج پولیس لائن
۶۔ گورنمنٹ علمدار حسین انٹر کالج
۷۔ گورنمنٹ اسلامیہ انٹر کالج
۸۔ گورنمنٹ ملت انٹر کالج
۹۔ گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج
۱۰۔ گورنمنٹ پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ
۱۱۔ گورنمنٹ کمرشل انسٹی ٹیوٹ
۱۲۔ ٹیکنیکل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ

۱۳۔ گورنمنٹ پائیلٹ اسکنڈری اسکول
۱۴۔ گورنمنٹ کچہری ہنسو ہائی سکول
۱۵۔ گورنمنٹ ہائی سکول گل گشت
۱۶۔ گورنمنٹ انڈسٹریل ہائی سکول
۱۷۔ گورنمنٹ مسلم ہائی سکول
۱۸۔ گورنمنٹ ملت ہائی سکول
۱۹۔ گورنمنٹ ہائی سکول ممتاز آباد
۲۰۔ گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول حرم گیٹ
۲۱۔ گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول عام خاص
۲۲۔ گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول دولت گیٹ
۲۳۔ گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول
۲۴۔ گورنمنٹ سمرا پبلک ہائی سکول
۲۵۔ نصرت الاسلام ہائی سکول
۲۶۔ گورنمنٹ ہائی سکول گل گشت
۲۷۔ گورنمنٹ ہائی سکول رشید آباد
۲۸۔ گورنمنٹ زنانہ ہائی سکول
۲۹۔ گورنمنٹ نارمل سکول برائے طلباء
۳۰۔ گورنمنٹ جامع العلوم ہائی سکول
۳۱۔ گورنمنٹ بخاری پبلک ہائی سکول
۳۲۔ گورنمنٹ جوہر ہائی سکول
۳۳۔ گورنمنٹ فیض عام ہائی سکول
۳۴۔ گورنمنٹ کنٹونمنٹ ہائی سکول
۳۵۔ گورنمنٹ پاکستان ہائی سکول
۳۶۔ گورنمنٹ قائد پبلک سکول
۳۷۔ گورنمنٹ علی گڈھ ماڈل سکول
۳۸۔ گورنمنٹ نارمل سکول برائے طالبات

نوٹ:۔ مشنری کے صرف دو سکول (۱) سینٹ میری کانونٹ سکول اور (۲) لاسال ہائی سکول ملتان کام کر رہے ہیں۔

پرائیویٹ اداروں کی کارکردگی پر ایک نظر

جب تک پرائیویٹ ادارے عروج پر تھے ان کے ملازمین اپنے منتظمین کی تعریف کرتے کرتے تھکتے نہ تھے۔ لیکن جونہی گورنمنٹ نے ان سے تعلیمی اداروں کا چارج سنبھالا اور یہ سابق آقاؤں کی گرفت سے آزاد ہوئے تو لگے ان کی شکایت کرنے۔ بعض کالجوں کے پروفیسروں کو یہ کہتے سنا گیا کہ سابقہ انتظامیہ تنخواہ کم دیتی تھی اور یونین فنڈ کو جیسا چاہتی

خرچ کرتی تھی۔ ہم کسی ادارے کے وکیل نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ زندگی بھر سررشتہ تعلیم سے وابستہ رہے ہیں۔ اس لئے ہم سابقہ انتظامیہ کے عیب و ثواب سے بخوبی واقف ہیں۔ جہاں تک فنڈز کے استعمال کا تعلق ہے۔ پرائیویٹ کالجوں اور ہائی سکولوں کی فلک بوس عمارتیں اس امر کا زندہ ثبوت ہیں کہ سابقہ منتظمین نے اس مد پر لاکھوں روپے خرچ کئے۔ اور اگر وہ گورنمنٹ سکیل کے مطابق تنخواہیں نہیں دے رہے تھے تو یہ ان کی مالی مشکلات تھیں۔ ہمارے ان نکتہ چین دوستوں کو نہیں بھولنا چاہئے کہ پرائیویٹ اداروں نے اس وقت اپنی درس گاہوں کا اجراء کیا تھا جبکہ مسلمان بچوں کو سرکاری کالجوں اور سکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ یہ ناشکرے اس وقت بیروزگار تھے۔ پرائیویٹ اداروں کی ملازمت قبول کر کے انہوں نے ان اداروں پر کچھ احسان نہیں کیا تھا۔ بلکہ جب انہوں نے چاروں طرف سے ملازمت کے دروازے بند پائے تو مجبور ہو کر ان اداروں کا رخ کیا۔ یہ اچھے تھے یا برے۔ ذہین تھے یا غبی۔ محنتی تھے یا کام چور، ان اداروں نے انسانی ہمدردی کے پیش نظر انہیں سینے سے لگایا اور جو کچھ ان کے امکان میں تھا ان کے لئے کر گزرے۔ کیا ان حضرات کو معلوم نہیں کہ اب بھی ہزاروں ایم اے ڈ اور بی ایڈ اساتذہ کئی سالوں سے جے وی کی آسامیوں پر کام کر رہے ہیں۔ اور اسباب زیست کے لئے مزدوروں سے بھی زیادہ پریشان ہیں۔ کیا گورنمنٹ نے یہاں کالج بغیر کسی تحریک کے بنا دیئے تھے؟ ان کے لئے اخباروں میں شور و غوغا نہیں ہوا؟ اس دور کے ایم ایل اے حضرات نے اسمبلی ہال میں اپنے علاقے کی تعلیمی پستی کا نوحہ نہیں پڑھا تھا؟ اگر آپ کو علم نہیں، تو جناب واحد ندوی کی زبانی سنئے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے نواب مخدوم مرید حسین صاحب قریشی مرحوم نے بلا کر فرمایا:۔

"ندوی صاحب! ملتان کا گورنمنٹ کالج ربع صدی سے بدستور انٹر کالج چلا آتا ہے۔

غیر مسلموں کو تو کوئی تکلیف نہیں، لاہور چھوڑ سات سمندر پار انگلینڈ جا کر بھی وہ تحصیلِ علم کر سکنے پر قادر ہیں لیکن غریب مسلمان قوم کے ہونہار نونہال لاہور جا کر بھی تعلیم حاصل کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ ملتان کے اس انٹر کالج کو ڈگری کالج کا درجہ محض اس لئے نہیں مل رہا کہ اس سے جنوب مغربی پنجاب کے ستّر لاکھ مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اور غریب مسلمان بچے بھی گریجویٹ ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد ہفت روزہ "اسلام" نے "ملتان کے انٹر کالج کو فی الفور ڈگری کالج بنایا جائے" کے مستقل عنوان کے تحت بالاقساط مضامین لکھنے شروع کئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوبائی حکومت کے ایوان میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سرکاری ممبر نے بتایا کہ حکومت نے ڈائریکٹر تعلیمات سے ضروری کوائف طلب کر لئے ہیں اور بہت جلد لائل پور اور ملتان کے انٹر کالجوں کو ڈگری کالجوں کا درجہ دے دیا جائے گا۔[۱]

گیلانی مخادیم نے جب انجمن اسلامیہ کا چارج سنبھالا تھا تو اس کے زیرِ انتظام صرف ایک ہائی سکول چل رہا تھا۔ یہ ان کا ہی اثر و نفوذ تھا کہ ۱۹۴۷ء میں انجمن مذکور نے متارکہ غیر مسلم سناتن دھرم ہائی و مڈل سکول کی عمارتوں کو حاصل کر کے اسلامیہ ہائی سکول عام خاص اور حرم گیٹ اجراء کئے۔ ولایت حسینؒ کالج بھی یوں ہی نہیں بن گیا۔ اس کے لئے مخدوم زادہ سید محمد علمدار حسینؒ جو اس وقت وزیرِ صحت تھے اور مخدوم زادہ سید محمد ولایت حسینؒ چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ نے شب و روز تگ و دو کر کے پندرہ لاکھ روپے فراہم کئے۔ تب کہیں جا کر ولایت حسینؒ انٹر اور ڈگری کالج منظر عام پر آئے اور ان کی دو منزلہ عمارت تعمیر ہوئی۔ کیا اس سے پہلے ملتان میں مسلمانوں کا کوئی کالج تھا؟ ۱۹۶۲ء میں انجمن ہذا نے اسلامیہ گرلز کالج کا اجراء کیا۔ ۱۹۶۸ء میں اسلامیہ گرلز ہائی سکول قائم ہوا۔ کیا انجمن کا یہ قابلِ قدر کارنامہ نہیں کہ دولت گیٹ کا رنریں طالبات کی تعلیم

---

[۱] یادوں کے چراغ ص ۷۷ تا ۸۰ مصنفہ واحد ندوی جامپوری

کا اچھا انتظام کر دیا۔ جبکہ اس طرف کی دو لاکھ آبادی کے لئے کوئی زنانہ کالج اور ہائی سکول نہیں تھا۔ جب انجمن نے دیکھا کہ ولایت حسین کالج انٹر کے داخلے کے لئے مکتفی نہیں ہو رہا تو اس نے علمدار حسین انٹر کالج کا اجرا کیا۔ کیا کالج یونہی قائم ہو جاتے ہیں اور ان کے لئے کچھ تردد کرنا نہیں پڑتا!

ہم پرائیویٹ اداروں کی صفائی نہیں دے رہے اور نہ ہی ان کے منتظمین کو معصوم سمجھتے ہیں ہماری طرح وہ بھی انسان ہیں اور انتظامی سلسلے میں ان سے یقیناً غلطیاں سرزد ہوئی ہونگی۔ لیکن کم از کم انجمن اسلامیہ کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ اس نے کسی معلّم سے زیادہ رقم پر دستخط نہیں کرائے اور نہ ہی اُس کے فنڈز میں خورد بُرد ہوئی ہے۔

گورنمنٹ نے جس وقت انجمن اسلامیہ سے درس گاہوں کا چارج سنبھالا۔ اس کے زیر اہتمام ایک لا کالج، ایک ڈگری کالج، ایک انٹر کالج، ایک گرلز ہائی سکول، تین بوائز ہائی سکولز اور کئی پرائمری مدارس باتعریف کام کر رہے تھے۔

گورنمنٹ کی تحویل میں آنے سے جہاں کئی ملازمین کو ملازمت کا تحفّظ ملا وہاں کئی معمر اساتذہ بے روزگار بھی ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ کئی ناکارہ قسم کے لوگ پیر تسمہ پا کی طرح انجمن سے چمٹے ہوئے بھی تھے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ ان میں کئی حاجی محمد دین صاحب عاصی جیسے محنتی، فرض شناس اور معاملہ فہم حضرات بھی تھے۔ جنہیں مالیات کا زیادہ تجربہ تھا۔ اور وہ جوان اساتذہ کے مقابلہ میں دوگنا کام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے پرائیویٹ اداروں کا یہ کارنامہ انتہائی قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے طلبار اور طالبات کے لئے تعلیم کے حصول کو آسان بنا دیا۔ شہر کی ناخواندگی کے تناسب کو کم کیا۔ نادار طلبار کو مالی امداد دی اور ان کی فیسیں معاف کیں۔ ہم مخدوم سیّد شوکت حسین گیلانی، مخدوم زادہ سید فیض مصطفےٰ گیلانی، مرزا محمد بیگ مرحوم بانی مسلم ہائی سکول، چودھری عبد الرحمٰن صاحب، مرزا امیر بیگ

(مجلس ملی)، چوہدری نذیر احمد صاحب ایم اے (جامع العلوم)، میاں رسول بخش صاحب مرحوم اور عبداللہ خاں اخوند (ماڈل سکول) کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے نوعِ انسانی کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں اتنی عظیم خدمات انجام دیں۔

سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ

پہلے تمام سرکاری درس گاہوں کے امتحانات کا نظام پنجاب یونیورسٹی لاہور سے متعلق تھا۔ مگر اب ملتان میں ہی ایجوکیشنل بورڈ قائم ہو چکا ہے۔ اس کی انتظامیہ پندرہ[15] افسران اور تقریباً تین صد ملازمین پر مشتمل ہے اور یہ بورڈ ملتان اور بہاولپور ڈویژنوں کے انٹرمیڈیٹ اور سیکنڈری سکولوں کے طلبار کے امتحانات کا انتظام کرتا ہے۔ اور ہر سال انٹر میں پہلی بارہ اور میٹرک میں پہلی سولہ پوزیشنیں حاصل کرنے والے طلبا اور طالبات کو اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف بھی دیتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ محکمہ تعلیم نے ملتان میں یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے عید گاہ اور بوسن روڈ کے درمیان ۱۲۵ ایکڑ کے قریب اراضی خرید لی ہے اور اس پراجیکٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح سیکنڈری بورڈ کے لئے ۲۲ ایکڑ اراضی حاصل کر لی گئی ہے اور عمارتوں کی تعمیر کا کام شروع ہونے والا ہے۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ محکمہ تعلیم ملتان ڈویژن میں اپنا ڈائریکٹوریٹ بھی قائم کر رہا ہے اس کے بعد ملتان ڈویژن کے تعلیمی حلقوں کو گراں اخراجات اور دوسری انتظامی پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔

نابینوں کا سکول

آٹھ برس گزرے چند دردمند اصحاب نے حکام کے تعاون سے نابینوں کا سکول قائم کیا تھا۔ جسے محکمہ اوقاف گرانٹ بھی دیتا تھا۔ لیکن اب یہ سکول کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ انتظامی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔

بہرے گونگوں کا سکول

۱۹۵۸ء میں حاجی حمید الدین صاحب کاکوروی مرحوم نے سید نصرت حسن صاحب ڈپٹی کمشنر کے تعاون سے ڈیف اینڈ ڈمب سوسائیٹی کی بنیاد رکھی اور قلعہ قدیم کے دامن میں بہرے گونگوں کے سکول کا اجراء کیا۔ مسٹر مختار مسعود، ملک کرم داد، شیخ اظہار الحق اور ان کے بعد ڈاکٹر امتیاز احمد خاں یکے بعد دیگرے ایسے ڈپٹی کمشنر اس ضلع میں آئے۔ جنہوں نے انسانی ہمدردی کے پیش نظر حاجی صاحب کا پورا ساتھ دیا۔ چنانچہ ماسٹرز کالونی میں تین کنال اراضی حاصل کر کے اس میں سکول اور ہوسٹل کی شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ابتداءً منشی عبدالرحمٰن خان صاحب اس نیک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں حاجی صاحب کے دستِ راست بنے رہے۔ چنانچہ یہ تمام عمارتیں، بلکہ "دار الفلاح" بھی ان کی نگرانی میں تعمیر ہوا مگر بعد میں ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ جس پر منشی صاحب کو مستعفی ہونا پڑا۔ اور حاجی صاحب نے مرض الموت کے دوران ڈیف اینڈ ڈمب سکول، اس کی متعلقہ عمارات اور آمدنی کے جملہ وسائل کو ایک ٹرسٹ کی تحویل میں دے دیا۔ اور انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنی جان "جان آفرین" کے سپرد کی۔ اس وقت "حمید الدین وقف" کی ذمہ داری درج ذیل حضرات نے سنبھال رکھی ہے۔ (۱) چوہدری نذیر احمد صاحب دستی

ایس پی اس وقف کے صدر ہیں، اور بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ آپ کی مساعئ جمیلہ سے ہی محکمہ اوقاف نے سکول کو چھپن ہزار روپے کی بس عنایت کی ہے۔ ملک محمود احمد صاحب اعوان وقف ہٰذا کے نائب صدر ہیں اور ڈاکٹر محمد عمر خاں صاحب منیجر۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف اچھے منتظم ہیں، بلکہ ماہرِ تعلیم بھی ہیں اور سٹاف و طلبہ سے انتہائی شفقت سے پیش آتے ہیں۔

اس سکول میں مروجہ نصاب کے مطابق مڈل تک مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ جولائی ۱۹۸۳ء سے اس میں زنانہ دستکاری کا اجراء بھی ہو چکا ہے۔

یادِ رفتگاں

آج جس دَور سے ہم گزر رہے ہیں یہ سکون و اطمینان کا دَور ہے، ہماری اپنی حکومت ہے اور تمام تعلیمی سہولتیں ہمیں حاصل ہیں۔ مگر ایک زمانہ ایسا بھی گزر چکا ہے کہ ہم لوگ غلام تھے۔ ہم پر غیر قومیں حکومت کرتی تھیں۔ ہمیں اذان دینے کی اجازت نہ تھی۔ مساجد پر قفل لگے ہوئے تھے۔ ملازمتوں کے دروازے ہم پر بند تھے، مدرسے برائے نام تھے اور جو تھے ان میں ہمارے بچوں کو داخلہ نہیں ملتا تھا۔ ایسے حالات میں جن دردمند مسلمانوں نے مساجد آزاد کرائیں، بلند و بالا ماذنوں پر چڑھ کر اذانیں دیں۔ پیسہ پیسہ جمع کر کے سکول جاری کیے، ان کا ذکر نہ کرنا میرے نزدیک کفرانِ نعمت ہے۔ اس عظیم شہر کی تاریخ بہت پرانی ہے، میرا علم محدود ہے، میں قوم و ملت کے محسنین کا احاطہ کرنے سے قاصر ہوں۔ خدا معلوم اس شہر پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں اور کن کن خضر و مسیحا نے قوم کو تباہی و بربادی سے بچایا۔ میں ان کی ارواحِ صادقہ سے معذرت طلب ہوں کہ لاعلمی کے سبب اس تاریخی دستاویز کو ان کے اسمائے گرامی سے مزین نہ کر سکا — میرے ذہن کی سطح پر سب سے پہلے پیر حسن شاہ کی شبیہہ اُبھرتی ہے۔ جس نے عین اُس وقت جبکہ سکھوں کی بربریت کی وجہ سے سینکڑوں مسلمانوں کی لاشیں قلعہ میں بکھری پڑی تھیں، نواب مظفر خاں اور انکے صاحبزادوں

کی لاشوں کو تلاش کر کے حضرت شیخ الاسلام کی خانقاہ کے احاطے میں دفن کرایا۔ یہ اس دور کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے بعد اسی مردِ مجاہد کے دو صاحبزادوں مخدوم شاہ محمود اور پیر شاہ قریشی کا دور آتا ہے۔ تاریخ کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان تمام مسلمانوں کو جو سکھوں کی بربچا گردی سے ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ خطوط لکھ کر بلایا اور حکام کی منت خوشامد کر کے ہندو اور سکھ قابضین سے مکانات خالی کرائے اور ان میں مسلمانوں کو دوبارہ آباد کرایا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ملازمت صرف انگریزی پڑھے لکھے افراد کو ملتی تھی۔ انگریزی کی تعلیم کے لیے سارے شہر میں گورنمنٹ کا ایک سکول تھا۔ مگر اس میں حکام اور امراء کے لڑکے ہی داخل ہو سکتے تھے۔ غریب مسلمانوں کے بچے اس فرعونی عمارت میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہندوؤں کے دو ہائی سکول تھے۔ جن سے ہندو لڑکے میٹرک پاس کر کے دفتروں میں گھس جاتے تھے اور ملازمتیں حاصل کر لیتے تھے۔ اس کس مپرسی کے عالم میں سید میر حسن بخاری، سید خدا بخش بخاری، چوہدری ولی احمد اور شیخ عبدالحق وکیل جیسے مخلصین منظر عام پر آئے اور انہوں نے اپنے ذاتی سرمائے اور دوسرے صاحبِ خیر مسلمانوں کے چندے سے انجمن اسلامیہ ملتان شہر اور انجمن نصرت الاسلام ملتان چھاؤنی کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں کے لیے ایسے سکول جاری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو مسلمان بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مروجہ نصاب کے مطابق انگریزی کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ ملتان شہر کے ریلوے اسٹیشن پر کوئی مسافر خانہ نہیں تھا۔ مسلمان مسافروں کو، بالخصوص سندھی زائرین کو جو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے عرس میں شرکت کی غرض سے آتے تھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سیٹھ خدا بخش بخاری نے ہزاروں روپے کی لاگت سے اسٹیشن کے قریب وسیع و عریض سرائے بنوائی جس میں مسافروں کی رہائش کا پورا انتظام تھا۔ اور ان سے کوئی کرایہ

نہیں لیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں اسلامیہ ہائی سکول کے لئے ہوسٹل تعمیر ہو رہا تھا۔ اور اس کے لئے چوہدری دل احمد مرحوم ضلع میں طوفانی دورے کر کے مخیّر امراء سے دامن پھیلا پھیلا کر چندے وصول کر رہے تھے۔ اسی جہدِ مسلسل میں ایک دُبلا پتلا انسان منشی جان محمد انصاری بھی برابر مصروفِ کار تھا۔ جس کا خون پسینہ اِس ہائی سکول اور دار الاقامہ کے گل گارے میں رچا بسا ہُوا ہے۔ ان کی ہمّتِ مردانہ سے ہوسٹل کی شاندار عمارت تعمیر ہو گئی اور ملتان شہر کے مسلمان بچوں کے علاوہ ضلع بھر کے طلباء بھی اطمینان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان کے بعد ماضی کے آئینے میں ایک اور فعال جماعت نظر آتی ہے جس نے نواب ریاض حسین قریشی کی نگرانی میں ہزاروں روپے سے عید گاہ کی تعمیر و مرمت کرائی اور سیٹھ خدا بخش بخاری نے اپنی متصلہ اراضی اس تاریخی مسجد کی نذر کر دی جس سے اس کا صحن کشادہ ہو گیا۔

آخر میں ہمیں ڈاکٹروں اور طبیبوں کا ایک گروہ دکھائی دیتا ہے جس کے سرخیل حکیم شاہ بخش حکیم شیر محمد، ڈاکٹر رحیم بخش اور ڈاکٹر مقبول احمد مرحوم تھے۔ جن کی گھر پر آنے کی فیس اور دوائی کی قیمت برائے نام تھی، یہ سستے نجی ہسپتال خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار تھے اور بیماروں کے لئے آیۂ رحمت بنے ہوئے تھے۔ ہندو ویدوں میں ایک شریف پنڈت کا چہرہ بار بار نظر کے سامنے آتا ہے جو کالے منڈی میں بغیر لالچ اور طمع کے مریضوں کی تشخیص کرتا اور نسخے لکھ کر دیتا تھا۔ ایک صف میں مسلمان اور دُوسری میں ہندو بیٹھے نظر آتے سب سے یکساں سلوک کرتا۔ گھر جا کر مریض کو دیکھنے کی فیس چار آنے مقرر تھی۔ مگر مسلمانوں سے یہ چار آنے بھی نہیں لیتا تھا اور بڑے فخر سے سر اُٹھا کر کہتا کہ میرے اُستادِ محترم مسلمان تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری قوم غریب ہے۔ اس سے فیس نہ لینا، تو میں ان کی حکم عدولی کیسے کر سکتا ہوں۔ آج بھی حرم دروازے کے اندر ایک سفید ریش بزرگ اپنے بزرگوں کی طرح خدمتِ خلق میں مصروف ہے اور اس کھوٹے سِکّے میں بغیر کسی اُجرت کے پابندیٔ وقت کے ساتھ مریضوں

کو دیکھتا اور نسخے تجویز کرتا ہے۔ یہ حکیم خلیل احمد صاحب ہیں۔ اِسی طرح تغلق روڈ پر ڈاکٹر عبدالعزیز خاں، محلہ قدیر آباد میں حکیم عطا ءاللہ خاں، کچہری روڈ پر حکیم محمد حنیف اللہ، بوہڑ دروازہ کے باہر ڈاکٹر ولی محمد، پاک دروازہ کی فصیل پر حکیم محمد فیروز الدین اور چھاؤنی میں حکیم امین اللہ خاں کامل توجہ اور خلوص سے مریضوں کو دیکھتے اور بغیر کوئی اُجرت لئے نسخے تجویز کرتے ہیں ہم ان سب کو سلام کرتے ہیں، جب تک یہ دُنیا قائم ہے۔ عوام ان کے کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔

کُتب خانے

کوئی مدرسہ بڑا ہو یا چھوٹا اس کا اپنا کتب خانہ ضرور ہوتا ہے۔ جسے آجکل کی اصطلاح میں لائبریری سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی کافی کتب خانے موجود تھے۔ اور متھرا، کاشی اور دہلی جیسے عظیم شہروں سے بڑے بڑے ہندو دانشور یہاں آتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اِسلامی دور میں شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کے مدرسہ بہائیہ، سلطان ناصر الدین کے مدرسہ ناصریہ اور بعد میں ہر مدرسے کے ساتھ ساتھ مذہبی، ادبی اور تاریخی کتب خانوں نے فروغ پایا۔ اگرچہ کتابت و طباعت کی یہ سہولتیں حاصل نہ تھیں جو ہمیں آج میسّر ہیں۔ تاہم کسی زمانے میں کتابوں کی نایابی کا شکوہ سُننے میں نہیں آیا۔ اُس دور کا ہر شخص خوشنویس بننے کی کوشش کرتا تھا اور وہ فرصت کے اوقات میں کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا تھا۔ اِس لئے ہر موضوع پر کتابیں مل جاتی تھیں۔ امراء اور علماء تو شوقیہ لکھتے تھے۔ مگر ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس کی گزر اوقات کتب نویسی پر تھی۔ وہ لوگ ہماری طرح بدخط اور سُست قلم نہیں تھے۔ جب بھی لکھنے بیٹھتے ایک ہی نشست میں ساٹھ صفحے

صفحات لکھ ڈالتے تھے۔ اس لئے مدارس کے علاوہ لوگوں کے ذاتی کتب خانوں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ یہ ادبی ذخیرے حضرات علماء اور مشائخ کو جان سے بھی عزیز تر تھے۔ اگر کسی شہر سے نقل مکانی کرتے، تو اس قیمتی اثاثے کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبداللہ تلمبی مولانا عزیز اللہ، علامہ ابراہیم الجامعی اور مولانا سمار الدین جیسے بزرگوں نے ملتان کو خیرباد کہا ہے تو وہ اپنا علمی اثاثہ تمام و کمال ہمراہ لے گئے ہیں۔ بعض کتب خانے حملہ آوروں کی دستبرد کا شکار ہوئے۔ جو وہ ہمراہ لے جا سکتے تھے اُٹھا لے گئے اور باقیوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ کتب کی منتقلی کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ آج تک جاری ہے۔ سکھ خود کور ذوق تھے۔ مگر ان کے دربار میں فقیر عزیز الدین جیسے امراء موجود تھے، جنہیں ملتان کے شرفاء اپنے بزرگوں کے علمی نوادرات تحفہ کے طور پر پیش کر کے کام نکلواتے تھے۔ چنانچہ فقیر خانہ کے علمی مخطوطات اور تبرکات زیادہ تر ملتان سے تعلق رکھتے ہیں۔ سکھوں کی شکست کے بعد جب انگریز اس ملک کی قسمت کے مالک بنے تو اگر کوئی مخطوطہ خالصہ گردی سے بچ گیا تھا تو یہ لے اُڑے۔ اس سلسلے میں کیپٹن ہملٹن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ برطانوی اقتدار کے ابتدائی دور میں ملتان کا کمشنر تھا۔ اسے اردو فارسی پر خاصہ عبور تھا۔ اپنی کوٹھی میں اس نے الماریاں کتابوں سے سجا رکھی تھیں۔ سویرے اُٹھتا تو تو ئیے سے کتابوں کو صاف کرتا اور انہیں قرینے سے سجا کر رکھتا۔ کتابیں جمع کرنے کا جنون اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ فوجداری مقدمہ کی سماعت کے دوران بھی اگر وہ کسی کی بغل میں دیدہ زیب مجلد دیکھ لیتا تو بے تحاشا اس شخص کو بلاتا۔ اس کتاب کو دیکھتا۔ پھر مقدمہ کی سماعت شروع کرتا۔ جب ملتان کے امیروں پر کمشنر کی یہ کمزوری عیاں ہوئی، تو وہ قلمی کتابیں تحفتہً پیش کر کے اپنے کام نکلوانے لگے۔ اس طرح سینکڑوں کتابیں اس عیار نے جمع کر لیں اور انہیں اپنے ہمراہ انگلستان لے گیا۔ اس نے ان کتابوں سے یقیناً لاکھوں روپے کمائے ہوں گے۔ انگریز حاکم کی دیکھا دیکھی ملتان کے رئیسوں کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا اور

مخدوم حسن بخش قریشی، مخدوم حسن بخش گردیزی، مخدوم صدر الدین رح جیلانی، نواب عبدالقادر خاں بادوزئی، نواب محمد یار خاں خوگانی اور سیّد ناصر الدین شاہ گردیزی جیسے امراء نے اپنی لائبریریوں میں معیاری کتابیں جمع کر لیں۔ اگرچہ اب یہ کتب خانے اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ تاہم مؤخرالذکر لائبریری علیٰ حالہٖ موجود ہے۔ اور سیّد رمضان شاہ گردیزی نے اسے بڑی حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ بلدیہ کی لائبریری حال ہی میں وجود میں آئی ہے۔ پبلک لائبریری شہر کے پڑھے لکھے حضرات کے لئے لبسا غنیمت ہے۔ ان کے علاوہ کالجوں اور ہائی سکولوں کی بھی اپنی اپنی لائبریریاں ہیں۔ دینی مدارس میں مدرسہ خیر المدارس، مدرسہ قاسم العلوم، اور مدرسہ انوار العلوم کے کتب خانے قابلِ ذکر ہیں۔ ملتان چھاؤنی میں سیّد میر حسن بخاری نے ذاتی سرمائے سے ۱۹۱۰ء میں محمڈن لائبریری کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کا افتتاح مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے فرمایا تھا۔ سیّد عبدالباری صاحب تادمِ زیست اس کے آنریری سیکرٹری رہے، اور انہوں نے اسے کافی ترقی دی۔ اب بھی یہ لائبریری اپنی انمول کتابوں کے سبب دوسرے کتب خانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو مرکزی حکومت کے وزیر اوقاف مولانا کوثر نیازی نے اہلِ ملتان کو یہ خوشخبری سنائی کہ محکمہ اوقاف عنقریب شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کی درگاہ پر شاندار کتب خانہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ عمارت کی تعمیر اور کتب کی خرید کے لئے معقول رقم بھی مختص کی جا چکی ہے۔ اگر یہ کتب خانہ وجود میں آگیا تو مدینۃ العلم ملتان کی ایک اہم ضرورت پوری ہو جائے گی۔

نگار خانۂ ملتان میاں محمد شفیع مرحوم ایگزیکٹو آفیسر بلدیہ ملتان نے جب قلعۂ قدیم کی صفائی ستھرائی اور زیب و زینت کی مہم شروع کی تو اس دوران قلعے کے پیٹ سے چند ایسی اشیاء برآمد ہوئیں جو تاریخی اعتبار سے بے حد اہم تھیں میاں صاحب نے دمدمہ کے قریب میگزین کی زیریں عمارت کو نگار خانہ کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت

دے دی، جس میں بلدیہ نے قلعہ سے برآمد شدہ اشیاء اور ملتان کی مصنوعات قرینے سے دکھوا کر اسے سیاحوں کے لئے جاذب توجہ بنا دیا۔ تین سال تک بلدیہ نے اسے اپنے زیر انتظام چلایا مگر کامیاب نہ ہو سکی اور کئی ہزار روپے کا نقصان اٹھا کر اس سے دستبردار ہو گئی۔ پھر اسے محکمہ سمال انڈسٹریز کے سپرد کیا گیا۔ لیکن سات سال بعد اسے بھی دست کش ہونا پڑا۔ اور مال نیلام کر دیا گیا۔ اب ۱۹۶۸ء سے مسٹر عبدالمجید و محمد شریف نے اسے کرائے پر لے رکھا ہے۔ یہ دونوں جواں ہمت بھائی دلی لگن سے اس نگار خانے کو آراستہ کرنے اور سیاحوں کے پسند کی چیزیں فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ دن بھر یہاں عوام کی آمد و رفت سے عجیب گھما گھمی سی رہتی ہے۔ مسٹر مجید اور ان کے ملازمین بڑے با اخلاق ہیں۔ وزٹ بک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعۂ قدیم پر جو بھی حکام، افسران، اور بیرونی ملکوں کے سیاح وغیرہ آتے ہیں وہ اسے دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ نگار خانے میں درج ذیل اشیاء ہمہ وقت موجود رہتی ہیں اور مناسب قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں۔

ملتانی مٹی سے بنی ہوئی بلیو ٹائیلز، بلیو پھولدان، ظروف، پلیٹیں، اونٹ کے چمڑے کا سامان، شیڈ لیمپ، ٹیلیفون ریسیور، کھڑکی کپیاں اور مرتبان، مینا کاری کا سامان، زیورات پر قیمتی کام، برتنوں پر دیدہ زیب گلکاری، لاکھ کی مصنوعات، ہاتھی دانت کے بٹن، کانٹے، بال کلپ، گلدان، شطرنج کے مہرے اور سرمہ دانیاں، چوب کاری، لکڑی پر گل تراشی، تیر کمان پر نفیس کام، بیل بوٹے نقش و نگار وغیرہ، موسیقی کے آلات، یکتارہ، سہ تارہ، طبلے، بانسریاں وغیرہ، مٹی کے ظروف، بچوں کے کھلونے اور ایم فدا حسین، ہدایت اللہ سیفی، محمد الیاس اور غلام حسین راجپوت آرٹ کی مصوری کے شاہکار۔

افسوس ہے کہ اب جبکہ نگار خانہ زائرین اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے، چند حریص قسم کے لوگوں کی نگاہیں اس پر ترچھے زاویے سے پڑنے لگی ہیں اور وہ مجید صاحب سے ان کے خون پسینہ کی محنت کو غصب کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے میونسپل کمیٹی موجودہ کرایہ داران کی محنت شاقہ اور مشکلات کا صحیح احساس کرتے ہوئے ان سے کامل تعاون کرے گی۔

تہذیب و تمدن

اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ وادی سندھ میں جس قدر شہروں کے آثار ملتے ہیں، ملتان ان سب میں زیادہ قدیم ہے۔ اگرچہ اس کے گرد و پیش ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی قسم کے آثار ناپید ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر مسلسل آباد چلا آتا ہے اور اس کے مدفونہ حصے کی کھدائی نہیں ہو سکی۔ ۱۸۵۳ء میں جنرل کننگھم نے قدیم قلعہ کے متعدد مقامات پر کھدائی کرائی تھی، مگر وہ بمشکل چالیس فٹ تک نیچے جا سکے۔ اگر انہیں اس مہم کو جاری رکھنے کا مزید موقع ملتا تو پرانی تہذیبوں کے آثار یقیناً مل جاتے۔ عہد حاضر کے محققین نے عہد قدیم کو جس پیمانے سے جانچنے کی کوشش کی ہے اس کی بنا ظن اور تخمین پر ہے۔ محض اس لیے ملتان کو قدیم تصور نہ کرنا کہ اس کے قریب غاریں نہیں اور پہاڑ نہیں ہیں۔ حقائق سے انحراف کرنا ہے۔ شہروں کی ویرانی کا سب سے بڑا سبب دریاؤں کا رُخ بدلنا ہے، مگر ملتان ہمیشہ سے راوی اور چناب کے سنگھم پر آباد چلا آیا ہے۔ راوی نے رُخ بدلا تو اس کی جگہ دوامی نہروں نے لے لی۔ نیز چناب کے ذریعے کشتیوں اور جہازوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ باقی رہا پہاڑوں اور غاروں کا معاملہ۔ کوہ سلیمان ملتان سے کوئی خاص دُور نہیں ہے۔ جبکہ قدیم باشندوں کے قد ہمارے مقابلے میں دس گنا زیادہ لمبے تھے۔

ہبوط آدمؑ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ذراع تھا۔ تمام الہامی کتابیں حضرت آدم علیہ السلام کو ابوالبشر تسلیم کرتی ہیں۔ قرآنِ عزیز کا ہی ارشاد ہے کہ حضرت آدمؑ کو کائنات کی تمام اشیاء کے نام اور

ان کی ماہیت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ تاریخیں بتاتی ہیں کہ حضرت آدمؑ دُنیا میں اکیلے نہیں بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ کئی کار آمد چیزیں بھی اُتری تھیں اور حضرت جبرائیل نے انہیں لوہے کو پگھلا کر اس سے چھریاں، کلہاڑیاں بنانے کا فن سکھایا۔ یہ بھی قرآن سے ثابت ہے کہ حضرت آدمؑ کے لڑکوں قابیل اور ہابیل نے اپنی اپنی نذریں پہاڑ پر رکھیں۔ قابیل نے اجناس رکھیں اور ہابیل نے ایک موٹا تازہ دُنبہ پیش کیا۔ توریت میں صاف درج ہے کہ قابیل کاشتکاری کرتا تھا اور ہابیل بکریاں چراتا تھا۔ اور یہ بھی کہ حضرت آدمؑ نے اپنے ہر بیٹے کو کوئی نہ کوئی پیشہ سکھا دیا تھا۔ یہ بھی قرآن کریم کا ہی ارشاد ہے کہ حضرت نے سب سے پہلے اپنے رب کے لئے ایک مکان بنایا جو کعبہ کہلایا۔ تو پھر یہ مفروضہ کہاں قائم رہ سکتا ہے کہ انسان شروع میں غاروں میں رہتا تھا۔ اور درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کرتا تھا لیکن ننگے دھڑنگے تو اب بھی افریقہ میں پائے جاتے ہیں، ایسے قبائل بھی ہیں جو سانپ چوہے، مینڈک اور لومڑی گیدڑ وغیرہ پر گزر اوقات کرتے ہیں، مگر ان پر عصرِ حاضر کی تہذیب و تمدّن کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ نوعِ انسانی میں سے کئی قبیلے ایسے جنگلوں اور پہاڑوں میں جا پھنسے ہوں، جہاں اُنہیں دن غاروں میں، اور رات پہاڑوں پر بسر کرنے پڑے ہوں۔ لیکن کیا ضرور ہے کہ ہم ملتان کو بھی انہی تاریک علاقوں میں شمار کریں۔ بلاشبہ ملتان کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے ابوالبشر کے قدم چُومے اور نسلِ انسانی کے اوّلین گروہ نے اسے اپنی سکونت کا شرف و مجد بخشا۔ ابنِ سعد لکھتے ہیں کہ حضرت آدم کی اولاد سرزمینِ ہند میں اتنی بڑھی کہ وفات کے وقت ان کی اولاد در اولاد چالیس ہزار[1] کے قریب تھی۔ انہوں نے شہر بھی بسائے تھے اور پھر یہاں سے دُنیا کے دوسرے حصّوں میں منتقل ہوئے۔

[1] طبقات کبیر، از ابن سعد، جزو اوّل

آثارِ قدیمہ ہڑپہ اور موہنجو داڑو کا زمانہ آج سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے کا تشخیص کیا گیا ہے۔ ان کی بنیادیں ہمارے سامنے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر باور کرنا پڑتا ہے کہ اس دور کے لوگ مکانوں کی تعمیر میں اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ہر مکان کے آگے صحن، تین جانب رہائشی کمرے اور ایک طرف پانی کے نکاس کے لئے نالی۔ گلیاں کھلی، بازاریں وسیع۔ اجناس کے ذخائر رکھنے کے لئے محفوظ گودام۔ شہر کے گرد پختہ فصیل اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مضبوط برج۔ تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ یہ لوگ اپنے مُردوں کی لاشوں یا ان کی راکھ کو مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں بند کر کے دفن کرتے تھے۔ اس زمانے میں گندم، جَو، رایا اور کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔ یہ لوگ بت پرست تھے۔ شیوجی اور سورج دیوتا کی پوجا ہوتی تھی۔

آرین یہ قوم سکون و اطمینان سے زندگی بسر کر رہی تھی کہ آرین وسط ایشیا سے اس ملک میں داخل ہوئے۔ یہ ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قد آور، متناسب الاعضاء گندم گوں اور خوبصورت تھے۔ انہوں نے اصل باشندوں کو جنوبی ہند کی طرف دھکیل دیا۔ اور گھٹا کی طرح شمالی ہند پر چھا گئے۔ یہ لوگ اچھے کاشتکار، صنعت کار اور فوجی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا معاشرہ چار طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ یعنی برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ برہمن اپنے آپ کو تمام نوعِ انسانی سے افضل و برتر جانتے تھے۔ دوسرا گروہ کھشتریوں کا تھا۔ جو ملک کا انتظام چلاتے تھے۔ تمام راجے مہاراجے اسی طبقے سے ہوئے ہیں۔ تیسرا گروہ ویشوں کا تھا۔ یہ کھیتی باڑی اور تجارت کرتے تھے۔ چوتھا طبقہ شودروں کا تھا جو ان تینوں گروہوں کی نوکری کرتا تھا۔ منوجی نے جو قوانین بنائے تھے، وہ انتہائی ظالمانہ اور غیر عادلانہ تھے۔ برہمنوں کو مافوق الفطرت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور بے چارے شودروں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ ہندی تہذیب نے اشرف المخلوقات انسان کو ظلم و ستم کی بھاری زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ محکوم اور غریب عوام اس طبقے کو معبود سمجھتے اور ان کے سامنے سر سجدے میں رکھ دیتے تھے۔ مذہبی

تعلیم برہمنوں تک محدود تھی۔ ادنیٰ طبقے کا انسان اگر وید مقدس کا ایک منتر بھی سُن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے کا حکم تھا۔ برہمن سخت سے سخت جُرم کا مرتکب کیوں نہ ہوتا اس کی ذات قصاص اور سزایابی کی حدود سے بالاتر سمجھی جاتی تھی۔ مندروں اور دیگر مقدس مقامات میں نیچ ذات کے انسانوں کا داخلہ قطعی بند تھا۔ عورتیں دُنیا کی تمام آرام و آسائش سے محروم تھیں، وراثت کے باب میں ان کا کسی قسم کا کوئی حق نہ تھا۔ خواہ وہ کتنی کمسنی ہی میں رانڈ ہو جاتیں، لیکن دُوسری شادی کرنے کے حق سے وہ قطعاً محروم تھیں۔ جب ان کے شوہر مر جاتے تو ان بکیسوں پر دُنیا تاریک ہو جاتی۔ اس لئے وہ آنے والی مصیبتوں کے بھیانک منظر سے خوف کھا کر شوہر کے ساتھ ہی زندہ جل مرتی تھیں[1]۔

ملتان کی اخلاقی حالت

ملتان کے ایک مندر میں ہزاروں لڑکیاں بُتوں کے لئے وقف تھیں، جو مُرلیاں کہلاتی تھیں۔ ان کے لئے زنا عیب نہ تھا بلکہ فخر سمجھ کر کرتی تھیں۔ ان کی زناکاری کی اُجرت پر مندر کے اکثر خدام زندگی بسر کرتے تھے[2]۔

حکمرانوں کی کیفیت یہ تھی کہ رائے چچ ایک معمولی پنڈت کا لڑکا تھا۔ راجہ ساہسی رائے نے اس کو ذرّے سے آفتاب بنایا مگر اس نے ولی نعمت کے احسانات کا بدلہ اس طرح سے چکایا کہ پہلے اس کی رانی سے تعلقات قائم کئے اور پھر دونوں نے مل کر راجہ کو ٹھکانے لگا دیا[3]۔ اسی رائے چچ کے بیٹے داہر نے اپنی سگی بہن سے شادی رچائی[4]۔ جس ملک کی اخلاقی حالت اس حد تک گری ہوئی ہو۔ اس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا!

اسلام کے فیوض و برکات

اسی ماحول میں مسلمانوں نے اس شہر پر اپنی ظفر مندی کے جھنڈے گاڑے۔ علماء اور زہاد نے مساجد کے کھمبوں کے سہارے بیٹھ کر اپنے گرد درس کے حلقے قائم کئے۔ جن میں چراغ سے چراغ جلتے رہے

---

[1] حقیقت اسلام فروری ۱۹۳۸ء ص ۳۱ [2] تاریخ سندھ از مولانا عبدالحلیم شرر [3] و [4] تاریخ ہند از مولانا ذکاء اللہ

اور اس عظیم شہر نے معاشرتی اور روحانی اعتبار سے اتنی ترقی کی کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ بے ساختہ پکار اُٹھے ؎

ملتانِ ما بجنتِ اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

چنانچہ ۳۷۵ھ میں مشہور جغرافیہ نویس بشاری اس شہر میں وارد ہوتا ہے تو لوگوں کے اعلیٰ اخلاق کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اُسے اپنے سفرنامہ میں بے اختیار لکھنا پڑتا ہے کہ

"ان لوگوں کی اخلاقی حالت بہت اچھی ہے۔ ان میں زنا اور شراب کا مطلقاً رواج نہیں۔ اگر کوئی شخص اس جرم میں پکڑا جاتا ہے تو اسے یا تو قتل کر ڈالتے ہیں یا سخت سزا دیتے ہیں۔ تجارتی کاروبار میں یہ لوگ بڑے خوش معاملہ ہیں نہ تو جھوٹ بولتے ہیں اور نہ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ مسافروں کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں۔"

آگے چل کر پھر لکھتا ہے کہ :-

"تمام بازار میں کسی عورت کو بناؤ سنگار کیے ہوئے نہ دیکھ سکوگے اور نہ ہی کوئی کھلے بندوں ان سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے گا۔ یہاں کے لوگ عالی ظرف اور با مروت ہیں!"

چھٹی صدی ہجری میں اس شہر کے باشندوں کی دینداری اتنی ترقی کر چکی تھی کہ مشائخ اور علماء تو ایک طرف رہے اونچے گھرانوں کی نوکرانیاں چکی پیسنے بیٹھتیں تو قرآن ختم کر کے اُٹھتی تھیں۔ درویش سلیمان کسب نامے میں لکھتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ اور آن کے باکمال خلفاء کی تعلیمات کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ عوام میں خدا کا خوف شدت اختیار کر گیا تھا۔ ہر شخص پر "دل بہ یار و دست بکار" کا مقولہ صادق آتا تھا۔ حجام حجامت

بنانے بیٹھتا تو اس کی زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتی۔ اُسترے، قینچی، کنگھی اور ناخن تراش غرضیکہ ہر اوزار کے لئے الگ الگ ورد مقرر تھے۔ اسی طرح چوب تراش بھی کلہاڑا اٹھاتا تو ایک مخصوص آیت شریفہ کا ورد کرتا، لکڑی کو اُلٹاتا تو اور دُعا پڑھتا۔ اسی طرح دھوبی جلاہے سب کام کرتے وقت مخصوص اوراد پڑھتے رہتے تھے۔ ہر کاریگر کو یہ ذہن نشین کرادیا گیا تھا، کہ اگر تم بد دیانتی کروگے تو قیامت کے دن تمہارا حشر یہودیوں کے ساتھ ہوگا۔ اتقا کی کیفیت یہ تھی کہ قرض خواہ اس ڈر سے مقروض کے مکان کے سائے میں بیٹھنا گوارا نہ کرتا اور نہ ہی اس کے گھر سے پانی پیتا کہ کہیں یہ استفادہ سُود میں شمار نہ ہو مولانا حسام الدین متقی ملتان میں اپنے مشائخ کے آستانے پر حاضری دینے آتے تو شاہ رُکن عالمؒ کے مقبرے کے سائے میں نہ بیٹھتے کہ بادشاہ کا بنایا ہُوا ہے۔ ممکن ہے اس میں سرکاری خزانے کا کوئی پیسہ صرف ہو گیا ہو۔ خود حضرت قطب الاقطاب شاہ رکنِ عالم علیہ الرحمۃ نے بھی اس مقبرے میں اسی خطرے کے پیشِ نظر دفن ہونے سے انکار کردیا تھا۔ آپ کی تدفین کے بعد جب سلطان فیروز شاہ نے حضرت سجادہ نشین کو یقین دلایا کہ یہ مقبرہ میری نگرانی میں تعمیر ہوا ہے اور اس پر سلطان غیاث الدین کا ذاتی روپیہ خرچ ہُوا ہے، تو پھر حضرت کے صندوق کو اس تاریخی مقبرے میں منتقل کیا گیا۔[1]

سید عبدالوہاب[2] دین پناہ رحمۃ اللہ علیہ جن کا ظاہر و باطن نُورِ عرفان سے منوّر اور تاباں تھا۔ دن بھر دریائے سندھ میں مصروفِ عبادت رہتے اور رات کو کشتی سے اُتر کر کسی گاؤں میں چلے جاتے۔ اور بعد نمازِ عشاء، لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ مگر قیام و طعام کے لئے کسی پر بوجھ نہ بنتے۔ دن کشتی میں گزرتا اور رات کسی گاؤں کی مسجد میں ــــ حضور

[1] تاریخ فیروز شاہی از سراج عفیف [2] حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار صہ ۲۶۱ و تحفۃ السادات صہ ۲۴۹۔ دائرہ دین پناہ ضلع مظفر گڑھ

صائم الدہر اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ خادم جو مغرب کو کھانا تیار کرتا۔ اسی سے افطاری و سحری ہوتی۔

حافظ محمد جمال اللہ علیہ الرحمۃ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ یتیم کے کنوئیں سے اپنے گھوڑے کو بھی پانی نہیں پینے دیتے تھے۔ مولانا محمد عبید اللہ کو دعوت کے دوران علم ہو جاتا کہ صاحب دعوت مقروض ہے یا اس نے جوان لڑکیوں کو گھر میں بٹھا رکھا ہے، تو ہاتھ کھانے سے کھینچ لیتے۔ حضرت قاضی محمد عیسیٰ خان پوری نے قصاب سے گوشت اس لئے نہیں خریدا تھا کہ اسے ایمان کی شرطیں نہیں آتی تھیں۔ مولانا عبدالرحمٰن علیہ الرحمۃ کو کھانے کے وقت بی بی نے بتایا کہ لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ یہ سنتے ہی آپ فوراً اٹھ کھڑے ہو گئے اسی وقت ایک طالب علم سے بچی کا نکاح پڑھا، تب کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ خواجہ حسام الدین متقیؒ کے درس میں بہت سے طلباء پڑھتے تھے۔ مگر وہ کسی سے بھی خدمت نہیں لیتے تھے اور فرماتے کہ تم میرے نبیؐ کے مہمان ہو۔ تم سے بیگار لینا جائز نہیں۔ ہل جوت کر کھیت کو جاتے تو شاگرد پہلو بہ پہلو ساتھ چلتے۔ آپ ہل بھی چلاتے اور طلباء کو سبق بھی دیتے — اُچ کے گیلانی مخدوم حضرت سید عبدالقادر علیہ الرحمۃ کو سلطان محمود لنگاہ نے کئی بار دربار میں طلب کیا۔ لیکن آپ نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس نے آپ کی جاگیر ضبط کر لی، جو وظائف مقرر تھے وہ روک لئے اور کئی قسم کی انتقامی کارروائیاں کیں۔ آپ نے یہ سب کچھ برداشت کیا، لیکن بادشاہ سے ملنا گوارا نہ کیا۔[۵]

امراء کا کردار

اکثر امراء فقیر دوست اور خدا ترس تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں نواب مکرم خاں اور قلیچ خاں ملتان کی صوبے داری پر فائز رہے ہیں۔ ان کے زہد و ورع اور جود و سخا کا بڑا چرچا تھا۔ شہزادہ معظم شاہ ملتان میں گورنر مقرر ہو کر آیا تو رات کو

---

[۵] بحر السرائر

بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے گشت کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مخدوم شیخ محمد یوسف گردیزی کی مجلس میں شریک ہوا۔ حضرت مخدوم نے عشار کی نماز کے بعد نوافل پڑھنے جو شروع کئے تو بس پڑھتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی[1]۔ اور شہزادہ بہ تبدیلی لباس رات بھر ان کے قریب موجود رہا۔

نواب مظفر خاں کی والدہ فوت ہوئی تو اس نے وصیت کی کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر گناہ نہ کیا ہو اور نہ اس سے کوئی نماز قضا ہوئی ہو۔ اس مجمع میں بڑے بڑے خدا رسیدہ درویش موجود تھے، مگر کوئی آگے نہ بڑھا۔ آخر نواب مظفر خاں نے ہی جنازہ پڑھایا۔ اور دُنیا کو دکھا دیا کہ وہ ملتان کے فرمانروا ہونے کے باوجود دین میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ نواب شجاع خاں نے بڑے اشتیاق سے ایک جگہ شادی کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر عین اُس وقت جبکہ موصوف نکاح کے لئے مجلس میں جانے کو تھے۔ ایک نوجوان نے حاضر ہو کر عرض کیا حضور! آپ جس سے شادی کر رہے ہیں وہ میری منسُوبہ ہے۔ یہ سُن کر نواب کے قدم رُکے نہیں، وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق نکاح کی مجلس میں پہنچے۔ نکاح بھی ہُوا مگر ان کا اپنا نہیں، اُس نوجوان کا، اور نواب نے باپ بن کر جملہ رسُوم ادا کیں۔ اور ہزاروں روپے کے زیورات پارچات اور ظروف وغیرہ جو اس تقریب کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ سب اس نوجوان کو بخش دیئے[2]۔

نواب کا دستور تھا کہ جب کبھی شجاع آباد میں باہر سے برات آتی، خود تشریف لے جا کر دُلہن کو قیمتی جوڑا اور طلائی ہار مرحمت کرتے اور فرماتے "بیٹی! تو شجاع خاں کے شہر سے جا رہی ہے۔ اس شہر اور میری عزّت کا خیال رکھنا۔

---

[1] تذکرہ ملتان (قلمی) [2] لطائف سیرانی

تبلیغی اجتماعات آجکل جو میلے منعقد ہوتے ہیں یہ سکھوں کے دور کی یادگار ہیں۔ ورنہ پہلے یہ اجتماعات خالص تبلیغی نوعیت کے ہوا کرتے تھے۔ حضرت سخی سرور علیہ الرحمۃ نے اپنی زندگی میں جو تبلیغی وفود مرتب کئے تھے وہ ہر منزل پر وعظ کرتے اور عوام کو نیکی کی تلقین کرتے تھے۔ سکھوں نے انہیں میلوں ٹھیلوں میں بدل دیا۔ اسی طرح سندھ سے جو جماعتیں ملتان آتیں وہ بھی راستے میں جہاں قیام کرتیں، رات تسبیح و تہلیل اور وعظ و نصیحت میں بسر کرتی تھیں۔ اکثر اس میں نعت خوانی ہوتی تھی۔ اور علمائے کرام مواعظِ حسنہ سے دلوں کو گرماتے تھے۔ کہیں کہیں دوسری جانب چوگان بازی، کبڈی، گھوڑ دوڑ اور قوت آزمائی کے مظاہرے بھی ہوتے تھے۔ رنجیت سنگھ پہلا حکمران ہے جس نے حضرت مادھو لعل حسین علیہ الرحمۃ کے مقبرے پر رقص و سرود کی طرح ڈالی۔ اور جب ملتان اس کے قبضے میں آیا تو یہاں بھی راگ رنگ اور رقص و سرود کے یہی چرچے رواج پا گئے۔ سکھوں کے بعد انگریزوں نے شراب و کباب اور فسق و فجور کے ان اجتماعات کو انڈین کلچر کا نام دے کر اس میں مزید اضافے کئے۔ ڈوم ڈھاریوں نے فن کاری کا اعزاز پایا۔ اور ہر جگہ "ثقافت" کے پردے میں راگ رنگ اور رقص و سرود کے مظاہرے ہونے لگے۔ ہندو اور سکھوں کے لئے تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ سنگیت ان کے دھرم کی روح تھی۔ صبح شام مندروں میں مرلیاں اسی انداز میں بھجن گایا ہی کرتی تھیں۔ سکھ بھی ساز کے ساتھ اشلوک گانے کے عادی تھے، مگر تعجب اس بات کا ہے کہ وہ قوم جو تلواروں کی جھنکار کے سوا کسی سُر تال کو جانتی ہی نہ تھی، جس کو قرآن پڑھنے میں گانے سے زیادہ مزا آتا تھا، جس کا اوڑھنا بچھونا ذکرِ الٰہی تھا، وہ بھی "طاؤس و رباب" میں کھو گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عزت و کرامات کا تاج جو صدیوں سے اس کے سر پر جگمگا رہا تھا، غیر محسوس طریقے سے اُس کے سر سے اُتار لیا گیا اور تختِ طاؤس جس پر یہ کئی صدیوں سے اجلاس کرتی چلی آرہی تھی از خود اس کے نیچے سے کھسک

گیا۔ اور پھر لال قلعہ کی فصیل کے نیچے اس کے لاکھوں بوڑھوں، بچوں اور مرد، عورتوں کو کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ

اس بڑے المیہ پر مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے ربِّ غفور کی بارگاہ میں محمّد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر التجا کی کہ انہیں کفرستان میں پاکستان بنانے کا موقع عطا فرمائے۔ یہ اب کی دفعہ شیطان کے چکمے میں نہیں آئیں گے اور اس ملک میں تیرے قرآن کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ قدرت کالی کملی والے کے صدقے ایک دفعہ پھر اس قوم پر مہربان ہوئی اور برّصغیر پاک و ہند کے شرقی غربی بازو یعنی گنگ و جمن اور سندھ کی زرخیز وادیاں عطا فرمائیں۔ مگر اس ناشکری قوم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ پچیس سال کے عرصہ میں اس ملک پر قرآنی احکام نافذ نہ کر سکے۔ فسق و فجور کی انتہا ہو گئی وہ قوم جسے بارگاہِ ربّ العزّت سے خیر الاُمم کا تاج عطا ہوا تھا۔ جس کا کام جہالت کے اندھیروں میں علم و عرفان کے چراغ روشن کرنا تھا۔ ایک دفعہ پھر فسق و فجور کے سیلاب میں بہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے شیروں نے کفر کے گیدڑوں سے وہ مار کھائی کہ خدا کی پناہ، ملک کا آدھا حصّہ ہمیشہ کے لئے کٹ گیا۔ اور نوّے ہزار رزم آرا مجاہدین ہتھیار پھینک بھارت کی قید میں چلے گئے۔ اس المیہ کو ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر پاکستان کے یہ بہادر سپاہی ابھی تک دشمن کی سنگینوں کے نیچے بے بس قیدیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بھارت نے ان قیدیوں کو محض اس لئے روک رکھا ہے کہ پاکستان سے من مانی شرائط منوائے۔ یعنی یہ کہ

۱۔ پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرے۔

۲۔ کشمیر کے مطالبے سے دست بردار ہو جائے ــــ اور

۳۔ ہمیشہ کے لئے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرے۔

پاکستان گورنمنٹ اب تک اسی موقف پر قائم ہے کہ نوّے ہزار قیدیوں کا مسئلہ خالص انسانی

نوعیت کا ہے۔ اسے ریاست سے وابستہ نہ کیا جائے۔ اسی طرح اہل کشمیر نے آزادی کی جو تحریک چلا رکھی ہے اسے ختم کرنا کشمیریوں کو آزادی کے فطری حق سے محروم کرنا ہے۔ باقی رہا بنگلہ دیش کا معاملہ، یہ پاکستان کا ذاتی معاملہ ہے۔ بھارت کو اس میں دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد سے شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی ۱۹۵ فوجی قیدیوں پر مقدمہ چلانے کی دھمکی دے رکھی ہے۔ پاکستان نے بجواب آں غزل یہ اعلان کیا ہے کہ اگر مجیب نے بے گناہ فوجیوں پر مقدمہ چلایا تو یہ بھی ان بنگالیوں کے خلاف عدالتی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان سے غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ بھارت اور پاکستان کی اس کھینچا تانی کا نتیجہ کیا نکلے گا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

طریقِ معاشرت

انگریزی دور سے پہلے اہلِ ملتان کی بود و باش انتہائی سادہ تھی۔ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں میں یہ بات مشترک تھی کہ ان کے رہائشی مکانات کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک زنانہ، جسے محلسرا کا نام دیا جاتا تھا اور دوسرا مردانہ جو دیوان خانہ سے موسوم ہوتا تھا۔

اہلِ ملتان طبعاً فیاض واقع ہوئے تھے۔ مہمان نوازی میں ہی وہ اپنی شان تصور کرتے تھے۔ شام کو ہر ڈیرے پر دس پندرہ افراد ضرور مہمان ہوتے اور مالک مکان اپنی حیثیت کے مطابق ان کے قیام و طعام کا انتظام کرتا تھا۔ شہر میں ہوٹلوں اور ریسٹورنٹوں کا رواج بہت کم تھا صرف چوک چہلیک کے قریب ایک افغانی کاروان سرائے تھی جس میں تجارت پیشہ لوگ آکر ٹھہرتے تھے۔ اسی طرح دولت دروازہ کے باہر ایک محلہ اب تک کچی سرائے کے نام سے آباد ہے ملتان

شہر اسٹیشن بننے پر سیٹھ خدا بخش مرحوم نے بھی ایک پختہ سرائے بنادی تھی۔ ان سراؤں کے ساتھ ہوٹل تھے جہاں مسافروں کو قیمتاً کھانا مل جاتا تھا۔ دیہات میں بھی ہر زمیندار کا ایک الگ مہمان خانہ ہوتا تھا۔ اور وہ اس پر ناز کرتے تھے۔ چنانچہ ملک نصیر بخش صاحب (کھوکھر) میاں بڈھن شاہ (مخدوم رشید)، ملا خان محمد (شاہ پور) اور میاں نور احمد صاحب (خان پور شریف) کی مہمان نوازی اور جود و سخا کی بڑی شہرت تھی۔ خانقاہیں خواہ شہر میں تھیں یا مضافات میں مسافروں، مسکینوں اور درویشوں کے ٹھہرنے کے لئے ان میں حجرے بنے ہوتے تھے جہاں انہیں دونوں وقت کا کھانا اور موسم کے مطابق بستر بھی ملتا تھا۔ اس دور کے مشائخ کی سب سے بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ بیکس اور دکھی عوام کو ان کے ہاں سکون ملے اور وہ ہر کہ و مہ کو بلا امتیازِ رنگ و ملت اپنے سینے سے لگائیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ چشتی نظامی میں یہ صفت بدرجۂ کمال موجود تھی۔ ان کے زمانے میں چاچڑاں امن و عافیت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ ان کے لنگر خانے میں روزانہ ساڑھے بارہ من آٹا پکتا تھا۔ اور جب سفر پر روانہ ہوتے تو ایک جمِ غفیر ان کے جلو میں چلتا تھا۔ تقریباً ہر سال ملتان تشریف لاتے اور ملک کریم بخش کھوکھر کے دیوان خانے میں قیام فرماتے تھے۔ راستے میں جہاں جہاں منزل ہوتی اُس بستی والوں کو بھی حضرت کے لنگر سے کھانا ملتی تھی۔ چہ جائیکہ حضرت خود کسی پر بوجھ بنتے۔ ملتان کے رؤسا اور سجادگان کی طرف سے اگرچہ ضیافت کے طور پر زردہ پلاؤ کی دیگیں اور حلوا، فرنی اور گوشت روٹی ضرورت سے زیادہ بھجوائی جاتی تھی، پھر بھی حضرت کے لنگر خانہ کی آگ نہیں بجھتی تھی۔ یکصد سے اڑھائی سو افراد تک روزانہ آپ کے خوانِ کرم سے استفادہ کرتے تھے۔

اسی طرح مندروں، پاٹھ شالاؤں اور گوردواروں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کے قیام و طعام کا انتظام ہوتا تھا۔ اب چونکہ آمد و رفت کے وسائل اچھے ہو گئے ہیں اور ہر وقت

ہر جانب برق وش ٹرینیں اور موٹریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ہوائی پرواز کا بھی اچھا انتظام ہے اس لئے جگہ جگہ ہوٹل، موٹل اور ریسٹورانٹ قائم ہیں۔ عہدِ حاضر کا انسان اتنا عدیم الفرصت ہے کہ وہ ریل گاڑی پر ہوائی جہاز کو ترجیح دیتا ہے۔ صبح کو شہر میں آتا اور شام کو واپس لوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کسی دوست کے ہاں ٹھہرنے کے لئے اس کے پاس نہ وقت ہوتا ہے، اور نہ ضرورت محسوس کرتا ہے۔ بس سے اترے کسی ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ کچہری سے فارغ ہونے کے بعد شہر سے ضرورت کی چیزیں خریدیں اور شام کو گھر واپس پہنچ گئے۔ ویسے شہر میں ٹھہرنے کے لئے کم و بیش ہر زمیندار یا صنعت کار کی اپنی اپنی کوٹھیاں موجود ہیں۔ کسی کو دوسرے کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مکانوں کی جگہ اب کوٹھیوں نے لے لی ہے۔ جن کا سامنے کا حصہ مردانہ ہوتا ہے۔ ان میں دوستوں سے ملنے، کھانا کھانے اور سونے کے لئے الگ الگ کمرے مخصوص ہیں۔ ہر خواب گاہ کے ساتھ غسل خانہ اور بیت الخلاء کا انتظام بھی ہے۔ کوٹھی کا عقبی حصہ زنانہ ہوتا ہے۔ جس میں صاحب خانہ کے اہل و عیال رہتے ہیں۔ عمارتوں میں کچے گارے کی بجائے اب سیمنٹ استعمال ہوتی ہے۔ ہر کوٹھی کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ اور لان ضرور ہوتا ہے۔ جس میں کرسیاں بچھی رہتی ہیں۔ اور صاحب خانہ ٹھنڈے وقت میں اپنے احباب سے مل بیٹھتا ہے۔

لباس

(جدید تمدن کا ماتم)

ملتان کا شمار دنیا کے گرم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کے عوام سر پر لمبے بال رکھتے اور کھلے لمبے چولے زیب تن کرتے تھے جو گرمی کی شدت سے انہیں محفوظ رکھتے تھے۔ موسم سرما میں صدریاں اور لمبے چغے استعمال کرتے تھے جن کی تہوں میں کپاس سلی ہوتی

تھی۔ اب صدریوں کی جگہ سویٹروں اور اوورکوٹوں نے لے لی ہے۔ سر کے بال کٹوا دیئے ہیں۔ ڈاڑھی کو بلاوجہ رخصت کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس سے چہرہ وجیہہ نظر آتا تھا۔ آج سے پچاس برس قبل تک ہر ہندو، سکھ اور مسلمان کے چہرے پر ڈاڑھی نظر آتی تھی۔ "ڈاڑھی منا دا" ہمارے ہاں بہت بڑی گالی تھی۔ مگر اب تو ہر کہ و مہ حجام کو پکار کر کہتا ہے۔ "آ اوئے ڈاڑھی مُن وِنج" یعنی آؤ ڈاڑھی مونڈ دو۔ اسی طرح ہمارے رؤسا، خواہ ہندو تھے، یا سکھ اور مسلمان سب بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے تھے۔ مخدوم بہاول بخش قریشی اور مخدوم حسن بخش گردیزی کی پگڑیاں مشہور تھیں۔ لیکن اب عصر حاضر کی تہذیب نے سب کے سر سے پگڑیاں اُتار لی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پگ سے متعلق محاورے بھی بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ جیسے "آ اُو سائیں پگ بدھ آئے ہو!"[1] یا۔ "تیں اُوندی ڈاڈھی خدمت کیتی ہائی، پر اُوں تیکوں جو پگ بدھائی اے۔ او وی تیکوں ہمیشہ یاد رہسی"[2]۔ پگ اور دستار دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان سے "صاحب دستار" "پیر پگارو" جیسے نئے القاب وضع ہوئے۔ اور صدیوں تک فخر و مباہات کا باعث بنے رہے لیکن اب کسی "پیر پگارو" اور کسی "صاحب دستار" کے سر پر بھی پگڑی نظر نہیں آتی یہی صورت "طرہ بمقدار علم" کی ہے۔ اگر یہ محاورے درسی کتابوں میں رہ گئے۔ تو نئی نسلوں کو ان کے معنی و مطالب سمجھنے میں خاصی دقت ہو گی۔ تہ بند قدیم سے مروج ہے۔ لیکن اب شرفا شلوار اور پاجامے پہننے لگے ہیں۔ انگریز اپنے پیچھے ہیٹ اور پتلون چھوڑ گیا تھا۔ ہیٹ بڑی مفید چیز تھی اور گرمیوں میں چھتری کا کام دیتی تھی۔ پتلون غیر شرعی، غیر مفید اور نیم عریاں لباس تھا۔ مگر ہم نے مفید کو ترک کیا اور غیر مفید کو اپنا لیا۔ مستورات نے بھی قدیم برقعے کا استعمال چھوڑ دیا اور اس کی جگہ ایسے فیشنی برقعے کو اپنایا جس میں حجاب کم اور بے حجابی زیادہ ہے

---

[1] آؤ صاحب! انعام لے آئے ہو؟ [2] تو نے بھی اس کی بڑی خدمت کی تھی۔ لیکن اس نے جو صلہ تمہیں دیا ہے وہ تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا۔

اکبرؔ نے تو بے پردگی پر نوحہ کیا تھا۔ لیکن اب جدید تمدن دوپٹے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ حضرت خاتون کبریٰ نے عالم وفات میں وصیّت کی تھی کہ مجھے رات کی تاریکی میں دفن کیا جائے تاکہ کسی مرد کی نظر میرے جنازہ پر بھی نہ پڑ سکے۔ حضرت فریدالدین عطّار قدس سرّہٗ کو جب لوگوں نے بارش کے لئے دُعا کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں اپنے اندر تو کوئی ایسی بات نہیں پاتا جس سے باب رحمت کو کھٹکھٹا سکوں۔ البتہ ایک تجویز ذہن میں آئی ہے ممکن ہے اس مشکل وقت میں کام آجائے۔ یہ کہہ کر اپنے مکان میں تشریف لے گئے، ایک ڈبیہ لے آئے اور حاضرین کے سامنے آسمان کی جانب نظر کر کے عرض کی۔

"اے بارِ الٰہا! اس ڈبیہ میں اُس خاتون کا دوپٹہ ہے جس کا دعویٰ تھا کہ میں نے اسے چالیس سال تک پہنا ہے، مگر اس پر کسی غیر کی نظر نہیں پڑنے دی۔ اے ربّ العزّت! اگر اس بی بی کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو اس کے طفیل بارش نازل فرما۔"

یہ کہنا تھا کہ آسمان پر ابر چھا گیا۔ اور چھما چھم مینہہ برسنے لگا۔

وہ بھی زمانہ تھا کہ مستورات دوپٹے کا اتنا خیال کرتی تھیں۔ لیکن آج کی مستورات جو معنوی اعتبار سے اس اصطلاح سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ دوپٹے کے وزن کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے بجائے سر کے یہ کندھوں کی زینت بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن غالب تعداد ایسی ہے جو اس تکلّف کی بھی روادار نہیں۔ بالکل مردوں کی طرح کھلے بندوں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ کیسا بُرقعہ اور کیسا دوپٹہ! ابھی چند سال ہی گزرے ملتان کے امراء کی بہو بیٹیوں کو کہیں جانا ہوتا تو وہ رات کو جاتی تھیں۔ پھر ایک وقت آیا کہ موٹر یا ٹانگے کو زنان خانے کے قریب لے جاتے، مردان خانے کے دروازے بند ہو جاتے اور خادمائیں "پردہ پردہ" کی صدائیں بلند کرتیں۔ جو جہاں ہوتا وہ وہیں کسی اوٹ میں ہو جاتا

بند بہلیاں سوار ہو کر روانہ ہوتیں، تو مردوں کو اس ناگہانی نظر بندی سے نجات ملتی لیکن اب یہ صورتِ حال تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ شرفا زادیاں باہر جانے کے لئے بڑی بے تکلفی سے فیشنی برقعوں میں محلسرا سے برآمد ہوتی ہیں اور کہیں سے "پردہ، پردہ!" کی صدا البتہ نہیں آتی۔

موسیقی

بلاشبہ قبل از اسلام ملتان سنگیت کا زبردست مرکز تھا۔ صبح شام مندروں میں مرلیاں اور نائیک گا بجا کر وہ سماں باندھتے کہ اس کے آگے اِندر کا دربار بھی ماند پڑ جاتا مگر غازی محمد بن قاسم کی آمد پر یہ تمام رونقیں ختم ہو گئیں۔ منشی عبد الرحمٰن خاں صاحب کا یہ ارشاد قطعاً بے اصل ہے کہ "تغلق بادشاہوں کے زمانے میں محلہ کوٹلہ تغلق خاں میں موسیقی کی مختلف محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں، جن میں نائیک گوپال کمار نرمل اور امیر خسروؒ جیسے عظیم مغنی شرکت کرتے تھے۔"[1] پہلے تو یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ تغلق سلاطین کوٹلہ تغلق خاں میں رہتے تھے۔ بلاشبہ تغلق خاندان ابتداءً اسی محلے میں آ کر آباد ہوا تھا۔ مگر غیاث الدین اور اس کا بھائی رجب سلطانی لشکر میں ملازم ہوئے تو پھر یہ لوگ ملتان سے چلے گئے۔ سلطان نے جب خسرو خاں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا تو اس وقت وہ دیپال پور کا صوبیدار تھا۔ یہاں سے جو دہلی گیا تو پھر اُسے ملتان آنا نصیب نہیں ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سماع اور موسیقی کے خلاف اتنا سخت قدم اُٹھایا کہ پورے برِّصغیر میں کہیں ڈھنک دھیا کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ جو قوال یا گویا کسی صوفی کے آگے

---

[1] آئینہ ملتان صـ ۲۸۳

سرود گائے گا اُس کی زبان کھینچ لی جائے گی۔ خزینۃ الاصفیار کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"چوں سلطان غیاث الدین تغلق بر تخت دہلی متمکن گشت۔ در انسدادِ سماع تاکید تمام نمود و حکم داد کہ مطربے و قوالے پیش کسے سرود نگوید ورنہ زبانش از دہان کشیدہ خواہد شد۔ ازیں سبب ہنگامہ سماع بالکل سرد گشت۔ ہیچ قوالے راتاب آں نبود۔ کہ زبان بنغمۂ سرود بکشاید[1]۔"

شیخ عثمان سیّاح کی وارفتگی مفتی غلام سرور لاہوری نے اس موقع پر ایک لطیفہ بیان کیا ہے۔ جس سے سلطان کے حکم "امتناعِ سماع" کی شدت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ انہی ایّام میں ایک خوش گلو قوال میر حسن شیخ عثمان سیاح کی خدمت میں آنکلا۔ یہ شیخ سماع کے رسیا تھے۔ انہوں نے میر حسن سے منت کی کہ کوئی بیت یا شعر جو ذوق پیدا کرے آہستہ سے میرے کان میں گا کر سُنا۔ پہلے تو میر حسن نے سلطان کے خوف سے انکار کیا۔ مگر جب شیخ کا اصرار حد سے بڑھا تو اُس نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر آہستگی سے شیخ عثمان کو یہ شعر گا کر سُنایا ؎

زاہد ندیں برآمد مُلّا ز اعتقاد
کافر مجرّدی شد و صوفی چنانچہ ہست[2]!

امیر خسروؒ اور موسیقی یہ خاص دہلی شہر کی کیفیت تھی۔ ملتان میں نہ تغلق سلاطین رہے اور نہ کبھی موسیقی کی محفل منعقد ہوئی۔ اسی طرح ملتان میں حضرت امیر خسروؒ کو موسیقی کا بانی تصوّر کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ آپ جب سلطان محمد کے ساتھ ملتان تشریف لائے آپ کی عمر صرف ۲۶ برس تھی۔ آپ شعر ضرور کہتے تھے لیکن فنِ موسیقی میں اس قدر

---

[1] و [2] خلاصۃ الاصفیا، جلد دوم صہ ۵۴ و ۵۵

نہ شغف تھا اور نہ درک۔ اور نہ ملتان کا ماحول سازگار تھا۔ شہزادے کے دربار میں گاہے گاہے صرف اشعار پڑھے جاتے تھے بالکل اس طرح جیسے آجکل نعت خواں حضرات مجالس و وعظ میں مولود خوانی کرتے ہیں۔ ساز کے ساتھ گانے بجانے کا اس دور میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

حضرت امیر سلطان جلال الدین خلجی کے زمانے میں نظامی، خاقانی اور حافظ کی طرح منظرِ عام پر آئے۔ سلطان نے از راہِ قدردانی اپنا خاص لباس اور امیر کا منصب عطا کیا۔ اُسی دن سے لوگوں نے آپ کو امیر کہنا شروع کیا۔ علاء الدین خلجی کے زمانہ میں جب دربار میں موسیقی نے اپنا رنگ جمایا۔ اور بڑے بڑے کلاونت آ کر اپنے کمالات کا اظہار کرنے لگے تو حضرت امیر کی توجہ بھی اس طرف منعطف ہوئی۔ ان کی طباعت اور ذہانت مسلّم تھی، ساتھ ہی مرشدِ طریقت نے خصوصی توجہ فرمائی۔ بس پھر کیا تھا۔ تھوڑی سی کد و کاوش سے حضرت امیر تمام راگ راگنیوں اور سُر تال پر قادر ہو گئے۔ اور جب نائیک گوپال اپنے بارہ سو شاگردوں کے ساتھ سنگھاسن پر بیٹھ کر دربار میں آیا تو وہ امیر کے آگے ٹک نہ سکا۔ اور پھر جب آپ نے اپنی خاص ایجادات پیش کیں تو تمام راگیوں نے بے اختیار آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہ دہلی دربار کا واقعہ ہے جسے منشی صاحب نے کوٹلہ تغلق خاں کی مفروضہ مجالس غنا سے متعلق کر دیا ہے۔ اس واقعہ سے یہ اخذ کر لینا کہ حضرت امیر خسروؒ موسیقی کے جگت گرو تھے، اور ان کا کام ہر وقت طبلے کھڑکانا تھا ان کے حالات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے یہ تو ہنگامی کیفیت تھی جو اُسی دور میں ختم ہو گئی۔ علاء الدین کے آخری دور میں ہی یعنی ۷۱۳ھ میں حضرت امیر خسروؒ موسیقی کے لاحاصل مشاغل سے کنارہ کش ہو کر اپنے پیر و مرشد کے دستِ حق پرست پر دوبارہ بیعت ہوئے اس وقت حضرت محبوبِ الٰہیؒ

نے انہیں چار گوشہ کی ٹوپی عنایت کی جو اس سلسلے کی خاص نشانی تھی اور مریدانِ خاص میں داخل کیا۔ قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ امیر خسروؒ نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لُٹا دیا اور پابدامن ہو کر بیٹھ گئے۔ گویا امیر خسروؒ کی زندگی کا یہ تیسرا دَور تھا جس میں وہ راگ راگنیوں اور سُر تال سے کنارہ کش ہو گئے۔ اور پھر یہ کیفیت ہو گئی کہ ہر وقت مُرشد کی حضوری میں رہتے اور ان کے جمالِ بے مثال کو دیکھ کر جیتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہی تعلق تھا اور جب دُعا مانگتے تو خسروؔ کی طرف اشارہ کر کے عرض کرتے

"الٰہی! بہ سوزِ ایں ترک مرا بہ بخش!"

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ کسی زمانے میں بھی امیر خسروؔ کو درباری شاعر یا بطور نائیک کبھی تنخواہ نہیں ملی۔ ان کی درباری مصروفیات قطعاً مختلف تھیں۔ چنانچہ لیلیٰ مجنوں کے خاتمے میں نظامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُسے شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے ؎

تا خوں نہ رود ز پائے تا سر
دستم نہ شود ز آب کس تر

"بیانِ خسروؔ" کا مؤلف لکھتا ہے کہ حضرت امیر کو دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ مثنوی امیر صاحب کا اصلی مذاق نہیں سلاطین کی فرمائش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے۔

ملتان کا قیام تو ان کی زندگی کے پہلے دَور سے تعلق رکھتا ہے جبکہ آپ شہزادہ محمد بلبن کے ہم عمر مصاحب تھے۔ دربار میں سیاسی مشیر کی حیثیت رکھتے تھے اور میدانِ جنگ میں شہزادے کے پہلو بہ پہلو شمشیر افگنی کرتے تھے۔ شاعری ان کا ذاتی مشغلہ تھا۔

اور اگر کبھی دربار میں بزمِ سخن ترتیب پاتی تو اس میں خوش الحانی سے اشعار پڑھے اور گائے جاتے تھے، مگر مزامیر کے بغیر۔ جب تک چشتی حضرات ملتان میں نہیں آئے تھے اس شہر میں سماع قطعاً ممنوع تھا۔

نعمت خاں مراثی کا افسانہ باطل

منشی عبدالرحمٰن خاں کا دعوٰی ہے کہ نعمت خاں مراثی ملتان کا مشہور رقاص و موسیقار اور موجودہ اصطلاح میں فن کار تھا۔ اُسے ۱۷۱۲ء میں جہاندار شاہ نے ملتان کا گورنر مقرر کیا۔[1] ۱۳ ستمبر ۱۹۷۲ء کو عوامی جمہوریہ کوریا کے فن کاروں کو جو سپاسنامہ پیش کیا گیا اس میں نعمت خاں مراثی کے گورنر بنائے جانے کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ یہ اعزاز اور منصب نعمت خاں کو اس کے فن کی مہارت و عظمت کے پیشِ نظر دیا گیا تھا۔ لیکن افسوس اِس امر کا ہے کہ نعمت خاں مراثی نہ تو ملتان کا باشندہ تھا اور نہ اُسے اپنے فن میں مہارت حاصل تھی اور نہ ہی وہ ملتان کی گورنری حاصل کر سکا۔ یہ دعوٰی جس قدر بے سروپا، جھوٹا اور افترا ہے۔ اتنا اس کا تاریخی پس منظر دلچسپ بھی ہے، بات صرف اتنی ہے کہ لال کنور لاہور کی کسبن تھی، شہزادہ معزالدین نے اسے اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ جب اس کی تعیناتی بطور گورنر ملتان ہوئی تو لال کنور کو بھی اپنے ہمراہ لے آیا۔ اور جہاں اب ملتان سٹی سٹیشن واقع ہے یہاں ایک محل تعمیر کر کے اس کے چاروں طرف باغ لگایا۔ اور جب تک ملتان میں رہا، لال کنور کے ساتھ اسی محل میں رنگ رلیاں مناتا رہا۔ ۱۸ محرم ۱۱۲۴ھ کو اس کے والد سلطان بہادر شاہ کا انتقال ہوا تو امیر الامراء نواب ذوالفقار خاں کی مدد سے اپنے بھائیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد سلطان معزالدین جہاندار شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا اور لال کنور کو امتیاز محل کا لقب دے کر لال قلعے

[1] آئینہ ملتان، ص ۱۰۶

کی ملکہ بنا دیا۔ جب فسق و فجور کی بنیاد پوری طرح مستحکم ہو گئی۔ اور قلعے میں قوالوں، ڈوم ڈھاریوں اور کلاونتوں کے ناچ گانے اور راگ رنگ کا بازار گرم ہوا تو لال کنور نے ایک موقع پر جبکہ بادشاہ نشے میں دھت تھا، اپنے بھائی خوشحال خاں کے لئے اکبر آباد کی صوبے داری اور منصب پنج ہزاری، سہ ہزار سوار اور چچا زاد بھائی نعمت خاں کے لئے بھی منصب کا فرمان حاصل کر لیا۔ مگر جب یہ فرامین وزیر اعظم نواب ذوالفقار خاں کے پیش ہوئے تو اس نے ان خطابوں کے اسناد اور فرامین جاری نہ کئے۔ کم ظرف مراثیوں سے صبر کہاں ہوتا۔ انہوں نے وزیر اعظم سے مطلب نکالنے کے لئے تمام حربے استعمال کئے، مگر وہ فولادی انسان ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر ایک دن جب وہ قلعے میں بادشاہ سے ملنے آیا تو لال کنور نے جہاندار شاہ سے اس کی شکایت کی۔

بادشاہ نے ذوالفقار خاں سے پوچھا کہ لال کنور کے بھائی کو اب تک سند اور فرمان کیوں نہیں ملا؟

وزیر اعظم نے انتہائی بے باکی، مگر لطیف پیرائے میں گزارش کی۔

"حضور والا! ہم خانہ زاد رشوت ستاں ہیں اور بغیر رشوت لئے کسی کا کام نہیں کرتے!"

جہاندار شاہ نے مسکرا کر پوچھا کہ لال کنور سے کیا رشوت لو گے؟

وزیر اعظم نے عرض کیا۔ "ہزار طنبورے!"

بادشاہ نے سنجیدہ ہو کر پوچھا کہ طنبورے لے کر کیا کرو گے؟

وزیر اعظم نے دست بستہ عرض کی۔ "جہاں پناہ! جب قوال صوبہ داری کرنے لگیں گے، تو ہم خانہ زاد بیٹھے کیا کریں گے۔ ڈھول طنبورے ہی تو بجائیں گے!"

بادشاہ نے ہنس کر اپنا حکم منسوخ کر دیا۔

نعمت خاں تو لال کنور کا چچازاد بھائی تھا۔ مگر مدبّر وزیراعظم نے تو اس کے حقیقی بھائی خوشحال خاں کے مُنہ میں بھی خاک نہیں ڈالی۔ بلکہ جب دیکھا کہ ان کا گورنر بننے کا جنون حد سے تجاوز کر چکا ہے تو ایک دفعہ سرِ دربار طلب کر کے اُسے کوڑوں سے پٹوایا۔ اور پھر قلعہ سلیم گڈھ میں قید کر دیا۔ یہ مختصر سی گڑھی ہے جو لال قلعہ سے ملی ہوئی ہے۔ یہاں قید کرنے سے غالباً مقصد یہ تھا کہ لال کنور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اس کا بھائی کس شان سے گورنری کر رہا ہے؟

المختصر، یہ ملتان اور اہلِ ملتان پر تہمت ہے کہ اس صُوبے کی گورنری پر ایک مراثی فائز رہا۔ اور نہ ہی یہ دعویٰ صحیح ہے کہ لال کنور یا اُس کے بھڑوے بھائی ملتان کے باشندے تھے۔ خود جہاندار شاہ کا عرصۂ حکومت بھی صرف گیارہ ماہ ہے۔ ۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ کو تخت نشین ہوا۔ اور ۲۳ ذی الحج کو قتل ہوا۔

بہرحال سماع کو صُوفیائے چشت اہلِ بہشت کے ذریعے ملتان میں بار نصیب ہوا۔ چشتی وہ مغلوب الحال درویش تھے جنہیں گھوڑے کی ٹاپ پر وجد آ جاتا تھا درخت کے پتے ہلتے تو ان کے دلوں میں ہیجان پیدا ہو جاتا۔ ایک مرتبہ قاضی محمد عیسیٰ خان پوری قصبہ مُرل میں اپنے ایک مُرید کے ہاں مہمان تھے۔ باہر سے ہندو سبزی فروش نے آواز دی "سوئے پالک چوکا!" آپ نے سُنا تو جوشِ وجد میں اتنے اُچھلے کہ سر شہتیر کی میخ سے جا ٹکرایا اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ جب ذرا سکون ہوا تو اس فقرے کو زیرِ لب یوں دوہرایا:۔

"سوئے پلک چُکّا"

یعنی جو ایک لمحہ سویا، وہ قافلے سے بچھڑ گیا۔

سماع کے بارے میں مشائخ چشت ہمیشہ محتاط رہے ہیں۔ دُرالمعارف کی درج ذیل عبارت

ملاحظہ ہو:-

"در مجلس شریف حضرت نظام الدین سماع بود، بلامزامیر و بے حضور نساروامارد
بلکہ دست بر دست زدن ہم نبود۔"

یعنی حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کی مجالس میں نہ عورتوں کو گانے کی اجازت تھی نہ لڑکوں کو۔ انکے ہاں مزامیر کا استعمال جائز نہ تھا۔ یہاں تک کہ گاتے وقت قوال تالی بھی نہ بجا سکتے تھے۔ گویّے اور قوال بھی وہ ہوتے جو خود صاحب حال ہوں۔ سماع کی اباحت کا حکم صرف اس شخص کے لئے تھا جو اس کا اہل ہو۔ جیسے حضرت خواجہ جمال الدین ہانسوی (خلیفۂ اعظم حضرت باباصاحبؒ) فرماتے ہیں ؎

اصحاب نفوس را حرام است حرام
ارباب قلوب را حلال است حلال

مگر مصیبت یہ ہے کہ "اصحاب نفوس" راگ رنگ کی مجالس آراستہ کرتے ہیں اور انہیں سماع کا نام دیا جاتا ہے۔ ریڈیو پاکستان سے بھی بالعموم ایسے گانے نشر ہوتے ہیں جو انتہائی مبتذل اور فحش ہوتے ہیں۔ اب جبکہ اس مملکت کا آئین اسلامی خطوط پر بن چکا ہے۔ "طاؤس ورباب" کی ایسی بے ہنگم تقریبات پر قدغن ضروری ہے، تاکہ نئی نسل کے اذہان مفلوج نہ ہوں۔

زبان واہلِ زبان

خدا بہتر جانتا ہے کہ ملتان کی ابتدائی زبان کیا تھی۔ لیکن ماہرین لسانیات کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سرائیکی سنسکرت سے قدیم تر ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن مرحوم، سید نور علی ضامن حسینی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، سردار واحد بخش خاں (پنڈت)، ملک بشیر احمد ظامی اور دوسرے محققین کا بیان ہے کہ ہزاروں سال قبل وادیٔ سندھ پر ایک زبردست قوم حکومت کرتی تھی۔ جس کا نام اسوری تھا۔ اسی کی نسبت سے اس کی زبان اسوری کہلائی امتدادِ زمانہ سے آگے چل کر اسی زبان نے آسری، سرآوا کی، سوریا کی اور بالآخر سرائیکی نام پایا۔ جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے۔ ابتدا میں سرآوا حروف مروّج تھے۔ اس کے بعد لنڈے رسم الخط نے رواج پایا۔ در اصل یہ سرآوا کی اصلاح یافتہ صورت تھی اور جب مسلمان اس ملک میں آئے۔ اس وقت سرائیکی ایچی اور کٹھ کی اکھروں میں لکھی جاتی تھی۔ عرب جہاں کہیں گئے اپنی زبان (عربی) ساتھ لے گئے۔ اندلس پر انہوں نے آٹھ سو برس تک حکومت کی۔ ان کی سرکاری زبان عربی رہی اور پھر یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ پورے ملک نے اسے اپنا لیا۔ یہاں تک کہ جب اس ملک سے اسلامی سلطنت ختم ہوئی، پرتگیز عربی کو نہ مٹا سکے۔ یہ مزید ایک سو برس تک عیسائیوں کے گلے کا ہار بنی رہی۔ اسی طرح جب عرب سندھ کے راستے ملتان آئے تو انہوں نے عربی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ جب تک بنو عباس کا اس ملک پر تسلط رہا۔ عربی خواص و عوام میں برابر متداول رہی۔ ابن حوقل جو چوتھی صدی ہجری کے خاتمے پر ملتان آیا تھا

لکھتا ہے، کہ یہاں کے لوگ عربی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ یعنی عوام میں سرائیکی کا بدستور سکہ چلتا ہے۔ البتہ عربی کے اکثر الفاظ اس نے اپنا لیئے جیسے خمیس، قمیص، صبح، عشا، ظہر، برکت، رحمت، فضل، حج، زکواۃ وغیرہ یہ صورت حال ۱۹۴۷ء تک برابر قائم رہی۔ ہندو سرائیکی کو کرشتے اکھروں میں لکھتے تھے۔ اور بے شمار عربی الفاظ ان کی روزمرہ کی بول چال میں داخل ہو چکے تھے۔

عربی ادب

ہمارے دانشور جب عربی ادب کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو عربی شاعری کا آغاز ہارون ملتانی سے کرتے ہیں جو دوسری صدی ہجری میں گزرا ہے، حالانکہ عرب من حیث القوم وہبی شاعر تھے اور شعر گوئی کو انسانی شرف اور مجد سمجھتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں میں محمد بن قاسم کے وہ اشعار ملتے ہیں جو اس مجاہد اعظم نے اپنی شہادت کے وقت کہے تھے۔ جس قوم کا نوجوان جرنیل شاعر ہو سکتا ہے۔ اس کے سرباز مجاہدین، عاملین اور قضاۃ وغیرہ اس ذوق لطیف سے محروم کیسے رہ سکتے ہیں۔ البلاذری نے فتوحات سندھ کے ضمن میں الازدی، اعشیٰ ہمدانی، ابن مفرغ، حمزہ بن بیض الحنفی، ابو الجویرہ، جریر، اور الفرزدق کے اشعار درج کیے ہیں۔ لیکن ان کے باقی سرمایۂ حیات کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ یقیناً زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے ان کے دواوین ضائع کر دیئے۔ اور یہ قوم اپنے علمی و ادبی ورثہ سے محروم کر دی گئی۔

فارسی کی ہمہ گیری

سرائیکی عربی کے میل جول کو بمشکل چار صدیاں ہی گزری تھیں کہ غزنی سے ایک خورشید کلاہ تاجدار قشون قاہرہ کے ساتھ اس ملک میں در آیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی بھی چپکے سے اس مینو سواد خطے میں گھس آئی۔ مگر چونکہ ایرانی بادشاہت کی نشانی تھی اور عربی سے اس کا ایک مدت سے

بہتا پا چلا آتا تھا۔ اس لئے اس نے یہاں کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ کی۔ اور بہت جلد تینوں زبانیں آپس میں شیر و شکر ہو گئیں۔ چنانچہ علامہ محمد عوفی کی گراں قدر تصنیف "لب الالباب" سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں جس قدر علماء اور دانشور تھے وہ عربی اور فارسی پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ اور اپنے کلام کو عربی اور فارسی کے الفاظ سے اس طرح مزیّن کرتے تھے کہ اس کی افادیت میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ فخر الشعراء ضیاء الدین سنجری، محمد الکاتب البلخی اور علامہ فضلی، علامہ قطب الدین کاشانی، مولانا منہاج سراج اور حضرت شیخ الاسلام کے رسائل "الاوراد" اور "شروط اربعین" میں یہ اسلوب نمایاں ہے۔ حضرت شیخ الاسلام اور سلطان التارکین حمید الدین حاکم رحمہم اللہ علیہم کی باہمی خط و کتابت سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عربی اور فارسی کے غلبے کے باوجود سرائیکی ہر طبقے میں برابر مقبول تھی اور اس کی انفرادیت میں کسی قسم کا ضعف پیدا نہیں ہوا تھا۔

عربی فارسی کی مشترکہ تصانیف

حضرت شیخ الاسلام کے فضل و کمال کی کشش ایسے ایسے فخر روزگار علماء اور مشائخ کو ملتان کھینچ لائی تھی جو آسمان ادب پر مہر و ماہ بن کر چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا فخر الدین عراقی تھے جو دمشق دار العلوم کے ممتاز مدرس تھے۔ ملتان آ کر حضرت شیخ الاسلام کے مرید ہوئے۔ ان کے دیوان، کلیات، سہ بیت اور نور عرب کا بیشتر حصہ ملتان کا رہین منت ہے۔ دوسرے بزرگ سید میر حسینی تھے۔ انہوں نے نزہۃ الارواح، طرب المجالس، زاد المسافرین، اور کنز الرموز نام سے تصوف اور اخلاقیات پر کئی کتابیں مرشد کریم کی خانقاہ میں بیٹھ کر مدون کیں اور پھر اٹھارہ سوالات لکھ کر ایران کے صوفی مذاق فلسفی علامہ محمود شبستری کو ارسال کیے۔ جس کا جواب انہوں نے گلشن راز کی صورت میں دیا۔ پھر سات سو برس بعد پاکستان

کے حکیم الامت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمۃ نے ان میں سے ۹ سوالات منتخب کر کے ان کا جواب لکھا اور اسے "گلشن رازِ جدید" سے موسوم کیا۔ افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی ملتان سے طبع نہیں ہوئی۔

حضرت سید السادات جلال بخاری قدس سرہٗ نے اپنے پیر و مرشد کا تذکرہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی ملی جلی عبارت میں تحریر کیا جو صحت واقعات اور شگفتگی عبارت کے سبب ایک نادر تحفہ خیال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مختلف تذکرہ نگاروں نے اس صحیفہ صدق کے حوالے دیئے ہیں۔ مگر اصل نسخہ ابھی تک غیر مطبوعہ صورت میں ہے۔ حضرت شیخ العارف صدرالدین محمد علیہ الرحمۃ کی کنوز الفوائد اور تصریف حدو لی کا ذکر ہر تذکرے میں ملتا ہے۔ مگر اصل کتابیں نا پید ہیں۔ اسی زمانے میں علامہ فضل اللہ نے عوارف کے رنگ پر فتاوی صوفیہ مدوّن کیا اور اسے ترسیٹھ ابواب میں تقسیم کیا۔ اس دور کی اصل فقہی کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ علامہ علی بن احمد غوری حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے مرید تھے۔ انہوں نے شیخ الاسلام کے اوراد کی شرح کنز العباد کے نام سے لکھی، جو مغلوں کے آخری دور تک مدارس دینیہ میں سبقاً پڑھی جاتی رہی۔ اب اس کے صرف دو تین نسخے برصغیر پاک و ہند کی ذاتی لائبریریوں میں مل جاتے ہیں۔ اس کی طباعت کے لئے محکمہ اوقاف کو کئی بار متوجہ کیا گیا ہے۔ اگر اس کی طباعت میں جلد اہتمام نہ کیا گیا تو اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

سلطان التارکین خواجہ حمید الدین حاکم قدس سرہٗ حضرت قطب الاقطابؒ کے خلیفہ اعظم تھے۔ آپ کا دیوان اور ملفوظ مبارک سات سو برس سے آپ کی اولاد امجاد میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے مگر کسی کو طبع کرانے کا خیال نہیں آیا۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری قدس سرہٗ کا شمار حضرت قطب الاقطاب کے اکابر خلفاء میں ہوتا ہے۔ آپ

کی ایک یادگار "ملفوظ المخدوم" کئی بار طبع ہو کر اہلِ ذوق حضرات سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں دُوسرے ملفوظ غیر مطبوعہ ہیں۔ سفارت خانۂ ایران ان جواہر ریزوں کو حاصل کر کے طبع کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ حال ہی میں اس ادارہ نے خواجہ سنار اللہ خراباتی کی تصانیف پر گراں قدر کام کیا ہے۔ لیکن مخادیم بخاری کے ملفوظات تو عجیب چیزیں ہیں اور ان کی طباعت اسلام اور ملک کی بڑی خدمت ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں مگر ان کا ملتان کے قیام سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ سب ۶۸۳ھ سے بعد کی تصانیف ہیں۔ آپ کا ۱۹ برس تک کا کلام دیوان تحفۃ الصغر سے موسوم ہے۔ دُوسرا دیوان وسط الحیات ہے۔ جس میں ۲۰ برس سے ۳۴ برس کا کلام درج ہے۔ اسی کا کچھ حصہ ملتان کے قیام سے مربوط ہو سکتا ہے۔

یوں تو علائی دربار سے ملتان کے بہت سے امراء وابستہ تھے۔ جن میں مولانا محب ملتانی مولانا حمید الدین ملتانی اور مولانا شہاب الدین ملتانی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن عین الملک ملتانی ان سب میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہ نوجوان اپنے زمانے کا بہت بڑا ادیب، اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھا۔ اس نے امیر کبیر الغ بیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے جو فرامین اور مراسلات لکھے تھے وہ "ترسیلات عین الملکی" کے نام سے موسوم ہیں۔ حال ہی میں پروفیسر شیخ عبدالرشید علی گڑھ یونیورسٹی نے اس نسخہ کو "انشائے ماہرو" کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس سے اُس دَور کی تاریخ کے بہت سے پہلو بے نقاب ہوتے ہیں۔ عین الملک سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے زمانے میں دولت آباد کا گورنر رہا ہے اور گجرات کی فتح کا شرف بھی اسے حاصل ہُوا۔ افسوس ہے ملتان اپنے ایک فرزندِ جلیل کی ایسی تاریخی دستاویز سے محروم ہے جو بقولِ عفیف مدت تک مدارس میں متداول رہی۔

شرح منارہ | مولانا سماء الدین قدس سرہٗ جن دنوں ملتان میں مقیم تھے۔ انہوں نے

علمِ اصول میں "توجیہہ الکلام شرح منار" تحریر فرمائی تھی جو بڑی مقبول ہوئی۔

شرح یوسفی ایک اور بزرگ مولانا یوسف ملتانی نے قاضی ناصر الدین بیضاوی کی تصنیف لطیف "لب الالباب فی علم الاعراب" کی شرح تحریر فرمائی جو "شرح یوسفی" سے موسوم تھی اور علم نحو کے لئے سند خیال کی جاتی تھی۔

اخبار الاخیار یہ کتاب صوفیاء کے تذکروں میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے اس کے مصنف مولانا شیخ عبد الحق محدث دہلوی حضرت مخدوم سید جمال الدین موسیٰ پاک شہید قدس سرہٗ کے فاضل مرید اور خلیفۂ مجاز تھے۔ آپ نے یہ کتاب اپنے پیر طریقت کی خدمت میں رہ کر مدوّن فرمائی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم نے اس متحفہ پر نظر ثانی بھی فرمائی ہے۔ کیونکہ حضرت کا الگ تذکرہ کہیں نہیں۔ حضرت مخدوم حامد جہاں بخش علیہ الرحمۃ کے ضمن میں آپ کا ذکر ہوا ہے۔ نہایت مختصر اور نام صرف سید موسیٰ گیلانی درج ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ مرید نے شیخ طریقت کے حکم سے ایسا لکھا ہے۔ ورنہ تتمہ میں جہاں حضرت محدث دہلوی اپنی بیعت کا حال لکھتے ہیں۔ وہاں حضرت مخدوم کا ذکر اس قدر پُرشوکت انداز میں کرتے ہیں جس سے یقین ہوتا ہے کہ یہاں مصنف کا قلم آزاد ہو گیا ہے اور اس نے اپنی حسنِ ارادت کا اظہار دل کھول کر کیا ہے۔

کلیات نواب محمد سعید خاں قریشی شاہجہان کے زمانے میں ملتان کا ایک تابندہ ستارہ دہلی جا کر چمکا۔ یہ نواب محمد سعید خاں قریشی تھے۔ ان کا ذکر پہلے تفصیل سے ہو چکا ہے۔ اس نے کلیات محمد سعید خاں نام سے ایک نادر کتاب اپنی یادگار چھوڑی تھی۔ جس کا ایک آدھ نسخہ کسی کتب خانے میں مل جاتا ہے۔ مگر ملتان میں نہیں، جو اس کا وطن ہے اور جہاں یہ قادر الکلام اور بدیہہ گو شاعر ایک پُرشکوہ مقبرے میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

کلام اعجاز ایک صاحب محمد سعید اعجاز ملتانی تاریخ کے صفحات پر چھائے

ہوئے ہیں۔ ان کا دیوان اور مثنوی دیکھنے کی چیزیں ہیں۔

بحر السرائر | یہ گیلانی خاندان کا فارسی تذکرہ ہے۔ جسے مُلّا سعد اللہ قادری نے اپنے پیرانِ عظام کی خانقاہ میں بیٹھ کر قلمبند کیا۔ یہ ابھی تک طبع نہیں ہوا۔ اور گیلانی خاندان کی لائبریری میں موجود ہے۔

مثنوی مُلّا نادرؒ | مُلّا نادرؒ نواب مظفر خان کے زمانے کے بہت بڑے عالم فقیہہ، قاضی اور نائب مفتی تھے۔ انہوں نے اپنے مرشدانِ کریم کے حالات کو نہایت شگفتہ اشعار میں نظم کیا۔ آپ نے ان کے ابتدائی حالات تذکرۃ الانساب سے لئے ہیں جو مولانا عماد الدین خراسانی کی تصنیف ہے۔ یہ نسخہ نہایت بوسیدہ حالت میں جناب خواجہ زمد منیر صاحب کے پاس موجود ہے۔

گُل بہار | پیر قادر بخش قریشی کا یہ حسین گلدستہ دو حصوں میں منقسم ہے اور اس کے ۱۷۷۵ اشعار ہیں۔ پہلے حصے میں حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ہے اور دُوسرے میں مشائخ سہروردیہ کے ۱۲۱۵ھ تک کے حالات ہیں۔ غالباً اس کا ایک ہی نسخہ ہے۔ اور آج تک اسے طبع کرانے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔

تذکرۃ الملوک | یہ خُدکہ افاغنہ کی تاریخ ہے، فارسی میں ہے۔ ان کے ہی جدامجد شہزادہ علی محمد خاں خُدکہ کی تصنیف ہے۔ اصل نسخہ خان محمد عظیم صاحب خُدکہ کی لائبریری کی زینت ہے۔

توفیقیہ شریف | یہ مخطوطہ حضرت مولانا خدا بخش صاحب خیر پوری کی تصنیف ہے۔ اس میں مسئلہ وحدت الوجود پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دیوانِ حسنؒ | یہ حضرت منشی غلام حسن شہید علیہ الرحمۃ کا دیوان ہے، مطبوعہ ہے اور مل جاتا ہے۔ آپ کا تخلص فارسی میں حسنؔ اور سرائیکی میں گامنؔ تھا۔

تصانیف مولانا محمد عبید اللہ الملتانیؒ حضرت مولانا کثیر التصانیف بزرگ تھے ان کی جملہ تصانیف سوائے "سرِ دلبراں" کے غیر مطبوعہ ہیں۔ مؤخر الذکر بھی اب نایاب ہے یہ حضرت مولانا خدا بخش خیرپوری علیہ الرحمۃ کے حالات پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں فتح العبید رفیقیہ، سر السماء، اصولِ حافظیہ، وفیات الاعیان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

لطائفِ سیرانیؒ مولانا علی مردان علیہ الرحمۃ نے اس کتاب میں حضرت مخدوم صاحب السیر علیہ الرحمۃ کے حالات اور ارشادات جمع کئے ہیں۔ یہ مطبوعہ ہے اور کتب فروشوں سے مل جاتی ہے۔

تصانیف مولانا صابرؒ ۔ آئینہ وحدت، فرہنگ تحفۃ الاحرار جامی

تذکرۃ الملتان غالباً یہ فارسی زبان کی آخری تصنیف ہے۔ اسے حضرت مخدوم محمد یوسف صاحب سجادہ نشین حضرت شاہ گردیز علیہ الرحمۃ نے ملکہ وکٹوریہ کے عہدِ حکومت ۱۸۶۱ء میں مدوّن کیا۔ سیّد مراد شاہ گردیزی نے اس نسخے کی چند نقلیں شہر کے معارف میں تقسیم کی تھیں۔ اصل نسخہ سیّد عباس حسین شاہ گردیزی ایم اے کے پاس ہے۔

فارسی شعراء میں مولانا صابر، مولانا طالوت، خان محمد اسد خاں اسد ملتانی، آغا صادق، مولانا عبد المجید فریدی، فرخ دُرّانی اور سیّد اصغر علی شاہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سرائیکی اور اردو

عرب فطرتاً وسیع القلب واقع ہوئے تھے۔ اس لئے جہاں کہیں جاتے بڑی

بے تکلفی سے مقامی لوگوں میں گھل مل جاتے تھے۔ چنانچہ ملتان آئے تو بہت جلد یہاں کا تمدن قبول کر لیا۔ مقدسی لکھتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بالخصوص امراء کی وضع قطع تو ہندو راجاؤں جیسی ہے۔ ابوالیقظان علوی حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے وَ لِسَانُھُمْ ھِنْدِی یعنی ان کی زبان ہندی ہے۔ یہ سرائیکی ہی تھی جسے ابن حوقل نے سندھی اور ابوالیقظان نے ہندی کا نام دیا ہے عربی، فارسی اور سرائیکی کے اختلاط سے ایک نئی زبان جنم لے رہی تھی۔ جس نے آگے چل کر "اردو" نام پایا۔ جب امیر خسروؒ سلطان محمد بلبن کے ہمراہ ملتان آئے اُس وقت فارسی اور عربی زبانیں سرائیکی کے الفاظ کو سُرعت سے اپنے اندر جذب کر رہی تھیں چنانچہ امیر خسرو کا اپنا ایک شعر اِس اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

من کہ بر سر نہ نہادہ بودم گل
توبرہ بر سرم نہادہ گفتا چل

یعنی "اگرچہ میں نے کبھی اپنے سر پر پھول بھی نہیں رکھا تھا۔ لیکن منگولوں نے میرے سر پر توبرہ رکھ دیا۔ اور کہا چل آگے بڑھ!"

اسی طرح جعفر زٹلی کا ایک شعر ہے ؎

اگر "لوٹا" نباشد بر "اریڑی"
نہ آید آب گر صد بار "گیڑی"

یعنی "اگر مالھ پر لوٹے نہ ہوں، تو کنوئیں کو خواہ سو بار کیوں نہ چلائیں پانی نہیں آئے گا" لوٹا، اریڑی اور گیڑی تینوں سرائیکی کے الفاظ ہیں۔

زبانوں کے اس انجذابی عمل نے بہت جلد اردو کو اس قابل بنا دیا کہ عوام کے اظہارِ خیال کا ذریعہ بن سکے۔ امیر خسروؒ نے "خالق باری" کے عنوان سے ایک طویل نظم

لکھی اور اس میں فارسی اور سرائیکی کے ہم معنی الفاظ کو ایک ہی مصرعے میں اس طرح سمویا کہ صدیوں تک عوام اس سے فارسی سرائیکی لغات کا کام لیتے رہے۔

محمد تغلق نے جب دولت آباد کو دار السلطنت قرار دیا، تو حکم دیا کہ ملتان اور دہلی کے نصف باشندے اس شہر میں منتقل ہو آئیں۔ جس پر بہت سے قبائل ملتان سے دولت آباد کو ہجرت کر گئے اور اپنے ساتھ نومولود زبان اردو کو بھی لے گئے۔ جو آگے چل کر دکنی اردو سے موسوم ہوئی اور جب تیمور کے حکم سے خضر خاں ملتان سے ایک لشکر جمع کر کے دہلی لے گیا تو اس کے ذریعے اردو براہِ راست دار الخلافے کے عوام سے متعارف ہوئی۔ اور پھر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے سبب مغل سلاطین کی منظورِ نظر بنی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اردوئے معلّٰی کے نام سے لال قلعے کے بلند و پست پر چھا گئی۔ اگرچہ اردو نے ملتان میں جنم لیا تھا۔ مگر اس شہر میں اسے چنداں فروغ نہ ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی اور عوام سرائیکی بولتے تھے۔ سب سے پہلے قرآن مجید کے ترجمے اردو میں چھپنے شروع ہوئے۔ زاں بعد تاریخ اور سیر کی طرف توجہ ہوئی۔ سید علی شاہ اور مولوی فیروز پہلے اردو شاعر تھے جنہوں نے مرثیہ گوئی کی بنیاد رکھی۔ مخدوم حسن بخش قریشیؒ نے مشائخ سہروردیہ کے حالات مدوّن کیے۔ اور اس تاریخی گلدستے کو "انوارِ غوثیہ" کا نام دیا۔ مخدوم حسن بخش صاحب گردیزی کو بھی شعر و شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی کوٹھی "حسن کوشک" میں محفلِ مشاعرہ بھی منعقد کی تھی۔ جس میں ملک کے نامور شعراء نے حصّہ لیا تھا۔ ارشد گورگانی آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عزیزوں میں سے تھے۔ جنگِ آزادی میں جان بچا کر لاہور آ گئے۔ ملازمت اختیار کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ملتان میں سکونت اختیار کی اور یہیں فوت ہوئے۔ قبر حسن پروانہ قبرستان میں ہے۔

اردو شعراء میں طالب ملتانی، مولانا صابر، میر عظیم الدین بسمل، بال کشن بترہ، پنڈت

جیون لعل شوق، ناطق ملتانی، غنچہ امروہوی۔ ہیم راج ذار، جے چند پریم ملتانی، بھیم سین ظفر ادیب، اسد ملتانی، مولانا طالوت، ممتاز ملتانی، صوفی آذر، کشفی ملتانی، وحشت اور غلام موسٰی جم خاص مقام رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر صاحب دیوان تھے۔ ان کے زمانے میں ملتانی اردو نے لاہور اور دہلی کا لب و لہجہ اور رنگ ڈھنگ اپنا لیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے انتقالِ آبادی میں ہندو شعراء بھارت چلے گئے۔ اور ان کی جگہ جن شعراء نے ملتان کو اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا۔ ان کی علمی قابلیت اور فنی صلاحیت کا پایہ جاننے والوں سے پوشیدہ نہ تھا اور فیع و اعلیٰ تھا جو نہی مہاجرت کے زخم مندمل ہوئے انہوں نے اردو زبان کو فروغ دینے کے لئے دلی لگن سے کام کرنا شروع کیا اور تھوڑے سے عرصے میں مقامی دانشوروں کے اتحاد و اشتراک سے کئی مفید علمی و ادبی ادارے منظرِ عام پر آ گئے۔ ملتان اکادمی کے روحِ رواں آغا شیر احمد خاموش تھے ۱۹۷۰ء میں جب انہوں نے ضعیفی کے باعث اس سے تعلق ختم کیا۔ تو یہ بحرِ سکوت میں کھو گئی۔ رائٹرز گلڈ کے لئے مرحوم حاجی حمید الدین کاکوروی نے عدیم المثال قربانی کا ثبوت دیا۔ گلڈ کے نام پر گلڈ ہوٹل، گلڈ ہاؤس، گلڈ لائبریری اور رائٹرز کالونی قائم کیں، منشی عبد الرحمٰن خاں کی جدوجہد سے گلڈ نے خاصا مقام حاصل کر لیا تھا۔ مگر اب جبکہ حاجی صاحب فوت ہو چکے ہیں اور منشی صاحب نے بھی تعاون کا ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ گلڈ جسدِ بے روح بن کر رہ گئی ہے۔ بایں ہمہ ملتان انجمنوں اور سوسائٹیوں کا شہر ہے، شہر کے ہر دروازے اور ہر موڑ پر کسی نہ کسی انجمن یا اکیڈمی کا بورڈ ضرور نظر آ جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) اردو اکادمی (۲) سرائیکی اکادمی (۳) پنجابی اکادمی (۴) ادارہ فکر و فن (۵) بزمِ فرید (۶) مجلس فکر و نظر (۷) مجلسِ اقبال (۸) حریم فن (۹) گوشہ ادب (۱۰) بزمِ اقبال (۱۱) بزمِ داغ (۱۲) بزمِ طلوعِ ادب (۱۳) بزمِ ترقی ادب (۱۴) بزمِ احباب (۱۵) بزمِ سیماب (۱۶) بزمِ حسان (۱۷) بزمِ عیش (۱۸) بزمِ ثقافت (۱۹) مجلس وارث شاہ (۲۰) پنجابی ادبی سنگت، اور (۲۱) سرائیکی ادبی سنگت وغیرہ

اہلِ قلم :- (۱)، شیخ اکرام الحق انصاری (۲)، منشی عبدالرحمٰن خاں (۳)، ڈاکٹر مہر عبدالحق (۴)، عتیق فکری (۵)، ساغر صدیقی (۶)، خواجہ عبدالکریم قاصف (۷)، ڈاکٹر مقصود زاہدی، (۸)، محمد طاہر خاں غنی (۹)، مسعود اشعر (۱۰)، گلچیں کرنالی (۱۱)، شبیر حسن اختر (۱۲)، ابن حنیف۔

شعرائے کرام :- آغا شیر احمد خاموش، آغا صادق حسین، عزیز حاصل پوری، فرخ درانی صادق مصوّر، کیفی جامپوری، مولانا عبدالمجید ناز فریدی، پیرزادہ کشفی الاسدی، ارشد ملتانی عاصی کرنالی، اسلم انصاری، پروانہ جالندھری، مذاق العیشی، ہلال جعفری، حیدر گردیزی شمیم شمسی، سحر رومانی، اقبال ارشد، خادم ملک، سید اصغر علی شاہ، طارق، جامی وغیرہ

اردو مطبوعات

اردو مطبوعات کا گوشوارہ مرتب کرنا میرے لئے بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ بیماری نے بندہ کو خانہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے جن کتابوں کے نام یاد ہیں وہ عرض خدمت ہیں :-

مذہبی کتب :- مطبوعات منشی عبدالرحمٰن خاں۔ خیر الکلام فی مسائل الصیام

تاریخ وسیر :- تاریخ ملتان از لالہ حکم چند۔ مرقع ملتان از سید اولاد علی گیلانی، تاریخ ملتان از خاکسار عفاعنہ۔ ارضِ ملتان از شیخ اکرام الحق مرحوم۔ آئینہ ملتان، از منشی عبدالرحمٰن خاں۔ بلوچ قوم اور اس کی تاریخ۔ بلوچ قبائل۔ آئینہ بلوچ ــــ تذکرہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ، تذکرہ شیخ الاسلام صدر الدین عارفؒ، تذکرہ قطب الاقطاب حضرت شاہ رکن عالمؒ۔ غوث الاعظمؒ۔ جام دُرک۔ جمالِ یوسف ملفوظِ المخدوم۔ سفرنامہ مخدوم صاحب سفرنامہ عراق از سید قاسم علی شاہ گردیزی۔ زائر کعبہ کے مشاہدات۔ دیارِ حبیبؐ کی ایک جھلک

اسلامی افسانے :- انسانیت حیوانیت کی راہ پر۔ اندازِ سخن۔ بازارِ رشوت۔ راہِ عمل۔ مشعلِ راہ۔

منظومات :- رُوحِ اسلام۔ گلِ صد برگ۔ نُورِ صبح صادق۔ کیف و کرب۔ زنگِ سنگ جوہر عرفان۔ نکاتِ حیات وغیرہ

در خورِ اعتنا سمجھتا ہے اور نہ صوبہ خاطر میں لاتا ہے۔

سرائیکی ادب

نواب علی محمد خاں خوگانی کے بعد جب ملتان کی نظامت پر سدوزئی پٹھان فائز ہوئے تو سرائیکی نے قلعے میں قدم رکھا۔ پٹھانوں کو اس ملک میں آئے ڈیڑھ صدی کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اور وہ سرائیکی میں بے تکلفی سے بول لیتے تھے۔ نواب مظفر خاں اور ان کے اعزہ و اقارب تو اس کے والہ و شیدا تھے۔ جب مقامی دانشوروں اور ادیبوں نے حکمران طبقے کو اس پر مہربان پایا تو انہوں نے بھی اسی زبان میں سی حرفیاں، ڈوہڑے، کافیاں اور قصّے قصائد لکھنے شروع کئے۔ اس زمانے میں جامع مسجد نواب علی محمد خاں کے متولّی اور خطیب مولوی نور محمد بڑے فاضل انسان تھے۔ اُنہوں نے سرائیکی میں نور نامہ تصنیف کیا۔ اُن کے دو قابل شاگردوں میں سے سیّد علی حیدر نے سی حرفیاں لکھیں مولوی لُطف علی نے سیف الملوک کا قصّہ نظم کیا۔ نواب بہاول پور کے محلات کی زبان سرائیکی تھی۔ جھنگ کا احمد خاں سیال بھی سرائیکی بولتا تھا۔ مظفر گڑھ، ڈیرہ غازیخاں کے تمندار و روسار سب کی مادری زبان سرائیکی تھی۔ ہر جگہ لسانی عصبیت جاگ اُٹھی۔ شعراء نے اپنے اپنے امراء کے ذوق و وجدان کے مطابق مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی شروع کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پنجند کی پوری وادی میں سرائیکی نغمے گونجنے لگے اور درج ذیل قصّے منظوم ہو کر خواص و عوام کی زبان پر آ گئے۔

سیف الملوک، لیلیٰ مجنوں، مرزا صاحباں، گاذر نامہ، یوسف زلیخا، سسّی پنّوں
باغ و بہار، ہیر رانجھا دیہ قصہ چراغ اعوان، اکبر شاہ، میرن شاہ، سوہے خاں
اور مولوی نور الدین مسکین نے اپنے اپنے اسلوب اور انداز میں لکھا ہے)

اصنافِ سخن میں سے سی حرفی، بارہ ماہہ، ہفت روزہ، ہشت پاس، مثنوی، کافی اور مراثی میں اکثر رسائل طبع ہوئے۔ حافظ محمد جمال اللہ علیہ الرحمۃ سے صرف ایک سی حرفی منسوب ہے۔ مولانا

محمد عبید اللہ اور منشی غلام حسن رحمہما اللہ) نے بھی سرائیکی کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، ان کے کلام کا نمونہ اُن کے حالات میں دیا جا چکا ہے۔

سندھ میں بھی سرائیکی کا خاصا چرچا رہا ہے، حمل خاں لغاری، سچل سرمست اور نواب ولی محمد خاں لغاری سرائیکی اور سندھی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

سرائیکی اور خواجہ فریدؒ

یوں تو اس ملک میں ہزاروں فرید گزرے ہیں۔ مگر زیادہ مشہور تین بزرگ ہیں۔ ایک فریدؒ اوّل ہیں جن کا پورا نام شیخ الاسلام حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمتہ ہے دُوسرے حضرت ابراہیم فریدؒ ہیں جو گیارھویں پشت میں حضرت فرید اوّل کی اولاد ہونے کا شرف رکھتے ہیں، تیسرے وادیٔ پنجند کے مشہور عارف، ولیٔ کامل اور سرائیکی کے ملک الشعراء حضرت خواجہ غلام فرید چشتی نظامی علیہ الرحمۃ ہیں، جن کے الہامی کلام نے اپنے بے پناہ سوز و گداز کی بدولت دلوں کی کائنات میں تہلکہ برپا کر دیا۔ اور ہمیں دیوانِ فریدؒ کی صُورت میں ایسا گراں بہا تحفہ عنایت کیا، جس سے سرائیکی زبان کو چار چاند لگ گئے۔

سرائیکی زبان کا تاریخی پس منظر بیان کرتے وقت اکثر تذکرہ نگاروں سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ انہوں نے فریدِ ثانی اور فریدِ ثالث رحمہم اللہ کے حالات اور واقعات کو فریدِ اوّل سے منسُوب کر دیا۔ بعد میں جن لوگوں نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، بلا تحقیق ان غلط روایات کو نقل کرتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر درج ذیل قصّے ہی کو لے لیجیے:۔

کیفی مرحوم لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم بہاء الحق والدینؒ زکریا ملتانی ہر سال حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں تحفۃً گاجریں بھجوایا کرتے تھے، اور حضرت گنج شکر بھی مخدوم کی خدمت میں موسم بہار کے بیر ارسال کرتے تھے۔ کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک سال

شبیہ مبارک

قطب العارفین سراج السالکین

حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمتہ چشتی نظامی

چاچڑاں شریف

مخدوم نے گاجریں نہ بھیجیں، چنانچہ گنج شکرؒ نے بھی بیر ارسال نہ کئے۔ موسم بہار گزرنے پر حضرت مخدومؒ نے شکایت لکھ بھیجی۔ جواب میں حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا ؎

ہتھڑیں وٹوں ہتھڑے، پیریں وٹوں پیر
تُساں نہ مُقیاں گاجراں اساں نہ مُقے بیر

سوچنے کی بات ہے کہ اس زمانے میں جبکہ راستے محفوظ نہ تھے اور سفر قافلوں کی شکل میں طے کیا جاتا تھا۔ اُونٹوں، خچروں اور گھوڑوں کے ذریعے ایک منزل طے کی جاتی تھی جو بارہ کوس کی ہوتی تھی۔ ملتان سے اجودھن کا راستہ دُنیا پور، دوکوٹہ اور دیوان چاولی مشائخ سے ہو کر گزرتا تھا۔ کیونکہ ملتان سے دیوان چاولی تک لق ودق صحرا تھا۔ جسے اب بھی چیٹ ڈائی سے موسوم کرتے ہیں۔ اجودھن جانے میں پندرہ دن لگ جاتے تھے۔ آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ اتنے دنوں بعد گاجریں یا بیر قابلِ استعمال رہ جاتے ہوں گے۔ اور پھر کسی زمانے میں بھی نہ ملتان کی گاجروں کی شہرت سُنی ہے اور نہ پاکپتن میں بیریوں کے درخت نظر آتے ہیں بالخصوص حضرت بابا صاحب کے زمانے میں تو شہر کے گرد و پیش جنگل ہی جنگل تھا۔ خانقاہ کے درویش کریہہ کے ڈیلے چُن لاتے تھے اور اُنہیں اُبال کر کھاتے تھے۔

کیفی مرحوم کو فریدؒ کے لفظ سے مغالطہ ہوا ہے ورنہ یہ واقعہ تو حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ اور حضرت غلام میراں محی الدین قدس سرہٗ سجادہ نشین رانی پور (سندھ) سے متعلق ہے۔

چاچڑاں شریف کے مشہور سرائیکی شاعر اور حضرت نازک کریم علیہ الرحمۃ کے مرید صوفی احمد جان صادق فریدی کا بیان ہے کہ میں نے یہ واقعہ پیر سیّد صالح محمد شاہ صاحب سجادہ نشین رانی پور سے سُنا تھا جبکہ میں تو دس سال کا تھا۔ اور ان کے مدرسہ میں "سکندر" پڑھتا تھا۔ سیّد صالح محمدؒ شاہ صاحب نے فرمایا کہ :-

ایک دفعہ میرے والد ماجد قبلہ غلام میراں شاہ سائیں علیہ الرحمۃ نے اپنے مُرید خاص

سید احمد شاہ کے ذریعے حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ

"میاں فریدن سائیں! تساڈے شہر دیاں گاجراں مٹھیاں ہن۔ اساں دوں ڈے سو کلو!"[1]

جب یہ عنایت نامہ حضرت خواجہؒ کو موصول ہوا تو آپ نے بھی ایک خط لکھا جس کی عبارت یہ تھی:-

"میڈے دل دا محرم راز، غوث زماں سائیں میراں محی الدین سائیں! سلامت ہوویں تساڈے شہر اتے باغ دے بیر مٹھے اتے مشہور ہن۔ اساں دوں بھجوا کرائیں مہربانی فرماؤ!"[2]

یہی خط پھر حضرت سید غلام میراں سائیں کے دربار میں پیش ہوا تو حضورؒ نے پڑھ کر بیساختہ فرمایا

ہتھیں ستوں ہتھ فریدا بیریں ستوں بیر
تیں نہ موکلیاں گاجراں ایں نہ موکلئے بیر

جب حضرت خواجہ صاحبؒ کو یہ شعر سنایا گیا تو آپ کی طبع مبارک میں جذبہ پیدا ہو گیا۔ تالی بجاتے تھے اور یہ شعر پڑھتے تھے۔ اتنے میں میاں برکت قوال آلات سرود لے کر آ گیا اور اس بیت کا سماع شروع ہو گیا۔ حضرت خواجہؒ کو بڑا وجد اور گریہ ہوا۔ اور ساتھ ہی مجلس میں جو ارباب صدق و صفا تشریف رکھتے تھے وہ بھی خاصے متأثر ہوئے۔ اور بعض جو دانائے راز تھے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

تو کیا یہ گاجروں اور بیروں کا قصہ تھا؟ جس نے پورے مجمع کے دلوں کو تڑپا دیا؟ صوفی

---

[1] میاں فریدن صاحب! آپ کے شہر کی گاجریں میٹھی ہیں، ہماری طرف بھجوا دیں!

[2] میرے دل کے محرم راز، غوث زماں ساگی ——— میراں محی الدین سائیں، عمر دراز ہو۔ آپ کے شہر اور باغ کے بیر میٹھے اور مشہور ہیں، ہماری جانب بھجوا کر لطف و کرم فرمائیں!

[3] اے فرید! تجھ میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ تُو نے گاجریں نہیں بھیجیں ہم نے بیر ارسال نہیں کئے!

احمد جان لکھتے ہیں کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ گاجریں اور بیروں کے پردے میں چاچڑاں اور رانی پور کے دونوں اقطاب نے معرفت کے کچھ ایسے اشارے کیے تھے جس کی وجہ سے دونوں شہروں کے فاصلے کم ہوگئے تھے۔ اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کو گلے لگا کر اس طرح ملے کہ "من تو شدم تو من شدی" کا مصداق بن گئے۔ خواجہ صاحب کے بعد اُن کے فرزند ارجمند خواجہ محمد بخش صاحبؒ نازکؔ، سیّد ولایت شاہ بخاریؒ، خواجہ عاقل محمد صاحب جوگی عمر خاں شاہدؔ گوپانگ، احمد یار، طالبؔ ملتانی، میاں چندنؔ ملتانی، خواجہ نُور احمد احمدؔ مولانا محمد یار بیدلؔ، مولوی گل محمد صاحب چشتی، مولانا تاج محمود صاحب تاجؔ، جان محمد گدازؔ محمد بخش نوروزؔ، قاضی امام بخش امامؔ، منشی نبی بخش مضطرؔ، اللہ بخش خادمؔ، مولانا عبدالرشید طالوُتؔ، خرمؔ بہاولپوری، محمد یار فوقؔ، خوشدلؔ، نُورن گداؔئی، میاں درویشؔ، میاں مسکینؔ، اسدؔ ملتانی، برخور گوپانگ، آصفؔ بیلوی، حیدر بخش مونسؔ، زخمیؔ خیرپوری غلام حیدر خاں یتیمؔ، محمد بخش بخشؔ، اخترؔ وحید انصاری اور محمد نواز خاں نوشترؔ وغیرہ کا شمار سرائیکی کے محسنین میں ہوتا ہے۔ ان سب نے مادری زبان کو نکھارنے میں بیش از بیش حصہ لیا ہے۔ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح خوانوں میں سکندرؔ ملتانی، سید علی شاہ، مولوی غلام سکندر، مولوی فیروزؔ، مولوی قدرؔ، مولوی غلام حیدر فداؔ، مولوی گل محمد عاشقؔ ملتانی، مولوی محمد رمضان بہارؔ، سیّد شبیر شاہ شمسیؔ اور شوقؔ شجاع آبادی خاص مقام رکھتے ہیں۔

"دیوانِ فریدی"

"دیوانِ فریدی" خواجہ صاحب کے عارفانہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے جذبات اور کیفیات کی ترجمانی فرمائی ہے۔ آپ کا کلام آورد نہیں بلکہ "آمد" اور "وارداتی" ہے۔ جو لوگ حضرت کے کلام کو صرف مجاز سمجھتے ہیں، وہ دراصل حضرتؒ کے

کلام کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ خواص، جنہوں نے خواجہ صاحب کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کے نزدیک تو یہ "ہست قرآن در زبان سرائیکی" کا مصداق ہے۔ اور جن کی نظروں صرف مجاز تک ادراک کر سکتی ہیں وہ بھی اس کا پایہ عام شاعری سے ارفع اور اعلیٰ جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں جناب احمد ندیم قاسمی کی رائے قابلِ ملاحظہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

"پورے پنجاب میں جس شاعر کی کافیاں نہایت عقیدت، محبت اور شوق سے گائی جاتی ہیں وہ خواجہ فریدؒ ہیں۔ آپ ایک خدا رسیدہ راہنما اور مرشد تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ آپ کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ شعری کے ان خزانوں سے بھی فیض یاب کیا تھا جو ابتدائے آفرینش سے اب تک بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آئے ہیں۔ آپ کی کافیاں ملتانی یا بہاولپوری میں ہیں۔ ٹھیٹھ پنجابی سے یہ زبان قطعاً الگ ہے۔ مگر اس کی مٹھاس، نرمی اور حلاوت پڑھنے اور سننے والوں کو بہت جلد اس کے قریب تر کر دیتی ہے۔ خواجہ فریدؒ کی کافیوں کو غیر فانی شاعری کی صفِ اوّل میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ فریدؒ کا کلام وارث شاہؒ کی "ہیر" سے زیادہ ہر دلعزیز ہے سجادہ نشینوں کے ہاں قوالی کی صورت میں بھی گایا جاتا ہے۔ اور مزدوروں اور کسانوں کے ہاں لوک گیت کی حیثیت میں! سوز و گداز اور نغمہ و نور سے چھلکتی ان کافیوں کا انتخاب بہت دشوار ہے۔ کیونکہ ہر کافی پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ع کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں جا است!"

"شعر فرید تیڈا اوبخ ہلیا"

قاسمی صاحب تو خیر سے اس زبان پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ نیز کافی عرصہ بحیثیت ملازم
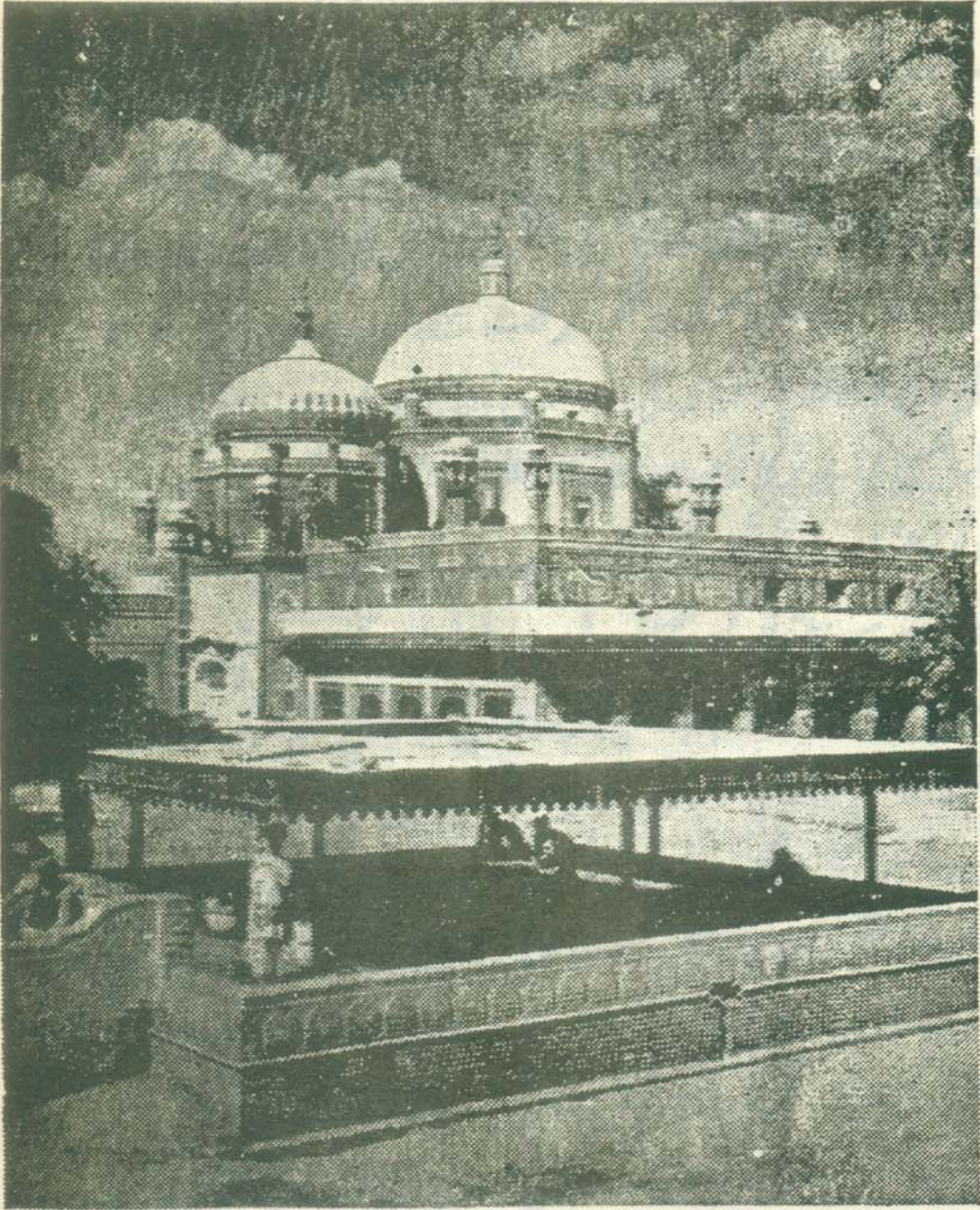
مقبرہ عالیہ حضرت غلام فرید چشتی نظامی رحمتہ اللہ علیہ
کوٹ مٹھن شریف

آپ ملتان میں بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ بھی اس زبان کے سوز و گداز، نیز شیرینی و حلاوت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔ جبکہ آزادیٔ ہند کی تحریک آخری دَور میں داخل ہو چکی تھی اور انگریز بوکھلا کر ہندوستانی لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونس رہا تھا۔ ہفت روزہ "ریاست" دہلی کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتون بھی اپنی قابلِ اعتراض تحریروں کے جرم میں منٹگمری جیل میں قید کاٹ رہے تھے۔ ایک زمیندار نے کہیں سے گراموفون منگوا کر گانے سننے شروع کئے۔ جب خواجہ صاحبؒ کی کافی کا آغاز ہوا تو اس کی درد بھری آواز نے بے اختیار مفتون صاحب کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ بڑی توجہ سے سنتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ جب کافی ختم ہوئی، تو زمیندار سے پوچھا یہ کس کا کلام ہے۔ اس کے سننے سے بے اختیار دل پر آری سی چلنے لگتی ہے۔ زمیندار نے بتایا کہ یہ نواب بہاول پور کے پیرِ طریقت حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ کا کلام ہے۔ پھر اُس نے کافی کا اردو میں ترجمہ کرکے سنایا۔ جس سے مفتون صاحب نے کہا کہ بھائی یہ تو ایسے لگتا ہے جیسے خیام کا کلام ہو۔ اس کے بعد مفتون صاحب گاہے گاہے زمیندار مذکور کو خواجہ صاحب کی کافی سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ اور جب جیل سے رہا ہو کر دہلی پہنچے تو انہوں نے نواب بہاولپور کو خط لکھا کہ میں نے آپ کے پیر و مرشد کا کلام سنا ہے جو بے حد اثر انگیز ہے اس کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔ اگر آپ توجہ فرمائیں تو بہتر ورنہ مجھے اجازت دیں تاکہ میں اس کا ترجمہ کرا کر چھپوا دوں۔ نواب صاحب نے خط پڑھتے ہی دبیر الملک مولانا عزیز الرحمٰن کو بلایا اور یہ کام ان کے ذمہ لگایا۔

سرائیکی حروف تہجی

مولانا صاحب نے سرائیکی کے حروف تہجی متعین کرنے کے لئے ایک چھوٹی کمیٹی

بنائی۔ جس میں درج ذیل حضرات شامل تھے:۔
(۱) مولانا عبدالرشید طالوت (۲) جناب خرّم بہاولپوری (۳) پروفیسر دلشاد کلانچوی (۴) واحد بخش خاں پنڈت (۵) دبیر الملک مولانا عزیز الرحمٰن (۶) یہ نیاز مند نور احمد خاں فریدی)

کمیٹی نے بڑے غور و فکر کے بعد طے کیا کہ اردو حروف تہجی کو قائم رکھتے ہوئے اس پر ان پانچ حروف کا اضافہ کیا جائے۔

ٻ، ڄ، ݙ، ڳ، ݨ

اس کے بعد ہمیں پچاس پچاس کافیاں ترجمہ کرنے کے لئے دی گئیں۔ مترجمین میں مولانا صوفی عبدالمجید تاز فریدی صاحب بھی شامل تھے۔ مولانا نے ان تمام تراجم کو سامنے رکھ کر اپنے خاص اسلوب میں دیوان شریف کا ترجمہ کیا۔ ملتان کے مشہور خوشنویس میاں شیر محمد صاحب اس کی کتابت پر مقرر ہوئے۔ مولانا طالوت مرحوم نے سو صفحات کا مقدمہ لکھا۔ اور گیارہ سو صفحات کا یہ دبیز اور ضخیم تحفہ ایک سال کے عرصے میں چھپ کر تیار ہو گیا۔ نواب صاحب کے حکم سے دیوان شریف کے یہ قیمتی نسخے خواجہ صاحب کے ارادت مندوں میں مفت تقسیم کئے گئے۔ جس سے سرائیکی حلقوں میں ایک دفعہ پھر زندگی کی حرارت پیدا ہو گئی۔ نواب صاحب کو اس طرف متوجہ پایا تو مولانا عزیز الرحمٰن مرحوم نے اپنے اردو ماہنامے "العزیز" کو سرائیکی کے لئے وقف کر دیا اور مستقل طور پر اس میں سرائیکی مضامین اور مقالات شائع کرانے شروع کئے۔ مولانا نے قرآن مجید کا سرائیکی ترجمہ سرائیکی محاورے اور چند ایک منظوم و منثور قصے بھی مدوّن فرمائے۔ جن میں سے اکثر ان کی زندگی میں طبع ہو گئے۔ لیکن کافی علمی نسخے ابھی تک سیٹھ محمد عبیدالرحمٰن صاحب کے ذاتی کتب خانے میں پڑے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

ملک بشیر احمد صاحب ظامی

مولانا عزیز الرحمن مرحوم کے بعد دوسرے بزرگوار جنہوں نے سرائیکی پر اپنا تن من دھن قربان کیا۔ وہ ملک بشیر احمد ظامی ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ نعمت ان کی دستگیری کرتا تو یہ سرائیکی پر اتنا مواد طبع کرا لیتے کہ دنیا دنگ رہ جاتی۔ بایں ہمہ ظامی صاحب نے اتنا قابلِ قدر کام کیا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کی تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے:۔

بہاولپوری ملتانی زبان و ادب۔ سرائیکی زبان دا قاعدہ۔ لغات سرائیکی۔ اردو ترجمہ مثنوی سیف الملوک۔ چھڑکے۔ نخلستان قواعد سرائیکی زبان دا ارتقاء پھلاں دے ہار۔

ملتان کی سرائیکی دار الاشاعت

اب تک ملتان میں سرائیکی دانشور اپنے رسائل اور مضامین اپنے ذاتی مصارف سے طبع کراتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن اس زبان کے محسنین پر ایک ایسا دور بھی آیا کہ سرائیکی مصنفین اور شعرائے کرام سالہا سال کی جگر کاری کے بعد جب کوئی شاہکار طبع کرانا چاہتے تو ان کی تہی دامنی سنگِ راہ بن جاتی اور خداوندانِ نعمت اس جانب توجہ ہی نہ کرتے۔ ایک مدت کے بعد ایک درویش نے قلندرانہ جرأت سے کام لے کر صلائے عام دی۔ کہ "اے یارانِ سرائیکی! اگر امراء اور رؤساء تمہیں سہارا نہیں دیتے تو نہ سہی۔ آؤ! میں تمہیں سینے سے لگانے کو تیار ہوں!"

یہ صدا اگرچہ نحیف و نزار حلق سے نکلی تھی، مگر خلوص کی بے پناہ قوت نے اسے کوہ سلیمان کی خشک بوس چوٹیوں سے ٹکرا دیا۔ یہ ناشر، یہ شاعر، یہ ادیب اور ناقد جناب مولانا محمد خیر الدین صابر تھے۔ مولانا موصوف نے بوہڑ دروازہ کے اندر اپنے نام پر ایک کتب خانہ قائم کیا اور پھر جو سرائیکی شعراء اپنا کلام طبع کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان سے

مسودات منگوا کر طبع کرانے لگے اس طرح بہت سے شعراء کے مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آ گئے۔ جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ملتان میں طباعت کا تسلی بخش انتظام نہ ہونے کے سبب مولانا نے کئی کتابیں لاہور اور کئی دہلی اور آگرہ سے طبع کرائیں، تو ان کی ہمتِ مردانہ پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مولانا کی اس فیاضانہ پیشکش سے جن مصنفین نے فائدہ اٹھایا ان میں طبیب شکوہی، خواجہ عاقل محمد شائق، محمد بخش نوروز، قاضی امام بخش کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ سوء اتفاق سے ان ایام میں یکے بعد دیگرے مولانا کے دو صاحبزادے فوت ہو گئے۔ جس سے ان کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی۔ نشر و اشاعت کا کام تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ اور مولانا دل شکستہ ہو کر حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کی خانقاہ مبارک میں جا بیٹھے۔ اور یہ تعلق لمحاتِ آخر تک قائم رہا۔ حتیٰ کہ صدائے ارجعی کو لبیک کہہ کر وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

یادگارِ صابر | مولانا اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے۔ اور انہیں مرزا داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ آپ نے فارسی، اردو اور سرائیکی میں بہت کچھ کہا تھا۔ لیکن روحانی صدمات کے سبب آپ اسے طبع نہ کرا سکے۔ مولانا کے چھوٹے صاحبزادے جناب محمد منیر الدین نے جب یہ دیکھا کہ زمانے کا بے رحم ہاتھ ان کے والد ماجد کی زندگی بھر کے علمی اثاثے کی طرف بڑھ رہا ہے تو انہوں نے فوراً اس شعری مجموعے کو "یادگارِ صابر" کے نام سے طبع کرا دیا۔ یہ اسی نوجوان کی سعئ مشکور کا ہی نتیجہ ہے کہ آج مولانا صابرؒ کا تمام کلام ہمارے سامنے ہے جو صرف ادبی اور شعری سرمایہ ہی نہیں، بلکہ اس کے قصائد اور تاریخی مادے، آج سے پچاس ساٹھ سال قبل کے بعض تاریخی گوشوں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق ایم اے | آپ نے ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق پر مقالہ لکھ کر وہ غیر فانی کارنامہ انجام دیا ہے جس کے طفیل آپ کو زمانہ

صدیوں تک یاد رکھے گا!

محمد علی کیفی مرحوم کیفی مرحوم نے "آبِ حیات" کے انداز میں سرائیکی شعرا کا تذکرہ کر کے ان لوگوں کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے جو اس زبان کو پنجابی کی شاخ کہتے ہوئے جھجکتے نہ تھے۔ جوں جوں نئی کتابیں منظرِ عام پر آتی جا رہی ہیں سرائیکی کے گنج ہائے گراں مایہ کی چمک دمک سے اغیار کی نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور انصاف پسند حلقے اعترافِ عظمت پر مجبور ہو گئے ہیں۔

سرائیکی ادبی مجلس بہاولپور اس مجلس کو وجود میں آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے پہلے اس نے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا۔ پھر مختلف مصنفین کی کتابوں کو طبع کرانا شروع کیا، چنانچہ اب تک کافی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر سرائیکی دانشوروں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ گورنمنٹ اسے معقول گرانٹ دیتی ہے اور بریگیڈیر سید نذیر علی شاہ اور عزیز نشتر غوری صاحب اس مجلس کے لئے روحِ رواں ہیں۔

بزمِ ثقافت و دیگر سرائیکی انجمنیں بزمِ ثقافت نے سردار عبدالجبار خاں اور ریاض انور صاحب کے اشتراکِ عمل سے خواجہ صاحب کی یادگاری تقریبات منائیں سرائیکی اکیڈیمی ملتان نے جس کے جنرل سیکرٹری خان رضوانی اور سیکرٹری شعبۂ نشر و اشاعت اختر علی خاں بلوچ تھے، ہفت روزہ "اختر" کا ماہواری ایڈیشن سرائیکی میں نکالنا شروع کیا۔ ساتھ ہی جانباز اور سرور کربلائی جیسے کئی نمبر بھی نکالے۔ ازاں بعد غلام حیدر خاں یتیم کا شعری مجموعہ شائع کیا، اس اکیڈیمی نے حال ہی میں "وسدیاں جھوکاں" نام کی ایک دیدہ زیب کتاب عوام کو عنایت کی ہے۔ جس میں سرائیکی دانشوروں کے قیمتی مضامین اور منظوم کلام درج ہے۔ پچھلے دنوں جناب غلام حسن خاں حیدرانی نے تونسہ شریف کے حسن و عشق کے سچے قصے کو "سمی" کی شکل میں پیش کر کے سخن شناس حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

حال ہی میں بھٹہ واہن (ضلع رحیم یار خاں) کی ممتاز اکیڈیمی نے "وہندے نیر" کے نام سے ایک شعری مجموعہ پیش کیا ہے۔ اس طرح اس اکیڈیمی کے جواں سال صدر جناب ممتاز علی خاں حیدرؔ نے دوسرے سرائیکی دانشوروں کو احساس دلایا ہے کہ وہ بھی اپنی مادری زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے اس طرح کی کوششیں کریں۔ اس سلسلہ میں خان پور کی بزم یارانِ سرائیکی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو اب تک نظم و نثر اور افسانوں کے کئی معیاری مقابلے کرا چکی ہے۔ یہ انتہائی ناسپاسی ہو گی اگر اس موقع پر ہم ضلع رحیم یار خاں کی واحد علمی و ادبی شخصیت مخدوم نور محمد ہاشمی ایم این اے کا ذکر نہ کریں جن کا دستِ سخا دانشوروں اور ادیبوں کی اعانت کے لئے ہر وقت کشادہ رہتا ہے جزاہ اللہ خیر الجزاء

عصرِ جدید کے سرائیکی شعراء

عصرِ حاضر میں سرائیکی شعراء کی کمی نہیں۔ وادیٔ پنجند کے ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں سرائیکی انجمنیں قائم ہیں اور باقاعدہ مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ تمام اکیڈیمیوں اور انجمنوں کا الگ الگ تذکرہ مشکل ہے۔ البتہ جن شعراء کے اسمائے گرامی ہم تک پہنچے ہیں، ان کی فہرست پیش کی جا رہی ہے۔ مگر یہ تمیز مشکل ہے کہ ان میں پختہ کار کون ہے اور خام کون؟ اُستاد کون ہے اور شاگرد کون؟ اگر کسی بزرگوار کا نام مقدم و مؤخر ہو جائے تو اسے ہماری لاعلمی پر محمول کیا جائے، ورنہ ہمارے نزدیک تمام شعراء یکساں لائقِ احترام ہیں۔ ان میں کئی ایسے ہیں جنہوں نے سرائیکی زبان کو وسعت دینے کے لئے نئے نئے خیالات اور تشبیہات سے نوجوان طبقے کو روشناس کرایا ہے۔ اور

اپنے جانشینوں کو نئے نئے راستے دکھائے ہیں۔ ان میں نوجوان شعراء کا وہ طبقہ بھی شامل ہے، جنہوں نے زبان کو اپنے عہد کے احساس کے ساتھ نیا مزاج دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے جہد، جہاد اور اجتہاد سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

جانباز جتوئی، سرور کربلائی، ڈاکٹر نور بخش طالب، ڈاکٹر مہر عبدالحق، مولانا غلام حسین زائر، عتیق فکری، غلام حسن خاں حیدرانی، صدیق طاہر، نور محمد سائل، نسیم دلیہ، سنبل قریشی، بسمل احمدانی، صوفی احمد جان صادق فریدی، امید ملتانی، رشید عثمانی، نسیم ملک، سلمان غنی، ارشد ملتانی، میاں سراج الدین ساقول، صالح محمد صالح، عزیز نشتر غوری، اُستاد دامن، سید حسن رعنا گردیزی، ریاض رحمانی، محسن نقوی، نقوی احمد پوری، دلشاد کلانچوی، فیض محمد دلچسپ، خان رضوانی، اقبال سوکڑی، سفیر لاشاری، مقبول تنویر، فرحت ملتانی، خادم ملک ملتانی، حبیب فائق، راشد جمیل، دلدار بلوچ، ممتاز علی خاں حیدر، فانی اللہ آبادی، نصر اللہ خاں ناصر، اصغر ندیم سید، فیض احمد شفیق، پرواز قیصرانی، منیر فاطمی، ثمینہ چندا، اسحٰق، انجم گیلانی، قیس فریدی، واصف قریشی، محمد حارث قریشی، بشیر احمد اختر ملغانی، ساجد، فدا، کمتر، اصغر، عبداللہ میر، تحسین سبائے والوی، عاصم اوچوی، طارق جامی، مخدوم محمد حسین آزاد، خواجہ اخگر احمد پوری، سیفل، صاحبزادہ خلیل احمد دین پوری، شاد گیلانی، ہمراز تونسوی، محمد عالم شاہ کلیم، محمد رمضان طالب، خاکستر بکھروی، غلام رسول سندر، صفدر بخاری آتش، افضل مسعود، شاد بہاولپوری، نصیر سرمد، حافظ ماہڑوی، ڈاکٹر محمد شفیع ایاز، پرویز حیدر، پیرزادہ فخر الدین مست، بخت علی بخت، نوکر، حافظ گنگوری، محی الدین شان، شائق، خورشید کل خان پوری، رشید احمد رشید، کوکب، عارف فریدی، رشید ناصر وغیرہ۔

کلام الملوک، ملک الکلام

تمام سرائیکی شعراء ہمارے نزدیک یکساں قابلِ احترام ہیں، اور خدا کے فضل سے ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر ان کے کلام کا نمونہ درج کرنے لگیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ لیکن تاریخ ملتان کے صفحات میں اتنی گنجائش کہاں۔ اس لئے تبرکاً حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی ایک مشہور اور مقبولِ عام کافی ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس سے سرائیکی زبان کی جامعیت اور اس کے سوز و گداز کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

تُوں بِن موت بھلی، وَنجُم شالا مری!
ٹکساں ہِک نہ ذری، جیساں پل نہ گھڑی

"اے میرے محبوب! تیرے بغیر تو موت ہی اچھی ہے۔ تیرے بغیر تو میں ایک لحظہ بھی یہاں نہ رہوں گی اور نہ زندہ رہ سکوں گی!"

پُورب طرف ڈِٹھوں مینگھ ملہار ڈُھم　　　بجلی لسک ڈِتی گج گجکار جاں سُنیم

رہساں اتھ نہ اَڑی ویساں وطن وری

"میں نے پُورب کی طرف سے گھٹا اٹھتی ہوئی دیکھی۔ بجلی کوندی اور بادلوں کی گرج سُنائی دی۔ اب تو میں یہاں ہرگز نہ رہوں گی۔ اور اپنے وطن کو لوٹ جاؤں گی!"

کتنیں ووڑ ہیم روہی ڈُٹھڑی دی　　　ڈھولا کل نہ لدھو ڈکھڑیں گھڑی دی

پھاڑیم چولی چُنی، ڈروروتھیوم چِڑی

"میرے کانوں میں روہی کے آباد ہونے کی بھنک پڑی ہے۔ اے میرے محبوب! تم نے مجھ ستم رسیدہ کی کوئی خبر نہیں لی۔ میں نے تو تیرے ہجر و فراق میں اپنے کپڑے چولی چنڑی (اوڑھنی) تک پھاڑ ڈالے ہیں اور رو رو کر دیوانی ہو گئی ہوں!"

اپنڑے ڈیس ونجاں دل کوں تانگ تھئی   ڈیکھاں تاڈے ٹوبے لانڑے کھار بوئی

پر ڈوں راہی تھیواں ساڑیں سول سڑی

"دل میں پھر وطن جانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ تا کہ وہاں جا کر اپنی رہائش گاہیں، برساتی جوہڑ اور ہرے بھرے جنگلی پودے دیکھوں، جنگل کی طرف چل دوں کیونکہ سوزشِ دردِ دل نے جلا کر رکھ دیا ہے۔"

اوڈنگاں پونگ اٹھن بدلیں کیتی لس   گھن گھن نام تیڈا روندی تھئی بے وس

سانوں تینڈا ملاں یا پھر پووم مری

"گھن گرج کا شور برپا ہے اور بادل جھوم جھوم کر آ رہے ہیں۔ اے محبوب! تیرا نام لے کر، اور روتے روتے بے بس ہو گئی ہوں۔ اب تو صرف ایک ہی خواہش ہے، کہ یا تو تیرا دیدار نصیب ہو جائے، یا پھر موت ہی آ جائے!"

سرخی مہندی مٹھی، کجلہ دھار گیم   ناز نواز بھلیا، ہار سنگار گیم

بینسر بول بھناں اجڑی مانگ دھڑی

"محبوب کے فراق میں اب میری حالت یہ ہے کہ سرخی مہندی چھوٹ چکی ہے۔ اور کاجل کی دھار کا خیال تک نہیں رہا۔ ناز نخرے اور ہار سنگار سب بھول گئے ہیں،

بُھلے، بینئیر ٹوٹ پھوٹ گئے اور مانگ دھڑی بھی اُجڑ گئی!"

کھیڈݨ کوڈݨ گیا، سکھ دا ٹول گئیم ڈُکھڑے پکڑے پے خوشیاں رُل گئیم

بھڑ کر راول جوگی لائی پرم جھڑی

"راول جوگی (محبوب) نے محبت کی ایسی آگ بھڑکائی کہ کھیل کود اور عیش و آرام سب رخصت ہو گئے اور جہان بھر کے رنج و غم میرے حصّے میں آ گئے۔"

کھمدی کھمݨ فرید جھوکاں یاد پووݨ اکھیاں نیر ہنجوں کر برسات وہݨ

لکھ لکھ دھانھاں اُٹھم جاں جاں ڈٹھم جھڑی

"اے فرید! جب بجلی کوندتی ہے اور بادل سر اُٹھائے نظر آتے ہیں تو بے اختیار روہی یاد آجاتی ہے اور قدیم ٹھکانے تصوّر کی نگاہوں میں گھومنے لگتے ہیں، جس پر آنکھوں سے آنسو بارش کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں!"

نشر و اشاعت

ملتان میں ۱۹۲۰ء تک طباعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سب سے پہلے بلدیہ ملتان نے دفتری کام کے لئے ایک پریس لگایا جو ہاتھ سے چلتا تھا۔ اس کے بعد بیک وقت تین ہندوؤں سونو رام، مُول چند ملان اور بُدھو رام نے دستی پریس لگائے۔ بھاپ سے چلنے والا پریس سب سے پہلے ملک رام کشن نے حسین آگاہی میں لگایا تھا۔ مسلمانوں میں سے ۱۹۲۱ء میں مولوی فیض احمد صاحب اُویسی نے اور ۱۹۲۲ء میں مولوی عبدالسلام قادری نے پریس لگائے۔ مؤخر الذکر پریس کو مولوی محبوب احمد صاحب اُویسی نے خرید کر اقبال برقی پریس سے موسوم کیا اور ۲۰×۳۰" سائز کی پہلی مشین اس میں نصب کی گئی۔ اسے گورنمنٹ نے ہندو مسلم فسادات کے دوران ضبط کر لیا۔ اس کے فوراً بعد خان محمد اکرم خاں نے "مطبع شمسی" کے نام سے پریس قائم کر لیا۔ انتقالِ آبادی میں ہندو پریس کے مالکان بھارت چلے گئے اور ان کی جگہ ایسے افراد آئے جنہیں طباعت کا زیادہ تجربہ تھا۔ اُنہوں نے نہ صرف متروکہ چھاپہ خانوں کو سنبھالا، بلکہ متعدد ایسے پریس بھی قائم کئے جنہوں نے اہل ملتان کو ایک حد تک طباعتی سلسلے میں لاہور سے بے نیاز کر دیا۔ موجودہ چھاپہ خانوں میں سیّد الیکٹرک پریس، یونین پرنٹنگ پریس، ہمدرد پرنٹنگ پریس، نو بہار پرنٹنگ پریس، صدّیقیہ پرنٹنگ پریس، مطبع شمس، رحیمیہ پرنٹنگ پریس، قادری پرنٹنگ پریس، پردیز پرنٹنگ پریس، عزیز پرنٹنگ پریس،

امروز پرنٹنگ پریس، خدا آرٹ پریس، الہلال پرنٹنگ پریس، مجاہد آرٹ پریس، سجاد آرٹ پریس، آرمی پریس، وکٹوریہ پرنٹنگ پریس، امان پریس، سلیم آرٹ پریس، اور مبارک پرنٹنگ پریس قابلِ ذکر ہیں۔ امروز اور ہمدرد چھاپہ خانوں میں آفسٹ مشینیں بھی نصب ہیں۔ محکم آرٹ پریس روزنامہ "نوائے ملتان" کا اپنا پریس ہے۔ کچھ عرصہ سے ٹین پر بھی چھپائی کا کام شروع ہو چکا ہے۔ جس سے ملکی صنعت پر خوشگوار اثر پڑا ہے۔

کتابت

کتابت ملتان شہر کا قدیم فن ہے۔ جب یہاں چھاپ سے چلنے والے پریس نصب ہوئے تو خوشنویسی کے فن نے بھی کروٹ لی۔ منشی غلام جیلانی اور منشی نورالدین انصاری نے بہت سے شاگرد پیدا کئے۔ انہی ایام میں اُستاد بدرالدین لاہور سے اور مولوی محمد امین صاحب بہاولپور سے تشریف لائے۔ منشی عاشق محمد کتابت کے ساتھ ساتھ مصوری بھی کرنے لگے تھے۔ حافظ بشیر احمد صاحب اچھے خوشنویس تھے۔ لیکن انہوں نے اس فن کو پیشہ کے طور پر اختیار نہ کیا۔ اس وقت صرف میاں شیر محمد صاحب ہی پرانے کاتبوں کی یادگار رہ گئے ہیں۔ مگر اب یہ بھی شوقیہ یا عادتاً لکھتے ہیں۔ محمد حسن کلیم کا پچھلے دنوں انتقال ہو چکا ہے۔ مولوی منظور احمد احقر، اور منشی طفیل احمد قادری کا شمار بھی ملتان کے کامل الفن خوشنویسوں میں ہوتا تھا۔ مگر قدرت نے اپنی رحمت کاملہ سے ان پر رزقِ حلال کے اور دروازے کھول دیئے۔ احقر صاحب نے ہمدرد پریس نصب کیا اور جناب طفیل احمد صاحب نے نیشنل فین کی ایجنسی لے لی۔ اور اپنے ابتدائی پیشہ سے بے نیاز ہو گئے۔ مولوی منظور احمد صاحب احقر کا حال ہی میں (۵ر محرم ۱۳۹۳ھ) انتقال ہو چکا ہے۔ موجودہ خوش نویسوں میں میاں صالح محمد صاحب جمالی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے قلم کا نکھار مصنفین اور ناشرین کے لئے مرکزِ توجہ بن چکا ہے۔ اس لئے ہر وقت ہر شخص کے لئے عدیم الفرصت بن کر رہ گئے

ہیں۔ ان کے بعد منشی نذر حسین، منشی سلیم چشتی صاحب، مولوی عبدالغفار شاد، منشی نذر محمد اپنے انداز اور اسلوب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ منشی خلیل الرحمٰن، منشی محمد اسلم اور یوسف طاہر صاحب کی خطاطی جدید تقاضوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

مصوری

منشی عاشق محمد پہلے خوش نویس تھے جنہوں نے مصوری کی طرف توجہ دی۔ اور اس فن میں ید طولیٰ حاصل کرنے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اسے ان کے چھوٹے بھائی میاں فدا حسین نے جلد پُر کر لیا۔ اب یہ پورے شہر کے لئے مرکز توجہ بن چکے ہیں اور اپنے فن میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلاک سازی

ملتان میں بلاک سازی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور ضرورت مند حضرات کو اس مقصد کے لئے لاہور جانا پڑتا تھا۔ مگر حال ہی میں مسٹر اعجاز حسین سجاد لاہور سے تشریف لے آئے ہیں اور انہوں نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ ان کے ہاں لائن بلاک ہاف ٹون بلاک، ٹرائی کلر بلاک، سینما سلائیڈ، ریڈیو ڈائیل، نیم پلیٹ اور آفسٹ کے لئے نیگیٹو اور پازیٹو تسلی بخش تیار ہوتے ہیں۔ ان کا کارخانہ "سجاد بلاک سروس" کے نام سے حسن پروانہ روڈ پر واقع ہے۔

جلد سازی

جلد سازی میں ملتان کو قدیم الایام سے خاص شرف حاصل رہا ہے۔ کتب خانہ ناصریہ میں مقامی کاریگروں کی ایسی عمدہ جلدیں دیکھنے میں آتی ہیں جن پر اہل ملتان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ مولوی غلام مرتضیٰ، خلیفہ بہار الدین، خلیفہ غلام قادر اور مولوی شہاب الدین بلاشبہ اس فن میں مہارت کاملہ رکھتے تھے۔ موجودہ جلد سازوں میں میاں عبدالعزیز اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ اگر انہیں عمدہ کپڑا اور اچھا گتہ مل جائے، تو لاہور کے مقابلے میں اپنی تیار کردہ جلدوں کو زیادہ مزین کر سکتے ہیں۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب

نادر کتب کی جلد بندی اور آرائش میں کلاسیکی حیثیت رکھتے ہیں۔ خلیفہ نور احمد صاحب اور میاں عبدالشکور کا شمار بھی اچھے جلد سازوں میں ہوتا ہے۔

صحافت ملتان میں صحافت کے بانی میر مہدی صاحب خیال کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی ایک ہفت روزہ نکالا تھا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ ان کے بعد ایک ہندو پروہت ملک رگناتھ رائے نے "PEACE" نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ زاں بعد جناب اسد ملتانی نے ہفت روزہ "الشمس" نکالا جو ہندو مسلم فسادات کی نذر ہو گیا۔ بایں ہمہ اس سے ملتان کے دانشوروں میں بیداری کی ایک ایسی لہر پیدا ہو گئی کہ بیک وقت متعدد ہفت روزے منظر عام پر آ گئے۔ ہفت روزہ "الشمس" روزنامہ "شمس" کی شکل میں بڑی آب و تاب سے طلوع ہونے لگا۔ واحد ندوی اور شیخ مظفر الدین "زمیندار" "سدھار" نکال رہے تھے۔ منشی عبدالرحمٰن خاں "مجاہد اسلام" پیرزادہ کشفی الاسدی "ملتان پنچ" غلام علی آتش "طوفان" اور مولوی محبوب احمد اویسی "محسن" نکالتے تھے۔ احقر العباد کی ادارت میں "صداقت" چھپتا تھا۔ ہندو اخبارات کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کم و بیش گیارہ ہندو پرچے باقاعدہ شائع ہوتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد "شمس" اور "زمیندار" "سدھار" کچھ عرصہ نکل کر بند ہو گئے۔ "کارزار" اپنے جاندار اداریوں، سیاسی مقالات اور علمی شہپاروں کے سبب کچھ عرصہ تک قارئین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ لیکن جب "امروز" "نوائے وقت" اور "کوہستان" ملتان سے چھپنا شروع ہوئے تو یہ ان کے مقابلے میں پنپ نہ سکا اور بند ہو گیا۔ ماہناموں میں "بلوچی دنیا" اور "سرائیکی ادب" قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر میر چاکر خاں کی ادارت میں نکلتا ہے اور اس کے پڑھنے والے بلوچستان اور خلیج العرب کے گرد و پیش بستے ہیں۔ "سرائیکی ادب" ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے۔ اگر حالات سازگار رہے تو یقیناً ترقی کرے گا۔ دنیا بامید قائم!

تجارت

دار الامان ملتان قدیم الایام سے تجارت کی زبردست منڈی رہا ہے۔ کیونکہ مغربی سرحد پر برصغیر کا یہ پہلا عظیم شہر ہے۔ ایران، عراق اور شام سے جو بھی تجارتی قافلے ہندوستان آتے تھے اُنہیں پہلے ملتان کا پانی پینا پڑتا تھا۔ نیز یہ شہر دریائے راوی اور چناب کے سنگم پر واقع تھا۔ ان دونوں دریاؤں میں کشتیوں کے ذریعے لاکھوں روپے کی تجارت ہوتی تھی۔ قبل از اسلام بھی ہندوستان کے تاجر مصر تک تجارت کے سلسلے میں آمد و شد رکھتے تھے جیسا کہ بابا رتن ہندی کے بیان سے ظاہر ہے کہ وہ والد کے ہمراہ تجارت کے سلسلے میں حجاز جا پہنچا۔[1]

اگرچہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں ملتان کے قلعہ سے ہی روانہ ہوتی تھیں۔ مگر بڑی کشتیوں اور جہازوں کو دریائے چناب میں ہی روک لیا جاتا تھا۔ یہ مقام اب تک راج گھاٹ سے معروف چلا آتا ہے۔ راجہ سہاریں نے تجارت کو مزید فروغ دینے کے لئے ہی ملتان شہر سے جانب غرب دو میل کے فاصلے پر ایک ماڈل ٹاؤن تعمیر کرایا تھا۔ جو چند راؤ سے موسوم تھا۔ عربوں نے ملتان فتح کیا تو انہوں نے اس قصبے کو المنصورہ[2] کا نام دیا۔ عرب گورنر اور اس کے فوجی حکام اسی قصبے میں رہتے تھے۔ راجگھاٹ سے سامان تجارت یہاں لایا جاتا اور پھر یہاں سے ملتان شہر کو منتقل ہوتا تھا۔ مغلوں کے آخری دور میں جب ملتان کا الحاق افغان گورنمنٹ سے ہوا تو کابل، غزنی اور قندھار کے قافلے درہ سخی سرور کے راستے کثرت سے آنے لگے

---

[1] نزہتہ الخواطر جلد اول از مولانا سید عبدالحی [2] اسی نام کا ایک شہر سندھ میں بھی آباد تھا۔

چوک چھلیک کے پاس پاوندوں کی بہت بڑی سرائے تھی۔ جس میں پٹھان تاجر آکر ٹھہرتے تھے۔ افغانستان کے خشک میوے، ہینگ، کھالیں، پشم اور بھیڑ بکریاں فروخت کرتے اور یہاں سے اجناس اور کپڑا لے جاتے تھے۔ اسی قسم کی ایک سرائے دہلی دروازہ کے باہر تھی۔ یہاں لاہور اور دہلی کے سوداگر قیام کرتے اور ہزاروں کا لین دین کرتے تھے۔ اب اگرچہ وہ سرائے نہیں رہی مگر مقبرہ حافظ محمد جمال اللہ علیہ الرحمتہ کے شرقی جانب کچی سرائے نام کا ایک محلہ ابھی تک اس کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ ہندوستان میں ملتانی چھینٹ بڑی مقبول تھی اور اسے ہندوستان کے راجے مہاراجے بڑے شوق سے زیب تن کرتے تھے۔ سدوزئی خاندان کے دور میں کابلی پٹھانوں نے المنصورہ میں جو کثرت استعمال سے عامی سورہ اور پھر "سورج میانی" سے موسوم ہو گیا تھا، بود و باش اختیار کی اور اپنے ہاں کی طرز کے مکانات تعمیر کرائے جس سے یہ قصبہ کابل کا ایک محلہ نظر آنے لگا۔

ملتان قدیم سے کپڑے کی منڈی تھا۔ مگر انگریزوں نے اپنے ملک کے کپڑے کو کھپانے کی خاطر یہاں کی پارچہ بافی کو تقریباً ختم ہی کر دیا۔ اس کی جگہ یورپ سے لاکھوں روپوں کا کپڑا آتا اور ہندو ساہوکاروں کی وساطت سے فروخت ہوتا۔ اس بزنس کی تمام اجارہ داری ہندوؤں کو حاصل تھی۔ مسلمان بطور پرچون فروش ہندو ساہوکاروں سے مال خریدتے اور فروخت کر کے گزارہ کرتے تھے۔ انتقال آبادی کے وقت جب ہندو یہاں سے رخصت ہوئے، تو ان کا خیال تھا کہ مسلمان تجارت کو فروغ نہیں دے سکیں گے اور تجارتی اعتبار سے ملتان شہر مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ مگر ان کی جگہ جو لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ وہ اگرچہ ان کی طرح سرمایہ دار نہیں تھے۔ مگر لین دین کا اچھا تجربہ رکھتے تھے۔ انہوں نے تھوڑے سے عرصہ میں ہی نہ صرف تجارتی کاروبار کو سنبھال لیا، بلکہ اسے چار چاند لگا دیئے۔ انگریزوں اور پٹھانوں کی جنگوں کے سبب ملتان میں پاوندوں کے قافلے آنا بند ہو گئے تھے۔ ممکن ہے پاکستان کے

قیام سے افغانستان سے تجارت دوبارہ شروع ہو جاتی۔ مگر انگریز جاتے جاتے پختونستان کا ایسا شوشہ چھوڑ گیا کہ ابھی تک پاکستان اور افغانستان کے درمیان مغائرت کی خلیج علی حالہ حائل ہے۔ اسی بنا پر ان دو مسلمان ملکوں کے درمیان تجارتی لین دین کا سلسلہ معطل ہے۔ اور ڈیڑھ صدی سے کوئی تجارتی قافلہ کابل قندھار سے پھر ملتان میں نہیں آیا۔ ہاں البتہ شاہراہ ریشم کے کھلنے سے چین کا مال ملتان کے بازاروں میں بکثرت نظر آنے لگا ہے۔

ضلع ملتان میں گندم، رُوئی، تیل نکالنے کے بیج، مکی، جوار، باجرہ اور جَو بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی زمانے میں ملتان نیل کی بھی بڑی منڈی تھا۔ لیکن اب مانگ نہ ہونے کے سبب اس کی کاشت نہیں ہوتی۔ البتہ کپاس اس علاقے کی بڑی پیداوار ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے کی گانٹھیں بیرونی ممالک کو جاتی ہیں۔ اور یہی واحد جنس ہے جس سے ہمارا ملک سب سے زیادہ زرِ مبادلہ کماتا ہے۔ میوہ جات میں آم، انار، سنگترے، مالٹے اور کھجور ہزاروں من روزانہ بیرونجات کو جاتے ہیں۔ موم بتیاں، صابون، روغنی برتن، تیل، مینا کاری کے اسٹینڈ، ٹین، اونٹ کے چمڑے کے مرتبان، رکابیاں، پائیدار غالیچے، دریائی، دھوپ چھاؤں، صوفی لنگیاں، ریشمی زرتار دوپٹے ملتان کی خاص مصنوعات تھیں۔ مگر اب دریائی، دھوپ چھاؤں اور صوفی لنگیوں وغیرہ کا نکاس کم ہو گیا ہے۔ گل ٹیکس کو گل محمد خاں ترین مرحوم نے ۱۹۲۶ء میں قائم کیا تھا۔ یہ اس وقت ایشیا میں ہینڈ لومز کا سب سے بڑا یونٹ ہے۔ اس کارخانے کا تیار کیا ہوا مال ہر سال پچیس چھبیس لاکھ روپے کا زرِ مبادلہ کماتا ہے۔ اور زیادہ تر مشرقِ وسطیٰ امریکہ اور یورپ کو جاتا ہے۔ اس کارخانے میں تقریباً ۳۵۰ کاریگر کام کرتے ہیں اور تین سو کے قریب لاوارث بی بیاں گھروں میں بیٹھ کر اس کے مال کی سلائی سے گزر بسر کرتی ہیں اور گل ٹیکس کے بانی کو دعائے خیر سے یاد کرتی ہیں۔

ملتان کو صنعتی اعتبار سے بھی جنوبی ایشیا کے تمام شہروں پر برتری حاصل رہی ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کون کون سی صنعتوں نے اس شہر میں جنم لیا اور پھر اپنی طبعی عمر ختم کر کے نسیاً منسیاً ہو گئیں۔ مثال کے طور پر ہاتھی دانت کے کام کو ہی لے لیں۔ اب یہ صنعت برائے نام رہ گئی ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ دکان ہاتھی دانت کے کام کی نظر آجاتی ہے جس میں صرف چوڑیاں تیار ہوتی ہیں۔ لیکن انگریزوں کے ابتدائی دور تک یہ صنعت اس شہر میں پورے عروج پر تھی۔ صرف چوڑیاں ہی نہیں بلکہ گھر کی ضرورت کی اکثر چیزوں پر ہاتھی دانت کا کام بڑی نفاست سے ہوتا تھا۔ خاندانی گھروں میں ابھی تک ایسی میزیں نظر آجاتی ہیں، جن پر ہاتھی دانت کا بہترین کام ہوا ہے۔ اسی طرح مختلف زیورات، ہار، کلپ کانٹے، نیز چاقو، چھریوں، سرمہ دانیوں اور تلواروں کے دستوں پر ہاتھی دانت کا نفیس کام ہم نے خود دیکھا ہے۔ آج سے ایک صدی پیشتر ہاتھی کی سواری امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کے لیے اتنی لازمی تھی جیسا کہ زمانۂ حال میں موٹر۔ انگریز نے اس کی جگہ دو اسپہ اور سہ اسپہ فٹن کو رائج کیا۔ جب سے ہاتھی کا وجود آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ساتھ ہی اس کے دانتوں کی صنعت بھی معدوم ہو گئی۔ اس کے علاوہ کئی صنعتیں ایسی ہیں جو کبھی عروج پر تھیں، مگر اب دم توڑ رہی ہیں، جیسے کاشی گری کا کام۔ اس فنِ شریف کے صناع چھٹی صدی ہجری میں تاتاریوں کے حملے کے سبب کاشان سے ترکِ وطن کر کے صوفیا، اور مشائخ کے ہمراہ ملتان آئے اور یہاں انہوں نے عمارات کی آرائش بالخصوص مساجد اور مقابر کے

لئے روغنی اینٹیں تیار کرنا شروع کیں۔ زاں بعد قسم قسم کے ظروف، پھولدان، مرتبان اور ستون بننے لگے۔ کاشی گری میں بالعموم فیروزی رنگ کا کام ہوتا ہے۔ سبز رنگ بھی استعمال ہوتا ہے، مگر بہت کم۔ آجکل جو روغنی کام ہو رہا ہے۔ وہ قدیم زمانے کی طرح دیرپا نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس میں پہلے کام کی طرح چمک دمک پائی جاتی ہے۔ چونکہ یہ صنعت ملتان کے صرف چند گھرانوں تک مخصوص ہے جو کاشی گر کہلاتے ہیں اور دوسروں پر اس فن کا بھید ظاہر کرنا گناہ جانتے ہیں۔ اس لئے یہ فن آہستہ آہستہ اب معدوم ہوتا جا رہا ہے، ملتان شہر میں درج ذیل عمارتوں پر روغنی اینٹوں کا قابلِ قدر کام ہوا ہے۔

۱۔ مقبرہ شاہ یوسف گردیزؒ

۲۔ مقبرہ شاہ رکنِ عالمؒ

۳۔ مقبرہ خواجہ اویس کھگہؒ

۴۔ مقبرہ مولانا عبید اللہ الملتانیؒ

مسجد خدکہ، عیدگاہ، ساوی مسجد اور مسجد نواب علی محمد خاں، وغیرہ

● نقاشی

کاشی کی طرح نقاشی جسے سرائیکی میں کمنگری کہتے ہیں، ملتان کی خاص صنعت ہے، بلکہ ایک بڑا گنجان محلہ[1] اس صنعت سے موسوم ہے۔ جس میں قلعہ کے قرب کی وجہ سے زیادہ تر نقاش، کمان گر، اسلحہ ساز اور کامل الفن معمار آباد تھے۔ نقاشی گری کا کام ہر قسم کے رنگوں کے ساتھ تمام چیزوں پر ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان سلاطین نے پہلے پہل اپنے محلات کی دیواروں اور چھتوں کو اس سے مزین کرایا۔ اس کے بعد مساجد اور خانقاہوں میں یہ کام ہونے لگا۔ اب اگرچہ یہ فن متروک ہو چکا ہے۔ پھر بھی عہدِ قدیم عمارتوں میں ایسے نقش و نگار کافی ملتے ہیں، جن کی آب و تاب اور چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ بالخصوص

---

[1] محلہ کمنگراں

شیشہ بندی کا منظر دیدنی ہے۔ اُستاد خدا بخش کلاں، اُستاد عبداللہ اور اُستاد الٰہی بخش اس فن کے یکتا اور ماہر خیال کئے جاتے تھے۔

محلات کے در و دیوار کے بعد ان باکمال فن کاروں نے روزمرہ کی استعمال کی چیزوں کو آراستہ کرنا شروع کیا۔ فوجی لوگ اپنے اسلحہ کو ان سے مزین کراتے۔ بیگمات زیورات رکھنے کی صندوقچیوں، الماریوں، پلنگوں اور کرسیوں پر نقش گری کا کام کراتیں۔ جب جمالیاتی ذوق نے اور ترقی کی تو انہی باکمال صناعوں نے اونٹ کے چمڑے پر زیب و زینت کا کام شروع کیا اور ایسے حسین و جمیل مرتبان، گلدان، ٹیلیفون ریسیور اور شیڈ لیمپ بنا کر پیش کئے کہ ان کی شہرت یورپ تک جا پہنچی۔ اس وقت اس فن کا مرکز حسین آگاہی میں ہے اور کافی عروج پر ہے۔

نقاشی کا کام کپڑوں پر بھی بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس صنعت میں کہروڑ پکا خاصی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے تیار کردہ پلنگ پوش، جاجم اور منقش رومال کثیر مقدار میں برآمد کئے جاتے ہیں۔

• مینا کاری

اس فن کو ساڑھے چار سو برس قبل نتھو نامی سنار نے ایجاد کیا تھا۔ اس کا اصول بھی وہی ہے جو کاشی گری کا ہے۔ چاندی کو تانبے میں ملا کر مختلف قسم کے زیورات اور برتنوں پر خوبصورت نقش و نگار نکالے جاتے ہیں۔ پہلے چاندی پر چھینٹے کے ذریعے نقش و نگار نکالتے ہیں۔ پھر ان پر مینا کاری کا کام کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہندو سناروں کے چلے جانے سے یہ صنعت قدرے پھیکی پڑ گئی تھی، مگر مقامی سناروں نے اسے سنبھال لیا۔ یہ کاریگر پلٹ، اسٹڈ، رکابیاں اور کئی قسم کے خوبصورت برتن بناتے ہیں۔ جو بیرونی ممالک میں بھیجے جاتے ہیں۔ ان کی مانگ روز بڑھ رہی ہے۔ یہ فن دورِ حاضر میں کافی مقبول ہے اور ترقی کر رہا ہے۔

• **قالین بافی۔** غوریوں کے زمانۂ اقتدار میں ایک خاندان ایران سے یہاں آکر

آباد ہوا۔ جس نے اون اور سوت کو ملا کر قالین تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ ان کے کارخانے میں کافی آدمی ملازم تھے۔ اور ان کے تیار کردہ قالین دُور دراز علاقوں میں بھیجے جاتے تھے۔ عتیق فکری صاحبؒ نے مراۃ احمدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ قالین اتنے عمدہ تیار ہوتے تھے کہ شاہجہان بادشاہ کو جب حرم شریف کے لئے قالین تیار کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے یہ شرف و مجد ملتان کو ہی عطا کیا۔ انگریزی دَور میں چودھری عبد الحق صاحب چشتی کے دَم قدم سے یہ فن زندہ تھا۔ ۱۹۲۳ء میں جب لندن کی نمائش میں قالین بافی کے عمدہ نمونے پیش کئے گئے تو ملتان سے چشتی صاحب نے بھی ایک قالین اور دو نمونے وائسرائے ہند کی وساطت سے بھجوائے۔ بدقسمتی سے وائسرائے کی بیگم قالین پر ریجھ گئیں۔ چنانچہ وائسرائے نے قالین تو اپنے ہاں رکھ لیا اور نمونے لندن بھجوا دیئے۔ جب انعامات تقسیم ہونے لگے تو چشتی صاحب کے قالینوں کو سیکنڈ پرائز ملا۔ ساتھ ہی یہ تحریر کیا گیا کہ اگر پورا قالین ہوتا تو اوّل درجے کا انعام دیا جاتا۔ جب یہ اطلاع چودھری صاحب کو ہوئی تو وہ انگریز وائسرائے کی اس بددیانتی پر بھونچکے سے رہ گئے اور اُسے غم و غصّے کا خط لکھا۔ جس پر وائسرائے کی بیگم نے معذرت کی اور اپنی طرف سے ایک ہزار روپے ارسال کئے۔ مگر چودھری صاحب نے قبول نہ کئے۔ اور عطائے تو بلقائے تو بخشیدم کے مصداق واپس لوٹا دیئے۔ اس وقت ملتان میں قالین بافی کے چودہ رجسٹرڈ اور کئی غیر رجسٹرڈ کارخانے کام کر رہے ہیں۔ مگر ان میں وہ اگلی سی بات نہیں رہی۔[1]

• پارچہ بافی

پارچہ بافی ملتان کی قدیم صنعت ہے۔ آج سے ہزاروں سال قبل جب آرین وسط ایشیا سے اس ملک میں آئے، تو وہ اس صنعت کو بھی ہمراہ لائے۔ کپاس کی کاشت کے لئے یہاں کی زمین زیادہ موزوں تھی۔ اس لئے موٹا اور نفیس ہر قسم کا سُوتی کپڑا یہاں تیار ہو کر بیرونی ممالک کو

[1] ملتان قدیم و جدید

برآمد ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کئی قسم کے رنگین کپڑے تیار ہوتے تھے، مسلمانوں نے اس صنعت میں اور رنگوں کا اضافہ کیا۔ ہندوستان کی تاریخوں میں ملتان کی پارچہ بافی کا خاص طور پر ذکر آیا ہے۔ اس زمانے میں ملتان شطرنجی اور چھینٹ کی صنعت میں خاص طور پر مشہور تھا اور چھینٹ کو ہندوستان کے بڑے راجے مہاراجے بڑے شوق سے زیب تن کرتے تھے۔ چنانچہ نواب سید محمد خاں بلوچ نے جب بھرت پور کے راجہ سورج مل کو قتل کیا۔ وہ ملتانی چھینٹ کا انگرکھا پہنے ہوئے تھا۔ انگریزوں نے جب ملتان پر قبضہ کیا تو اس وقت اس شہر میں پارچہ بافی کے ۱۲۶۴۷ر چھوٹے بڑے کارخانے کام کر رہے تھے۔ ان شاطروں نے ڈھاکہ کی طرح ملتان سے بھی اس صنعت کا خاتمہ کیا، تاکہ مانچسٹر کا کپڑا یہاں فروخت ہو سکے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے پر جب مہاجرین اس شہر میں آئے۔ اگرچہ یہ سرمایہ دار نہیں تھے، مگر پارچہ بافی کی صنعت میں ماہر تھے۔ اُنہیں جہاں سر چھپانے کو جگہ ملی، وہیں انہوں نے چھوٹی سی کھڈی بھی نصب کر لی۔ اور پھر جونہی ان کے پاس کچھ روپیہ پیسہ جمع ہوا۔ انہوں نے بجلی سے کھڈیوں کی تنصیبات شروع کیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دہلی دروازے کے باہر خانقاہ حضرت منشی صاحب کے گرد و پیش منظور آباد، غریب آباد، شریف پورہ اور رشید آباد میں جگہ جگہ کھڈیاں اور کرگھے دکھائی دینے لگے، جن کی تعداد ۱۹۷۰ء میں ایک محتاط اندازے کے مطابق لاکھ تک جا پہنچی تھی۔ ان کے علاوہ اسمٰعیل آباد ٹیکسٹائل ملز۔ اللہ وسایا ٹیکسٹائل ملز اور یونائیٹڈ ٹیکسٹائل ملز بھی وجود میں آ گئیں اس وقت تقریباً سات کے قریب کاٹن ٹیکسٹائل ملز اور کئی وولن ملز کام کر رہی ہیں۔ اسمٰعیل آباد کی ٹیکسٹائل ملیں آدم جی ملز کا مقابلہ کرتی ہیں۔ گُل ٹیکس خوبصورت چادریں، تکیے، کھڑکیوں کے لئے خوشنما پردے اور اعلیٰ قسم کی وردیاں مہیا کرتا ہے۔ بین الاقوامی نمائشوں میں اس نے ہمیشہ امتیازی اعزاز حاصل کیا ہے۔

ﻟﮧ سیر المتاخرین

ریشم کا کام

ریشم کی صنعت کا سراغ ملتان میں اس زمانے سے ملتا ہے۔ جبکہ یہاں اشوک کی حکومت تھی۔ اور بدھ مت کے بھکشو اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کے لئے بلخ بخارا تک کا سفر کرتے تھے۔ ان دھرم پرچارکوں کے ذریعے یہ ملک ریشم سے متعارف ہوا۔ جس پر لاکھوں روپے کا ریشم وسط ایشیا سے ملتان آتا اور یہاں کے کارخانوں میں اس سے مال تیار ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ انگریزی دور تک رہا۔ چنانچہ مسٹر بیڈن پاول مشہور یورپین سیاح و این صاحب کے حوالے سے اپنی ہینڈ بک میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اطرافِ بخارا و ترکستان سے قبیلہ لوہانی کے لوگ تقریباً سات سو من ریشم ہر سال ملتان میں لاتے ہیں۔ یہاں ایک سو پچاس کارخانوں میں مال تیار ہوتا ہے ایک کاریگر، ایک کھیس جو تقریباً تین گز لمبا اور نصف گز چوڑا ہوتا ہے۔ چھ روز میں تیار کرتا ہے۔ لیکن تانا بانا تیار کرنے میں آٹھ روز اور لگ جاتے ہیں۔ نہایت اعلیٰ قسم کا کھیس سولہ روز میں تیار ہوتا ہے۔ سُرخ رنگ کا ریشم نہایت قیمتی ہوتا ہے۔ جو ایک قسم کی بوٹی سے نکالا جاتا ہے۔ جسے "کوچی نیل" کہتے ہیں جو ملک بخارا سے آتی ہے۔ اور ایک سیر فی روپیہ کے حساب سے ملتی ہے۔ یہ تجارت اب تک جاری ہے اور صوبہ بھر میں اس سے بہتر کام کہیں نہیں ہوتا۔ لاہور، امرتسر وغیرہ میں بھی ریشم کا کام ہوتا ہے۔ جو بناوٹ اور طرز کے لحاظ سے یورپین نگاہوں کو زیادہ مرغوب ہے۔ لیکن ملتان کی دریائی دھوپ چھاؤں اور کھیس اپنی بناوٹ، عمدگی اور چابکدستی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ چمک دمک کے لحاظ سے بھی یہاں کا مال ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ روئی اور ریشم کا ایک مرکب کپڑا "صوفی" کے نام سے یہاں زیادہ مرغوب ہے۔ کیونکہ اسلام میں مردوں کے لئے خالص ریشم کا کپڑا پہننا

ممنوع ہے۔ لنگیوں، پگڑیوں، قمیصوں اور دوپٹوں کے کناروں پر سنہری تار کا
کام بھی نہایت خوبصورتی اور کاریگری سے کیا جاتا ہے۔ اس مال کی ایک ممتاز
خصوصیت یہ ہے کہ بے حد مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔"

یہ ملتان کی ریشمی صنعت کی رپورٹ ایک انگریز کی لکھی ہوئی ہے۔ اب اس صنعت کی تباہی کا ذکر
سیّد اولاد علی شاہ گیلانی مرحوم سے سُنیئے۔ "مرقع ملتان" کے صفحہ ۱۸۹ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"افسوس ہے کہ جاپانی اور یورپی مقابلہ نے اس صنعت کا بھی تدریجی طور پر خاتمہ
کر دیا ہے۔ غیر ملکی مال اَب کثرت سے آنے لگ گیا ہے۔ اس میں پائیداری اور
مضبوطی تو نام کو نہیں ہوتی۔ لیکن خوشنمائی اور ارزانی کی وجہ سے زیادہ استعمال
ہونے لگ گیا ہے۔ اِس وجہ سے اس دستکاری کی اب کوئی قدر نہیں رہی۔"

سر پر باندھنے کی لنگی جو خالص ریشم سے تیار ہوتی تھی، اور ملتان کے سوا کہیں تیار نہیں ہوتی تھی۔
زیادہ تر پشاور اور کابل بھیجی جاتی تھی۔ یہاں بھی خورد و کلاں سب اسے پہنتے تھے اور یہ ایک
خوبصورت اور دیرپا چیز تھی۔ آج سے چالیس برس پیشتر کوئی شخص ننگے سر بازار میں چلا آتا، تو
لوگ تعجّب کرتے تھے اور یہ ایک بڑی عیب کی بات خیال کی جاتی تھی۔ مگر اب ننگے سر چلنا فیشن
میں داخل ہو چکا ہے۔ اور امیر غریب سب بلاتفریق ننگے سر بازاروں میں پھرتے دکھائی دیتے
ہیں اور دوپہر کو بھی جبکہ شدّت کی گرمی پڑ رہی ہوتی ہے، تو بھی کوئی پگڑی کی ضرورت محسوس
نہیں کرتا۔ جب پگڑی کا رواج ہی نہ رہا، تو لنگیاں کس لئے تیار ہوتیں۔ اِس لئے یہ صنعت بھی
تقریباً ختم ہو چکی ہے۔

لکڑی کا کام

عمارتی لکڑی بالعموم دریا کے ذریعے آتی ہے۔ اور مُنّاں بھگت ؒ کے مقام پر اُترتی ہے
پہلے چوب تراشی کی دُکانیں حرم دروازہ سے لے کر دہلی دروازے تک سرکلر روڈ پر واقع تھیں

مگر اب بلدیہ نے وہاڑی روڈ پر ٹمبر مارکیٹ قائم کر دی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے لاکھوں روپے کی لکڑی کشمیر سے آتی تھی۔ مگر جب سے اس گلریز وادی پر بھارت کا قبضہ ہوا ہے۔ عمارتی لکڑی کا آنا بند ہو گیا ہے۔ معمولی مقدار میں دیودار کی لکڑی آزاد کشمیر یا بنوں کوہاٹ سے آتی ہے۔ مگر اس میں کشمیری لکڑی کی طرح پختگی نہیں ہے اور اسے دیمک چاٹ جاتی ہے اس لئے جدید عمارتوں میں لوہے کے گرڈر، ٹی آئرن اور سریئے وغیرہ کی کھپت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ حرم دروازہ اور پاک دروازہ کے مابین سرکلر روڈ پر متعدد فرمیں لوہے کا کاروبار کرتی ہیں۔

● چوب کاری

دوسری صنعتوں کی طرح چوب کاری بھی ملتان کی قدیم صنعت ہے۔ ساتویں صدی کے چوبی کام کے نمونے حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا اور قطب الاقطاب شاہ رکن عالم رحمہم اللہ علیہم کے مقابر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ حضرت شاہ رکن عالمؒ کے مقبرہ کی مرمت محکمہ اوقاف بڑے پیمانہ پر کر رہا ہے۔ شیشم کی لکڑی پر دورِ تغلق کی گل تراشی اور آیات و ابیات کو کندہ کرنے کا کام اتنی نفاست سے ہو رہا ہے کہ قدیم و جدید کام میں تمیز نہیں ہوتی۔ اس سے یہ دعوئی کیا جا سکتا ہے کہ چوب کاری کا کام ابھی تک ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ ملتان شہر میں ہر سال بیسیوں تعزیے تیار ہوتے ہیں جو زیب و زینت اور نفاست میں جواب نہیں رکھتے۔ اُستاد، شاگرد اور جال ویڑھا کے تعزیئے اس صنعت کے شاہکار خیال کئے جاتے ہیں۔

● چمڑے کا کام

یوں تو چمڑے کا کاروبار ہر شہر میں ہوتا ہے۔ لیکن ملتان اس صنعت میں بھی دوسرے شہروں پر سبقت لے گیا ہے۔ ہائیڈ مارکیٹ کروڑوں روپے کی پشم اور چمڑا یورپی ممالک کو برآمد کرتی ہے۔ ملتان کے "کھسے" خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ حرم دروازے اور بوہڑ دروازے

کے درمیان شہر کے اندر جفت سازی کا سنٹر ہے۔ یہاں سے صوبہ سرحد اور سندھ کو جوتے برآمد کیے جاتے ہیں۔ ایک اور سنٹر ٹبی شیر خاں میں اُبھر رہا ہے جہاں کافی تعداد میں کفش دوز مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔

• انڈسٹریل اسٹیٹ

انڈسٹریل اسٹیٹ ملتان ۱۴۱۰ ایکڑ کے یکصد پلاٹوں پر مشتمل تھی۔ چونکہ اسے انکم ٹیکس کی رعایت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے صنعت کار اس طرف بہت کم متوجہ ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۱ء تک صرف ۱۶، ۱۷، پلاٹ الاٹ ہو سکے تھے۔ ملتان کے مقابلے میں چونکہ ضلع مظفر گڑھ کو یہ رعایت حاصل ہے۔ اس لئے صنعت کاروں نے ملتان کی بجائے اس ضلع میں نئی صنعتیں قائم کرنی شروع کر دی ہیں اور ملتان کی صنعتی ترقی میں جمود سا پیدا ہو گیا ہے حالانکہ مشرقی پاکستان کے کٹ جانے سے یہاں مزید کارخانوں کے قیام کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے چنانچہ "ڈبلیو، پی، آئی، ڈی، سی" نے اعتراف کیا ہے کہ ملتان ہی ایک ایسا علاقہ ہے، جہاں انڈسٹری قائم ہو سکتی ہے اور اس نے سفارش کی ہے کہ ملتان کو سب سے بڑا انڈسٹریل شہر بنا دیا جائے۔ کراچی، لاہور اور مظفر گڑھ کو جو مراعات حاصل ہیں، اُن سے ملتان زیادہ رعایتوں کا مستحق ہے۔

• ملتان کے صنعتی ادارے

سنہ ۱۹۷۰ء کے اختتام پر کارخانوں اور فیکٹریوں کے جو اعداد و شمار مرتب ہوئے اسکی فہرست "آئینہ ملتان" کے اندراج کے مطابق درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	نام صنعت	تعداد کارخانہ	نمبر شمار	نام صنعت	تعداد کارخانہ
۱	کاٹن ٹیکسٹائل ملز	۷	۲	سپیشلائیزر ٹیکسٹائل ملز	۴
۳	وولن ٹیکسٹائل ملز	۱	۴	آرٹ سلک فیبریکس	۴

نمبر	نام	تعداد	نمبر	نام	تعداد
۵	ہینڈلومز یونٹ	۲۰	۶	دری وکمبل ساز فیکٹریاں	۷
۷	ہوزری یونٹ	۱	۸	کاٹن جننگ و پراسسنگ فیکٹریاں	۷
۹	ویجی ٹیبل گھی ملز	۳	۱۰	آئیل ملز	۲۵
۱۱	تیل خوردنی کے یونٹ	۴	۱۲	سلائی کی مشین کی فیکٹریاں	۷
۱۳	گلاس فیکٹریاں	۴	۱۴	چمڑے کے کارخانے	۸
۱۵	سٹیل رولنگ ملز	۳	۱۶	فونڈریاں اور ورکشاپ	۱۰
۱۷	سکرین پرنٹنگ یونٹ	۵	۱۸	صابن و بیلنگ یونٹ	۳
۱۹	الیکٹرک جنریٹرز	۲	۲۰	المونیم کے کارخانے	۲
۲۱	زرعی آلات کے کارخانے	۱۳	۲۲	کھاد فیکٹری	۱
۲۳	فلورملز	۱	۲۴	ٹین کا ڈبہ ساز کارخانہ	۱

۲۵۔ فارمیسوٹیکل یونٹ ۱

ملتان کے تحفے

کسی ستم ظریف کا شعر ہے ؂

چار چیز است تحفۂ ملتاں ؛ گرد و گرما گدا و گورستاں

مگر اب یہ شعر کچھ جچتا نہیں۔ کیونکہ باغات کی کثرت اور پانی کی فراوانی سے گرد و گرما کی شدت نہیں رہی۔ اکثر گورستان سڑکوں کے نیچے آگئے ہیں۔ بعض گورستان کئی ٹکڑوں میں بٹ گئے تھے۔ اس لئے بلدیہ نے قبور کے تحفظ کے لئے ان کے گرد احاطے بنوادیئے مگر قبروں کی مرمت کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبریں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئیں اور لوگوں نے ان احاطوں میں اپنے جانور باندھنے شروع کردیئے۔ اب کہیں کہیں مکانات بھی تیار کئے جارہے ہیں۔ اس طرح توقع ہے کہ قبور کی زیادتی کا کسی کو شکوہ نہیں رہے گا۔ باقی رہے گدا چونکہ

اہلِ شہر اب سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ گداؤں اور فقیروں کی صداؤں پر کان نہیں دیتے اس لئے ان کی تعداد میں بھی خاصی کمی واقع ہو گئی ہے۔ البتہ چند ایک چیزیں جو صرف ملتان سے مخصوص ہیں اور تحائف میں شمار ہوتی ہیں ۔۔ وہ یہ ہیں :۔

۱۔ طلاء دار جوتے اور جوتیاں
۲۔ اجرکیں
۳۔ ریشمی لنگیاں
۴۔ کھیس
۵۔ چادریں اور تکیے
۶۔ سوئی سے کڑھے ہوئے کرتے
۷۔ پھولدار دریاں
۸۔ کاشی کا زیبائشی سامان
۹۔ اونٹ کی کھال کے لیمپ شیڈ اور مرتبان
۱۰۔ پلاسٹر آف پیرس کے منقش پھولدان
۱۱۔ ملتانی سوہن حلوہ
۱۲۔ ملتانی فالودہ
۱۳۔ آم
۱۴۔ صابون
۱۵۔ تیل، دھنیاں اور سرسوں
۱۶۔ شیشے کا سامان

- بنکاری

صنعتی کاروبار کے بڑھ جانے سے بینکاری میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، چنانچہ اس وقت تیرہ بنک مصروفِ کار ہیں جو درج ذیل ہیں :۔

(۱) یونائیٹڈ بنک (۲) حبیب بنک (۳) مسلم کمرشل بنک (۴) کامرس بنک (۵) نیشنل بنک (۶) سٹینڈرڈ بنک (۷) آسٹریشیا بنک (۸) بہاولپور بنک (۹) یونین بنک (۱۰) لاہور کمرشل بنک (۱۱) سینٹرل کواپریٹو بنک (۱۲) صنعتی ترقیاتی بنک (۱۳) زرعی بنک۔

کمرشل بنکوں کے ذریعے ملتان کی مصنوعات دساور کو ارسال کی جاتی ہیں۔

جدید ترقیاتی جائزے

یورانیم

خداوند پاک نے اپنے فضل و کرم سے پاکستان کو بڑے انعامات سے نوازا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا بیشتر حصہ زرعی ہے۔ اس لئے اجناس کے لئے اس ملک کو کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ دوسرا یہ کہ پٹرول، چونے کا پتھر، گندھک، جپسم، نمک، کرومائٹ اور کوئلہ جیسی معدنیات کا کافی ذخیرہ اس ملک میں موجود ہے۔ سوئی گیس اور یورانیم تو واہب العطایا کا خاص عطیہ ہیں۔ سوئی گیس نے کافی حد تک ہمیں ایندھن کے فکر سے بے نیاز کر دیا ہے اور یورانیم کے سبب پاکستان اس قابل ہو گیا ہے کہ ایٹمی طاقتوں کے ممالک کی صف میں جب چاہے کھڑا ہو سکے۔

سوئی گیس

یہ ایک قدرتی گیس ہے جو بلوچستان میں سوئی نام ایک مقام میں واقع ہونے کی وجہ سے "سوئی گیس" سے موسوم ہوئی۔ سوئی گیس کے طفیل ہمارے ملک کے بیشتر کارخانے عمدگی سے کام کر رہے ہیں۔ ملوں کے اخراجات میں اس کے استعمال سے کافی کمی آگئی ہے۔ اسی کی بدولت ملتان میں کھاد فیکٹری اور پاور اسٹیشن قائم ہوئے اور شہروں کی طرح دیہات بھی بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔

کھاد فیکٹری

یہ فیکٹری لاہور روڈ پر ملتان سے پانچ میل کے فاصلے پر قائم ہے۔ اور دو سو پچاس

ایکڑ اراضی میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں یوریا اور امونیم نائٹریٹ دونوں قسم کی کھاد تیار ہوتی ہے۔ جو ہمارے ملک کی اراضی کے لئے بے حد مفید ہے۔ اس فیکٹری سے نہ صرف ہمارے ملک کی ضرورت پوری ہوتی ہے، بلکہ ہر سال لاکھوں روپے کی کھاد بیرونی ممالک کو بھی برآمد کی جاتی ہے۔ کھاد کے لئے ایک اور فیکٹری کی تعمیر بھی زیر غور ہے۔

نشتر میڈیکل کالج

یہ سہ منزلہ پُر شکوہ عمارت ڈسٹرکٹ جیل کے قریب ایک سو پچیس ایکڑ اراضی میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس میں جراحی، علم الابدان، افعال الاعضاء وغیرہ کی تعلیم اور علاج معالجہ کے تمام شعبے موجود ہیں۔ متصلہ ہسپتال میں ۴۰۴ بستروں اور خوراک وغیرہ کا انتظام ہے۔ جس کے لئے بارہ وارڈ ہیں۔ تپ دق کی شاخ جو سول ہسپتال میں قائم ہے اس میں ۶۰ بستروں کا اور اس کی زچہ بچہ شاخ واقعہ فاطمہ جناح ہسپتال میں پندرہ بستروں کا بندوبست ہے۔ اس کالج میں طلباء کی اقامت کے لئے تین ہوسٹل رازی ہال، ابن سینا ہال اور ابوالقاسم ہال ہیں۔ ہر اقامت گاہ میں ۱۱۷ طلباء کے رہنے کا انتظام ہے۔ ایک اقامت گاہ طالبات کے لئے مخصوص ہے جس میں پچھتر طالبات کی رہائش کا بندوبست ہے۔ ۲۱۰ نرسوں کے لئے الگ نرسنگ ہوم ہے۔ کالج کے احاطے میں پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے لئے نئے ڈیزائن کی خوبصورت کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور ایک دیدہ زیب مسجد بھی ہے۔ پہلے اس کالج میں طلباء اور طالبات کو یکجا تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر مخلوط تعلیم کے خراب نتائج کی بنا پر طالبات کا داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ صرف چار لڑکیوں کو داخلہ ملتا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء تک اس کالج سے ۱۲۲۷ طلباء اور ۱۹۸ طالبات ایم بی بی ایس کر چکی تھیں۔ علاوہ ازیں ۲۰۴ ڈسپنسروں، ۲۷۵

نرسوں اور ۳۱۶ مڈوائف نرسوں نے تربیت حاصل کی ہے۔

اس کالج کی منظوری اور تعمیر میں جن مردانِ خدا نے حصہ لیا، ان کا ذکر ضروری ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے صرف دو کالج تھے۔ ایک کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج بشمول میو ہسپتال۔ دوسرا بالک رام میڈیکل کالج بشمول گنگارام ہسپتال۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد تیسرے کالج اور ہسپتال کے لئے راولپنڈی اور ملتان کا مقابلہ تھا۔ طے پایا کہ جو دس لاکھ روپے ادا کرے کالج اسے دیا جائے۔ کمشنر صاحب راولپنڈی نے اتنی بڑی رقم کی ادائیگی سے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن ملتان کے کمشنر مسٹر آئی یو خاں نے حامی بھر لی۔ جس پر لاہور کے ڈاکٹروں کی مخالفت کے باوجود لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد خاں ملک اور ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ نے بھاگ دوڑ کر کے ملتان میں کالج کے قیام کی منظوری حاصل کر لی اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو لانگے خاں باغ میں بجائے دس لاکھ کے ملتان ڈویژن کی طرف سے اٹھارہ لاکھ پچیس ہزار روپے کی تھیلی بھی سردار عبدالرب نشتر کو پیش کر دی گئی چونکہ ڈاکٹر بھٹہ اس کالج کے قیام کے سلسلے میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے، اس لئے اس منصوبے کی تکمیل کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ جو انہوں نے بطور آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی اس خدمت کو احسن طور پر انجام دیا۔ ۲۸ر اپریل ۱۹۵۱ء کو سردار عبدالرب نشتر نے اس کالج کا سنگِ بنیاد رکھا اور ان کے نام پر ہی یہ کالج نشتر کالج اور نشتر ہسپتال سے موسوم ہوا۔ چونکہ نشتر کو عملِ جراحی سے خاص مناسبت ہے، اس لئے یہ نام بہت مقبول ہوا۔

۱۰ر جولائی ۱۹۵۱ء کو کالج کی تعمیر شروع ہوئی اور یکم اکتوبر کو ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ اس عظیم طبی درس گاہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ جنہوں نے دو کروڑ روپے کی لاگت سے پانچ سال کے عرصے میں اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچایا۔ بلاشبہ یہ عظیم کارنامہ ڈاکٹر بھٹہ صاحب کی برق رفتاری، ان تھک محنت اور دیانت داری کا زندہ ثبوت ہے۔ اور وہ

اس پر جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس رفاہی ادارے کو منظر عام پر لاکر بھٹہ صاحب نے اتنی بڑی نیکی کا کام کیا ہے جو ان کی نجات کے لئے کافی ہے، تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔

ریڈیو پاکستان، ملتان

ریڈیو اسٹیشن کی سہ منزلہ عمارت ملتان چھاؤنی میں واقع ہے۔ نشری آلات بہاولپور روڈ پر نصب ہیں، جو ملتان سے کافی دور ہیں اور انہیں آپس میں ایکدوسرے سے مربوط کیا گیا ہے۔ اہلِ ملتان کے دیرینہ مطالبے کی بنا پر ۱۹۶۶ء میں اس کی منظوری ہوئی اور اس کے لئے مناسب مقامات پر اراضی حاصل کی گئی۔ اس کے لئے مشینری ہالینڈ سے منگوائی گئی۔ اور اس کے نصب کرنے کا کام پاکستانی انجنیئروں نے انجام دیا۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو نوابزادہ شیر علی خاں وزیر اطلاعات و نشریات نے اس کا افتتاح کیا اور یقین دہانی کرائی گئی کہ اس ریڈیو پر علاقائی زبان کا حق فائق ہوگا۔ مگر افسوس ہے، کہ سرائیکی زبان کو جو اس علاقہ کے دو کروڑ عوام کی زبان ہے ـــــ درخور اعتنا تصوّر نہیں کیا گیا۔ تمام پروگراموں پر پنجابی کو بالادستی حاصل ہے۔ یہاں تک کہ خبریں، اور زرعی و دیگر اصلاحی اعلانات تک پنجابی میں ہوتے ہیں اور سرائیکی کے پرانے ریکارڈ نشر کرکے اس زبان کا منہ چڑایا جاتا ہے۔ عملے میں بھی سرائیکی کو نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس زیادتی کو شدت سے محسوس کیا جارہا ہے۔

مؤتمر عالمِ اسلامی

مسلمانوں کو متحد اور منظم کرنے کی جو کوششیں مختلف اوقات میں عمائدینِ اسلام نے

کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ تحریک بھی ہے۔ جس کی بنیاد ۱۹۲۶ء میں شاہ ابن سعود نے مکہ مکرمہ میں رکھی تھی۔ اس کا دوسرا عالمی اجتماع ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس میں ہوا اور ۱۹۴۹ء میں تیسرا اجلاس خاص کراچی میں ہوا۔ جس کا افتتاح اس وقت کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کیا۔ اس کی ایک شاخ ملتان میں بھی قائم ہوئی۔ جس کے اجلاس گاہے گاہے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

انجمن اتحادِ ثلاثہ

یہ انجمن ایران، پاکستان اور ترکی کے اربابِ اختیار کی تحریک پر ۲۱ جولائی ۱۹۶۱ء کو بمقام استنبول قائم ہوئی۔ اس کا مقصد علاقائی سطح پر مشترکہ کوششوں سے اقتصادی اور معاشرتی مسائل کا حل کرنا ہے۔ ملتان میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہے جو تینوں ممالک کی قومی اور تاریخی تقریبات کے موقع پر اپنے اجلاس منعقد کرتی ہے۔

انجمن پاک ایران دوستی

ایران اور پاکستان کا قدیم سے چولی دامن کا ساتھ چلا آیا ہے۔ ان تعلقات کو استوار کرنے کے لئے پاکستان اور ایران کے بڑے بڑے شہروں میں اس انجمن کی شاخیں قائم ہیں چنانچہ ملتان میں بھی اس نام کی ایک انجمن قابلِ تعریف کام کر رہی ہے۔ جس کے روحِ رواں مسٹر غضنفر مہدی ہیں جو ایرانی تقریبات کے موقع پر شاندار اجلاس منعقد کراتے ہیں۔

یوتھ موومنٹ

یہ تحریک نوجوان طبقہ میں خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کرنے اور انہیں عسکری تربیت دینے

کے گئے ۱۹ر جولائی ۱۹۵۹ء کو وجود میں آئی۔ ابتدائً ایک ورک کیمپ ہوا جس میں ایک سو نوجوانوں نے حصہ لیا۔ جنہیں ملٹری ٹریننگ دینے کے لئے یوتھ رائفل کلب قائم ہوئی۔ اسے حکومت نے ۲۲ بور بندوق کے پانچ فری لائسنس بھی عطا کئے تاکہ عوام کو فوجی تربیت دی جا سکے۔ مگر یہ تحریک اب عملی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اور یوتھ سنٹر ملتان صرف ڈنگل کا کام دے رہا ہے۔

سپورٹس

کالجوں اور سکولوں کے کھیل اور ورزش کا انتظام سرکاری طور پر ڈویژنل انسپکٹر کرتا ہے۔ اس کے زیرِ انتظام پندرہ ایسوسی ایشنز مصروفِ عمل ہیں۔ ان کے لئے ایک ڈویژنل ٹریننگ سنٹر مقرر ہے۔ جس کے وسیع و عریض میدانوں میں اعلیٰ سطح پر کھیلوں کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ ایسوسی ایشنز درج ذیل کھیلوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

فٹ بال، ہاکی، باسکٹ بال، کرکٹ، ریسنگ، والی بال، اتھلیٹکس، بیڈمنٹن ٹیبل ٹینس، سکوائش ریکٹ، لان ٹینس، کبڈی، باڈی بلڈنگ، ویمن سپورٹس۔

ملتان کرکٹ کلب

اس کلب کی بنیاد مولوی عرفان احمد انصاری، چودھری عبداللطیف امرتسری، اور ملک محمد صدیق نے ۱۹۴۳ء میں رکھی۔ ۱۹۶۸ء میں اس کی سلور جوبلی منائی گئی۔ اگرچہ اسے شروع سے سرکاری حکام کی سرپرستی حاصل رہی ہے، مگر اس نے گورنمنٹ کے آگے مالی اعانت کے لئے کبھی دامن نہیں پھیلایا۔ اس کے شائقین خود اس کے اخراجات کے کفیل بنے رہے ہیں۔ نواں شہر چوک کے قریب اس نے ۱۹۵۲ء میں وسیع پلاٹ حاصل کر کے اس پر کافی رقم خرچ

کی اور اپنے لئے مفید مطلب بنایا۔ اس کلب نے ہی ممتاز الرحمٰن اور اعجاز حسین جیسے نامور کھلاڑی پیدا کئے۔ موجودہ کھلاڑیوں میں ملک بشیر، آغا محمد حسین، ملک صدیق اور بشیر کا رودار قابلِ ذکر ہیں۔ سنہ ۱۹۶۰ء تک سردار عبدالجبار خاں اس کے صدر اور چودھری عبداللطیف سکرٹری رہے۔ مگر اب مؤخر الذکر ہی اس کے صدر ہیں۔

فٹ بال ایسوسی ایشن

اس ایسوسی ایشن کی بنیاد ضلعی سطح پر سردار عبدالجبار خاں، نوابزادہ غلام قاسم خاں اور فیض محمد خاں دُرّانی نے سنہ ۱۹۴۹ء میں رکھی۔ اور آل پاکستان قائدِ اعظم فٹ بال ٹورنامنٹ کا آغاز کیا جو ہر سال قلعۂ قدیم کے سٹیڈیم میں ایک ماہ تک ہوتا ہے۔ اس میں پاکستان کی پچیس ٹیمیں شرکت کرتی ہیں، اس کی تقسیم انعامات کی تقاریب کو محترمہ فاطمہ جناح، سردار نشتر اور جنرل موسیٰ خاں جیسی عظیم شخصیتوں نے صدارت کا اعزاز بخشا۔ اور سلیم اللہ خاں، شرف الدین، شیخ اقبال، فیض محمد خاں، کرنل محمود خاں، کریم نواز خاں، اللہ نواز خاں، نعمت اللہ خاں اور عطا محمد خاں جیسے نامور فٹ بالرز اُبھرے۔ کریم نواز خاں نے تو عالمی شہرت حاصل کی۔

ورزشی ادارے

جسم کی ساخت میں مناسب ردّو بدل کی غرض سے ملتان میں چودہ ورزشی اکھاڑے قائم ہیں۔ جن کا رجسٹریشن پاکستان باڈی بلڈرز ایسوسی ایشن لاہور کرتا ہے۔ انہی کلبوں کے طفیل عابد حسین بٹ نے مسٹر پاکستان، اور مسٹر یونیورس کمپی ٹیٹر کا شرف حاصل کیا۔ وکیل الدین مسٹر ملتان، ظفر اقبال مسٹر ملتان ڈویژن، ڈاکٹر محمد عمر خاں مسٹر ملتان اور پاکستان کے کلاس ونر قرار پائے۔ محمد عمر خاں اور عابد حسین بٹ نے لندن کے مقابلوں میں ملتان کی نمائندگی کی۔

تاریخی عمارتیں

ٹاؤن ہال

یہ عالی شان عمارت لوہاری دروازے کے باہر واقع ہے۔ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے اس کا بنیادی پتھر رکھا۔ اور بلدیہ نے اس پر مصارف کثیر سے نارتھ بروک کلاک ٹاور اور ٹاؤن ہال تعمیر کرایا۔ بلدیہ کے جملہ دفاتر اسی عمارت میں واقع ہیں۔ ہال میں سرکاری اور غیر سرکاری اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔

مینارۂ یادگار

یہ گاؤدم مینار قلعۂ قدیم کے عین درمیان واقع ہے اور تقریباً پچاس فٹ بلند ہے۔ اس کو سر رابرٹ نے مسٹر اگینیو اور مسٹر اینڈرسن کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ چبوترے کے مغربی جانب مدفون انگریزوں کے وقائع کندہ ہیں۔

باغیچہ مرزا جان

یہ باغیچہ نواب مرزا جانی بیگ نے بزمانہ صوبیداری ۱۵۹۵ء میں تعمیر کرایا تھا، مگر موصوف یہاں تھوڑا عرصہ رہے اور پھر ٹھٹھہ (سندھ) کو منتقل ہو گئے۔ اب باغیچہ تو نہیں رہا، البتہ مرزا جانی بیگ کے زمانہ کی بنگلہ نما عمارت موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ یہ جائیداد اب ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے رئیس نواب غلام نقشبند خاں علی زئی کی ملکیت ہے جس میں انہوں نے مفید مطلب عمارتیں تعمیر کرائی ہیں۔

شیش محل

یہ نادرۂ روزگار عمارت نواب شاکر خاں کی تعمیر کردہ ہے۔ چونکہ اس میں شیشہ بندی

کی گئی تھی اس لئے شیش محل سے موسوم ہوئی۔ یہ وہ تاریخی محل ہے جہاں نواب مظفر خاں شہید نے سالہا سال تک اس رواداری اور بے تعصبی سے عدل و انصاف کیا، کہ اہلِ ملتان نوشیرواں کے نام کو بھول گئے۔ مگر افسوس جہاں زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے بوڑھے نواب اور اس کے شیر دل بچوں کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح اس عمارت کو مسخ کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ آج اس عمارت میں نہ شیشے کا کام ہے اور نہ نقاشی و منبت کاری کا کچھ نشان ملتا ہے۔ یہ محل آجکل کمشنر ملتان کی قیام گاہ کا کام دے رہا ہے۔ اور باغ کا کافی حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ چونکہ نواں شہر سے شیش محل تک باغ ہی باغ تھا۔ مگر اب اس کے حصے بنجر ہو چکے ہیں۔ اور اس پر کوٹھیاں تعمیر ہو گئی ہیں۔ البتہ ان کے صحن میں کہیں کہیں آموں کے پیڑ نظر آ جاتے ہیں، جو سدوزئی افاغنہ کے وسیع و عریض گلستان کی یاد دلاتے ہیں۔

اسی طرح شجاع آباد میں بھی نواب مظفر خاں کا محل تھا۔ وہ بھی شکستہ ہو چکا ہے اور دیواروں پر جو خوبصورت نقش و نگار تھے وہ یا تو مٹ چکے ہیں یا مسخ ہو گئے ہیں محکمہ آثارِ قدیمہ نے ان دونوں تاریخی یادگاروں کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ضلع ملتان میں تاریخی عمارتوں کا فقدان ہے۔ مناسب ہے کہ گورنمنٹ ان دونوں محلات کو اصل صورت میں لانے کا انتظام کرے اور انہیں عوام کے لئے واگزار کر دے تاکہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سدوزئی حکمرانوں کی طرزِ تعمیر سے واقف ہو سکیں۔

ہندو یادگاریں

سورج مندر

ملتان میں ہندو تہذیب کا سب سے بڑا شاہکار سورج مندر تھا جس کے درشن کو

ہندوستان کے طول و عرض سے ہندو یاتری کھچ کھچا کر جمع ہوتے تھے۔ اس کا شمار سندھ کے مرکزی بُت خانوں میں ہوتا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر جلد اوّل میں آچکا ہے۔ اب سورج مندر کا کوئی نشان باقی نہیں ہے بلکہ محل وقوع تک کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

پرہلاد پوری

ملتان شہر میں جس مندر کو تاریخی اعتبار سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ پرہلاد جی کا مندر ہے۔ اس کا ذکر بھی جلد اوّل میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔

سمادھ دیوان ساون مل

یہ سمادھ ولایت حسین کالج کے جانب شرق واقع ہے۔

سمادھ باوا سفرا

یہ سمادھ مقبرہ شاہ شمسؒ کے قریب واقع ہے۔ بسنت کے دن یہاں ہندوؤں کا بڑا میلہ لگتا تھا اور ہندو سبھا کے زیر انتظام ٹورنامنٹ بھی ہوتے تھے۔

مندر رام تیرتھ

یہ مندر دہلی دروازہ کے باہر میلسی اور دُنیا پور کی سڑکوں کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ ملتان جلد اوّل، صفحہ ۵۱ و ۵۲۔

سمادھ ہنت کیشو پوری

یہ سمادھ تالاب رام تیرتھ کے کنارے واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ ہنت صاحب بڑے عبادت گزار انسان تھے۔ ملتان شہر کا نام ایک عرصہ تک اُن کی وجہ سے کیشو پوری مشہور رہا۔ اس عمارت میں چند ایک اور سمادھیں بھی ہیں۔ اور دیوتاؤں کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی ایک سرداب ہے جس میں دوپہر کے وقت سادھو آرام کرتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات کے زمانے میں اسے اسلحہ خانہ کے طور پر استعمال میں لایا جاتا تھا۔

گیان تھلہ

گیان تھلہ دہلی دروازے کے باہر واقع ہے۔ اور اب مدرسہ عربیہ خیر المدارس کے کام آرہا ہے۔ ہندو مسلم فسادات کے زمانے میں اس وسیع و عریض عمارت کو ہندو دفاعی قلعے میں تبدیل کر لیتے تھے۔ یہاں ہر قسم کا آتشیں اسلحہ جمع رہتا تھا اور فسادات کے دنوں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی تھی۔

مندر نرسنگھ پوری

پہلے یہ مندر قلعے میں واقع تھا۔ چونکہ اندر جانے کے لئے حکام سے اجازت لینی پڑتی تھی اس لئے یاتریوں کو پوجا پاٹ میں تکلیف ہوتی تھی۔ بنا بریں پرہلاد پوری کے مہنت، بابا رام جی داس نے فتح چند ٹنگسالیہ کے گوردوارہ میں ایک نیا مندر بنوایا اور نرسنگھ جی کی مورتی کو اس میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۲ء کے قریب سیٹھ کالو رام صاحب خزانچی نے دس ہزار روپے کی لاگت سے اس پر شاندار عمارت تعمیر کرائی۔

جین مندر

یہ مندر چوک بازار کے بالکل قریب چوڑی سرائے میں واقع ہے۔ پہلے یہاں ایک مسلمان بزرگ شاہ مجید کی قبر تھی اور یہ چوک بھی انہی سے موسوم تھا۔ ۱۸۸۰ء میں ہندوؤں نے قبر پر بت خانہ بنا کر اسے مندر میں تبدیل کر لیا، پھر ساڑھے ہزار روپے کی لاگت سے اس پر خوبصورت عمارت تعمیر کی۔ اب جبکہ یہ مقام ہندوؤں کے تسلط سے آزاد ہو چکا ہے۔ شاہ صاحب کی قبر کو بھی آزادی ملنی چاہیئے تاکہ مسلمان اس پر فاتحہ پڑھ سکیں۔

مندر ہنومان جی

یہ خوبصورت مندر چوک بازار میں واقع ہے اور اس میں ہنومان جی کی مورتی رکھی ہے۔

دوارہ بھگت بنارسی داس جی

تین سو سال گزرے بنارسی داس نام کا ایک

خدا رسیدہ بھگت ملتان میں رہتا تھا۔ اس کی یاد کو قائم رکھنے کے لئے یہ مندر تعمیر کرایا گیا۔ یہ مندر اندرون حرم دروازہ واقع ہے۔

مندر تو تلاں مائی:۔ ایک ہندی دوہا مشہور ہے ؎

ہنگلاج پچھم شاستری توتل گھر ملتان
نگر کوٹ دُکھ بھنجی تینو دیو پردھان

اس کا مطلب یہ ہے کہ تین دیویاں قابلِ ذکر ہیں۔ شاستری ہنگلاج کے مغرب میں، توتلاں کا مقام ملتان میں ہے۔ اور دُکھ بھنجی کا استھان نگر کوٹ میں۔ بیان کرتے ہیں کہ پہلے اسس دیوی کا استھان سورج کنڈ کے قریب شجاع آباد روڈ پر تھا۔ اورنگ زیب کی صوبیداری کے زمانے میں مندر کا پجاری اس مورتی کو شہر میں لے آیا۔ حرم دروازہ کے اندر اسے ایک مکان میں رکھا گیا۔ موجودہ عمارت جو مورتی پر موجود ہے، یہ مدن ہزاری کاردار کے زمانہ میں تعمیر ہوئی ہے۔ دیوان ساون مل نے تین چار ہزار روپے خرچ کر کے اسے اور وسیع کیا۔ اسلامی دور میں اس مندر کے لئے یکصد روپیہ سالانہ مقرر تھا۔ علاوہ ازیں چاہ دیویاں والہ بھی معاف تھا۔ لیکن انگریزی عہد میں یہ معافی ضبط ہو گئی۔

مندر جوگ مایا

یہ مندر اسٹیشن ملتان شہر کے قریب واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہرناکشپ کو سزا دینے کے لئے نرسنگھ اوتار آتشیں ستون سے برآمد ہوئے تو اس کے غصہ کو فرو کرنے کے لئے متعدد دیوی دیوتا ملتان پہنچے اور جہاں جہاں جس نے قیام کیا۔ وہاں ان کی یادگاریں استھان بن گئے۔ چنانچہ یہاں جوگ مایا نے قیام کیا۔ پہلے اس جگہ چبوترہ تھا جس پر بکریاں وغیرہ بھینٹ چڑھائی جاتی تھیں۔ بعد میں جب توتلاں مائی کے جوت یہاں منتقل کئے گئے تو اس چبوترے کا نام جوت استھان پڑ گیا۔ اور بعد میں جوگ مایا کے نام سے موسوم ہوا۔ دیوان

ساون مل نے اس پر خشت و آہک کا شاندار مندر تعمیر کرایا تھا۔ جب تک ہندو یہاں آباد تھے اس مندر میں ہر وقت جوت روشن رہتے تھے۔ اور سال میں دو دفعہ یعنی ماہ چیت اور اسوج کے نوراترہ میں یہاں زبردست میلے لگتے تھے۔

چندر کنڈ، تارا کنڈ

یہ دونوں تالاب شجاع آباد روڈ پر واقع ہیں۔ ہندوانہ روایات کے مطابق نرسنگھ جی کے غیظ و غضب کو فرو کرنے کے لئے ان مقامات پر چاند دیوتا اور تارا دیوتا اترے تھے

سورج کنڈ

یہ تالاب ملتان شہر سے چار میل جنوب کو شجاع آباد روڈ پر واقع ہے۔ مشہور ہے کہ راجہ ہرناکشپ کے قتل کے وقت سورج دیوتا یہاں اترے تھے اور انہوں نے یہ بر دیا تھا کہ جو اس تالاب میں نہائے گا وہ پھل پائے گا۔ چنانچہ سورج دیوتا کے ارشاد کی تعمیل میں یہاں ایک بڑا تالاب بنایا گیا۔ دیوان ساون مل نے اس کی مرمت کرائی اور اوپر سکونتی عمارتیں بنائیں ہندوؤں کے چلے جانے سے اس کی تمام رونقیں ختم ہو گئی ہیں۔

خالصہ یادگاریں

دہلی دروازے کے باہر نشیب میں آبادی کا کافی حصہ آغا پورہ کے نام سے مشہور ہے یہاں پہلے پہل بہادر شاہ کے استاد بھائی نند لعل نے سکونت اختیار کی تھی۔ چونکہ وہ غزنی کے رہنے والے تھے۔ اس لئے لوگ انہیں "آغا" کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ آغا پورہ سے موسوم ہوا۔ انتقالِ آبادی سے پہلے یہاں سہج دھاری سکھ آباد تھے۔ اب زیادہ تر مہاجرین آباد ہیں۔

بیٹھک گورونانک

سکھ بیان کیا کرتے تھے کہ گورونانک صاحب نے شاہ شمسؒ کے مقبرہ پر حاضری دی ہے۔ اس لئے اس مقبرے کو گورونانک کی بیٹھک تصوّر کر کے سکھ ثواب کی خاطر یہاں حاضری دیا کرتے تھے۔

گوردوارہ بھائی دیال

یہ گوردوارہ دہلی دروازہ کے اندر واقع ہے۔ جب سکھ اس شہر میں آباد تھے۔ یہاں کافی رونق رہتی تھی۔ اس جگہ مسافروں کی رہائش اور خوراک کا اچھا انتظام ہوتا تھا۔ اور اس میں ہندو مسلمان کی تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ ہر مسافر سے ہمدردانہ سلوک کیا جاتا تھا۔

سنگ سبھا ملتان چھاؤنی

ملتان چھاؤنی میں بالعموم کیسہ دھاری سکھ آباد تھے۔ ان میں اکثر ملازمت پیشہ تھے جو باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان کے زیر انتظام ایک سنگھ سبھا قائم تھی جس کا ایک گوردوارہ کنک منڈی میں واقع تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سکھ کنیا پاٹھ شالہ اور ایک لائبریری بھی تھی۔ یہ تمام رونقیں سکھوں کے ساتھ ختم ہو گئیں۔

مسیحی یادگاریں

ملتان چھاؤنی اور شہر میں عیسائیوں کے کئی گرجے، ہسپتال اور سکول ہیں تفصیلات کے لئے مقامی مسیحی مشنریز اور ان کے کارکنان سے رابطہ قائم کیا گیا، مگر انھوں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس لئے انتہائی اشتیاق کے باوجود ہم ان کی تبلیغی اور رفاہی سرگرمیوں پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں ؛

کتابیات

اِس کتاب کی تدوین میں درجِ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے :۔

تاریخ ملتان از لالہ حکم چند۔ مرقع ملتان از سید اولاد علی گیلانی۔ کتاب الہند از بیرونی۔ سیاحت نامہ ہیون تسانگ۔ انڈیکا از میگھستینز یا ڈر اجستھان۔ تاریخ ہند از مولانا ذکا اللہ۔ ملتان قدیم و جدید۔ چچ نامہ۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ملتان۔ تحفتہ الکرام۔ دارالحکومت دہلی۔ تاریخ یمینی۔ تعارف۔ اسلامی ہند۔ تاریخ ہند از لالہ رگھوناتھ سہلئے۔ مفتاح التواریخ ۔ تاریخ اجمیر از ہربلاس سارداـ تاریخ ہندوستان از پنڈت وشوناتھ۔ تاریخ ہند کے ماخذ۔ وید۔ بھگوت گیتا۔ رامائن۔ منو کے قوانین۔ تاریخ ہند از ایلیٹ۔ سکندر اعظم از کرٹس روفس۔ سکندر اعظم از اناہبیس۔ سکندر از پلوٹارک۔ راج ترنگنی۔ تاریخ فیروز شاہی۔ تاریخ فرشتہ۔ تزک بابری۔ ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم۔ تاریخ حقی۔ تاریخ شیر شاہی از عباس خان ۔ آئین اکبری۔ تزک جہانگیری۔ بادشاہ نامہ۔ عملِ صالح۔ ماثر عالمگیری۔ تاریخ بدایونی، ترجمہ ایلیٹ۔ ابن اثیر۔ ابنِ کثیر۔ اصطخری۔ الادریسی۔ یاقوتی۔ یعقوبی۔ ابن رستہ۔ ابن حوقل۔ بشاری مقدسی۔ ابن خلکان۔ قزوینی۔ ابن ندیم۔ آبِ کوثر۔ ارضِ ملتان۔ آئینہ ملتان۔ پاکستان ناگزیر تھا۔ یادوں کے چراغ۔ دیوانِ حسن۔ لطائف سیریہ۔ دیوانِ فریدی۔ مثنوی مُلّا نادر۔ تذکرۃ الملتان۔ تواریخ خالصہ۔ ظفر نامہ رنجیت سنگھ۔ احمد شاہ ابدالی۔ سرِّ دلبراں۔ منتخب اللباب خافی خاں۔ مقاماتِ داؤدی۔ مشائخ سہروردی۔ ملتان کے سدوزئی از عمر کمال خاں۔ حیات خسروؒ۔ سیر العارفین۔ نزہتہ الخواطر۔ تاریخ سندھ از مرزا محمد کاظم۔ مولانا شرر، سید ابوظفر ندوی۔ رہنمائے کشمیر۔ سفر نامہ ابنِ بطوطہ۔ اسلامی ہند۔ سیر المتاخرین۔ گلِ بہار۔ بلوچ قوم اور اس کی تاریخ۔ سرزمین ملتان۔